زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ) ------ 500 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 4000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 5000 روپے

مکمل ناول

مستقل سلسلے

فروری 2011
جلد 33 شمارہ 11
قیمت 40 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔
پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام اشاعت: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: khawateendigest@hotmail.com , info@khawateendigest.com

مدیرہ

فروری کا کرن آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

ہمارا پورا ملک خصوصاً کراچی ان دنوں جن حالات سے گزر رہا ہے وہ نئے نہیں ہیں۔ پچھلے کئی سالوں سے یہ ہی کیفیت ہے لیکن اب تو دہشت عروج پر پہنچ گئی ہے۔ انسانی جانوں کی یہ ارزانی تو افسوس ناک ہے لیکن اس سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ حالات کو سدھارنے کی کوئی کوشش نہیں کی جا رہی ہے۔ عجیب بے حسی کا عالم طاری ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم بحیثیت قوم اجتماعی مفادات کا جائزہ لیں اور اپنی حالت سدھارنے کے لیے کوئی فعال قدم اٹھائیں۔

دعا کریں کہ عروس البلاد کراچی کی رونقیں لوٹ آئیں۔ نفرتوں کی آگ کے بجائے محبتوں کی خوشبو ہو، کوئی تعصب نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ ہماری دعاؤں کو قبول فرمائے۔ (آمین)

مارچ کا شمارہ حسب روایت سالگرہ نمبر ہوگا جس میں قارئین کی دلچسپی کے لیے نئے نئے سلسلے بھی شامل ہوں گے۔ مصنفین اور قارئین سے درخواست ہے کہ اپنی تحریریں ہمیں جلد از جلد روانہ کر دیں تاکہ سالگرہ نمبر میں شاملِ اشاعت ہو سکیں۔

اس شمارے میں،

- اداکار "عادل مراد" کی شاہین رشید سے ملاقات،
- میزبان "نعیم خان" "دو کے پہاڑے کے ساتھ"،
- گلوکار "جواد احمد" کی نازیہ کنول نازی سے باتیں،
- پرویز مشرف کی بیگم صہبا مشرف سے (?) ان کے گھر کی باتیں،
- "بول کہ لب آزاد ہیں" قارئین کے لیے دلچسپ سلسلہ،
- "دستِ کوزہ گر" فوزیہ یاسمین کا سلسلے وار ناول،
- "دردِ دل" نبیلہ عزیز کا سلسلے وار ناول،
- "عشق آتش" سعدیہ راجپوت کا طویل مکمل ناول،
- "تیرے آسماں تلے" نازیہ کنول نازی کا مکمل ناول،
- "میری حسرتوں کو شمار کر" مہوش افتخار کا ناول،
- آصفہ عنبرین قاضی کا دلچسپ مکمل ناول،
- "گوشۂ عافیت" شگفتہ بھٹی کا ناولٹ اختتام کی طرف،
- عائشہ نصیر، فوزیہ احسان اور رمشا خالد کے افسانے اور مستقل سلسلے،

مفت،

کرن کتاب "سوپ ہی سوپ" کرن کے ہر شمارے کے ساتھ مفت پیشِ خدمت ہے۔ استفادہ کریں۔

مجھے تجھ سے محبت ہے، مرے اللہ
یہی میری عبادت ہے، مرے اللہ

مجھے بھی تو وہی خوبی عطا کر
جو خوبی تیری فطرت ہے، مرے اللہ

خود اپنے رنگ میں تو رنگ لے مجھ کو
یہی اس دل کی حسرت ہے، مرے اللہ

میں تیرے کام کا بندہ نہیں تو کیا
کہ تو میری ضرورت ہے، مرے اللہ

مجھے اس راہ پر ہی گامزن رکھنا
کہ جو راہ ہدایت ہے، مرے اللہ

ہے جو بھی کچھ مرے دامانِ قسمت میں
وہ سب تیری عنایت ہے، مرے اللہ

پرویز ساحر

نعت رسول مقبول ﷺ

پاؤ گے قرآن کی ایک ایک آیت کا شعور
دل سے گر حاصل کرو آقا ﷺ کی سیرت کا شعور

وہ ﷺ سراجِ ضوفشاں ہیں یعنی مصباحِ منیر
کاش دنیا کو ہو اس نورِ نبوت کا شعور

مل نہیں سکتی مواخاتِ مدینہ کی مثال
آپ ﷺ نے انساں کو بخشا ہے اخوت کا شعور

آپ ﷺ عبدِ بے مثال اور آپ ﷺ سردارِ انام
آپ ﷺ نے ہم کو دیا رب کی عبادت کا شعور

آپ ﷺ کی تعلیم ہے، اللہ سے ڈرتے رہو
دل میں رکھنا سختیٔ روزِ قیامت کا شعور

پیٹ پر باندھے ہیں پتھر اور خندق کھود لی
آپ ﷺ کی سیرت سے ملتا ہے مشقت کا شعور

بے گماں رب کی اطاعت ہے اطاعت آپ ﷺ کی
پھول! رکھنا چاہیے ہر پل اطاعت کا شعور

تنویر پھول

عادل مراد سے ملاقات

شاہین رشید

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ انفرادی طور پر کتنی ہی کامیابیاں کیوں نہ حاصل کرلیں لیکن ان کی پہچان ان کے والدین ہی ہوتے ہیں۔۔۔ عادل مراد بھی ان میں ہی شمار ہوتے ہیں۔

وحید مراد کو دنیا سے گزرے ہوئے کئی برس ہوگئے ہیں مگر ان کا نام زندہ ہے۔ ان کے چاہنے والوں کی تعداد اب بھی بہت زیادہ ہے اور عادل مراد بھی وحید مراد کے حوالے سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔ جبکہ عادل مراد خود بھی شوبز میں بہت کامیابیاں سمیٹ چکے ہیں۔ گزشتہ دنوں وحید مراد کو حکومت پاکستان کی جانب سے ستارہ امتیاز دیا گیا۔ اس حوالے سے اور عادل مراد کی اپنی زندگی کے حوالے سے کچھ بات چیت ہوئی۔

★ "کیسے ہیں عادل مراد صاحب اور آپ کو بہت مبارک ہو کہ آپ کے والد محترم وحید مراد صاحب کو حکومت پاکستان کی جانب سے "ستارہ امتیاز" ملا ہے؟"

✻ "جی الحمدللہ میں ٹھیک ٹھاک ہوں اور بہت شکریہ آپ کی مبارک باد کا۔"

★ "ستائیسویں برسی پہ یہ اعزاز دیا گیا کچھ زیادہ ہی دیر نہیں ہوگئی؟"

✻ "بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ یہ اعزاز بہت دیر میں ملا ہے لیکن چلیں ملا تو سہی اور آپ یقین کریں کہ اتنے مبارک باد کے فون آرہے ہیں کہ بتا نہیں سکتا۔"

★ "آپ کو اندازہ ہو رہا ہوگا کہ آپ کے پاپا آج تک کتنے پاپولر ہیں؟"

✻ "جی۔۔۔ میں یہی آپ کو بتانا چاہ رہا تھا کہ اتنے سال گزرنے کے باوجود لوگ ابھی تک پاپا کو بھولے نہیں ہیں اور ابھی تک انہیں اور ان کی فلموں کو پسند کرتے ہیں۔ وہ کل بھی ہیرو تھے اور آج بھی ہیرو ہیں۔ اور ہمیشہ رہیں گے۔ کیونکہ آج کی نسل بھی ان کو بہت پسند کرتی ہے۔"

"میں چاہوں گی کہ آپ اپنے والد کی کچھ یادیں ہمارے قارئین کے ساتھ شیئر کریں اور کچھ باتیں آپ کی فیلڈ کے بارے میں؟"

★ "جی ضرور آپ پوچھیں میں ضرور بتاؤں گا۔"

"آپ کو آپ کتنے سال کے تھے جب آپ کے والد کا انتقال ہوا؟"

✻ "میں تقریباً سات سال کا تھا جب میرے والد صاحب کا انتقال ہوا اور اس وقت میری امی اور بہن امریکہ میں تھے اور کچھ دنوں کے بعد ہمیں بھی امریکہ جانا تھا۔"

★ "پاپا کے ساتھ منائی گئی سالگرہیں یاد ہیں آپ کو؟"

✻ "جی مجھے اپنی آخری سالگرہ تو بہت اچھی طرح یاد ہے جو کہ میری ساتویں سالگرہ تھی اور چونکہ میری امی اور بہن ان دنوں امریکہ میں تھے تو ہم نے یہ سالگرہ پاپا کی منہ بولی بہن کے گھر منائی تھی۔

پاپا نے میرا ہاتھ پکڑ کر کیک کاٹا تھا۔ پاپا کے ہاتھوں کا لمس آج بھی میں محسوس کر سکتا ہوں۔ سالگرہ کے دس یا بارہ دن کے بعد مجھے اور پاپا کو بھی امریکہ جانا تھا مگر اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہیں تھا اور جانے سے دو تین دن پہلے ان کا انتقال ہوگیا۔"

★ "اپنے بچپن کے بارے میں بتائیے جو اپنے والد کے ساتھ گزارے؟"

✻ "سات سال کا عرصہ بہت مختصر ہوتا ہے اور بچوں کو اتنی کم عمری کی باتیں یاد نہیں رہتیں اور اگر میرے والد صاحب حیات ہوتے تو شاید مجھے اپنے بچپن کی باتیں یاد نہ ہوتیں لیکن چونکہ والد صاحب کم عمری میں ہی جدا ہوگئے تو ان کے ساتھ گزارے ہوئے سارے ہی دن ذہن نشین ہوگئے۔۔۔ میں بچپن میں خاصا شرارتی ہوا کرتا تھا اور میری شرارتوں سے پاپا اکثر پریشان ہو جاتے تھے اور کبھی کبھی ڈانٹ کے ساتھ ساتھ مار بھی پڑ جایا کرتی تھی۔"

★ "گیم کیا کھیلتے تھے اور فرمائشیں کیا کرتے تھے؟"

✻ "فرمائشوں کا تو یہ حال تھا کہ جو مانگتا تھا مل جاتا تھا۔ بہت زیادہ پیار کرتے تھے پاپا اور کرکٹ کھیلنے کا ہم دونوں کو بہت شوق تھا تو میں اکثر ان کے ساتھ کرکٹ کھیلتا تھا اور لاہور میں ہی والد صاحب کے ساتھ گھومتا پھرتا تھا۔ ان کے ساتھ گھر سے باہر کھانا کھاتا۔ غرض یہ کہ اس عمر کے جو یادیں ہیں بالکل تازہ ہیں۔"

★ "والد صاحب کی خواہش تھی کہ آپ بھی بڑے ہو کر ان کی طرح ہیرو بنیں؟"

✻ "میرا نہیں خیال کہ ان کا ایسا کوئی خیال تھا کیونکہ وہ تو ہمیں کبھی اپنے ساتھ نہ تو شوٹ پہ لے جاتے تھے اور نہ ہی کبھی اسٹوڈیو لے جایا کرتے تھے' ہاں وہ فنکار جو ہمارے گھر کے قریب رہتے تھے یا جو ہمارے گھر آتے جاتے تھے ان سے میری ملاقات ضرور ہو جایا کرتی تھی اور ان سے ملنا کوئی ایسی انوکھی خواہش یا انوکھی بات نہیں لگتی تھی۔"

★ "آپ کی ایک بہن اور آپ۔۔۔ والد صاحب کس سے زیادہ پیار کرتے تھے اور آپ پاپا کے زیادہ نزدیک تھے یا والدہ کے؟"

✻ "پاپا ہم دونوں سے ہی بہت پیار کرتے تھے۔ لیکن پتا نہیں کیوں مجھے پاپا سے بہت ڈر لگتا تھا اور میں ان سے تھوڑا دور رہتا تھا۔ باپ کی حیثیت ان کا ایک رعب تھا اپنی اولاد پہ۔ مگر وہ ایک پیار کرنے والے انسان اور باپ تھے۔"

★ "آپ کے والد کے انتقال کے بعد آپ کی والدہ نے آپ پر بہت محنت کی اور آپ کو اعلا تعلیم بھی دلوائی' کچھ کہیں گے ان کے بارے میں؟"

✻ "جی بالکل میری والدہ بہت عظیم خاتون ہیں۔ انہوں نے ہماری پرورش و تربیت بہت ہی اچھے انداز میں کی یہی وجہ ہے کہ اتنی کم عمری میں باپ کے سائے سے محروم ہونے کے باوجود ہم لوگ اور خاص طور پر میں لڑکا ہونے کی وجہ سے بھٹکا نہیں اور والدہ کو اچھا بیٹا بن کے دکھایا اور والدہ نے تربیت کے ذریعے مجھے یہ بھی احساس دلایا کہ اب والد کے بعد مجھے اس گھر کی

ذمہ داری انھائی ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ میں نے اپنی والدہ کو مایوس نہیں کیا۔"

★ "کیمرے سے شناسائی کب ہوئی اور آپ سمجھتے ہیں کہ اداکاری کی صلاحیت موروثی ہوتی ہے یا قدرتی ہوتی ہے؟"

✲ "کیمرے سے شناسائی کم عمری میں ہی ہو گئی تھی۔ بحیثیت چائلڈ اسٹار کے میں نے فلم "ہیرو" میں کام کیا اور اس میں میرا ڈبل رول تھا اور فلم "شادی میرے شوہر کی" میں بھی میں نے بحیثیت چائلڈ اسٹار کے کام کیا اور آپ کے سوال کا دوسرا ـــ جواب یہ ہے کہ موروثی بھی ہوتی ہے اور قدرتی بھی۔ کتنے ہی لوگ ہیں اس فیلڈ کے کہ جن کا کوئی بھی نہیں ہے اس فیلڈ میں ' لیکن وہ بہترین کام کر رہے ہیں تو موروثی والے تو کم ہی ہوتے ہیں اپنے ٹیلنٹ کے ساتھ آنے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔"

★ "آپ نے تو اپنے والد کی سب فلمیں دیکھی ہوں گی کیسی لگتی ہیں گزرے زمانے کی فلمیں؟"

✲ "جی ہاں میں نے اپنے والد کی سب فلمیں دیکھی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ آج کے مقابلے میں وہ فلمیں بہت اچھی بلکہ بہترین تھیں اور وہ لوگ جو کچھ سیکھنا چاہتے ہیں وہ پاپا کے دور کی فلمیں ضرور دیکھیں انھیں بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا۔"

★ "آپ کا دل چاہتا ہے کہ آپ بھی اپنے والد کی طرح فلموں میں آئیں اور ان کی طرح ایک رومانٹک ہیرو کہلائیں؟"

✲ "جو خوبیاں میرے پاپا میں تھیں میں سمجھتا ہوں کہ وہ خوبیاں مجھ میں نہیں ہیں اور نہ ہی میں ان جیسا رومانٹک انسان ہوں۔ جو پرفارمنس میرے والد صاحب دے گئے ہیں میرا نہیں خیال کہ کوئی اور دے سکا اور پھر دور دور کی بات ہوتی ہے وہ زمانہ اور تھا اور یہ اور ـــ ماحول بہت بدل چکا ہے۔ رومینس کے طریقے بہت بدل چکے ہیں۔"

★ "آپ کا اپنا پروڈکشن ہاؤس ہے۔ اس کے بارے میں کچھ بتائیں؟"

✲ "جی ہمارا اپنا پروڈکشن ہاؤس ہے جس کا نام "فلم آرٹس انٹرٹینمنٹ" ہے اور ہمارا کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا کہ یہ پروڈکشن میرے دادا کے زمانے کا ہے۔ تو مجھے بہت کچھ ورثے میں بھی ملا ہے۔ دادا کے بعد والد نے اس کو آگے بڑھایا اور اب میں اس کو آگے بڑھا رہا ہوں۔"

★ "اس پروڈکشن ہاؤس کے تحت کیا کیا کام بہت مشہور ہوئے؟"

✲ "موجودہ کام بتانے سے پہلے میں آپ کو بتاؤں کہ پاکستان کی پہلی پلاٹینم جوبلی فلم "ارمان" ہمارے ہی ادارے کی فلم تھی۔ جس میں بہترین پروڈیوسر اور اداکار کا ایوارڈ میرے والد کو ملا۔ پھر "دوراہا" اور "مستانہ ماہی" بھی اسی ادارے سے بنیں اب ہم اس ادارے کے تحت ڈرامے پروڈیوس کر رہے ہیں۔"

★ "ڈرامے پروڈیوس کر رہے ہیں فلمیں کیوں نہیں؟"

✲ "اس لیے کہ ہماری فلمیں شدید بحران کا شکار ہیں اور ٹی وی ڈرامے لوگ بہت شوق سے دیکھتے ہیں۔ لوگوں کو فلموں کا بھی بہت شوق ہوتا ہے لیکن کیا کریں کہ کوئی اچھا سبجیکٹ ہی سامنے نہیں آتا کہ جس پہ فلمیں بنائی جائیں۔ ہم تو اس انتظار میں ہیں کہ اچھا سبجیکٹ ملے تو ہم اچھی فلم بنائیں۔"

★ "آپ کے پروڈکشن ہاؤس کے کون سے ڈرامے زیادہ مقبول ہوئے ہیں؟"

✲ "کافی سارے ہیں جن میں چند ایک یہ ہیں "بری عورت" 'پیار کہانی' 'جنم جلی' 'دھرتی کی پکار' 'حیدر آباد جنکشن' 'ابھی کچھ دیر باقی ہے' 'نادان نوکرانی' 'داستان' 'بند آنکھیں' 'دادا جی دلہنیا لے جائیں گے' 'پناہ" اور "رب جانے۔"

★ "آپ خود زیادہ کام نہیں کرتے؟"

✲ "اس لیے کہ میں مصروف بہت زیادہ رہتا ہوں۔ ویسے اپنے پروڈکشن ہاؤس کے ڈرامے "بری عورت" میں میں نے بھی کام کیا تھا اور فلم بھی کروں گا بشرطیکہ بہت اچھا کردار ہو۔ بہت اچھا سبجیکٹ ہو آج کل ٹی وی ایک کامیاب میڈیا ہے اس لیے اس کو ترجیح دیتا ہوں۔"

★ "آپ کتنا عرصہ ملک سے باہر رہے اور وہاں کیا کیا آپ نے؟"

✲ "میں ملک سے باہر یعنی امریکہ تقریباً پندرہ سال رہا اور میں نے ہوسٹن یونیورسٹی سے گریجویشن کیا ہے فنانس میں اور بیچلر مکمل کرنے کے بعد وہاں ملازمت کی اور پھر 2005ء میں وطن واپس آگیا اور یہاں اپنے پروڈکشن کے لیے کام کر رہا ہوں۔ پاکستان میں میری ابتدائی تعلیم "بیکن ہاؤس" میں ہوئی اور میٹرک کے بعد ہی میں ملک سے باہر چلا گیا۔"

★ "تقریباً پندرہ سولہ سال آپ ملک سے باہر رہے۔ جب کوئی اتنا عرصہ ملک سے باہر رہے تو پھر اس کا دل نہیں کرتا ملک میں واپس آنے کو آپ کی واپسی کی وجہ؟"

✲ "واپسی کی وجہ ماں اور بہن تھے اور میرا اپنا ملک پاکستان۔ بیٹا ہونے کی وجہ سے ماں اور بہن میری ذمہ داری ہیں اور مجھے اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے اس لیے میں واپس آیا۔"

★ "اس دوران پاکستان سے ان ٹچ رہے؟"

✲ "بالکل رہا میں جب موقع ملتا تھا پاکستان ضرور آجاتا تھا اور امی اور بہن بھی میرے پاس آجایا کرتی تھیں اور چونکہ پاکستان آنا جانا لگا رہتا تھا اس لیے مجھے واپس آکر اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔"

★ "کیا آپ نے بچپن میں ہی سوچ لیا تھا کہ آپ کو اس فیلڈ میں آنا ہے؟"

✲ "نہیں ایسی بات نہیں بے شک مجھے اس فیلڈ سے بچپن سے ہی لگاؤ تھا اور پھر والد صاحب کے بعد لگاؤ اور بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ لیکن میری اپنی ذاتی خواہش تھی کہ میں پائلٹ بنوں ..... مگر بن نہ سکا اور اس میں میری اپنی کوتاہی ہے اور وہ یہ کہ ایئرفورس کو جوائن کرنا 'پھر حد سے زیادہ ڈسپلن کا خیال رکھنا صبح صبح اٹھنا اور

پریڈ کے لیے جانا یہ سب کام مجھے بہت مشکل لگتے تھے۔ بس اس لیے میں نے ایئرفورس جوائن نہیں کی۔"

★ "ڈسپلن کا اور وقت کی پابندی کا خیال تو ملک سے باہر بھی بہت رکھنا پڑتا ہے؟"

✲ "بالکل رکھنا پڑتا ہے۔ لیکن بس مجھے ایئرفورس کی لائف ذرا مشکل لگی۔ اس لیے پھر میں نے اپنے والد کی لائن کو ترجیح دی اور اللہ تعالیٰ نے مجھے کامیابی بھی دی 'شاید یہی میری قسمت میں لکھا تھا۔"

★ "جب اس کام کی ابتدا کی تو پہلا پروجیکٹ کیا تھا؟"

✲ "واپس آکر پہلا پروجیکٹ ثانیہ سعید کے ساتھ کیا اور وہ پہلی ٹیلی فلم تھی جس کا نام "سنو نا" تھا اس کے ڈائریکٹر شاہد شفاعت تھے اور اس ٹیلی فلم کا مجھے بہت اچھا رسپانس ملا اور بس اس کے بعد کامیابیاں ملتی چلی گئیں۔"

★ "آپ جب کوئی ڈرامہ سیریل اور سوپ پروڈیوس کرتے ہیں تو کن باتوں کا خیال رکھتے ہیں؟"

✲ "سب سے اہم بات تو یہ کہ میں اس بات کا خاص خیال رکھتا ہوں کہ سیریل ہمارے کلچر کا عکاس ہو اور پڑوسی ملک کے ڈراموں کی کاپی تو دور کی بات ہے اس کی جھلک بھی نظر نہ آئے میں اپنے ڈراموں میں اپنے فنکاروں کو اپنی میوزک کو اور اپنی ثقافت کو پروموٹ

کرنا چاہتا ہوں اور آپ نے دیکھا ہو گا کہ میرے ڈراموں میں فنکاروں کے لباس بھی مشرقی انداز لیے ہوئے ہوتے ہیں ——— بہت زیادہ فیشن اور وولگریٹی نہ ہو۔"

★ "اس فیلڈ میں کن لوگوں سے آپ کو شکایت رہتی ہے؟"

☼ "ان لوگوں سے مجھے بہت شکایت رہتی ہے، جو کام کرنے کا وعدہ کر لیتے ہیں۔ مگر پھر دو چار دن کے بعد آکر کہتے ہیں کہ ہمیں کام نہیں کرنا کہ یہ کام ہم سے ہو نہیں سکتا۔ تو میں کہتا ہوں کہ جب کر نہیں سکتے تو پھر وعدہ کیوں کیا تھا۔"

★ "اب کچھ اپنے بارے میں بتائیں کب کہاں پیدا ہوئے اور شادی کب ہوئی؟"

☼ "جی میں 13 نومبر 1976ء کو لاہور میں پیدا ہوا۔ فیملی کے بارے میں آپ کو علم ہے۔ ماں ہے بہن ہے اور میں ہوں۔ میری شادی 2005ء میں ہوئی، میری والدہ اور میری، بہن کی پسند سے میری بیگم کا نام مریم رحیم ہے اور وہ نو سال ٹینس کی قومی چیمپئن رہ چکی ہیں اور ماشاء اللہ میرا ایک بیٹا بھی ہے، جس کا نام ایان ہے۔"

★ "آپ کافی عرصہ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں گزار کر آئے ہیں۔ پھر بھی شادی کے لیے آپ نے اپنی والدہ کی پسند کو ترجیح دی کیوں؟"

☼ "اس لیے کہ میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ ان کے دل میں میرے لیے ارمان تھے، انہوں نے ہمارے لیے بہت قربانیاں دیں، اپنی ساری زندگی اپنی ساری جوانی ہمارے لیے وقف کر دی، میں ان کے ارمانوں کا خون کیسے کر دیتا اور سچی بات ہے کہ میری کوئی پسند بھی نہیں تھی۔ میں نے ہمیشہ یہی سوچا تھا کہ اپنی ماں کی پسند سے شادی کروں گا۔"

★ "آپ اپنی گفتگو سے بہت نرم مزاج اور دھیمے لہجے میں بات کرنے والے لگ رہے ہیں۔ کیا میں نے صحیح کہا؟"

☼ "آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں کیونکہ میں واقعی نرم مزاج ہوں۔ غصہ بہت کم آتا ہے اس وقت تک جب تک کوئی مجھ سے غلط بات نہ کرے اور اگر میرے مزاج کے خلاف کوئی بات ہو جائے تو بس پھر اس کی خیر نہیں ہوتی۔"

★ "اوہ ہو پھر تو آپ سے بچ کر رہنا چاہیے۔ کوئی اچھی اور بری عادت بتائیں؟"

☼ "ویسے تو یہ سوال آپ کو میرے ارد گرد کے لوگوں سے پوچھنا چاہیے تھا، لیکن خیر لوگوں کو خود بھی آئیڈیا ہو جاتا ہے۔ مجھے اپنی ایک عادت بہت اچھی لگتی ہے کہ جب میں کسی کام کو کرنے کی ٹھان لوں تو پھر پیچھے نہیں ہٹتا اور اس کام کو کر کے ہی چین سے بیٹھتا ہوں اور بری کے لیے لوگ کہتے ہیں کہ میری یہی بری عادت ہے کہ میں ضدی ہوں۔ تو میں کہتا ہوں کہ ٹھیک ہے یہ بری ہے تو پھر ہے۔"

★ "گھر والوں کو وقت دیتے ہیں یا بہت مصروف رہتے ہیں؟"

☼ "کوشش تو کرتا ہوں کہ ٹائم دوں۔ مگر پھر بھی کوتاہی ہو ہی جاتی ہے۔ دراصل میرے گھر آنے کے کوئی اوقات مقرر نہیں ہیں اور نہ ہی رات کو سونے کے کوئی اوقات مقرر ہیں۔ بس میری ان باتوں سے گھر والے ڈسٹرب ہوتے ہیں اور انہیں مجھ سے شکایت رہتی ہے۔"

★ "اور کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟"

☼ "پروڈکشن ہاؤس میں مصروف رہتا ہوں اور میں فنانس Consultant بھی ہوں۔ اس میں بھی تھوڑا مصروف رہتا ہوں۔ پھر مجھے سونے سے پہلے مطالعہ کی بھی عادت ہے۔ جو اچھی کتاب آجائے پڑھ لیتا ہوں۔"

★ "اور چھٹی کا دن؟"

☼ "کوشش کرتا ہوں کہ فیملی کے ساتھ گزاروں اور کامیاب بھی رہتا ہوں۔"

☼ ☼

پیا کا گھر پیارا لگے

نورِ عین عاصم بشیر

شاہین رشید

شادی شدہ لوگوں کے لیے یوں تو بہت سی کہاوتیں مشہور ہیں۔ لیکن ایک کہاوت تو کثرت سے استعمال ہوتی ہے کہ شادی بور کے لڈو ہیں، جو کھائے وہ بھی پچھتائے اور جو نہ کھائے وہ بھی پچھتائے اور اکثریت کا خیال ہے کہ کھا کر پچھتانا چاہیے۔ ویسے بھی ہر چیز کا ذائقہ ضرور چکھنا چاہیے پسند آئے نہ آئے یہ اور بات ہے۔ حسرت نہ رہ جائے۔

جو کچھ بھی ہے۔ شادی ایک شرعی حکم بھی ہے اور یہ ضرورت بھی بہت ہے۔ خواہ لڑکی ہو یا لڑکا بندھن میں ضرور بندھنا چاہیے۔ اس لیے کہ ایک تو انسان بے راہ روی کا شکار ہونے سے بچ جاتا ہے۔ لائف سیٹل ہو جاتی ہے۔ فیملی بنتی ہے اور جب شادی شدہ زندگی میں آنگن میں پھول کھلتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ دنیا جہاں کی خوشیاں مل گئی ہیں۔ زندگی خوب صورت لگنے لگتی ہے اور جینے کا مقصد سمجھ میں آنے لگتا ہے۔

عاصم بشیر کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ایف ایم 101 کے "آر جے" بہت خوب صورت پروگرام کرتے ہیں اور سننے والے انہیں بے حد پسند کرتے ہیں۔ 25 نومبر 2010ء کو رشتہ ازدواج میں بندھے ——— نیا جوڑا ہے باتیں، دیکھیں کہ شادی کے بارے میں ان کے کیا خیالات ہیں۔

★ عاصم بشیر صاحب کو ہماری طرف سے اور ہمارے ادارے کی طرف سے شادی مبارک ہو۔

☼ عاصم بشیر کے بارے میں ہم بتائیں کہ ان کے آباؤ اجداد کا تعلق انڈیا سے ہے اور یہ 23 جون 1977ء میں کراچی میں پیدا ہوئے ان کی چھ بہنیں اور دو بھائی ہیں ان کا نمبر پانچواں ہے قد 5 فٹ 11 انچ اور ستارہ کینسر ہے تعلیمی قابلیت گریجویشن ہے۔

★ "کیسی گزر رہی ہے یہ نئی زندگی اور آپ تو سوچ رہے ہوں گے کہ پہلے کیوں نہ ہو گئی شادی؟"

☼ "بہت اچھی گزر رہی ہے اور واقعی سوچ رہا ہوں کہ پہلے کر لینی چاہیے تھی۔" ہنستے ہوئے۔

★ "زندگی میں کیا تبدیلی محسوس کر رہے ہیں؟"

☼ "میں ذرا لاابالی شخص تھا اور تھوڑا ڈسپلن آ گیا

ہے۔ ذمہ داریوں کا احساس اب محسوس ہونے لگا ہے۔ پہلے ایک آزاد زندگی تھی اور مجھ پر کوئی ذمہ داری بھی نہیں تھی کیونکہ والدین حیات نہیں ہیں اور باقی بہن بھائی اپنی اپنی زندگی میں خوش ہیں۔"

★ "لڑکے تو آزاد زندگی کو ہی پسند کرتے ہیں اور شادی کے کچھ ہی عرصے بعد اپنی بیچلر لائف کو یاد کرتے ہیں؟"

✻ "ہاں... آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ لیکن وہ محاورہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ آج نہیں تو کل اور کل نہیں تو پرسوں شادی تو کرنی ہی تھی۔"

★ "اور یہ محاورہ بھی تو بہت مشہور ہے کہ شادی بور کے لڈو ہیں۔ تو کھا کر پچھتانا چاہیے یا؟"

✻ "ہماری سوسائٹی کا جو کلچر ہے اس میں تو کھا کر ہی پچھتانا چاہیے' نہ کھا کر تو آپ لوگوں کی تنقید کا ہی نشانہ بنے رہتے ہیں ایک ہی سوال میں تو سن سن کر عاجز آگیا تھا کہ کب ہو رہی ہے شادی' اب تک کیوں نہیں کی وغیرہ وغیرہ۔"

★ "اصل میں دوسرے لوگوں کو زیادہ بے سکونی اور پریشانی ہوتی ہے۔ اب تو سب کو قرار آگیا ہوگا؟"

✻ قہقہہ "کچھ کو قرار آگیا ہوگا کچھ کی بے قراری بڑھ گئی ہوگی اور جن کی شادی نہیں ہوئی ان کے بےقراری بڑھ گئی ہے کہ کاش ہماری بھی ہو جائے۔"

★ "بیگم کا نام کیا ہے اور ان سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی؟"

✻ "بیگم کا نام نور عین ہے اور یہ میں آپ کو بتا دوں کہ یہ خالصتاً" ارینج میرج ہے اور میں انہیں دیکھنے اپنے گھر والوں کے ساتھ ان کے گھر پر ہی گیا تھا اور وہ ہی پہلی ملاقات تھی۔"

★ "تو پسند آپ کی تھی یا گھر والوں کی؟"

✻ "انہیں پہلے میری بہنوں نے پسند کیا تھا اور پھر میں گیا تو مجھے بھی اپنی بہنوں کی پسند پسند آئی اور میں نے یس کر دی۔"

★ "نوجوان تو لو میرج کو ترجیح دیتے ہیں اور بیچلر لائف میں پسند ناپسند کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔ تو آپ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہوا؟"

✻ "دیکھیں پسند ناپسند تو چلتی رہتی ہے۔ میری ہمیشہ سے یہ عادت ہے کہ جو چیز میں حاصل کر سکتا ہوں یا کرنا چاہتا ہوں میں خواب بھی اسی کے دیکھتا ہوں۔ میں نے کبھی اس طرح کا خواب نہیں دیکھا تھا کہ لڑکی ایسی ہو یا ویسی ہو' یعنی کوئی آئیڈیل نہیں بنایا تھا اور میری خواہش بھی وہی تھی جو سوسائٹی کے عام لڑکوں کی ہوتی ہے تو بس اللہ کا شکر ہے کہ اس خواہش کے مطابق مجھے اللہ تعالیٰ نے بیگم دے دی۔"

★ "سسرال کیسا ملا ہے؟"

✻ "ابھی تو نیا نیا ہے۔ ابھی تو سب ہی بہت پیار محبت سے پیش آرہے ہیں۔ بہت آؤ بھگت ہو رہی ہے۔ بہت دعوتیں ہو رہی ہیں۔ مگر ایک بات ضرور کہوں گا کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے جیسا رویہ آپ رکھیں گے ویسا ہی رویہ آپ کو ملے گا بھی۔"

★ "بیگم سگھڑ ہیں امور خانہ داری سے دلچسپی ہے؟"

✻ "ہاں جی سگھڑ ہیں امور خانہ داری سے بھی لگاؤ ہے اور چونکہ والدین ہیں نہیں تو مجھے خود بھی عادت ہے کام کرنے کی اور مجھے ایسی ہی لائف پارٹنر کی ضرورت تھی کہ جو گھر کا بھی خیال رکھے میرا بھی رکھے اور اللہ کا شکر ہے کہ مجھے ایسی ہی شریک حیات ملی ہے۔"

★ "ہنی مون کے لیے کہاں گئے تھے؟"

✻ "جی بالکل گیا تھا اور پاکستان کے خوب صورت مقامات مری' سوات وغیرہ گئے تھے اور میں اسے ہنی مون نہیں کہوں گا بلکہ یہ کہوں گا کہ ہم گھومنے پھرنے گئے تھے۔"

★ "نرم گفتار ہیں یا غصے کی تیز ہیں؟"

✻ "نرم گفتار ہیں اور ابھی تک غصہ دکھایا تو نہیں ہے لیکن مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ غصہ ان کو نہیں آتا ہوگا اور اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ میں نے بھی ان کو اپنا غصہ نہیں دکھایا اور ابھی تو اچھی اور بری عادتوں کا بھی کچھ آئیڈیا نہیں ہوا ویسے لونگ بہت ہیں۔"

★ "آپ کے خیال میں شادی کے لیے لڑکے اور لڑکی کی عمر کیا ہونی چاہیے؟"

✻ "اب تو ٹرینڈ تھوڑا بہت بدل گیا ہے اور اب لڑکے کی عمر انڈر 30 ہونی چاہیے اور لڑکی کی انڈر 25 ہونی چاہیے۔"

★ "اور خوب صورت ہونا کتنا ضروری ہے؟"

✻ "میرے لیے تو کافی ضروری تھا۔ اور یقین کریں کہ میرے لیے یہ فیصلہ کرنا بڑا مشکل تھا کہ شادی کس سے کروں اور وہ لڑکی کیسی ہو کیونکہ میں جس فیلڈ سے تعلق رکھتا ہوں اس میں قدم قدم پر مختلف اور نئے چہرے ملتے ہیں اور پھر پرستار بھی بہت ہیں۔ کئی نے تو مجھ تک پہنچنے کی کوشش بھی کی۔"

★ "پرستاروں نے شرکت کی یا کوئی بدمزگی ہوئی؟"

✻ "نہیں میرے پرستار بہت سمجھدار ہیں اور میں نے پرستاروں کے درمیان فاصلہ بھی رکھا ہے۔ اس لیے اللہ کا شکر ہے کہ کسی نے شرکت نہیں کی اور نہ ہی کوئی بدمزگی ہوئی ویسے بہت سے پرستاروں کے پاس میرا نمبر بھی ہے وہ SMS بھی کرتے ہیں مگر میرا تعلق سب سے ایک لیول تک ہوتا ہے۔"

★ "آپ چاہیں گے کہ آپ کی بیگم آپ کے ساتھ آپ کی فیلڈ میں آئیں یا شوبز کی فیلڈ میں جائیں؟"

✻ "شوبز تو بہت مشکل ہے اور ریڈیو پہ بھی مجھے نہیں لگتا کہ وہ جائیں گی کیونکہ وہ تو بہت کم بولتی ہیں۔ لیکن اگر انہیں شوق ہوا تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

★ "فیشن ایبل ہیں یا سادگی پسند ہیں؟"

✻ "سادگی پسند ہیں۔ انہیں میں نے زیادہ سجے بنے دیکھا نہیں ہے۔ ویسے ابھی نئے نئے دن ہیں تو تیار تو رہنا پڑتا ہے کیونکہ مہمانوں کی آمد و رفت تو لگی ہوتی ہے۔"

★ "منگنی کے دوران ملاقات وغیرہ ہوتی تھی؟"

✻ "نہیں ملاقات تو نہیں ہوئی البتہ ٹیلی فون پہ بات روزانہ ہوتی تھی تاہم بہت کم تھا تیاریاں کرنی تھیں اور پھر جب فون پہ بات ہو جاتی تھی تو ملاقات ضروری نہیں سمجھی۔ میری تربیت بہنوں کے درمیان رہ کر ہوئی ہے اور میں بڑا کلچرڈ قسم کا انسان ہوں تو ملاقاتوں کو اچھا نہیں سمجھتا۔ بس اس لیے ملاقات کو ترجیح نہیں دی اور پھر شادی کے بعد تو پوری زندگی ایک ساتھ گزارنی ہوتی ہے۔"

★ "پہلی مرتبہ اپنے ہاتھوں سے کیا پکا کر کھلایا تھا انہوں نے؟"

✻ "کھیر پکائی تھی اور قورمہ۔ جو کہ مجھے بہت پسند ہے اور ماشاءاللہ یہ بہت اچھا کھانا پکاتی ہیں۔"

★ "اور آپ سے یہ آخری سوال کہ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ لوگوں کے لیے کچھ کہنا چاہیں گے؟"

✻ "جو شادی شدہ نہیں ہیں ان سے کہوں گا کہ جلدی سے شادی کرلیں اور شادی شدہ لوگوں سے کہوں گا کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو ایشو نہ بنایا کریں۔ کیونکہ دیکھا جائے تو یہ مضبوط رشتہ بھی ہے اور نازک بھی بہت ہے اور یہ وہ رشتہ ہے جو میرے خیال میں دنیا میں سب سے اہم رشتہ ہے۔"

★ اور اب نور عین سے کچھ باتیں۔

✻ "جی کیسی ہیں آپ اور شادی مبارک ہو آپ کو'

اس سے پہلے کہ ہم کچھ باتیں آپ سے کریں۔ آپ اپنا فیملی بیک گراونڈ بتایئے؟"

★ "میں ٹھیک ہوں اور مبارک باد کا شکریہ۔ میں سات جون کو کراچی میں پیدا ہوئی۔ ہم پانچ بہن بھائی ہیں اور میں سب سے چھوٹی ہوں اور میں نے بی کام کیا ہوا ہے اور ابھی میں پیپر ہی دے رہی تھی کہ شادی کی بات چیت چل پڑی اور پھر شادی ہو گئی۔"

٭ "نئی زندگی کیسی لگ رہی ہے؟"

★ "بہت اچھی لگ رہی ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ ہر چیز کے ملنے کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ تو جو وقت مقرر تھا اسی وقت میں شادی ہو گئی۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ دیر ہو گئی ہے یا جلدی ہو گئی ہے۔"

٭ "لڑکیاں والدین کے گھر بہت آزادی کی زندگی گزار رہی ہوتی ہیں۔ سسرال میں آتے ہی ذمہ داریاں مل جاتی ہیں تو آپ؟"

★ "جی میں جوائنٹ فیملی میں نہیں آئی' میرے ساس سسر حیات نہیں ہیں تو ہم علیحدہ رہتے ہیں.... اور مجھے یہ نئی ذمہ داریاں بہت اچھی لگ رہی ہیں اور اتنی کوئی خاص ذمہ داریاں بھی نہیں ہیں اور گھر جیسا ہی ماحول ہے۔"

٭ "سسرال میں نند دیور کا رشتہ کیسا لگا؟"

★ "بہت اچھا سب ماشاء اللہ بہت محبت کر رہے ہیں۔ بہت خیال رکھتے ہیں۔ بہت پیار سے پیش آتے ہیں اور ماحول بھی بہت اچھا ہے۔"

٭ "آپ ان کے ریڈیو پروگرام سنتی تھیں؟"

★ "نہیں جی پہلے تو نہیں سنتی تھی' لیکن رشتہ طے ہونے کے بعد سننے لگی ہوں اور پہلے کیوں نہیں سنتی تھی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے ریڈیو سے زیادہ دلچسپی نہیں اور پھر ان کے بارے میں میں جانتی بھی نہیں تھی۔"

٭ اور جب پتا چلا کہ ایک مشہور بندے سے میری شادی ہونے والی ہے تو پھر آپ کے کیا احساسات تھے سوچا تھا کہ میں بھی مشہور ہو جاؤں گی؟"

★ "بہت خوشی بھی ہوئی اور اچھا بھی لگا۔ لیکن ایسا نہیں سوچا تھا کہ میں بھی ان کی وجہ سے مشہور ہو جاؤں گی۔ نہ میں نے ان سے ان کی فیلڈ کے بارے میں کچھ پوچھا ہے۔"

٭ "پہلی ملاقات کے بارے میں بتائیں اور پہلی ملاقات میں کیسے لگے تھے؟"

★ "میرے گھر پہ ہوئی تھی' یہ مجھے دیکھنے آئے تھے اور اس وقت تو سچویشن ایسی تھی کہ کچھ سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا۔ امی نے ہی دیکھا اور انہوں نے ہی پسند بھی کیا۔ میں نے انہیں تصویروں میں ہی دیکھا تھا۔"

٭ "آپ نے سوچا تھا کہ بس اب امی انہیں کو پسند کر لیں؟"

★ "نہیں ایسا کچھ نہیں سوچا تھا' سب اختیارات امی کو ہی دیے ہوئے تھے کہ وہ جس کو چاہیں پسند کریں اور جس کو ناپسند کریں۔"

٭ "شادی کے کیا فائدے کیا نقصانات ہیں؟"

★ "فائدے اور نقصانات برابر ہی ہیں۔ شادی نہ کرنے میں نقصان ہے۔ کیونکہ شادی کرنی تو ہوتی ہی ہے۔ زندگی میں ایک خوشگوار تبدیلی آجاتی ہے۔"

٭ "مزاج کے کیسے ہیں؟"

★ "بہت اچھے ہیں۔ بہت نرم مزاج ہیں۔ ابھی تک تو میں نے ان کا غصہ نہیں دیکھا ہے۔۔۔ آگے کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

٭ "آپ چاہیں گی کہ یہ جو کچھ کمائیں آپ کے ہاتھ میں لا کر رکھیں اور آپ ہی گھر کا نظام چلائیں؟"

★ "نہیں ایسا کچھ نہیں سوچا۔۔۔ اور گھر چلانے کی ذمہ داری تو دونوں کی ہوتی ہے اور دونوں کو ہی ذمہ داری اٹھانی چاہیے۔"

٭ "اپنا دلہن کا روپ کیسا لگا تھا؟"

★ "اچھا لگا تھا۔ بالکل عام زندگی سے بہت مختلف لگا اس دن کا تو روپ ہی الگ تھا۔ سب نے تعریف کی تھی۔"

٭ "نکاح سے پہلے کیا احساسات تھے اور پھر جب مہندی مایوں کی رسمیں ہوئیں تو کیا محسوس کر رہی تھیں آپ؟"

★ "بس بہت ایکسائیٹڈ منٹ تھی اور اس وقت کے جو احساسات تھے اس کی وضاحت نہیں کر سکتی اداسی بھی تھی اور خوشی بھی تھی۔ نکاح کے وقت بہت رونا آیا تھا رخصتی کے وقت کم آیا تھا۔"

٭ "شادی کی رسموں میں سب سے اچھی رسم کون سی لگی تھی؟"

★ "سب ہی رسمیں انجوائے کی تھیں کیونکہ پہلے نکاح ہو گیا تھا تو کوئی ٹینشن نہیں تھی تو جب میں بیاہ کر ان کے گھر آئی تو کھیر چٹائی کی رسم ہوئی تھی اور اس رسم کو میں نے انجوائے کیا۔ ویسے بہت زیادہ رسمیں نہیں ہوئی تھیں۔"

٭ "میاں صاحب کی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیں؟"

★ "ابھی تک تو کوئی بری عادت نظر نہیں آئی اور اچھی عادتیں بہت ہیں ان میں سب سے زیادہ تو یہ کہ خیال بہت رکھتے ہیں۔ محبت بہت کرتے ہیں' مزاج کے بہت نرم ہیں۔"

٭ "آپ دونوں کس طرح ایک دوسرے کو بلاتے ہیں اور رومانٹک کتنے ہیں؟"

★ "یہ بھی میرا نام لیتے ہیں اور میں بھی ان کا نام لیتی ہوں اور رومانٹک تو اچھے خاصے ہیں۔"

٭ "آپ عاصم کو کس روپ میں اچھی لگتی ہیں۔ بنی سنوری یا سادگی میں؟"

★ "میں خود بھی بہت سادگی پسند ہوں اور میں انہیں اچھی بھی سادگی میں ہی لگتی ہوں۔"

٭ "ابھی تو آپ کی شادی کو چھ مہینے ہوئے ہیں۔ لیکن پھر بھی ایک خطرناک سوال کہ اسلام میں چار شادیوں کی اجازت ہے اور۔۔۔۔"

★ "دیکھیں۔۔۔ آپ ابھی ایسی خطرناک' خوفناک باتیں نہ پوچھیں۔ بس میری تو دعا ہے کہ اللہ نہ کرے کہ یہ کبھی بدلیں اور ایسا سوچیں اور یہ اب جیسے ہیں ہمیشہ ہی ایسے رہیں۔"

٭ "آپ کا کبھی دل چاہے ریڈیو پہ آر جے بننے کا تو ان کی طرف سے اجازت ہوگی؟"

★ "کچھ کہہ نہیں سکتی' نہ ہی میں نے ایسا کبھی سوچا ہے اور اگر سوچا اور انہوں نے اجازت دی تو پھر ضرور کام کروں گی۔"

٭ "منہ دکھائی میں کیا ملا تھا؟ اور گھومنے پھرنے کہاں گئے تھے؟"

★ "گولڈ کی چین۔ لاکٹ اور بس گھومنے پھرنے مری' نتھیا گلی وغیرہ گئے تھے۔"

٭ "آپ نے عاصم کو سب سے پہلے کیا پکا کر کھلایا تھا؟"

★ "میں نے کھیر اور قورمہ پکایا تھا انہیں بھی بہت پسند آیا تھا اور گھر میں جتنے لوگ تھے انہیں بھی بہت پسند آیا تھا اور اب تو ان کی خواہش ہوتی ہے کہ میں ہی پکاؤں۔"

٭ "اب تو گھونگھٹ کا کوئی رواج نہیں ہے۔۔۔ تو ہم یہ سوال اس طرح پوچھ لیتے ہیں کہ کمرے میں آ کر پہلا جملہ آپ کے لیے کیا بولا تھا۔"

★ "کچھ خاص نہیں' بس یہی کہا تھا کہ بہت اچھی لگ رہی ہو۔"

☼ ☼

دو کا پہاڑہ

فہیم خان

شاہین رشید

1 "کوئی دو نام جن کے لیے آپ کی خواہش ہے کہ کاش یہ آپ کے ہوتے؟"

○ "نور جو کہ میرے دادا کا نام ہے اور محبوب یہ میرے نانا کا نام ہے۔"

2 "آپ کے دو لکی نمبرز؟"

○ "تین اور تیرہ اس کے لیے ایک مثال موجود ہے کہ نہ تین میں نہ تیرہ میں۔"

3 "دو تاریخی ادوار جن میں آپ جانا چاہتے ہیں؟"

○ "1857ء کی جنگ آزادی کے دور میں اور کربلا کے میدان میں جانا چاہتا ہوں۔"

4 "کن دو افراد کے SMS کے جواب فوراً" دیتے ہیں؟"

○ "بیوی کے اور باس کے۔"

5 "دو بری عادتیں جن سے آپ نجات پانا چاہتے ہیں؟"

○ "بولتا بہت زیادہ ہوں۔ میرے خیال میں یہ میری بری عادت ہے۔"

6 "دو جھوٹ جو آپ اکثر بولتے ہیں؟"

○ "جب مجھے کہیں پہنچنا ہوتا ہے تو میں چھ کلومیٹر پہلے سے ہی بول دیتا ہوں کہ میں آگیا ہوں۔ میں گیٹ پہ ہوں یہ جھوٹ میں اکثر بولتا ہوں تاکہ انتظار کرنے والا بندہ ریڈی ہو جائے اور دوسرا یہ کہ میرے تو فون کی بیٹری ڈاؤن ہو گئی تھی۔"

7 "اپنے بارے میں کن دو باتوں کو سن کر غصہ آجاتا ہے؟"

○ "ایک تو اس وقت جب کوئی مجھے جھوٹا بولے حالانکہ میں ایک سچا انسان ہوں اور دوسری بات یہ کہ جب لوگ مجھے شاہ رخ کے ساتھ۔۔۔ میں کہتا ہوں کہ کیوں بھئی کیوں میری شخصیت کی اپنی ایک پہچان ہے

مجھے نہیں پسند شاہ رخ خان۔"

8 "حالات حاضرہ کے دو اینکر جو آپ کے خیال میں پرچی سے آئے ہیں؟"

○ "آفتاب اقبال (خبرناک والے) یہ فل پرچی ہیں ہر سائز کی پرچی ہیں اور فیصل قریشی (ٹی وی ون کے) جو رہے ہیں اور اس لیے بھی پسند ہیں کہ بہترین انداز گفتگو تو ہے ہی لیکن جب ہم اسکول جا رہے ہوتے تھے تو وہ کارٹون فلم بھی دکھایا کرتے تھے اور دوسری "سویرا ندیم۔"

10 "دو دوست جن پر آپ بھروسہ کرسکتے ہیں؟"

○ "اپنے آپ پر کیونکہ میں نے اپنے آپ سے بھی دوستی کر رکھی ہے میں اپنے آپ پر بھی بہت بھروسہ کرتا ہوں اور دوسری میری دوست میری بیوی ہے جس پر بھروسہ کرسکتا ہوں۔"

11 "دو مشہور شخصیات جن کے ساتھ آپ دنیا گھومنا چاہتے ہیں؟"

○ "اچھا کہ مجھی جنید جمشید ان دونوں کام ہو جائیں گے دنیا بھی اور دین بھی اسلامی طریقے سے بھی گھوم پھرلوں گا اور دنیاوی طریقے سے بھی۔"

12 "دنیا کی دو ایسی شخصیات جن کی قسمت پر رشک آتا ہے؟"

○ "صدر مملکت پاکستان محترم جناب زرداری صاحب رشک اس لیے آتا ہے کہ پیسہ ان کے پاس بہت ہے عزت ذرا سی بھی نہیں ہے اور سابق صدر پرویز مشرف۔"

13 "دو تہوار جو آپ اہتمام سے مناتے ہیں؟"

○ "عید الفطر اور ہولی۔"

14 "دن کے چار پہر میں سے کون سے دو پہر اچھے لگتے ہیں؟"

○ "جب سورج طلوع ہو رہا ہوتا ہے اور جب سورج غروب ہو رہا ہوتا ہے۔"

15 "پہلی ملاقات میں کون سے دو جملے لازمی بولتے ہیں؟"

○ "جناب اور شکریہ۔"

کہ بڑی نزاکت میں بولتے ہیں۔ یہ بھی فل پرچی ہیں۔"

9 "مارننگ شو کے دو اینکرز جو بہترین ہیں آپ کی نظر میں؟"

○ "مستنصر حسین تارڑ انہیں ہم بچپن سے دیکھتے آ

16 "دو کھانے جنہیں کھا کر کبھی بور نہیں ہوتے؟"

○ "امی کے ہاتھ کے کھانے اور بیوی کے ہاتھ کے، خواہ وہ کچھ بھی پکا دیں میں کبھی بور نہیں ہوتا۔"

17 "دو افراد جن سے معافی مانگنے میں شرم محسوس نہیں کرتے؟"

○ "والدین۔"

18 "کن دو خوب صورت دنوں کے منتظر ہیں؟"

○ "روز قیامت کے لیے صدر پاکستان کی تبدیلی کے دن کا۔"

19 "دو پسندیدہ کھلاڑی جن کی وجہ سے آپ کرکٹ میچ دیکھتے ہیں؟"

○ "ثانیہ مرزا اور رونالڈو (قہقہہ) یہی لکھیے گا میں میچ انہی کے وجہ سے دیکھتا ہوں خواہ کرکٹ ہو یا کچھ اور ہو۔"

20 "دو چیزیں جنہیں لیے بغیر آپ گھر سے نہیں نکلتے؟"

○ "موبائل فون کیونکہ اس کے بغیر تو بندہ محتاج ہو جاتا ہے اور پیسے لیے بغیر۔"

21 "دو الفاظ یا محاورے جو آپ بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں؟"

○ "جو کرتا ہے اللہ بہتری کے لیے کرتا ہے اور چل نکل شاباش بیٹا غائب ہو جا بہت برداشت کرلیا۔"

22 "دو پسندیدہ صحافی؟"

○ "طلعت حسین اور کاشف عباسی۔"

23 "سات دنوں میں سے کون سے دو دن اچھے لگتے ہیں؟"

○ "کوئی اسپیشل دن نہیں ہے پیر سے لے کر اتوار تک کوئی بھی دن اچھے ہو سکتے ہیں۔"

24 "بارہ مہینوں میں کون سے دو مہینے اچھے لگتے

ہیں؟"
○ "اسکول کے زمانے میں تو جون جولائی اچھے لگتے تھے۔ بس اب بھی یہی مہینے اچھے لگتے ہیں۔"
25 "اپنے گھر میں آپ کی دو پسندیدہ جگہیں؟"
○ "کچن اور واش روم۔"
26 "گھر کے دو کام جو آپ کو پسند نہیں؟"
○ "گھر کا کوئی کام مجھے پسند نہیں۔ آپ دو کی بات کر رہی ہیں۔"
27 "دو پسندیدہ پکنک پوائنٹ؟"
○ "ایمسٹرڈیم اور سوئٹزرلینڈ چونکہ میں یہاں کبھی گیا نہیں اس لیے پسند ہے پاکستان تو گھوم چکا ہوں۔"
28 "کن دو ممالک کی ترقی سے متاثر ہیں؟"
○ "بنگلہ دیش اور ایران۔"
29 "کون سے دو رنگ کے لباس پسند ہیں؟"
○ "کالا اور سفید۔"
30 "اپنے ملک کے دو پسندیدہ شہر؟"
○ "کوٹ ادو اور اللہ یار خان۔"
31 "سال کے چار موسموں میں سے کون سے دو موسم پسند ہیں؟"
○ "ساون کا مہینہ اور سردی کا۔"
32 "لڑکیوں کی دو ناپسندیدہ باتیں؟"
○ "ناپسندیدہ تو بہت ساری ہیں اس لیے پسندیدہ لکھ لیں کہ ایک تو وہ کثرت سے دستیاب ہیں اور ہر لڑکی کے پاس اپنا سیل فون ہوتا ہے۔"
33 "صبح اٹھ کر کون سے دو کام سب سے پہلے کرتے ہیں؟"
○ "صبح اٹھتے ہی میں دوبارہ سو جاتا ہوں اور دوبارہ اٹھ کر دوسرا کام اپنے گلاسز ڈھونڈتا ہوں۔"
34 "دو خواتین جنھوں نے آپ کی زندگی بنانے میں اہم رول ادا کیا ہو؟"
○ "امی اور بیوی۔"
35 "دو پسندیدہ پروفیشن؟"
○ "ایک تو میرا شوق ہے کہ میں میکڈونلڈ یا کے ایف سی کا "ویٹر" بنوں اور دوسرا یہ کہ امریکہ کے پیٹرول پمپ پہ جاب کروں سنا ہے اس جاب پہ بہت کمائی ہے۔"
36 "دنیا کے دو بہترین سیاست دان آپ کی نظر میں؟"
○ "قائداعظم اور گاندھی جی۔"
37 "والدین کی دو نصیحتیں جو آپ نے گرہ سے باندھ لی ہوں؟"
○ "ایک یہ کہ جو کماؤ امی کے ہاتھ میں لا کر دو اور ہمیشہ دوسروں کا حق مارو۔"
38 "اپنے ہی دو پروگرام جنھیں آپ فراموش نہیں کر سکتے؟"
○ "میں نے گیٹ اپ کیا تھا گاندھی جی کا جو کہ بہت شاندار تھا اور مجھے خود بھی اپنی پرفارمنس اچھی لگی اور دوسروں کو بھی اور ایک گیٹ اپ کیا تھا عامر لیاقت حسین کا۔"
39 "غصے میں کون سی دو گالیاں نکلتی ہیں؟"
○ قہقہہ "تمام گالیاں لکھ لیں جو دو اچھی لگیں منتخب کر لیں۔"
40 "اپنے کیے گئے دو فیصلے جو غلط ثابت ہوئے ہوں؟"
○ "ایک اپنی پیدائش کا فیصلہ یا کسی نے بھی ہوتا تو میں نے اپنی مرضی سے ہی تھا مجھے پیدا نہیں ہونا چاہیے تھا اور آپ کو انٹرویو دینے کا فیصلہ۔"
41 "کن دو باتوں سے پرہیز کرتے ہیں؟"
○ "جھوٹ بولنے اور سچ بولنے سے۔" (کنفیوژن کریٹ کر رہا ہوں۔)
42 "پانچ وقت کی نمازوں میں کون سے دو وقت کی نمازیں لازمی پڑھتے ہیں؟"
○ "عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ۔ اللہ کی قسم یہ لازمی پڑھتا ہوں۔"
43 "بیرون ملک شاپنگ میں کیا چیزیں لازمی خریدتے ہیں؟"
○ "چاکلیٹ اور شوز۔"

44 "دو لوگ جن کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"
○ "صدر اوباما کب امداد بند کر دے اور ایران کے صدر کے غصے سے۔"
45 "کن دو لوگوں کی تعریف میں بخل سے کام نہیں لیتے؟"
○ "فہیم خان کی تعریف میں بخل سے کام نہیں لیتا ..... فہیم خان یعنی میں خود اور عامر خان کی تعریف میں۔"
46 "دو پسندیدہ مشروب جب کے بغیر نہیں رہ سکتے؟"
○ "دودھ والا روح افزا اور محرم الحرام میں جو تخم ملنگاں والا شربت ہوتا ہے جس میں پستے بادام بھی ہوتے ہیں بہت پسند ہے۔"
47 "ملک میں کون سی دو تبدیلیاں ضروری ہیں؟"
○ "گورنمنٹ کی تبدیلی بہت ضروری ہے اور پولیس میں جتنے بھی توند والے پولیس والے ہیں ان کو نکالا جائے۔"
48 "آپ کے دو پسندیدہ گلوکار؟"
○ "حسن جہانگیر اور بابا سہگل۔"
49 "شادی کی دو رسمیں جو آپ انجوائے کرتے ہیں؟"
○ "جب سسر صاحب دولہا کو مہنگی والی گھڑی پہناتا ہے اور دوسری وہ جب دولہا کا سالا "سونے" کی چین یا انگوٹھی پہناتا ہے۔ باقی رسموں میں تو دولہا کا ہی خرچ ہوتا ہے۔"
50 "دو باتیں جو آپ کا موڈ خراب کر دیتی ہیں؟"
○ "جب تنخواہ دیر سے ملتی ہے اور جب اے ٹی ایم پہ لکھا آتا ہے کہ آپ کے اکاؤنٹ میں پیسے نہیں ہیں۔"
51 "اپنے لباس میں کن دو باتوں کا خاص خیال رکھتے ہیں؟"
○ "ایک تو یہ کہ لباس 'لباس' ہو اور دوسرے یہ کہ بڑے سے بڑے پتے استعمال کروں 'سب سے الگ ہو میرا لباس۔"
52 "کن دو افراد کے ساتھ بارش انجوائے کرتے ہیں؟"
○ "بیگم کے ساتھ اور دوستوں کے ساتھ۔"
53 "کن دو کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"
○ "جو سیاست کی جڑوں میں گھسے ہوئے ہیں اور دوسرے کینسر cancer کے کیڑوں سے۔"
54 "دو ریسٹورنٹ جہاں سے کھانا کھانا پسند کرتے ہیں؟"
○ "فری کھانا کھانا پسند کرتا ہوں خواہ کہیں بھی ہو اور عبداللہ شاہ غازی کے لنگر کا کھانا۔"
55 "اپنے ملک کے دو شاپنگ مال جہاں سے شاپنگ کرنا پسند کرتے ہیں؟"
○ "لنڈا بازار اور چمن بارڈر سے۔"
56 "دو چینلز جو آپ شوق سے دیکھتے ہیں۔"
○ "ایک بتا نہیں ... سکتا اور دوسرا کارٹون نیٹ ورک۔"
57 "دو تبدیلیاں جو آپ اپنی شخصیت میں لانا چاہتے ہیں؟"
○ "موٹا ہونا چاہتا ہوں اور تھوڑا کالا ہونا چاہتا ہوں۔"
58 "کھانے کی ٹیبل پہ کیا دو چیزیں نہ ہوں تو کھانے کا مزا نہیں آتا؟"
○ "ایک تو کھانا نہ ہو اور دوسری کالی مرچیں نہ ہوں تو کھانے کا مزا نہیں آتا۔"
59 "اپنے والٹ میں کیا دو چیزیں لازمی رکھتے ہیں؟"
○ "اے ٹی ایم کارڈ لاکرز کی چابیاں۔"
60 "کن دو شخصیات کو اغوا کرنا چاہیں گے اور تاوان میں کیا وصول کریں گے؟"
○ "بھینسک بچن کو اغوا کروں گا اور تاوان میں ایشوریا رائے وصول کروں گا اور ریکھا کو اغوا کرنا چاہوں گا اور تاوان میں شیخ رشید کو مانگوں گا۔"

☼ ☼

جواد احمد کی باتیں

نازیہ کنول نازی

جواد احمد ان دنوں اپنی فلم "ورثہ" کی ریلیز کے بعد اس کی کامیابی کا لطف سمیٹ رہے ہیں۔ مختلف ٹی وی چینلز پر اس فلم کا تعارفی پروگرام آپ دیکھ ہی رہے ہوں گے۔ آیئے اس فلم کے خالق جواد احمد سے اس موضوع پر ہونے والی دلچسپ بات چیت آپکے گوش گزار کروں۔

○ "السلام علیکم جواد، کیسے ہیں آپ؟"

☆ "جی وعلیکم السلام میں ٹھیک ہوں آپ سنائیں۔"

○ "بخیریت الحمد للہ۔ آج کل تو خاصے مصروف ہیں ورثہ کی ریلیز کے بعد؟"

☆ "جی مصروفیت تو کبھی کم نہیں ہوتی۔ اور مجھے فارغ رہنا اچھا لگتا بھی نہیں، جہاں تک ورثہ کی بات ہے تو اس فلم کے لیے میں نے بہت محنت کی ہے۔"

○ "جی، وہ تو ہم دیکھ ہی رہے ہیں، کیسا رسپانس مل رہا ہے لوگوں کا؟"

☆ "بہت اچھا، چونکہ یہ انڈیا اور پاکستان دو سرحدوں پر پہلی فلم ہے تو دونوں ممالک میں اس کی مقبولیت یکساں ہے اور میں اس کے لیے بہت خوش ہوں۔"

○ "جواد ایک وقت تھا جب لوگ پاکستان فلم انڈسٹری کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہاں بننے والی فلمز کاپی کی جاتی تھیں۔ لیکن اب انڈین فلم انڈسٹری کی مانگ ہے آپ کیا سمجھتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟"

☆ "انڈین فلم انڈسٹری ایک بڑی انڈسٹری ہے، ایک ارب سے زیادہ لوگ تو صرف انڈیا میں ہیں، جس کو وہ فلم دکھاتے ہیں، تو اس حساب سے وہ مارکیٹ بڑی ہے تو آپ پیسہ لگا کر پھر پیسہ کما بھی سکتے ہیں اسی لیے وہاں بڑے بجٹ کی فلمیں بنتی ہیں، اس کے علاوہ انڈیا کی مارکیٹ انٹرنیشنل بھی ہو چکی ہے۔ پوری دنیا میں ان کی فلمیں لگتی ہیں۔ پوری دنیا کے لوگ ان کی فلم دیکھنا چاہتے ہیں تو وہاں بات اب کروڑوں سے نکل کر اربوں تک پہنچ گئی ہے۔ انڈین انڈسٹری اس وقت ہالی ووڈ انڈسٹری کے اوپر کام کر رہی ہے۔ اور ہالی ووڈ کے بہت سے ایکٹرز وہ یہ چاہتے ہیں، یہ انڈین انڈسٹری میں کام کریں۔ یا ان کے بہت سے پروڈیوسرز یہ چاہتے ہیں کہ انڈین ایکٹرز کے ساتھ کام کریں۔ تو اب ہماری انڈسٹری کا ان سے مقابلہ نہیں ہے۔ وہ اتنا بڑا ملک ہے ان کے پاس ظاہری بات ہے کہ اتنے مواقع بھی ہیں کہ وہ اس کا پورا فائدہ اٹھا سکیں۔"

○ "آپ ماشاءاللہ کامیاب سنگر ہیں اب کامیاب فلم میکر بھی ہیں، تو کیا کبھی ایک ایکٹر کی حیثیت سے کام کرنے کا خیال نہیں آیا دل میں؟"

☆ "نہیں، مجھے اصل میں اتنا کبھی نہیں آیا، لوگ مجھے کہتے تھے جب میں نیا نیا اس فیلڈ میں آیا تھا۔ اب انہوں نے کہنا بند کر دیا ہے کیونکہ انہیں پتہ ہے یہ کرے گا نہیں، فلم اور ڈرامے دونوں کے لیے آفر ہوئیں، لیکن میں سمجھتا تھا کہ ایک ہی کام (گلوکاری) اسے ہی کمال تک پہنچانا چاہیے۔ آخر تک لے جانا چاہیے بجائے اس کے کہ دو چار چیزیں اور سوار ہو جائیں۔ البتہ میرا دل کرتا ہے کہ میں اپنی وڈیو میں پہلے سے زیادہ اچھا کام کروں۔

جتنی محبت عزت اور شہرت ملی ہے۔ یہ اللہ کا بہت کرم ہے، اور میں اس سے بہت مطمئن ہوں۔ لیکن کبھی کبھی دل کرتا ہے کہ اپنی کسی وڈیو میں پہلے سے زیادہ اچھا کام کروں۔ تاہم فلم یا ڈرامے میں کام کرنا خاصا مشکل ہے۔ جس طرح کہ میں نے پہلے سوچا تھا۔"

○ "پہلا گیت جس سے آپ کو پہچان ملی کون سا تھا؟"

☆ "سب سے پہلا گانا جس سے مجھے پہچان ملی اور لوگوں نے مجھے رجسٹر کرنا شروع کر دیا تھا وہ "اللہ میرے دل کے اندر" تھا اس کے بعد دوسرا گانا جو بہت زیادہ ہٹ ہوا۔ "لونگ دی اے سیاں میں تیری آں" اور تیسرا گانا جو "وہ لمحے" میں بھی شامل ہوا۔ "بن تیرے کیا ہے جینا" یہ بھی بہت ہٹ ہوا تھا۔"

○ "وہ لمحے" تو مہیش بھٹ صاحب کی انڈین فلم ہے نا؟"

☆ "جی "وہ لمحے" انڈین فلم ہے اور اس میں میرا جو گیت ہے "بن تیرے کیا ہے جینا" کو "ری میک" کر کے بھی چنا گیا۔"

○ "اب تک اتنے گیت آپ نے گائے ہیں، کبھی خود بھی کچھ لکھا کہ نہیں؟"

☆ "نہیں، میں نے اپنی تینوں البمز جو بنائی ہیں، ان میں زیادہ تر گانے میں نے خود لکھے ہیں۔ میرا خیال ہے پہلی البم میں سے تو خیر 95 فیصد گیت میرے تھے۔ صرف فائیو پرسنٹ ادھر ادھر سے لیے تھے۔ لیکن جو سیکنڈ اور تھرڈ البم تھے اس میں میں نے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کے۔ مختلف آئیڈیاز ڈسکس کیے تھے۔ ابھی تک ٹوٹل کام اگر دیکھا جائے تو پچھتر فیصد گانے میرے اپنے لکھے ہوئے ہیں۔ اور میں آپ کو بتاتا چلوں کہ "بن تیرے کیا ہے جینا" بھی میں نے خود ہی لکھا تھا لوگ چونکہ جانتے نہیں ہیں اس لیے وہ کہتے نہیں کہ یہ کسی سے لکھوایا ہے۔"

○ "اب تک آپ کے جو البمز آئے ہیں، ان میں کس قسم کے گیتوں کو زیادہ اہمیت دی ہے آپ نے؟"

☆ "البم میرے تین آ چکے ہیں۔ اور چوتھا البم آنے والا ہے اس میں جیسا میرا اسٹائل ہے اس کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر انداز میں کام کیا ہے، کسی ایک چیز پر فوکس نہیں ہے اس میں بھنگڑے بھی ہیں۔

رومانٹک گانے بھی ہیں اس کے علاوہ اس میں پاکستان کے لیے بھی گیت ہیں ایک دو انقلابی چیزیں بھی ہیں' فوک بھی ہیں کچھ گانے ویسٹرن انداز میں بھی ملیں گے۔ میرے البم میں ہر طرح کا انداز ملے گا۔

○ "اب تک کتنے ممالک میں پرفارم کر چکے ہیں آپ؟"

☆ بہت زیادہ ممالک میں پرفارم کر چکا ہوں پاکستان سے ہٹ کر آپ دیکھیں تو مڈل ایسٹ کے جتنے بھی ممالک ہیں۔ انڈیا' نیپال' وہ سب میں نے دیکھے ہیں ابوظہبی' دبئی' مسقط' کویت' بحرین' سعودی عرب' اور بہت سے ایسے ممالک ہیں جن کے ابھی ذہن میں نام نہیں آرہے ہیں اس کے علاوہ انگلینڈ' امریکہ' کینیڈا' اور یورپ کے ــــ ممالک ہیں جانا بھی گیا ہوں "تقریباً" تمام ممالک میں پرفارم کیا ہے۔"

○ "جی اب تھوڑی پرسنل زندگی پر بات ہو جائے یہ بتایئے کہ شادی ارینج ہوئی تھی یا لو؟"

☆ "شادی ٹوٹل ارینج تھی۔ میری مدر نے کروائی تھی۔ میری مدر کی ایک کولیگ کالج پرنسپل بھی تھیں ان کی بیٹی سے شادی ہوئی۔"

○ "بیگم کی موجودگی میں کسی فین لڑکی کا فون آجائے تو کیسا رویہ ہوتا ہے ان کا آپ کے ساتھ؟"

☆ "ان کا رویہ کوئی ایسا غلط نہیں ہوتا کیونکہ اعتماد کی جو فضا ہوتی ہے گھر میں وہ اگر ہو تو پھر ایسی کوئی بات نہیں ہوتی۔"

○ "کبھی کسی پاگل فین سے پالا پڑا۔"

☆ "نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا اگر ہوا بھی تو میں نے بڑے طریقے سے پیار سے اسے ہینڈل کیا۔"

○ "کھانے پینے کے کتنے شوقین ہیں۔"

☆ "بہت زیادہ شوقین ہوں۔ اور بہت ساری چیزیں شوق سے کھاتا ہوں۔ مثلاً آم بہت شوق سے کھاتا ہوں اس کے علاوہ باقی سارے پھل بھی بہت شوق سے کھاتا ہوں۔ سبزیاں بھی تقریباً" سب کھاتا ہوں دال چاول بہت مرغوب ہے چنے کی دال اور گوشت بہت پسند ہے۔ آلو گوشت بہت شوق سے کھاتا ہوں۔

○ "موسم کون سا پسند ہے۔

☆ "موسم سارے ہی پسند ہیں ہر موسم کی اپنی ایک الگ شان' احساس اور حسن ہے۔"

○ "کوئی ایسی یاد جو کسی خاص موسم سے وابستہ ہو؟"

☆ "یادیں تو بہت ساری ہوتی ہیں کسی نہ کسی موسم سے کوئی نہ کوئی یاد آجاتی ہے مگر ایسی کوئی خاص یاد نہیں ہے۔"

حسب روایت کرن کی سالگرہ کے موقع پر ہم قارئین سے دلچسپ سوالات کر رہے ہیں۔ سوال یہ ہیں۔

(1) 2010ء میں شائع ہونے والے ناول' ناولٹ اور افسانوں میں آپ پسندیدہ اقتباس یا پچویشن؟

(2) شاعر کہتا ہے۔

روز اٹھ کر چاند ٹانکا ہے فلک پر رات کو
اور دن کی روشنی میں رات تک آیا کیے
ہاتھ بھر کے فاصلے کو عمر بھر چلنا پڑا

ایسی کوئی شخصیت جس تک پہنچنے کے لیے آپ نے مستقل سفر کیا ہو پھر بھی فاصلہ طے نہ ہوا ہو؟

(3) اپنے پسندیدہ اداکار و اداکارہ سیاست دان یا شخصیت کو اس کی سالگرہ کے موقع پر آپ کیا تحفہ دینا پسند کریں گی؟

(4) اگر آپ کو اپنے ماضی میں جانا پڑا تو آپ اپنے کون سے دور میں جانا چاہیں گی وجہ بھی بتائیں؟

(ان کے جوابات تصویر کے ساتھ (اگر دینا چاہیں تو) جلد از جلد روانہ کریں تاکہ سالگرہ نمبر میں شامل اشاعت ہو سکیں)

مکالمہ انسان کو زندگی کی دیگر شکلوں سے ممتاز کرتا ہے انسان و حیوان کے مابین ایک واضح حد کھینچتا ہے اور انسان کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ نا صرف دوسرے انسانوں کے احساسات اور سوچوں کو جان سکے' بلکہ اپنے خیالات اور جذبات سے بھی آگہی حاصل کر سکے۔

زندگی کے ہر میدان اور شعبے میں ہر شخص باتوں کی بساط بچھا کر لفظوں کے مہرے آگے پیچھے کرنے میں لگا ہوا ہے۔ ہر موضوع پر باتیں ہو رہی ہیں' ہر زاویے پر لکھا جا رہا ہے۔ نئے نکتے تلاش کر کے نئے سرے سے باتوں کے جال بچھائے جا رہے ہیں لیکن اپنے کہے پر' اپنے منصوبوں پر عمل کوئی نہیں کر رہا۔ ہر شخص دوسرے سے شکوہ کناں ہے۔

اگر آپ کو حالات سے' لوگوں کے رویوں سے' اردگرد کے ماحول سے کچھ شکایات ہیں تو ایسی شکایات اوروں کو بھی آپ سے ہوں گی متعلقہ افراد سے ان شکایات کے سلسلے میں تبادلہ خیالات کر کے ان شکایات کو دور کیا جا سکتا ہے۔ لوگوں کی ایسی تمام باتیں' حرکتیں جو تکلیف دہ محسوس ہوں انہیں کہہ دیں۔ اگر اسے آپ نے اپنے ذہن میں جمع کیا تو وہ فضول احساسات کا کباڑ خانہ بن جائے گا اور اس میں کسی اچھے جذبے' احساس' خیال یا تصور کے لیے جگہ نہیں رہے گی۔

اپنے خیالات کو لفظوں کا روپ دے کر ہمیں بھیجیں۔ مگر تنقید برائے اصلاح ہو نہ کہ تنقید برائے تنقید..... آپ کی تنقید ہو سکتا ہے کہ کچھ سدھار لانے میں معاون ثابت ہو۔

اسی حوالے سے ہم نے قارئین کے لیے ایک سلسلہ "بول کہ لب آزاد ہیں تیرے" کے نام سے شروع کیا ہے۔ جس کے ذریعے آپ کے خیالات دوسروں تک با آسانی پہنچ سکتے ہیں اور یہی ذریعہ معاشرے میں سدھار لا سکتا ہے تو اپنی رائے کا اظہار کھل کر کریں۔

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے

ریحانہ امجد بخاری

زویا ایم قادری..... کراچی

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے
بول کہ جاں اب تک تیری ہے
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

اک خوشگوار و خوش کن احساس "بول کہ لب آزاد ہیں تیرے" یہ آزادی بھی بڑی نعمت ہے۔ اور اس طرح کی آزادی کہ جو چاہو کہہ لو۔ اس سے زیادہ جان فزا احساس اور کیا ہو گا۔ مگر وہ کیا ہے کہ حد سے بڑھی ہوئی آزادی یا اس کا ناجائز استعمال کہیں سے بھی سود مند نہیں۔ (کاش ہمارا میڈیا خصوصاً" اینکرز کو اس کا ادراک ہو جائے) بہرحال اعتدال کی راہ سب سے مناسب ہے۔ لیکن سوچوں کی ان تلاطم خیز موجوں کا کیا کیجیے۔ جو بسا اوقات بہا کر ہی لے جاتی ہیں؟ اور اس طوفان بلاخیز سے نمٹنے کے لیے کرن کے اس پلیٹ فارم پر جو اہتمام کیا گیا ہے۔ اس کے لیے بے حد شکریہ!

اس قلم و قرطاس کا سہارا لے کر لفظ بکھیرتے ہوئے

کوشش تو یہی ہے کہ دریا کو کوزے میں بند کروں۔ اب دیکھیے کہ کہاں تک کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں ہمیں دراصل جس جانب توجہ مبذول کروانا چاہ رہی ہوں' وہ ہماری سوچوں کا دھارا ہے! ایک قوم کی حیثیت سے یا ایک انفرادی فرد کی حیثیت سے۔ ہماری زندگی میں بے معنی و منفی سوچوں کا عمل دخل کچھ اس قدر بڑھتا جارہا ہے کہ بسا اوقات اچھے مثبت پہلو میں سے بھی منفی معنی اخذ کرنے میں دیر نہیں لگتی۔ اور یہ حالت کچھ تسلی بخش نہیں کہی جاسکتی۔

مانا کہ حالات شہر کے' ملک کے حتی کہ اپنی ذات کے گردش دوراں کا شکار ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے انسان کو اگر اشرف المخلوقات کا درجہ دیا ہے تو اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ اس میں کچھ ایسا ہے جو دوسری مخلوق کو حاصل نہیں قوتِ ارادی' ذہن اور سوچ جیسی لازوال دولت' جو اللہ کی طرف سے ہمیں ودیعت کی گئی ہے اس کا جائز استعمال یہی ہے کہ منفی و مثبت' دونوں راہوں میں درست کو چنا جائے اور ہم مسلمانوں کی تو تعریف بھی یہی ہے کہ

"امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ جو نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔"

تاریخ گواہ ہے کہ حالات پہ چھایا جمود ہمیشہ طاری نہیں رہتا اور جب باکمال و باعمل لوگ ہوں تو یہ جمود چند لمحوں کا مہمان ثابت ہوتا ہے تو کیا عجب ہے کہ یہ قوم مل کر اس جمود کو کہ جس کا شکار ہر فرد ہے' ختم کرنے کے لیے کوشاں ہو جائے کیونکہ!

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ اور ویسے بھی جب لوگ ملتے ہیں تو کارواں خود بہ خود بن جاتے ہیں۔ ضرورت تو صرف پہلے قدم کی ہے۔ اور یہ پہلا قدم میرا بھی ہو سکتا ہے اور یہ پہلا قدم آپ کا بھی ہو سکتا ہے۔

جگر کی آگ' نظر کی امنگ' دل کی جلن
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگار صبح کدھر گئی؟
ابھی چراغ سر راہ کو کچھ خبر ہی نہیں

ابھی گرانی شب میں کمی نہیں آئی
نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

کب تک دوسروں پہ تکیہ کیے بیٹھے رہیں گے؟ بہتر نہیں ہے کہ خود ہی بڑھ کر تیشے سنبھال لیں کہ لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے۔ مانا کہ

چوہا مامور ہیں اس شہر کی دربانی پر
اور رونا آتا ہے اس طرز نگہبانی پر

مگر یہی گمان اگر ملت کے باہمت افراد کے ہاتھوں میں آجائے۔ خود کو بدلنے کا عمل کیے بعد دیگرے شروع ہو جائے۔ تو ملک کیا تقدیر بدل سکتے ہیں کہ بندہ کو وہی کچھ ملتا ہے جس کا وہ گمان کرتا ہے یا جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے۔ بزرگوں کے اقوال اور احادیث مبارکہ سے یہ بات ثابت ہے کہ!

"لوگوں پر ہمیشہ ویسے حکمران مسلط کیے جاتے ہیں جیسے کہ وہ خود ہوتے ہیں۔" تو پھر کہیں نہ کہیں جھول تو ہم میں ہی ہے۔

تبدیلی کا عمل ہمیشہ نیچے والی سطح سے شروع ہوتا ہے۔ طوفان ہمیشہ آخری موج سے اٹھتا ہے۔ پھر لحظہ لحظہ بڑھتا ہوا' موجوں کی صورت میں ساحل سے ٹکراتا ہے۔ تو ایک مثبت تلاطم خیز طوفان کو آگے بڑھانے کے لیے آخری اور سب سے چھوٹی موج کو کچھ کرنا پڑے گا۔

کیوں نہ خود سے عہد کرلیں کہ اب ٹریفک کے قوانین کو نہیں توڑنا۔ خود سے ابتدا کرلیں کہ اب ہر گلی و کوچے کو اتنا ہی صاف رکھنا ہے جتنا کہ ہمارا فرض ہے۔ تبدیلی کا آغاز شروع کردیں کہ محبت و اسلام کی روایت کو عام کرنا ہے کہ "میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے" خود پر لازم کرلیں کہ برائی کا جواب برائی سے نہیں دینا۔ ایک نئے دور میں قدم رکھ دیں جہاں کوئی نسلی امتیاز نہیں' کوئی صوبائی حد بندی نہیں' کوئی قومیت کا تفرقہ نہیں۔ جو بھی ہیں۔ بس ایک پاکستانی ہیں۔ سبا' ہم پاکستانی!

چلو کوئی ایسا نگر بسائیں
جہاں سب لوگ مل کر مسکرائیں
جہاں موسم خزاں سے اجنبی ہو
چراغوں سے ہوا کی دوستی ہو
جہاں خوشبو رواں ہو شعلگی میں
ہوا خود سے کتھک ناچے گلی میں
جہاں الجھیں نہ آندھی سے شرارے
نہ خندہ زن ہوں جگنو پر ستارے
جہاں چمکیں ہر اک سو فاختائیں
فسردہ لب ترانے گنگنائیں
جہاں سب لوگ مل کر مسکرائیں
چلو کوئی ایسا نگر بسائیں

نزہت جبیں........کراچی

یہ بہت بہترین سلسلہ ہے جس میں ہم لوگ بلا جھجک کھل کر معاشرے میں پھیلی غلط باتوں کی طرف توجہ دلا سکتے ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر یہ بات بے حد بری لگتی ہے کہ لڑکے تو لڑکے لڑکیاں جو گھر کے باہر مسلسل موبائل فون میں مصروف رہتی ہیں' اسٹاپ پر بس کے انتظار میں کھڑی کالج اور اسکول کی بچیاں ہوں یا فیکٹریوں میں کام کرنے والی لڑکیاں' مارکیٹوں میں ہوں یا کسی آئس کریم پارلر میں' یا پھر راستے میں پیدل چلتے ہوئے بھی کانوں میں موبائل لگا ہوتا ہے آس پاس سے قدرے بے نیاز زور سے بولتی ہوئی اور قہقہہ لگاتی لڑکیاں جنہیں دیکھ کر کم از کم مجھے تو بہت غصہ آتا ہے۔

گو کہ موبائل آج کے دور کی بہت اہم ضرورت ہے شہر کے حالات کا کوئی بھروسہ نہیں ہمارے گھر کے بچے بھی کالجز میں ہوتے ہیں' ہمیں بھی پریشانی ہوتی ہے ذرا سا کہیں کچھ ہنگامہ ہو ہم فوراً اپنے بچوں سے رابطہ کرتے ہیں۔ لیکن کچھ بچوں نے اس ضرورت کو غلط طریقے سے استعمال کرکے خود کے لیے بھی پریشانیاں پیدا کرلی ہیں۔ آئے دن موبائل چھینے جاتے ہیں مگر ان بچوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا' لڑکوں کو دیکھیں تو بھی آدھی رات تک گلی کے کونوں پر قدرے سنسان جگہ پر بیٹھ کر باتوں میں لگے رہتے ہیں' کتنی کتنی دیر ایسے میں کوئی بھی آکر ان سے موبائل چھین لیتا ہے ایک ضروری اور کار آمد چیز کو غلط طریقے سے استعمال کرکے نسل نے اپنے لیے مشکلات پیدا کرلی ہیں۔

میری اپنے بچوں سے گزارش ہے کہ خدارا اپنے والدین کی حلال سے کمائی رقم کا کچھ تو خیال کریں اور جس مقصد کے لیے والدین نے کم عمروں میں آپ کو یہ تحفے دیے ہیں ان کا صحیح استعمال کریں۔

حرمت روا اکرم........ڈلوال

آج کل کے آزاد زمانے میں جب لب کشائی کی اتنی چھوٹ ہے کہ آپ منٹوں میں کسی کی عزت کا جنازہ نکال سکتے ہیں' کرن کا تنقید برائے اصلاح کا آپشن کچھ خوش آئند اور حیرت ناک ہے۔ ہم جیسے گھریلو لوگ کہاں ملک کے حالات پہ کڑی نظر رکھ پاتے ہیں' بس کچھ باتیں جاننے کو مل جاتی ہیں تو غنیمت ہے بھئی۔ خیر بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔

اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو تخلیق کیا تو اس کو ہر نعمت سے نوازا۔ مگر انسان ہر دور میں ناشکرا رہا۔ تب بھی جب اس کو من سلویٰ عنایت کیا جاتا تھا اور اس کا دل لہسن اور پیاز کھانے کو کرتا تھا۔ اور آج بھی کہ من وسلویٰ سے لے کر لہسن' پیاز تک سب کھانے کو ملتا ہے تو وہ اسی بے دردی سے اس کا ضیاع بھی کرتا ہے۔ یہ سوچے بغیر کہ دنیا کے کسی کونے میں اسی رزق کے لیے کوئی اپنے معصوم بچوں کو زندہ جلانے پہ مجبور ہے تو کوئی زہر پھانکنے پہ۔ ہمارے پیارے ملک پاکستان میں بڑے بڑے محلوں میں گیٹ ٹو گیدر اور دوسری پارٹیوں کے نام پہ رزق کا جو ضیاع سامنے آتا ہے' وہ معاشرے کے بھوکے لوگوں کے پیٹ میں جاکر انہیں سکون دیتا دکھائی نہیں دیتا' اتنی لمبی تمہید کا مقصد فقط یہ ہے کہ خدارا اس ذات پاک نے جو آپ کو رزق کی فراوانی عطا کی ہے تو کسی معصوم بچے کی بھوک سے ویران آنکھوں کا خیال کیجیے۔ آپ بے شک اپنے ہاتھ سے اس کا رزق اس تک نہ پہنچائیں مگر اتنا ضائع بھی مت

کریں کہ وہ اس سے محروم رہ جائے۔

نہ تو میں کوئی عالم فاضل ہوں کہ نصیحت کروں اور نہ ہی ایک مکمل ذات کہ جو تنقید کروں۔ بس اپنی کچھ سوچ آپ تک منتقل کرنی تھی کہ روزانہ جو کھانا ہم باسی سمجھ کر پھینک دیتے ہیں اپنے محلے میں ضرور کہ ہمارا اختیار شہر اور گاؤں تک نہیں ہے۔ تو محلے تک تو لوگ اپنے حصے کی روٹی کھا سکیں۔ اپنے جہنم (پیٹ) کی آگ بجھا سکیں۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اس عمل صالح کی توفیق عطا کرے اور آپ سب کو بھی۔ (آمین)

ثمینہ اکرم .... بہار کالونی

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے.... آزاد سے یاد آیا کہ آزاد تو 63 سال قبل ہی ہو گئے تھے۔ مگر آزاد ہو کر بھی ان دیکھی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں ہمارا معاشرہ اب مختلف طبقوں میں تقسیم ہو چکا ہے اور طبقہ کسی نہ کسی نظریے کا ٹھیکیدار بن چکا ہے اب خیالات و افکار کی آزادی کہاں ؟

اس صورت حال میں کچھ بولنے سے پہلے سو مرتبہ سوچنا پڑتا ہے۔

شہر قائد کراچی میں اسٹریٹ کرائمز اور ٹارگٹ کلنگ جیسے جرائم کھلے عام ہو رہے ہیں۔ ہر جگہ لاقانونیت کا راج ہے اور شہر میں جیسے جنگل کا قانون رائج ہے۔ ہماری پولیس ان جرائم کی روک تھام میں بے بس نظر آتی ہے۔ مہنگائی اور غربت نے عام آدمی کو جس نفسیاتی اور سماجی پیچیدگیوں میں الجھا دیا ہے۔ ان کی طرف حکومتی بقراطوں کی نظر بھی نہیں جاتی۔ بعض اوقات یہی نفسیاتی الجھنیں اتنی بڑھ جاتی ہیں کہ انسان چوری ڈکیتی اور اقدام قتل جیسی انتہا پسندانہ حرکت کر بیٹھتا ہے۔

شہر میں بڑھتی ہوئی وارداتوں نے عام شہری کا سکون چھین لیا ہے۔ قانون کے ادارے شہریوں کی جان و مال کے تحفظ میں بری طرح ناکام ہو گئے ہیں۔ معاشرے میں ہر طرف نفسانفسی کا عالم ہے۔ ملک میں سیاست کے نام پر مذہب کو بدنام کرنے کی سازشیں ہو رہی ہیں اور آج مسلمانوں کا تصور دنیا کے مغربی ممالک میں انتہا پسند اور دہشت گرد کے طور پر ہو رہا ہے۔ خدارا کچھ تو سوچیں ہم اپنے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو بھول چکے ہیں۔ مسلمانوں میں آپس میں اتحاد نہیں جس سے مغربی قوتیں فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا ہی قتل عام ہو رہا ہے۔ یہ ہمارے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ یہ وقت ملت مسلمہ کے اتحاد کا وقت ہے اگر اب بھی ہم نے ہوش کے ناخن نہ لیے تو پھر ہمارا اللہ ہی حافظ ہے۔ پھر نہ ہمیں یہ زمین معاف کرے گی اور نہ اوپر آسمان....

اے کاش کہ ہم مسلمان یہودی قوتوں کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں۔

کرن .... شجاع آباد

آپ نے "بول کے لب آزاد ہیں" کا سلسلہ شروع کر کے ہمارے اندر کی گھٹن کو باہر نکالنے کا راستہ بنایا ہے۔ آج کل موبائل کے ذریعے لوگ ایسے ایسے دھوکے کر رہے ہیں جس کا تصور کرنا بھی مشکل ہے لوگ فون کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم فلاں کمپنی کی طرف سے بات کر رہے ہیں آپ کا پانچ لاکھ کا انعام نکلا ہے آپ اس نمبر پر کال کریں جی تو اس نمبر پر کال کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ پندرہ موبائل کارڈ لوڈ کروا دیں یا ہمیں ان کے نمبر بتا دیں شکر ہے ہم تو اس کے فریب سے بچ گئے مگر کیا وہ لوگ یہ نہیں سوچتے کہ جن کے ساتھ دھوکہ کر رہے ہیں وہ کیسے ہیں؟ ان کے حالات کیسے ہیں؟ ہماری حکومت کو چاہیے اپنی ترقی کو چھوڑ کر ملک کی ترقی پر بھی غور فرمائیں۔ جو امداد ہمیں دوسرے ممالک سے ملتی ہے اس میں سے پچھتر فیصد تو ٹیبل پر بیٹھے بیٹھے ہی تقسیم ہو جاتی ہے اور پچیس فیصد لوگوں تک بامشکل پہنچ پاتی ہے۔

حکومت کو چاہیے کہ موبائل فون پر دھوکہ دینے والوں کو سزا دیں

فوزیہ یاسمین

دستِ کوزہ گر

زوبیہ کو اپنے گھر میں اپنی خالہ شائستہ کی روح نظر آتی ہے۔ لیکن وہ اس سے بات نہیں کرتی... جبکہ زوبیہ ان سے بات کرنے کے لیے بے چین ہے ــــ اس کی ملاقات رخسار سے ہوتی ہے۔ جو کالج میں اس کے ساتھ پڑھتی ہے اور روحوں سے بات کرنے کا دعوا بھی کرتی ہے... زوبیہ اسے رات کے دو بجے اپنے گھر کی چھت پر لے جاتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس کی خالہ کی روح کو بلائے... وہ روح کو بلانے کی کوشش کرتی ہے۔

رومیلہ، سنبل اور نمل کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن مل جاتا ہے۔ اور اسی خوشی میں نمل ان دونوں کو لنچ کی دعوت دیتی ہے... اس آفر پر دونوں حیران رہ جاتی ہیں۔ جبکہ دوسری طرف خرم، ذکی سے شرط ہارنے کے بعد اس کی عجیب و غریب شرط کو قبول کرلیتا ہے۔ اور انہیں لنچ کے لیے کہہ دیتا ہے۔

زوبیہ اپنی خالہ سے بات کرنے کے بعد بہت مطمئن ہوتی ہے جبکہ رخسار اس کے بے وقوف بن جانے پر خوش ہے۔ وہ دونوں واپس جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھتی ہیں کہ اچانک لائٹ چلی جاتی ہے؟ اور کوئی رخسار کو اندھیرے میں زخمی کردیتا ہے...

(اب آگے پڑھیے)

۱۱

گیارہویں قسط

عائشہ اختر ماؤف ہوتے ذہن کے ساتھ کارڈلیس پکڑے بیٹھی رہیں دوسری طرف ڈاکٹر شکیلہ مسلسل ہیلو ہیلو کی تکرار کر رہی تھیں۔

بلال اختر جو اتنی صبح صبح کال آنے پر ناشتے سے ہاتھ روکے انہیں ہی دیکھ رہے تھے انہیں سکتے میں جاتا دیکھ کر ان کا کندھا ہلاتے ہوئے پوچھنے لگے۔

"عائشہ کیا بات ہے آپ ٹھیک تو ہیں؟" وہ تو پہلے ہی انہیں ٹھیک نہیں لگ رہی تھیں اب فون میں ان کا اس طرح ساکت ہو جانا بلال اختر کو پریشان کر گیا تھا۔

بلال اختر کے پوچھنے پر عائشہ اختر خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھنے لگیں۔

آخر بلال اختر سے برداشت نہ ہوا اور انہوں نے کارڈلیس عائشہ اختر کے ہاتھ سے چھین کر کان سے لگا لیا۔

دوسری طرف ڈاکٹر شکیلہ کی آواز سن کر جہاں وہ چونکے تھے وہیں ڈاکٹر شکیلہ کو بھی ان کی موجودگی کا علم ہوتے ہی ایکدم بریک لگ گیا تھا۔

"کیا بات ہے ڈاکٹر۔ آپ نے اتنی صبح صبح کیوں فون کیا ہے؟" بلال اختر بری طرح پریشان ہو گئے۔

ڈاکٹر شکیلہ کی سمجھ میں نہیں آیا فوری طور پر کیا جواب دیں۔

عائشہ اختر نے انہیں جو کچھ بھی بتایا تھا وہ سب بلال اختر کو بتانے سے منع کر دیا تھا خود وہ بھی بلال اختر کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھتی تھیں۔

ان کا بھی یہی خیال تھا بلال اختر کو زوبیہ کی حالت کے بارے میں کچھ نہ بتایا جائے کم از کم تب تک جب تک وہ خود ایک بار زوبیہ سے مل کر بات نہیں کر لیتی۔

"آں.... مسٹر بلال.... آپ ذرا مسز بلال کو فون دیجیے گا۔" وہ ٹالنے والے انداز میں بولیں۔

"نہیں پہلے آپ مجھے بتائیں آخر ہوا کیا ہے۔" بلال اختر کو ان کی ٹال مٹول پر غصہ آگیا عائشہ اختر ان کا بگڑا ہوا انداز دیکھ کر خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگیں ہمران کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا بلال اختر سے کارڈلیس کیسے لیں۔

"بات کچھ نہیں ہے۔ مجھے آپ.... ان سے کچھ پوچھنا تھا وہ شاید اپائنمنٹ لینا چاہ رہی تھیں اور میں آج شام شہر سے باہر جا رہی ہوں اس لیے میں نے سوچا انہیں بتا دوں وہ ابھی آ جائیں تو زیادہ اچھا ہے۔" ڈاکٹر شکیلہ بہت سوچ سوچ کر بولیں۔

"لیکن وہ آپ کے پاس آنا کیوں چاہتی ہیں؟" بلال اختر بھلا کہاں مطمئن ہوتے یہ اور بات تھی کہ اس وقت تک عائشہ اختر نے بھی خود کو کمپوز کر لیا تھا وہ فوراً بولیں۔

"وہ.... بلال جانا تو ضروری نہیں ہے۔ بس کچھ بات کرنی تھی اور بس.... آپ فون ادھر دیں نا۔" انہوں نے چھیننے کے انداز میں ان سے فون لے لیا۔

بلال اختر الجھے ہوئے انداز میں ان کا رویہ اور حرکتیں دیکھتے رہے البتہ بولے کچھ نہیں کیونکہ عائشہ اختر تیز تیز کہہ رہی تھیں۔

"ڈاکٹر شکیلہ میں آپ کو بعد میں فون کرتی ہوں۔"

"جی جی میں انتظار کر رہی ہوں۔" دوسری طرف ڈاکٹر شکیلہ نے بھی فوراً" سمجھتے ہوئے لائن کاٹ دی۔

"آخر ہوا کیا ہے کچھ پتا بھی تو چلے؟" عائشہ اختر آف کا بٹن پریس کرتے ہوئے جیسے ہی اٹھیں بلال اختر زچ ہو کر بولے۔

"کچھ نہیں ہوا ہے آپ کچھ زیادہ ہی دخل دینے لگے ہیں ہر بات میں۔ میں بات کر رہی تھی آپ نے کارڈلیس

چھین لیا۔" عائشہ اختر سے جب کوئی معقول بہانہ نہیں بنا تو انہیں غصہ آگیا۔

"آپ بات کہاں کر رہی تھیں آپ کو تو سکتہ ہو گیا تھا۔" بلال اختر اعتراض کرتے ہوئے بولے تو عائشہ اختر جان بوجھ کر بغیر کچھ کہے کمرے سے نکل گئیں۔

وہ زوبیہ سے بات کرنا چاہ رہی تھیں مگر بلال اختر کے جانے کے بعد۔ وہ پہلے ہی مشکوک ہو رہے تھے لہذا وہ نہیں چاہتی تھیں کہ بلال اختر کے کان میں ذرا سی بھی بھنک پڑے ان کے اور زوبیہ کے مابین ہوئی گفتگو کی۔

ہمران کے جانے کے بعد جب عائشہ اختر نے اخبار میں سے وہ خبر نکال کر پڑھی اور زوبیہ کے سامنے اخبار لے جا کر رکھا تو حسب سابق زوبیہ کے پاس ان کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"میں.... میں کچھ نہیں جانتی مما۔ مجھے یہ پتا ہے کہ نطاشہ کے گرنے سے اس کے سر میں چوٹ لگی اور اس کی موت واقع ہو گئی باقی مجھے یہ سب کیسے پتا ہے مجھے خود بھی نہیں معلوم پتا۔" زوبیہ روہانسی آواز کے ساتھ بولی۔

عائشہ اختر کچھ دیر تو اسے دیکھتی رہیں پھر سپاٹ لہجے میں بولیں۔

"جلدی سے تیار ہو جاؤ میں تمہیں ڈاکٹر شکیلہ کے پاس لے جا رہی ہوں۔" زوبیہ بے بسی سے انہیں دیکھتی رہ گئی وہ جانتی تھی کچھ بھی کہنا بے کار ہے انہوں نے اگر اسے اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ کر لیا ہے تو وہ اسے لے کر ضرور جائیں گی وہ دل ہی دل میں ہراساں ہونے کے باوجود کپڑے بدلنے اٹھ گئی۔

راستے بھر اس کا دل سوکھے پتے کی طرح لرزتا رہا کیونکہ راستے بھر عائشہ اختر موبائل پر کسی نا کسی سے محو گفتگو رہیں۔

اتنا اندازہ تو زوبیہ کو ہو گیا تھا کہ وہ نطاشہ کی موت کی تفصیلات پتا کر رہی ہیں انہوں نے زوبیہ کے کالج کی پرنسپل اور ایک دو ٹیچرز کو فون کیا تھا لیکن انہیں کیا پتا چلا یہ زوبیہ جاننے سے قاصر تھی کیونکہ دوسری طرف کی گفتگو اسے سنائی نہیں دے رہی تھی اسے تو بس عائشہ اختر کے تاثرات نظر آ رہے تھے جو بہت زیادہ سنجیدہ اور ناقابل فہم تھے۔

ایک دو بار انہوں نے بات کرتے ہوئے بڑی گہری نظروں سے زوبیہ کو دیکھا تھا جس سے زوبیہ کے خوف میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا اسی لیے ڈاکٹر شکیلہ کے شاندار کمرے میں داخل ہوتے ہوئے وہ بری طرح نروس ہو رہی تھی۔

ڈاکٹر شکیلہ بھی اسے دیکھ کر معمول کی طرح مسکرائی نہیں تھیں بلکہ انہوں نے صرف مسکرانے کی کوشش کی تھی جس کے جواب میں زوبیہ ایسی کوئی کوشش بھی نہ کر سکی اور شیشے کی ٹیبل کے سامنے رکھی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

"مسز بلال آپ باہر بیٹھیے میں پہلے زوبیہ سے بات کر لوں۔" ڈاکٹر شکیلہ نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"آں.... پہلے آپ میری بات سن لیں۔" عائشہ اختر نے قدرے بے چینی سے کہا تو ڈاکٹر شکیلہ ایک نظر زوبیہ کو دیکھتیں اٹھ کر ان کے نزدیک چلی آئیں۔

وہ دونوں زوبیہ سے قدرے ہٹ کر دروازے کے قریب کھڑی ہو کر بات کرنے لگیں عائشہ اختر گھبرائے ہوئے انداز میں کہہ رہی تھیں۔

"میری زوبیہ کے کالج کی پرنسپل سے بات ہوئی ہے انہوں نے ذاتی طور پر مجھے اس حادثے کے بارے میں بتایا ہے جو اخبار میں نہیں چھپا وہ کہہ رہی تھیں...." عائشہ اختر کافی دھیمی آواز میں بول رہی تھیں اس کے باوجود زوبیہ کو سب سنائی دے رہا تھا اور شاید ڈاکٹر شکیلہ کو بھی یہ اندازہ ہو گیا تھا تبھی وہ انہیں روکتے ہوئے بولیں۔

"مسز بلال آئیں ہم دوسرے کمرے میں چلتے ہیں۔" ڈاکٹر شکیلہ کہنے کے ساتھ ہی دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔ زوبیہ کی گھبراہٹ سوا ہو گئی۔

پتا نہیں عائشہ اختر کو کیا بات پتا چلی تھی۔

اس کا دل چاہا وہ ان کے پیچھے جا کر ان کی بات سنے مگر اتنی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھ بھی پاتی لیکن بغیر گئے بھی اسے علم تھا جو بھی بات ہو رہی تھی اس کے حق میں نہیں اس کے خلاف ہو رہی ہو گی۔

اور واقعی عائشہ اختر نے دوسرے کمرے میں داخل ہوتے ہی بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"مجھے یقین ہے نطاشہ کو زوبیہ نے ہی مارا ہے۔" ڈاکٹر شکیلہ ان سے ایسے ہی کسی بیان کی توقع کر رہی تھیں تبھی کچھ بولے بغیر ان کی بات پوری ہونے کا انتظار کرنے لگیں۔

"نطاشہ کی پرنسپل کا کہنا ہے۔ نطاشہ اکثر کالج کے بہانے گھر سے کہیں اور چلی جایا کرتی تھی۔ اس دن بھی وہ کالج آورز میں ہی کی ویو چلی گئی تھی شاید اس کے ساتھ کوئی لڑکا بھی تھا۔

جس کے ساتھ وہ بارہ بجے تک وہیں تھی پھر اپنی گاڑی میں گھر جانے لگی تو راستے میں ایک شاپ پر رکی تھی اور وہیں کسی گڑھے میں وہ پاؤں مڑ جانے کی وجہ سے گر گئی۔" ڈاکٹر شکیلہ چپ چاپ عائشہ اختر کو سنتی رہیں جو تواتر سے کہہ رہی تھیں۔

"ساڑھے بارہ یا۔ ایک بجے کے قریب نطاشہ کی موت ہوئی ہے زوبیہ اس ٹائم پر گھر پر نہیں تھی اس کا کہنا ہے وہ کوارٹر میں ہوتی تھی لیکن مجھے پتا ہے وہ نطاشہ کا پیچھا کرتی ہو گی۔

جب نطاشہ اس شاپ کے سامنے اتری ہو گی تب زوبیہ نے ہی اسے گڑھے میں دھکا دیا ہو گا۔" عائشہ اختر بے چینی سے انگلیاں چٹخانے لگیں تو ڈاکٹر شکیلہ جو خود اسی قسم کی باتیں سوچ رہی تھیں انہیں تسلی دیتے ہوئے بولیں۔

"دیکھیں یہ سب صرف اندازے ہیں جو پرنسپل نے کیے ہیں ہو سکتا ہے وہ کسی لڑکے سے ملنے جاتی ہو لیکن یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ اس دن بھی گئی ہو اور ضروری نہیں کہ اس شاپ پر وہ کچھ لینے ہی اتری ہو۔"

"اس شاپ کے سامنے نطاشہ کی گاڑی کھڑی تھی۔ اس لیے پولیس نے یہ اندازہ لگایا ہے لیکن کالج کی اور نطاشہ کے گھر والوں کی بدنامی نہ ہو اس لیے اخبار والوں کو یہ چھاپنے سے روک دیا گیا کہ یہ حادثہ کس وقت پیش آیا۔

کیا اثر پڑے گا لوگوں پر جب انہیں پتا چلے گا کہ وہ کالج کے اوقات میں کہیں اور گئی ہوئی تھی۔ اور مجھے اس بات سے کوئی سروکار بھی نہیں ہے کہ وہ کہاں گئی اور کس کے ساتھ گئی۔

میں آپ سے صرف اتنا کہہ رہی ہوں کہ یہ سب اسی بیچ ہوا ہے۔ جس وقت زوبیہ گھر سے غائب ہوتی تھی اور مجھے پورا یقین ہے کہ یہ سب زوبیہ نے ہی کیا ہے۔" عائشہ اختر زچ ہو کر بولیں تو ڈاکٹر شکیلہ انہیں ٹھنڈا کرنے کے لیے رسانیت سے کہنے لگیں۔

"جی۔۔۔ جی میں آپ کا مطلب سمجھ رہی ہوں۔ میں نے تو ایسے ہی ایک بات کہی تھی۔

ہمیں واقعی اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کہاں گئی تھی اور کس کے ساتھ گئی تھی ہمارے پیش نظر صرف ایک بات ہے کہ نطاشہ کی جس وقت موت ہوئی ہے زوبیہ اس وقت خود بھی غائب تھی۔

سچ پوچھیں تو خبر پڑھتے ہی میں نے آپ کو اسی لیے فون کیا تھا کہ میرے ذہن میں بھی یہی خیال آیا تھا۔

مجھے لگتا ہے زوبیہ splitpersonality کا شکار ہے۔" ڈاکٹر شکیلہ پر سوچ انداز میں بولیں۔

عائشہ اختر پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگیں۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ وہ آپ سے جھوٹ نہیں بولتی کہ میں کالج جانے کی بجائے سرونٹ کوارٹر میں جا بیٹھی تھی۔

بلکہ اسے خود سچ کا پتا نہیں ہوتا جب تک وہ زوبیہ ہوتی ہے تب تک وہ جو کچھ کرتی ہے اسے یاد رہتا ہے لیکن جب شائستہ کی شخصیت اس پر حاوی ہو جاتی ہے تب وہ جو بھی کرتی ہے اسے یاد ہی نہیں رہتا اس لیے اسے خود نہیں معلوم ہو گا کہ اس نے نطاشہ کو دھکا دیا ہے جبھی وہ آپ کو اس سوال کا جواب نہیں دے پا رہی کہ وہ یہ کیسے جانتی ہے کہ نطاشہ کہیں گر گئی ہے اور اس کی موت واقع ہو گئی ہے۔

ٹھیک یہی حرکت اس نے رخسار کے ساتھ کی تھی تب بھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ اسے شائستہ نے زخمی کیا ہے جبکہ اس کا سر زمین پر زوبیہ نے خود ہی مارا تھا۔" ڈاکٹر شکیلہ نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

عائشہ اختر بے چینی سے ان کے برابر والے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"تو پھر آخر اس کا حل کیا ہے۔ کیا وہ اسی طرح سب کو مارتی پھرے گی۔"

"یہی تو میں سوچ رہی ہوں اگر یہی حالت رہی تو مجھے اسے مینٹل ہاسپٹل میں ایڈمٹ کرنا پڑے گا۔"

"جی۔" عائشہ اختر کی آنکھیں پھیل گئیں تو ڈاکٹر شکیلہ فوراً بولیں۔

"میں خود نہیں چاہتی کہ ایسا ہو اس طرح اس کی حالت منظر عام پر آ جائے گی لڑکی ذات ہے وہ۔ ایک بار مینٹل کیس یا سائیکو کا دھبا لگ گیا تو۔ مگر میری بھی مجبوری ہے میں ایسے کیس میں پیشنٹ کے ساتھ زیادہ تعاون نہیں کر سکتی جو دوسروں کے لیے خطرہ ہو۔"

"نہیں نہیں ڈاکٹر ایسا مت کہیں۔ میں تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔ میری بیٹی پاگل خانے میں۔" عائشہ اختر کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔

مگر اس بار ڈاکٹر شکیلہ نے انہیں تسلی نہیں دی بلکہ سوالیہ انداز میں انہیں دیکھنے لگیں۔

"آپ اور کیا ایکسپیکٹ کر رہی ہیں ایک طرف آپ کو خود یہی لگ رہا ہے کہ زوبیہ نے نطاشہ کو مارا ہے تو ایسی کنڈیشن میں ہم اسے کھلا تو نہیں چھوڑ سکتے۔"

"لیکن ڈاکٹر کوئی اور سلوشن بھی تو ہو سکتا ہے۔" عائشہ اختر کے پاس جرح کرنے کے لیے کوئی نکتہ نہیں تھا وہ فوراً" مفاہمت بھرے انداز میں بولیں۔

"ایک سلوشن بتایا تو تھا مگر آپ نے اس پر عمل ہی نہیں کیا اور اب تو مجھے لگ رہا ہے اس پر عمل کرنے کا فائدہ بھی نہیں۔

زوبیہ جس splitpersonality (دوہری شخصیت) کا شکار ہے وہ اب اس سے باہر نہیں آ سکتی۔"

ڈاکٹر شکیلہ اس بار کچھ زیادہ ہی مایوس لگ رہی تھیں اور ان کا اس طرح دلبرداشتہ ہونا عائشہ اختر کی پریشانی میں اضافہ کر رہا تھا۔

"کون سا مشورہ دیا تھا آپ نے جس پر میں نے عمل نہیں کیا۔" عائشہ اختر کے پوچھنے پر ڈاکٹر شکیلہ نے قدرے تلخ ہوتے ہوئے کہا۔

"میں نے کہا تھا اس کی شادی کر دیں یا اسے کہیں گھمانے پھرانے لے جائیں۔"

"ڈاکٹر یہ دونوں کام میرے اختیار سے باہر ہیں یہ سب بلال کی مرضی سے ہی ہو سکتا ہے اور بلال ان دونوں باتوں کے لیے تیار نہیں ہیں۔" عائشہ اختر بے بسی سے بولیں۔

"جو کچھ نطاشہ کے ساتھ ہوا ہے وہ مسٹر بلال کو بتا دیں وہ فوراً" سے بیشتر تیار ہو جائیں گے۔" ڈاکٹر شکیلہ سپاٹ لہجے میں بولیں۔

عائشہ اختر کے چہرے پر پہلے ہراس میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔

"یہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ڈاکٹر۔"

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ یہ سب بلال اختر کے علم میں ہونا بہت ضروری ہے۔ آپ کیوں یہ سب ان سے پوشیدہ رکھنا چاہتی ہیں زوبیہ جتنی آپ کی بیٹی ہے اتنی ہی بلال اختر کی بھی اولاد ہے۔ اب اگر ایک بیماری آپ دونوں کی اولاد میں موجود ہے تو وہ چھپانے سے ٹھیک تو نہیں ہو جائے گی نا۔" ڈاکٹر شکیلہ کے ناراض لہجے پر عائشہ اختر کچھ بول تو نہ سکیں مگر ان چہرے کے تاثرات سے صاف ظاہر تھا وہ ان سے متفق بھی نہیں ہیں۔

ڈاکٹر شکیلہ کچھ دیر ان کے بولنے کا انتظار کرتی رہیں پھر کھڑی ہوتے ہوئے بولیں۔

"فی الحال میں زوبیہ سے بات کرنے جا رہی ہوں گھر جاتے ہی آپ مسٹر بلال کو سب کچھ بتا دیجیے گا۔ ورنہ ایک دو دن میں ، میں خود انہیں فون کر کے ساری صورت حال سے آگاہ کر دوں گی۔" ڈاکٹر شکیلہ اپنی بات کہہ کر رکی نہیں۔

عائشہ اختر تذبذب کے عالم میں بیٹھی اپنے ہونٹ کاٹتی رہیں پھر اٹھ کر وہ بھی اس کمرے میں واپس آ گئیں جہاں زوبیہ موجود تھی۔

ہمیشہ کی طرح اس کے چہرے پر گھبراہٹ واضح طور پر چھائی ہوئی تھی اور وہ بہت اٹک اٹک کر ڈاکٹر شکیلہ کے سوالوں کا جواب دے رہی تھی بلکہ اس کی رندھی ہوئی آواز سن کر لگ رہا تھا اس نے اپنے آنسوؤں پر بڑی مشکل سے بند باندھ رکھا ہے۔

"مجھے نہیں پتا... کہ میں نطاشہ کی موت کے بارے میں پہلے سے کیسے جانتی ہوں۔ مجھے بس یہ پتا ہے کہ اس کا پاؤں مڑنے سے وہ گر گئی اور چوٹ لگنے سے وہ مر گئی۔"

"کیا تم وہاں موجود تھیں جب وہ گری تھی۔" ڈاکٹر شکیلہ نے حتی الامکان اپنا لہجہ دوستانہ رکھا ہوا تھا۔

"میں وہاں کیسے موجود ہو سکتی ہوں ایک ہی سوال اگر آپ لوگ دس دفعہ پوچھیں گے تو میرا جواب بدل تو نہیں جائے گا۔" زوبیہ کا لہجہ تپ گیا تھا وہ کبھی عائشہ اختر کو دیکھنے لگتی تو کبھی ڈاکٹر شکیلہ کو۔

"دیکھو بیٹا میرا یہ مطلب نہیں تھا میں تو یہ پوچھ رہی تھی کہ..."

"کہ کیا میں نے نطاشہ کو قتل کیا ہے؟ یہی پوچھ رہی تھیں نا آپ۔" زوبیہ نے ان کا جملہ درمیان سے اچک لیا۔

عائشہ اختر نظریں چرا گئیں جبکہ ڈاکٹر شکیلہ بغور اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھتی رہیں جس کے روہانسے ہوتے چہرے پر دبا دبا غصہ اس کی حد درجہ۔ بے زاری اور دوسروں کو اپنی بات نہ۔ سمجھا سکنے کی بے بسی کو ظاہر کر رہی تھی۔

"آپ لوگوں نے پیپر میں نیوز پڑھی ہے نا کیا اس میں لکھا ہے کہ نطاشہ کا قتل ہوا ہے؟ یا مما نے جن لوگوں سے ابھی ابھی بات کی ہے انہوں نے کہا ہے کہ یہ حادثہ نہیں کوئی سازش ہے؟!

جب ایسی کوئی بات نہیں ہے تو آپ لوگ مجھے اس سب کا ذمہ دار ٹھہرانے پر کیوں بضد ہیں۔" زوبیہ کی آنکھیں بالآخر چھلک پڑیں۔

اس کا ایک ایک آنسو عائشہ اختر کے دل پر گر رہا تھا اور پھر زوبیہ نے جو کچھ کہا تھا اس کی بات کے معقول ہونے سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا تھا وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی کہ جب وہ ایک حادثہ تھا پولیس کا کہنا تھا کہ پاؤں مڑنے کی وجہ سے وہ گر گئی ہے تو یقیناً "اس کے پاؤں میں کوئی موچ وغیرہ ہو گی جبھی یہ اندازہ لگایا گیا پھر وہ کیوں اپنی بیٹی کو مجرم سمجھ رہی ہیں۔

لیکن ڈاکٹر شکیلہ کا دل اسے روتا دیکھ کر بالکل نہیں پسیجا بظاہر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اسے چپ کرانے لگیں اور یقین دلانے کی کوشش کرنے لگیں کہ ایسی کوئی بات نہیں وہ ایسا کچھ بھی نہیں سوچ رہیں۔ جبکہ وہ ایسا ہی سوچ رہی تھیں انہوں نے کچھ سوال گھما پھرا کر بھی پوچھے تاکہ کوئی سرا ہاتھ لگ جائے مگر زوبیہ نے کوئی بھی جواب ایسا نہیں دیا جس سے وہ کسی نتیجہ پر پہنچ سکتیں۔

اسی لیے جب زوبیہ ان کے کمرے سے باہر نکل گئی اور عائشہ اختر بھی الوداعی کلمات کہہ کر باہر جانے لگیں تو ڈاکٹر شکیلہ اپنے پروفیشنل حتمی انداز میں بولیں۔

"آپ شام تک مسٹر بلال کو سب بتا دیجیے گا کیونکہ کل میں ان سے فون پر بات کروں گی۔" عائشہ اختر تفکر سے ڈاکٹر شکیلہ کو دیکھنے لگیں جتنا وہ یہ سب بلال اختر سے چھپانا چاہ رہی تھیں وہ اتنا ہی بتانے پر بضد تھیں اور ان کے ضد پر آنے کا مطلب تھا بلال اختر کو آج شام ہی ساری صورت حال سے آگاہ کرنا اشد ضروری تھا۔

مگر اس کے بعد کیا ہوتا تھا اگر بلال اختر نے بھی یہی سوچا کہ یہ سب زوبیہ کا کیا دھرا ہے تو ان کی بیٹی کا مستقبل کیا ہو گا کیا وہ کسی پاگل خانے کی مریضہ بن کر رہے گی۔

عائشہ اختر کے لیے یہ سب سوچنا بھی محال تھا کجا کہ اس پر عمل کرنا۔

☼ ☼ ☼

نمل کچھ دیر تو انتظار کرتی رہی مگر خرم کو بدستور اپنی جگہ جما دیکھ کر لفافہ اپنی کتاب پر سے اٹھا کر ایک طرف رکھا اور کتاب کی ورق گردانی میں مصروف ہو گئی۔

ایک پل کو تو خرم کا دل چاہا لفافہ اٹھائے اور واپس لوٹ جائے مگر مجبوری تھی کہ وکی سے شرط لگی تھی۔ جسے اسے ہر حال میں جیتنا تھا اور بھرپور انداز میں کھیلنے کے لیے زیادہ وقت بھی نہیں تھا۔

مجبوراً" خرم کو لفافہ اٹھا کر کھولنا پڑا اس نے لفافے کے اندر ہاتھ ڈال کر پیسے نکالنے کی بجائے لفافہ میز پر الٹ دیا۔

پانچ ہزار کے تین نوٹ کے ساتھ ہزار کے بھی تین نوٹ میز پر آ گرے مگر ان کے ساتھ کالے رنگ کا ایک ڈبا بھی موجود تھا اور یہی لفافے کے پھولنے کا سبب بنا ہوا تھا۔

نمل جو کن انکھیوں سے لفافے کو دیکھ رہی تھی اس کالے رنگ کے خوبصورت سے کور کو دیکھ کر سوالیہ انداز میں سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

"تمہیں یاد نہیں تمہارے پرس میں گوگلز (دھوپ کا چشمہ) بھی تھے پیسے نکالنے کی جلدی میں وہ وہیں کہیں زمین پر گر گئے تھے۔

میں کیونکہ بہت جلدی میں تھا اور اس میں مجھے کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی تو میں نے اسے اٹھانے کی زحمت نہیں کی۔ لیکن اگر مجھے پتا ہوتا کہ تم کبھی دوبارہ ملو گی اور میں تمہیں پیسے لوٹاؤں گا تو میں اسے بھی اٹھا لیتا۔

"so keep that" یہ اس کے substitute کے طور پر ہے۔" خرم اتنی سنجیدگی سے بول رہا کہ نمل ایک سیکنڈ کے لیے واقعی الجھ گئی۔

آیا سچ اس کے پرس میں کوئی دھوپ کا چشمہ تھا یا نہیں۔

اس کے پاس ہر وقت اس قسم کی چیزوں کا اچھا خاصا ڈھیر لگا رہتا تھا مگر رومیلہ اور سنبل سے مختلف موقعوں پر وصول کیے گئے تحائف اور کچھ اس کی پرانی پرانی چیزوں کو بھی سنبھال سنبھال کر استعمال کرنے کی عادت کے سبب اس کے پاس ہر چیز بڑی وافر مقدار میں موجود رہتی تھی۔

اس لیے بہت حد تک ممکن تھا کہ اس وقت پرس میں کوئی دھوپ کا چشمہ موجود ہو مگر پیسے چوری ہو جانے کی فکر میں اس نے دھیان نہ دیا ہو اس کے غائب ہونے پر۔

نمل کچھ دیر پر سوچ نظروں سے چشمے کے کور کو دیکھتی رہی پھر خرم کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے مخصوص پر اعتماد لہجے میں بولی۔

"مجھے یاد نہیں آرہا کہ میرے پرس میں ایسا کوئی چشمہ تھا یا نہیں۔ اس لیے اسے رہنے دو۔" نمل نے کہنے کے ساتھ ہی پانچ ہزار کے تینوں نوٹ اٹھا لیے اور ہزار کے تین نوٹ میز پر چھوڑ دیے۔

"اتنے پیسے تو تم نے بل پے کرتے وقت دے دیے تھے۔ اس لیے ان کی بھی ضرورت نہیں۔" نمل کی بات پر فوری طور پر خرم کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا بولے۔

نمل کا کوئی چشمہ غائب نہیں ہوا تھا' نہ ہی خرم نے یہ گوگلز اس خطرے کے پیش نظر دیے تھے کہ اس کا چشمہ شاید اس کے پرس سے گر گیا ہو۔

اس نے تو اتنی جلدی میں پیسے نکالے تھے کہ اسے یاد بھی نہیں تھا کہ پرس میں پیسوں کے علاوہ اور کیا تھا۔ وہ تو بس نمل کو کوئی تحفہ دینا چاہتا تھا' مگر اچانک اتنا بے تکلف ہونا اسے عجیب لگ رہا تھا' پھر نمل سے کوئی بعید بھی نہیں تھا' وہ دو منٹ میں عزت اتار کر رکھ دے' جبکہ وہ اب مزید کوئی بد مزگی نہیں چاہتا تھا' اس لیے اس کے شرافت سے دھوپ کا چشمہ لوٹا دینے پر خرم رسانیت سے کہنے لگا۔

"اب تو میں خرید چکا ہوں' اب رکھ ہی لو' ورنہ ان لیڈیز گوگلز کا میں کیا کروں گا' میری تو کوئی بہن بھی نہیں' جسے دے دوں۔" خرم جس طرح بولا تھا نمل نا چاہتے ہوئے بھی اس کے چہرے پر کچھ کھوجنے لگی۔

اگر خرم نے بہن کی جگہ یہ کہہ دیا ہوتا کہ میری تو کوئی گرل فرینڈ بھی نہیں تو شاید نمل کو اتنی الجھن نہ ہوتی۔ مگر اب اس کا اتنی شرافت برتنا جہاں نمل کو حیران کر رہا تھا' وہیں یہ سوچنے پر مجبور بھی کر رہا تھا کہ ہو سکتا ہے ایک چشمہ لے لینے سے خرم خاموشی سے لوٹ جائے' جبکہ انکار کرنے کی صورت میں اس کی ازلی ضدی فطرت عود کر آئے گی۔

پچھلے کچھ دنوں سے' جس طرح خرم نے خاموشی اختیار کر رکھی تھی' جس کے باعث سنبل اور رومیلہ نے بھی اپنے وہم اور خدشات پس پشت ڈال دیے تھے' ان کو مد نظر رکھتے ہوئے نمل کو لگا وہ یہ چشمہ رکھ لے گی' تو خرم کے پاس بات کو طول دینے کے لیے کوئی بنیاد نہیں بچے گی۔

لیکن اس طرح ایک اجنبی سے کوئی چیز لینا اس کے اصول کے خلاف تھا' خاص طور پر یونیورسٹی کے آزاد ماحول میں' جہاں رائی کا پہاڑ بنتے دیر نہیں لگتی۔

نمل شش و پنج کا شکار ہونے کے باعث گوگلز کا کور اٹھا کر کھول کر دیکھنے لگی۔

کور کے اندر ایک نہایت بیش قیمت اور بہت ہی خوب صورت سا دھوپ کا چشمہ موجود تھا' جس کے چوڑے شیشوں پر گلابی رنگ کا فریم تھا۔

وہ فیصلہ جو نمل سے اتنی دیر سے نہیں ہو پا رہا تھا ایک پل میں ہو گیا' وہ چشمے کو واپس کور میں رکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولی۔

"میرا کوئی چشمہ اگر پرس میں سے گرا بھی ہو گا تو بھی وہ اتنا مہنگا نہیں ہو گا' اس لیے یہ تم اپنے پاس ہی رکھو۔"

خرم کو اس سے اسی جواب کی توقع تھی' وہ اپنی بے ساختہ مسکراہٹ روک نہ سکا۔

"ابھی ابھی میں نے کہا کہ ایک بار اگر میں کوئی چیز دے دوں تو واپس نہیں لیتا۔ اس لیے یہ اپنے پاس ہی رکھو اور اگر نہیں چاہیے تو پھینک دو۔" خرم کہہ کر رکا نہیں اور فوراً پلٹ کر بڑے بڑے ڈگ بھرتا لائبریری سے نکل

گیا۔
نمل سوچتی ہی رہ گئی' اسے کیا کہنا چاہیے' پھر الجھن بھری نظروں سے گوگلز کے کور کو دیکھنے لگی۔ ایک پل کے لیے اس کا دل چاہا ایسے ہی چھوڑ کر کھڑی ہو جائے' مگر یہاں چھوڑنے پر تو کوئی نہ کوئی اٹھا ہی لیتا اور خرم کو یہ لگتا کہ اس نے خرم کا دیا تحفہ اپنے پاس رکھ لیا ہے۔ اسے یہ چشمہ خرم کو واپس کرنا تھا' تاکہ اسے پتا چلے کہ وہ کسی انجان سے کوئی چیز نہیں لیتی۔

جس طرح خرم زبردستی اس کی میز پر رکھ گیا تھا' ایسے ہی وہ بھی زبردستی میز پر رکھ سکتی تھی۔
یہ سوچتے ہوئے اس نے وہ چشمہ اٹھا کر اپنے پرس میں رکھ لیا۔ مگر اسے کوفت ضرور ہو گئی تھی' اسی لیے وہ کتابیں سمیٹتی کھڑی ہو گئی کہ تبھی اس سے قدرے فاصلے پر پچھلی میز پر سے ایک لڑکا اٹھ کر اس کے نزدیک چلا آیا۔

"ایکسکیوز می' مس نمل۔" نمل چونک کر اسے دیکھنے لگی' وہ اس شخص کو پہلے بھی کئی بار یونیورسٹی میں ادھر ادھر آتا جاتا دیکھ چکی تھی' مگر وہ اس کا نام جانتا ہے' نمل کو اس بات پر حیرت ہوئی تھی۔
"جی فرمائیں۔" نمل نے حیرانی سے پوچھا۔
"یہ جو خرم حسن نے آپ کو سن گلاسز دیے ہیں' آپ یہ اسے لوٹا دیں۔" نمل کی پیشانی پر ایک دم بل پڑ گئے۔ اب یہ کون تھا جو خواہ مخواہ اس کا ہمدرد بنتا جا رہا تھا' اسے خود بھی نمل کے تاثرات سے اندازہ ہو گیا' تبھی کہنے لگا۔
"آپ کو شاید میرا انٹرفیئر کرنا برا لگا ہو' مگر میں آپ کے بھلے کے لیے ہی کہہ رہا ہوں' آپ شاید مجھے جانتی نہیں ہیں' میرا نام سمیر ہے' یونیورسٹی میں جو کچھ بھی ہو رہا ہوتا ہے' وہ عموماً میرے علم میں رہتا ہے' اس لیے مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ خرم نے آپ کو یہ گفٹ کیوں دیا ہے۔" اس نے پتا نہیں تجسس پھیلانے کی کوشش کی تھی یا نہیں' البتہ اس کا لب و لہجہ بڑا شائستہ تھا۔
نمل کو اس کا خواہ مخواہ مخاطب کرنا بالکل بھی مناسب نہیں لگا تھا۔ تبھی وہ یہ کہتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔
"مجھے بھی معلوم ہے' انہوں نے گفٹ کیوں دیا ہے' آپ بلاوجہ پریشان نہ ہوں۔"
"آپ کو نہیں پتا' خرم نے اپنے دوست وکی سے شرط لگائی ہے' آپ کے ساتھ فلرٹ کرنے کی' اگر وہ ہار گیا تو وہ اپنی نیو برانڈ گاڑی وکی کو دے دے گا۔" سمیر اسے متوجہ نہ دیکھ کر جلدی جلدی بولا' مبادا وہ سنے بغیر ہی چلی جائے۔
سمیر کی بات سن کر نمل پل بھر کے لیے واقعی ٹھٹک گئی' سمیر کو بہت سارے دوستوں میں گھرا وہ اکثر دیکھتی تھی' اس لیے اتنا اندازہ تو اسے تھا کہ اس کے واقف کار یونیورسٹی میں کافی ہوں گے' ایسے میں ایسی کسی بات کا علم ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔
اور واقعی سمیر کو اس کے دوست نے بتایا تھا کہ وکی اور حمید کینٹین میں بیٹھے بات کر رہے تھے کہ خرم یہ شرط جیت سکے گا یا نہیں اور یہ کہ انہیں وہ گاڑی ملے گی' تو کب ملے گی' وغیرہ۔ سمیر کا ارادہ ویسے تو اس معاملے میں پڑنے کا نہیں تھا۔ مگر جب اس نے لائبریری میں خرم کو نمل کی میز کے پاس آتا دیکھا تو وہ اٹھ کر ان کے قریب والی ٹیبل پر جا بیٹھا' جہاں سے وہ ان دونوں کی گفتگو با آسانی سن سکے اور ساری گفتگو سننے کے بعد اچانک اس کا دل چاہا جا کر خرم کی ساری محنت پر پانی پھیر دے۔
اسے اس بات کی قطعاً پروا نہیں تھی کہ نمل کو بے وقوف بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے یا اس سارے کھیل میں اسے تکلیف ہو گی' وغیرہ۔
اسے تو بس اس بات سے غرض تھی کہ خرم یہ بازی جیت نہ سکے' جب اس کے دوست نے اس شرط کے

متعلق بتایا تھا' تب اسے یہ نہیں پتا تھا کہ یہ نمل نامی لڑکی کون ہے' مگر اس وقت لائبریری میں خرم کو اس لڑکی سے مخاطب دیکھ کر سمیر کو بخوبی اندازہ ہو گیا کہ یہ ہی نمل ہے اور یہ دیکھ کر کہ لڑکی دیکھنے میں کافی اچھی ہے' سمیر کی کم ظرفی ایک دم پھڑک کر بیدار ہو گئی' اس کی شدید خواہش تھی کہ یہ شٹل کاک خرم کی بجائے اس کے گراؤنڈ میں آ گرے۔
نمل کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھتی رہی' پھر اپنے اسی سپاٹ انداز میں بولی۔
"اطلاع دینے کا شکریہ۔ ویسے آپ کو دوسروں کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" نمل یہ کہہ کر آگے بڑھ گئی۔
"میں دوسروں کے لیے پریشان ہونے والوں میں سے نہیں ہوں' میں تو صرف اپنے لیے پریشان ہوتا ہوں۔" سمیر نے مسکراتے ہوئے سوچا اور دور جاتی نمل کو تب تک دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"رومیلہ ذرا ادھر آنا۔" بھابھی کی آواز پر رومیلہ جو اپنا چائے کا کپ کچن میں رکھ کر واپس اپنے کمرے میں جانے کے لیے پلٹ گئی تھی بے دلی سے رک گئی۔
آج اس کے سر میں درد ہو رہا تھا' اس نے یونیورسٹی سے بھی چھٹی کر لی تھی' اس نے ناشتا بھی کچھ خاص نہیں کیا تھا' بس چائے پی تھی اور اس کے ساتھ ٹیبلٹ لے لی تھی' اس کا ارادہ فوراً" بستر پر لیٹ جانے کا تھا' لیکن اس وقت بھابھی نے روک لیا۔
وہ خود ابھی تک ڈائننگ ٹیبل پر موجود تھیں۔ ابرار بھائی اور بابا جانی آفس جانے کے لیے نکل چکے تھے۔ اسی لیے بھابھی کے انداز سے لگ رہا تھا وہ کوئی لمبی گفتگو کرنے والی ہیں۔
"جی بھابھی!" رومیلہ نے قریب آ کر بظاہر بڑے نارمل انداز میں کہا تو بھابھی ایک نظر اسے دیکھ کر اپنی چائے کی پیالی پر جھک گئیں اور سرسری انداز میں بولیں۔
"اس سنڈے کو مرزا صاحب بات پکی کرنے آ رہے ہیں' تم ذرا ڈھنگ سے تیار ہو جانا اور چاہو تو نمل اور سنبل کو بھی بلا لینا۔
نمل کے پیرنٹس کو تو بابا جانی بھی انوائیٹ کریں گے' پھر بھی تم اپنے طور پر بھی کہہ دینا۔" بھابھی جلدی جلدی کہہ کر ایک دم خاموش ہو گئیں۔
رومیلہ بے یقینی سے انہیں دیکھے گئی۔ اسے اپنی سماعتوں پر شبہ ہو رہا تھا' اسے لگ رہا تھا اس سے سننے میں کوئی غلطی ہو گئی ہے۔
بھلا یہ سب کچھ اس طرح کیسے ہو سکتا تھا۔ محض تین دن بعد سنڈے تھا اور اس گھر میں ایسا تو کوئی تھا نہیں جس کی بات پکی کرنے کے لیے مرزا صاحب تشریف لاتے' سوائے اس کے۔ لیکن اسے تو کسی نے کچھ بتانے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔ تین دن پہلے جس طرح سنبل اور نمل کو مدعو کیا جا رہا تھا' ویسے ہی اسے بلا لیا تھا۔
بھابھی خود پر جمی اس کی حیران نظروں کو محسوس کر کے سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگیں۔
"کیا ہوا' اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو' تمہیں بتایا تو تھا۔ مرزا صاحب کے بیٹے گلفام کے بارے میں۔"
"کیا بتایا تھا۔" رومیلہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا' تو پل بھر کے لیے بھابھی خاموش ہو گئیں' پھر گلا کھنکارتے ہوئے بولیں۔
"دراصل میں خود زیادہ نہیں جانتی' تو تمہیں کیا بتاؤں' تمہارے بھائی نے ذکر کیا تھا اپنے ایک کاروباری واقف

مرزا صاحب کا۔ ان کا ایک بیٹا ہے گلفام جو کینیڈا میں مقیم ہے' اس نے سی اے کیا ہے اور کسی انٹرنیشنل فرم میں ڈائریکٹر ہے۔"

بہت اچھی پوزیشن ہے' کوئی ذمہ داری وغیرہ بھی نہیں ہے' بس باپ اور بیٹا دو ہی لوگ ہیں' والد پاکستان میں ہوتے ہیں' تم وہاں اکیلی آرام سے عیش کروگی۔" بھابھی نے جب جملہ شروع کیا تھا تو رومیلہ کو لگا تھا وہ بھی اتنی ہی بے خبر ہیں' جتنی وہ خود لیکن اتنی تفصیل سننے کے بعد اس کا دل چاہا کہہ دے' جو آپ اب بتا رہی ہیں' وہ آپ پہلے بھی بتا سکتی تھیں۔

لیکن اس وقت اس شکوے سے زیادہ اہم ایک دوسرا سوال تھا' چنانچہ اس نے وہی پوچھا۔

"کیا آپ لوگ اس گلفام نامی شخص سے ملے ہیں یا صرف مرزا صاحب کے کہے پر یقین کر لیا ہے۔" بھابھی کو اس کا سوال برا چبھا تھا' تبھی ان کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

"تمہارے بابا جانی اور بھائی نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے' ابرار کے ایک دوست جو کینیڈا میں ہی رہائش پذیر ہیں وہ بذات خود جا کر گلفام سے ملے ہیں' اس کی جاب اور تعلیم کے علاوہ وہ لڑکے کے رکھ رکھاؤ سے بھی بہت متاثر ہوئے ہیں۔" بھابھی ایک دم کرسی گھسیٹ کر کھڑی ہو گئیں' چھوٹی چھوٹی باتوں پر وہ ایسے ہی بگڑ جاتی تھیں' تبھی تو اس دن یہ ساری بات بتانے کی بجائے آج ذکر کر رہی تھیں' ورنہ جس وقت انہوں نے گلفام کا تذکرہ چھیڑا تھا' تبھی بتانا چاہیے تھا' مگر اس وقت بھی وہ موڈ آف کر کے چلی گئی تھیں۔

اور اس سے پہلے کہ اس وقت بھی وہ خفا ہو کر نکل جاتیں' رومیلہ نے جلدی سے پوچھ لیا۔

"وہ صرف بات پکی کرنے آ رہے ہیں نا' تاریخ وغیرہ تو ابھی طے نہیں ہوگی نا' شادی تو میری پڑھائی ختم ہونے کے بعد ہوگی۔" بھابھی اس کی بات پر ایسے رکیں جیسے انہیں بڑا جھٹکا لگا ہو۔

"کیسی بچکانہ باتیں کر رہی ہو رومیلہ' اتنا اچھا رشتہ ہم تمہاری فضول سی پڑھائی کے ختم ہونے کے انتظار میں لٹکائے رکھیں گے کیا۔ انہیں تو تمہاری جیسی دس مل جائیں گی' لوگ تو ایسے رشتوں کی تاک میں ہوتے ہیں' ہم ان سے کہیں گے تمہاری پڑھائی ختم ہونے کے بعد شادی کریں گے تو وہ تو کہیں اور لڑکی دیکھ لیں گے۔

گلفام وہاں اکیلا ہوتا ہے' مرزا صاحب کو اس کی شادی کی بہت جلدی ہے۔" بھابھی کا تپا ہوا تعجب بھرا لہجہ رومیلہ کو ناگوار تو بہت گزرا' مگر وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی' کیونکہ ابھی اسے مزید ایک سوال کا جواب چاہیے تھا۔

"تو آپ کو کیا لگتا ہے بابا جانی شادی کی تاریخ کب تک رکھیں گے۔" "ارادہ تو جلد از جلد کا ہے اب جو خدا کو منظور۔" بھابھی صاف ٹالنے والے انداز میں کہتی آگے بڑھ گئیں۔

رومیلہ اپنی جگہ کھڑی سوچتی رہ گئی' وہ بابا جانی سے بات کرنا چاہ رہی تھی' مگر سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ ان سے کیسے بات کرے گی' آج اس وقت اسے اپنی ماں کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی' اگر آج وہ زندہ ہوتیں تو اس کے اور بابا جانی کے مابین جو ایک خلا تھا وہ نہ ہوتا۔

رومیلہ سوچ ہی رہی تھی کہ ڈائننگ روم کے دروازے پر رک کر بھابھی نہ جانے اسے تسلی دینے لگیں یا واقعی ان کا موڈ ٹھیک ہو گیا تھا' جو وہ قدرے جوش سے بولیں۔

"ویسے گلفام ہے بہت گڈ لکنگ' تم دیکھو گی تو خود پر رشک آ جائے گا۔" رومیلہ کسی گئی گزری شکل صورت کی مالک نہیں تھی' اس کا ساتھ بھی کسی دوسرے کے لیے باعث فخر ہو سکتا تھا۔ مگر بھابھی کا انداز مسلسل ایسا تھا جیسے مرزا صاحب نے اسے بہو بنانے کا فیصلہ کر کے اس پر احسان کیا ہو۔

اب یہ بھابھی کے انداز گفتگو کا اثر تھا یا کوئی اور بات تھی کہ بالکل اچانک رومیلہ کے ذہن میں ایک سوال

اٹھا۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی رشتے میں بس خوبیاں ہی خوبیاں ہوں اور کوئی خامی نہ ہو۔"

شام تک وہ اسی نکتے پر سوچتی رہی اور جب اسے یقین ہو گیا کہ اب نمل یونیورسٹی سے آ کر کھانے وغیرہ سے فارغ ہو گئی ہوگی تب اس نے نمل کو فون کر ڈالا۔

رومیلہ کی طرح نمل کو بھی سنتے ہی ایسی کوئی خاص خوشی محسوس نہیں ہوئی' بلکہ ایک عجیب سی الجھن ہوئی تھی اسے بھابھی کی گفتگو سن کر۔

وہ لوگ ایسے رومیلہ کی شادی کر رہے تھے جیسے رومیلہ کے لیے اتنا اچھا رشتہ آ جانے کی انہیں بالکل امید نہ ہو۔

لیکن نمل یہ سب رومیلہ سے کہہ کر اسے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی' اس لیے اسے تسلی دیتے ہوئے کہنے لگی۔

"اکثر لڑکیوں کی شادیاں ایسی ہوتی ہیں بالکل اچانک' کوئی ان کی مرضی بھی نہیں پوچھتا۔ تم خود کو ریلیکس رکھو۔ تعلیم اگر وقتی طور پر چھوٹ بھی جاتی ہے تو بعد میں یہ سلسلہ پورا کر لینا۔"

یہ سب کہہ کر جب نمل نے صبح یونیورسٹی میں ہوئی خرم سے گفتگو کے متعلق بتایا تو رومیلہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

"تمہیں ضرورت کیا تھی اس سے گفٹ لینے کی۔"

"گفٹ تھوڑی لیا ہے میں نے' میں تو خود اسے واپس کرنا چاہ رہی تھی' مگر وہ اچانک اتنی تیزی سے نکل گیا کہ میں کچھ کہہ ہی نہیں سکی۔" نمل قدرے شرمندگی سے بولی۔

"خیر اب لے لیا ہے تو اپنے پاس ہی رکھو' خوامخواہ اسے واپس کرنے جاؤ گی اور اسے پھر بات کرنے کا موقع مل جائے گا۔"

"پتا نہیں تم کس لڑکے کا ذکر کر رہی ہو' لیکن مجھے یقین ہے وہ جس شرط کا بھی ذکر کر رہا تھا' وہ سو فیصد درست ہوگی۔" رومیلہ سوچتے ہوئے بولی۔

"او زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں' اگر ایسی کوئی شرط خرم نے لگائی بھی ہے تو بھی وہ کبھی ایسی شرط جیت نہیں سکتا۔" نمل کوفت بھرے لہجے میں بولی' رومیلہ کی خوامخواہ کی گھبراہٹ محسوس کر کے اسے بڑی کوفت ہوئی تھی۔

"زیادہ بڑے بڑے بول بولنے کی ضرورت نہیں ہے' وہ خرم اچھا خاصا ہیرو ٹائپ لڑکا ہے' چلو اتنا تو میں تمہیں جانتی ہوں کہ تم شکل صورت سے متاثر نہیں ہوتیں' لیکن گڈ لکنگ ہونے کے علاوہ بھی اس میں کئی خوبیاں ہیں' وہ اگر فلرٹ کرنے پر اتر آیا تو کوئی اتنا ناممکن بھی نہیں ہے تمہارا اس کی باتوں میں آ جانا' بلکہ مجھے تو وہ شروع سے تم میں انٹرسٹڈ لگتا ہے۔"

"خیر اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔" نمل بری طرح چڑ گئی' رومیلہ کی بات سن کر۔

"بات تو ایسی ہی ہے' تم پہلے ہی اس کی توجہ کا مرکز تھیں' اب اس کے دوستوں نے چیلنج کر دیا ہے تو وہ اس گیم میں سر دھڑ کی بازی لگا دے گا۔"

"تو لگا دے سر دھڑ کی بازی' مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔" نمل ہٹ دھرمی سے بولی۔

"تمہیں کیوں فکر ہوگی' فکر کرنے کے لیے میں اور سنبل جو موجود ہیں۔" رومیلہ کے ناراضی سے لہجے پر خلاف توقع نمل کو ہنسی آ گئی۔

"یہ دن تمہارے فکریں پالنے کے نہیں' خواب دیکھنے کے ہیں۔"
"میں دن میں خواب دیکھنے پر یقین نہیں رکھتی اور جو تفصیلات بھابھی نے بتائی ہیں اسے سن کر تو وہ کوئی سچ مچ کا شہزادہ گلفام ہی لگ رہا ہے' ہر طرح پرفیکٹ' جس میں کوئی کمی ہی نہ ہو اور جہاں سب کچھ بہت اچھا ہو' وہاں کچھ نہ کچھ غلط ضرور ہوتا ہے۔" رومیلہ سوچتے ہوئے بولی۔
"اللہ نہ کرے۔ اچھا سوچو' تاکہ اچھا ہی ہو۔" کمل نے جھڑکتے ہوئے کہا۔ تو رومیلہ گہرا سانس کھینچ کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

الیان نے حامد کو گھیرنے کی کوشش کی' مگر حامد بتانے کی بجائے مزید سنجیدہ ہو گیا تو الیان کو زیادہ کریدنا اچھا نہیں لگا' مگر رات کو جب سب سونے کے لیے جانے لگے تو الیان نے ماموں جان اور شاہ جہاں ماموں سے رسمی سی اجازت لے لی' صبح واپس جانے کی۔
انہوں نے بھی رسمی سا روکنے کے بعد اس کا کندھا تھپکتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔
"چلو اگر تمہارا جانا اتنا ہی ضروری ہے تو ہم اصرار نہیں کریں گے' ویسے بھی ہم خود ان شاء اللہ بہت جلد تم لوگوں کی طرف آنے والے ہیں' بس ذرا یہاں ایک دو کام نبٹ جائیں' پھر مٹھائی کھانے آئیں گے۔"
"مٹھائی!" الیان ایک پل کے لیے واقعی نہیں سمجھا' جبکہ شاہ جہاں ماموں بھی مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔
"ہاں بھئی زندگی میں اس قدر بھاگ دوڑ مچ گئی ہے کہ خوشی کے موقع بھی نکلتے چلے جا رہے ہیں' ورنہ اب تک تو ہم منہ میٹھا کر بھی چکے ہوتے۔" الیان کی نظریں بے اختیار حامد کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ اس کے چہرے سے کچھ اخذ کرنا چاہتا تھا۔ مگر اسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ حامد بھی اس کے چہرے پر کچھ کھوج رہا تھا۔
وہ دونوں ایک دوسرے کو کچھ دیر دیکھتے رہے' مگر شاید دونوں ہی کے لیے ایک دوسرے کا چہرہ پڑھنا مشکل کام تھا' تبھی کچھ دیر بعد دونوں نے اپنی نظروں کا زاویہ بدل لیا۔
البتہ اگلے دن علی الصبح جب الیان جانے کے لیے اٹھا تو سیدھا حامد کے کمرے کی طرف چلا گیا۔
دستک کے جواب پر جب حامد نے دروازہ کھولا تو الیان کو دیکھ کر پہلے تو وہ یہ ہی سمجھا کہ وہ جانے سے پہلے اس سے ملنے آیا ہے' مگر الیان نے فوراً" ہی اصل موضوع پر آتے ہوئے صاف ظاہر کر دیا کہ وہ جانے سے پہلے اس سے کھل کر بات کرنے آیا ہے۔
"میرا یہاں آنے کے پیچھے ایک مقصد تھا جو پہلی ہی رات پورا بھی ہو گیا تھا' مگر اب مجھے لگ رہا ہے کہ جانے سے پہلے مجھے تم سے ایک بار ڈائریکٹ بات کر لینی چاہیے۔
اتنا تو ہم دونوں ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں کہ اس موضوع پر بات کرنے سے ہم دونوں ایک دوسرے سے بدگمان نہیں ہوں گے۔" حامد نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ محض سر اثبات میں ہلا دیا۔ اس کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ جلد از جلد الیان کی بات سننا چاہتا ہے۔
"ممی نے مجھ سے کہا تھا کہ ماموں جان بریرہ کا رشتہ لینا چاہتے ہیں تمہارے لیے' مگر گھر میں کچھ لوگ اس شادی کے لیے تیار نہیں ہیں' اسپیشلی ممانی جان۔
سچ پوچھو تو سنتے ہی مجھے بھی یہ رشتہ کچھ مناسب نہیں لگا' ایک تو میں اس بات سے مطمئن نہیں تھا کہ بریرہ گاؤں میں ایڈجسٹ ہو سکتی ہے' دوسرے یہ کہ میں تمہیں بھی ٹیپیکل جاگیردار ٹائپ سمجھ رہا تھا۔ مگر یہاں آکر اور خاص طور پر تم سے مل کر میرے سارے شک و شبہات دور ہو گئے۔
بس ایک کنفیوژن ہے جسے تم ہی دور کر سکتے ہو' کیا تم اس رشتے پر تیار ہو یا تم بھی ممانی جان کی طرف ہو۔"

الیان سوالیہ انداز میں اسے دیکھنے لگا جو بالکل جامد نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا' الیان کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ ابھر آئی۔
"میں جانتا ہوں تمہیں یہ سن کر برا لگا ہو گا کہ میں یہاں صرف تمہیں دیکھنے اور پرکھنے آیا تھا' لیکن۔"
"نہیں مجھے کیوں برا لگے گا یہ تمہاری بہن کی زندگی کا سوال ہے' تمہیں پورا حق ہے دیکھنے اور پرکھنے کا۔
مجھے تو تعجب اس بات پر ہے کہ تم نے یہ سب بتا کیوں دیا۔ میں کوئی لڑکی نہیں ہوں جس پر دباؤ ڈال کر اسے شادی کے لیے تیار کر لیا جائے۔" حامد' الیان کی بات کاٹتے ہوئے فوراً" بولا۔
"تمہیں لگتا ہے صرف لڑکیوں پر دباؤ ہوتا ہے اور لڑکوں کی شادی صرف اور صرف ان کی مرضی سے ہوتی ہے۔" الیان نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"ظاہری بات ہے لڑکوں کو کون مجبور کر سکتا ہے۔" حامد نے کاندھے اچکائے۔
"اس بحث میں اگر پڑیں گے تو ٹائم بہت ویسٹ ہو گا جو کہ فی الحال میرے پاس نہیں ہے۔ لیکن تمہارے اس سوال کا جواب ضرور دے سکتا ہوں جو تم پوچھ رہے تھے نا میں نے تمہیں بتا کیوں دیا۔
تو دراصل انجانے میں تم میرے سامنے یہ تو بول گئے کہ تم نے محبت کی ہے یہ اور بات ہے کہ تم نے مکرنے کی بہت کوشش کی' لیکن میرے دل میں تو یقین جڑ پکڑ چکا ہے کہ تم کہیں نہ کہیں انوالو ہو۔
اس لیے میں نے سوچا تم سے براہ راست پوچھ لوں' اگر تم انکار نہیں کر سکتے تو یہ کام ہم اپنے طور پر کر دیں گے۔" الیان کے کہنے پر حامد کچھ جھینپ سا گیا' تبھی الیان ہنستے ہوئے بولا۔
"تمہارا اتنا کترانا ہی مجھے شک میں مبتلا کر رہا ہے یا تو تم مجھے اس لڑکی کا نام اس لیے نہیں بتا رہے کہ میں اس لڑکی کو جانتا ہوں۔
یا تمہیں ڈر ہے کہ کہیں تمہیں بریرہ سے ہی شادی نہ کرنی پڑ جائے اور میں خوامخواہ ہمیشہ تمہاری طرف سے بدگمان رہوں۔" حامد فوری طور پر کچھ نہیں بولا' کچھ دیر بعد اس نے کہنا شروع کیا۔
"تمہارا پہلا اندازہ ٹھیک ہے' تم اس لڑکی کو جانتے ہو اور وہ کوئی اور نہیں بریرہ ہی ہے' لیکن ظاہری بات ہے یہ میں تم سے نہیں کہہ سکتا تھا' کچھ تو روایتی جاگیردارانہ سوچ کی وجہ سے۔
بہن کا نام سن کر کہیں تم اشتعال میں نہ آجاؤ۔" اپنی بات پر حامد خود بھی جھینپ کر مسکرا دیا' لیکن الیان کو مسکراتا دیکھ کر وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔
"اور دوسری بات یہ ہے کہ مجھے پتا تھا' تم یہاں کس مقصد سے آئے ہو اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اگر تم مجھے مسترد کر رہے ہو تو تمہیں میرے دل کا حال پتا چلے۔" الیان کی مسکراہٹ ایک پل میں غائب ہو گئی' وہ بڑی بے یقینی سے بولا۔
"تمہیں پتا تھا۔" حامد نے سر اثبات میں ہلایا' پھر تیزی سے بولا۔
"لیکن تم یہ بات کسی سے نہیں کہو گے' اصولی طور پر تو مجھے تمہیں بتانا نہیں چاہیے تھا' خاص طور پر ایسی صورت میں جب تم میرے حق میں فیصلہ کر چکے ہو۔
لیکن میرے ضمیر کو یہ مناسب نہیں لگ رہا' حالانکہ میں نے تمہارے سامنے کسی قسم کی کوئی اداکاری نہیں کی۔ میں بالکل ویسے ہی رہا جیسا میں ہوں۔
مگر پھر بھی ایک خلش تھی کہ تم مجھے انجان سمجھ رہے ہو' جبکہ پھوپھی جان (الیان کی والدہ شگفتہ غفار) مجھے پہلے ہی فون کر کے تمہارے یہاں آنے کی وجہ بتا چکی ہیں۔" الیان ششدر سا اسے دیکھے گیا' اسے یقین نہیں آرہا تھا ممی نے اس کے ارادوں کا پتا پہلے ہی حامد کو دے دیا۔

"اسی لیے تم فوراً" اسلام آباد سے واپس آگئے۔" بالکل بے ساختہ الیان کے منہ سے نکلا۔

"ہاں۔ پھوپھی جان نے مجھے ہوٹل فون کرکے بتایا تھا کہ تم مجھے قریب سے دیکھنا چاہتے ہو' جب انھیں پتا چلا کہ میں اسلام آباد آیا ہوا ہوں تو انھوں نے کہا' میں فوراً" واپس چلا جاؤں' ورنہ اگر ایک بار تم بددل ہوکر آگئے تو دوبارہ جانے کا ارادہ نہیں کروگے۔" الیان کے چہرے پر تناؤ پھیل گیا' وہ کچھ دیر تو لب بھینچے حامد کو دیکھتا رہا' پھر ایک ایک لفظ چباتے ہوئے بولا۔

"کیا ضرورت تھی مجھے یہ سب بتانے کی۔"

"کیونکہ چھپا کر ایسا لگ رہا تھا جیسے تمہارے ساتھ بے ایمانی کر رہا ہوں۔" حامد سادگی سے بولا' الیان کو غصہ تو بہت آرہا تھا' مگر حامد پر بگڑنے کا فائدہ نہیں تھا' جو کچھ کیا تھا اس کی اپنی ماں نے کیا تھا تو اس پر چلانے کا کیا جواز بنتا تھا۔

اسے رہ رہ کر شگفتہ غفار کی حرکت پر طیش آرہا تھا' جنھوں نے حامد کو بتا کر نا صرف الیان کا اعتماد مجروح کیا تھا' بلکہ حامد کی نظروں میں اس کی پوزیشن ہی آکورڈ کردی تھی' کیا سوچ رہا ہوگا حامد وہ رشتے داری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سیدھا اس کے گھر رہنے چلا آیا تاکہ اسے قریب سے دیکھ سکے۔

بے شک حامد زبان سے یہ ہی کہہ رہا تھا کہ اپنی بہن کی زندگی کا فیصلہ کرتے وقت اس کا ہر طرح سے اطمینان کرلینا جائز تھا۔ مگر الیان کے لیے یہ صورت حال برداشت کرنا سخت ناگوار تھا۔

اس کے چہرے پر کھنچاؤ دیکھ کر حامد رسانیت سے کہنے لگا۔

"مجھے معلوم ہے' تمہیں پھوپھی جان پر بہت غصہ آرہا ہے' لیکن الیان ان کی اتنی غلطی نہیں ہے میں انھیں بہت عزیز ہوں' انھیں ڈر تھا کہیں تم مجھے ڈیجیکٹ نہ کردو' اس لیے انھوں نے مجھے پہلے ہی انفارم کردیا' تاکہ میں تمہارے سامنے بہتر طریقے سے آؤں۔

لیکن خدا گواہ ہے میں تمہارے سامنے ہمیشہ ویسے ہی رہا جیسا میں حقیقتاً" ہوں' میں نے کچھ بھی پرتنقد کرنے کی کوشش نہیں کی۔

لیکن جب آج تم نے کہا کہ ہم ایک دوسرے کو اتنا سمجھتے ہیں کہ ایک دوسرے سے بدگمان نہیں ہوسکتے تو مجھے بھی لگا مجھے یہ سب بتا دینا چاہیے۔

ہوسکتا ہے یہ سب سننے کے بعد تم میرے ہر اس فعل کو ایک ڈرامہ سمجھ لو' جس کے باعث تم نے مجھے بریرہ کے لیے اوکے کردیا تھا' مگر مجھے معلوم ہے میں نے تمہیں امپریس کرنے کے لیے کوئی ہتھکنڈہ استعمال نہیں کیا۔

ایسا تو میں نے کبھی بریرہ کو متاثر کرنے کے لیے نہیں کیا' ورنہ وہ تو تمہاری اور پھوپھا صاحب کی اتنی لاڈلی ہے کہ اگر وہ میرا نام لے دیتی تو تم دونوں اس شادی کے لیے راضی نہ ہوتے ہوئے بھی انکار نہ کرتے۔

مگر بریرہ کو اپنی طرف متوجہ کرنے یا اس سے کچھ کہنے کی کوشش کرنے کے متعلق تک میں نے کبھی نہیں سوچا وہ میری پھوپھی کی بیٹی تھی' ہمارے خاندان کی عزت میں نہیں چاہتا تھا میرا کوئی غلط فعل اس کے لیے مسائل کھڑے کردے۔

لیکن یہ بھی سچ ہے کہ وہ مجھے بچپن سے پسند تھی اور اگر تم موقع دو تو میں یہ ثابت کرسکتا ہوں کہ میں اسے ہمیشہ خوش رکھوں گا۔" الیان کے چہرے کا تناؤ کم ہوتا چلا گیا' حامد کا ٹھنڈا مگر مستحکم لہجہ الیان کی رگوں میں خون کی گردش کو توازن پر لے آیا تھا۔

شگفتہ غفار کی حرکت سے اسے اب بھی اختلاف تھا' مگر حامد کی طرف سے اسے یقین تھا کہ اس نے اپنا اصل ہی الیان کے سامنے پیش کیا تھا اور کوئی بھی دکھاوا کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ہاں' اگر اس نے خود پر کوئی محنت کی تھی تو یہ بات بھی اس کے حق میں جاتی تھی کہ بریرہ اس کے لیے اتنی اہم تھی کہ وہ اسے حاصل کرنے کے لیے ہر کام کرنے کے لیے تیار تھا۔

حامد کچھ دیر منتظر نظروں سے اسے دیکھتا رہا' پھر اسے خاموش پاکر جانے کیا سمجھا کہ بڑی سنجیدگی سے کہنے لگا۔

"یار یہ سب پھوپھی نے تمہیں بتانے سے منع کیا تھا' مگر میں نے۔ پلیز تم ان سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کرنا۔ تم سمجھ رہے ہو نا کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔" حامد کچھ جھجکتے ہوئے بولا تو اتنی دیر سے سنجیدگی سے کھڑے الیان کے چہرے پر مسکراہٹ ابھر آئی۔

اس نے آگے بڑھ کر حامد کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"I know what do you mean بے فکر رہو' ہونے والی ساس نے ایک راز رکھنے کو کہا تھا' مگر تم نہیں رکھ سکے' لیکن میں یہ کام کرسکتا ہوں۔ فکر نہ کرو۔" حامد پہلے تو حیرانی سے اسے دیکھتا رہا' پھر خوشی کے مارے ایک دم اس کے گلے لگ گیا۔

☼ ☼ ☼

"بس کچھ دنوں کی بات ہے' پھر خرم کی وہ شان دار گاڑی میری دسترس میں ہوگی۔" وکی نے للچائے ہوئے انداز میں کہا تو حمید اسے ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"صرف تمہاری نہیں میری بھی' میں تمہارے ساتھ مل کر اتنی محنت محض اس لیے نہیں کر رہا کہ تم ڈرائیو کرتے رہو اور میں سڑک کے کنارے کھڑا تمہیں دیکھتا رہوں۔"

"ہاں ہاں بھئی تم بھی چلا لینا۔" وکی نے بےزاری سے کہا۔

"صرف چلا لینا نہیں' وہ ہم دونوں کی ہی ہوگی' ورنہ میں خرم کو بتا دوں گا کہ تم نے جان بوجھ کر خرم اور اپنے بیچ لگی شرط کا ذکر سمیر کے دوستوں کے سامنے کیا تھا' تاکہ وہ لوگ رنگ میں بھنگ ڈالنے آجائیں اور خرم شرط ہار جائے۔" حمید فوراً" بلیک میلنگ پر اتر آیا تو وکی عاجز آتے ہوئے بولا۔

"ہاں ہاں پتا ہے تم سارا بھانڈا پھوڑ دو گے اور خرم یہ سنتے ہی میرا سر پھوڑ دے گا۔ مگر تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے اس کے بعد تمہاری کھوپڑی بھی سلامت نہیں رہے گی۔

کتنی بار تو کہہ چکا ہوں' وہ گاڑی ہم دونوں کی ہوگی' کیوں بار بار دھمکائے جاتے ہو۔ یہ وقت لڑنے کا نہیں' سوچنے کا ہے۔

خرم تو کچھ بتاتا ہی نہیں' اس کے آگے کیا ارادے ہیں' ادھر سمیر کے دوستوں کا بھی پتا نہیں' انھوں نے ہماری باتیں سن کر اس پر کوئی دھیان دیا ہوگا یا نہیں۔ اگر سمیر بیچ میں نہیں آیا تو بہت ممکن ہے خرم یہ شرط جیت جائے۔"

"اگر وہ شرط جیت بھی جائے تو تم کون سا خودداری دکھاتے ہوئے یونیورسٹی چھوڑ دو گے۔

تم تو اگلے ہی دن ٹہلتے ہوئے آجاؤ گے" مجھے کوئی شرط یاد نہیں۔" حمید نے آخری جملہ نہایت بےسری آواز میں کہہ کر گویا وکی کی نقل اتاری' مگر وہ بھی سدا کا ڈھیٹ گردن اکڑاتے ہوئے بولا۔

"وہ تو ہے' میں تو ہارتے ہی مکر جاؤں گا' مگر خرم اپنی بات کا پکا ہے' وہ ضرور اپنی گاڑی کی چابیاں اگلے دن ہی دے دے گا' مگر یہ سب تب ہوگا جب ہمیں پتا ہو کہ وہ کیا کرنے والا ہے۔" وکی پرسوچ انداز میں بولا۔

"وہ ہمیں کیوں بتائے گا کہ وہ کیا کرنے والا ہے' بلکہ نادر اور ہارون بھی زیادہ کچھ نہیں جانتے' ورنہ ان دونوں سے ہی اگلوا لیتے۔" حمید نے پین کی پشت سے کان کا خلال کرتے ہوئے بوریت سے کہا۔

"کس سے کیا اگلوانے والے ہو۔" ہارون کی اچانک آواز سنائی دی تو وہ دونوں بری طرح ہڑبڑا گئے۔ جو پین حمید نے کان صاف کرنے کے لیے گھیر رکھا تھا' وہ کچھ اور بھی اندر چلا گیا تو حمید تکلیف سے چلا اٹھا۔

"کیا ہوا۔ تم ٹھیک تو ہو۔" ہارون نے اتنی بھیانک چیخ پر گھبرا کر پوچھا۔
"ہاں ہاں ٹھیک ہوں، تم کہاں سے بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو گئے۔" حمید نے کان سہلاتے ہوئے پوچھا۔
"ارے فرار ہو کر آیا ہوں' یہ خرم کے بچے نے بھی جان عذاب کر کے رکھی ہوئی ہے' تم لوگوں کو ضرورت کیا تھی یہ فضول شرط لگانے کی۔" ہارون تلخی سے بولا تو وہ دونوں ایک نظر ایک دوسرے کو دیکھ کر ہارون کے قریب کھسک آئے۔

"کیوں کیا ہوا' خیریت تو ہے نا۔" یہ اندازہ ہوتے ہی کہ ہارون کو کچھ نا کچھ پتا ہے' ان کی دلچسپی عروج کو پہنچ گئی تھی۔

"ارے خیریت کہاں ہے خرم' کرائے کے غنڈے ارینج کر رہا ہے' کل صبح جب نمل یونیورسٹی آئے گی تو وہ دونوں اسے چھیڑیں گے اور خرم صاحب فلمی ہیرو کی طرح عین موقع پر اسے بچانے پہنچ جائیں گے۔" ہارون کے چہرے پر بے زاری پھیلی ہوئی تھی' جبکہ وہ دونوں چونک کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔
"اب تم لوگ خود بتاؤ کیا نمل ایسی لڑکی ہے جو ان حرکتوں سے امپریس ہو جائے۔ خرم کا دماغ تو خراب تھا ہی نادر کا اس سے زیادہ خراب ہو رہا ہے' وہ کہہ رہا ہے' نمل کو جا کر سب بتا دیتے ہیں۔
ہم نمل کو جا کر بتائیں' تاکہ خرم کے ہاتھوں اگلے ہی دن شہید ہو جائیں۔ یار تم دونوں اپنی شرط واپس کیوں نہیں لے لیتے۔" ہارون نے التجائیہ انداز میں کہا۔
"کیا یہ خرم نے کہلوایا ہے۔" وکی نے آنکھیں گھماتے ہوئے پوچھا۔
"دماغ تو ٹھیک ہے۔" ہارون نے بگڑ کر کہا۔
"کیا وہ ایسا کچھ کہلوا سکتا ہے۔ یہ تو میں کہہ رہا ہوں' اب کل یہ خوامخواہ کی مار پیٹ ہو گی اور نمل پر اثر بھی نہیں ہو گا۔" ہارون نے بڑبڑاتے ہوئے کہا تو حمید اور وکی ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیے۔
کیونکہ یہ سارا پلان کل صبح کا تھا' چنانچہ ان دونوں کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ سمیر کو فوراً اطلاع دینی تھی' وہ ہارون کے پاس سے اٹھ کر سیدھا سمیر کے پاس پہنچ گیا' وہ حسب توقع اپنے دوستوں کے ساتھ کینٹین میں موجود تھا' ان دونوں نے پچھلی بار کی طرح ان کے قریب کی ٹیبل سنبھال لی اور خرم کا سارا پروگرام زور' زور سے ڈسکس کرنے لگے۔
پچھلی بار کے مقابلے میں اس بار وہ لوگ زیادہ متجسس لگ رہے تھے' وکی اور حمید ان کی دلچسپی محسوس کرتے ہوئے خوشی خوشی وہاں سے اٹھ گئے۔
مگر جیسے ہی وہ کینٹین سے باہر نکلے خرم کو سامنے کھڑا دیکھ کر ٹھٹک گئے۔
جس طرح وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے سکون سے کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا' وہ انہیں چونکنے پر مجبور کر گیا تھا۔ تبھی خرم سے ذرا پیچھے ہارون اور نادر کو کھڑا دیکھ کر وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔
خرم ایک ایک قدم اٹھاتا ان کے عین سامنے آ کھڑا ہوا۔ حمید کچھ خوف زدہ انداز میں وکی کے پیچھے چھپنے لگا' جبکہ وکی اندر سے پریشان ہونے کے باوجود خود کو نارمل ظاہر کرنے کی کوشش کرنے لگا۔
"اس شرط کو جیتنے کے لیے تم نے جو اوچھے ہتھکنڈے آزمائے ہیں اس کے بعد یہ چیلنج ہمارے بیچ سے ختم ہو گیا ہے۔ اب مجھے اپنی گاڑی تمہیں دینے کی ضرورت ہے نہ تمہیں یونیورسٹی چھوڑنے کی۔" خرم کی بات ابھی ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ وکی حیرانی کی اداکاری کرتے ہوئے اس کی بات کاٹ کر بولا۔
"یہ... یہ تم کیا کہہ رہے ہو یار' ہم نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔"
"کچھ نہیں کیا۔" خرم نے سوالیہ انداز میں اسی کا جملہ دہرایا' پھر ایک ایک لفظ چباتے ہوئے بولا۔
"تم لوگ اگر خود نمل کو سب بتانے جاتے تو مجھے پتا چل جاتا اور ساتھ ہی تم دونوں کی ہڈیوں کا چورا بھی نکل

جاتا' اس لیے تم نے سمیر کے دوستوں کے سامنے ساری کہانی اگل دی' تاکہ ان کے ذریعے نمل کو سب پتا چل جائے اور تم لوگ شرط بھی جیت جاؤ اور تمہارا نام بھی نہ آئے۔"
"ارے نہیں یار' تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے' ورنہ..." وکی نے کچھ کہنا شروع ہی کیا تھا کہ خرم نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔
"میں کوئی expla nation سننے کے موڈ میں نہیں ہوں' میں صرف یہ بتا رہا ہوں کہ شرط ختم ہو گئی ہے' اگر تم دونوں میرے دوست نہ ہوتے تو میں اس حرکت پر تم دونوں کا حشر بگاڑ دیتا۔" خرم نے ان دونوں کو مزید کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا اور دوسری طرف پلٹ گیا' ویسے بھی ان دونوں کے پاس کہنے کے لیے تھا ہی کیا۔
وہ جانتے تھے خرم نے یہ سب اندھیرے میں تیر چلانے والے انداز میں نہیں کہا' اسے پوری طرح پتا تھا' تبھی وہ بولا تھا۔
اور واقعی خرم نے اچھی طرح تصدیق کی تھی۔ دراصل نمل کو جب وہ لفافہ دے کر بظاہر لائبریری سے نکل گیا تھا۔ تب وہ وہاں سے گیا نہیں تھا' بلکہ لائبریری کی کھڑکی میں آ کر کھڑا ہو گیا تھا' یہ دیکھنے کے لیے کہ آیا نمل اس کا دیا تحفہ رکھتی ہے یا میز پر چھوڑ کر چل پڑتی ہے۔
اسے یہ دیکھ کر تو بڑی خوشی ہوئی کہ نمل نے گو گلز اٹھا لیے' مگر جب وہ جانے کے لیے کھڑی ہوئی تو سمیر کو اچانک اس کے قریب آتا دیکھ کر خرم کے کان کھڑے ہو گئے اور پھر جو کچھ اس نے سمیر کو کہتے سنا وہ سن کر اس کا دماغ گھوم گیا۔
جہاں اسے یہ سوچ کر غصہ آ رہا تھا کہ نمل کو اس شرط کے بارے میں پتا چل گیا' وہیں اسے وکی اور حمید کی حماقت پر تاؤ آ رہا تھا جو سمیر کے دوستوں کے سامنے یہ سب کہنے بیٹھ گئے۔
مگر تبھی اس کے ذہن میں ایک خیال سا کوندا' کہیں وکی اور حمید نے یہ سب جان بوجھ کر تو نہیں کیا' اپنے اندازوں کا ذکر اس نے ہارون اور نادر سے کیا اور پھر انہیں آزمانے کے لیے ایک فرضی پلان بنا کر ہارون کو ان دونوں کے پاس اس انداز میں بھیجا کہ انہیں یہ نہ لگے کہ وہ اپنے پلان سے انہیں آگاہ کر رہا ہے' بلکہ ایسا محسوس ہو جیسے یہ سب جوش اور غصے میں ہارون نے انہیں بتا دیا ہے۔
ہارون کے ذکر کرتے ہی وہ دونوں حسب توقع تیر کی طرح سمیر کے گروپ کے پاس پہنچ گئے اور خرم کا شک یقین میں بدل گیا۔
خرم نے تو یہ سب جھوٹ کہا تھا' لیکن سمیر اور اس کے دوست تو سچ ہی سمجھتے تھے' چنانچہ سمیر فوراً نمل کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا اور کچھ دیر بعد وہ اس کے سامنے کھڑا اسے یہ بتا چکا تھا۔
نمل کو سمیر کی یہ خوامخواہ کی ہمدردی سخت ناگوار گزر رہی تھی' اس لیے روکھے سے انداز میں۔
"بتانے کا شکریہ۔" کہہ کر آگے بڑھ گئی' اس کا ذہن رومیلہ کی وجہ سے پہلے ہی الجھا ہوا تھا' بلکہ اس وقت بھی وہ اور سنبل رومیلہ کو ہی ڈسکس کر رہے تھے' جس کے سر کا درد تو ٹھیک ہو گیا تھا' مگر طبیعت کے بوجھل پن کی وجہ سے اس نے آج بھی چھٹی کی تھی۔
"رومیلہ اندر سے ٹینس ہے' تبھی اس کی طبیعت گری گری سی ہے۔" سنبل اس کے ساتھ کلاس کی طرف جاتے ہوئے یہ ہی کہہ رہی تھی' جب سمیر پہنچ گیا' البتہ اس کے جاتے ہی جب نمل نے پھر رومیلہ کے بارے میں بات کرنی چاہی تو سنبل کا ذہن اس موضوع کی طرف نہ آ سکا' بلکہ وہ اسی راستے کو دیکھتے ہوئے بولی' جس پر ابھی ابھی سمیر گیا تھا۔
"کیا یہ وہی ہے' جس نے پہلے بھی تمہیں انفارم کیا تھا۔" نمل نے محض سر ہلا کر سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔
"یہ تو سمیر ہے نا۔"

"کون سمیر؟" نمل نے عام سے انداز میں پوچھا۔

"یہ یونیورسٹی میں خرم کا سب سے بڑا کامپیٹیٹر ہے' دونوں میں ہر وقت مقابلہ چلتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے یہ خرم کو پھنسانے کے لیے اس قسم کی باتیں کر رہا ہو۔" نمل اس کی بات پر سر جھٹک کر آگے بڑھنے لگی کہ سنبل قائل کرنے والے انداز میں بولی۔

"نہیں میں صحیح کہہ رہی ہوں یہ تو خرم کا حریف ہے' اگر یہ خرم کے بارے میں کچھ کہہ رہا ہے تو اس کی بات پر تو یقین کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ یہ خرم کو پھنسانے کے لیے یہ سب کہہ رہا ہو گا۔ تم خرم سے اس موضوع پر کوئی بات نہ ہی کرو تو بہتر ہے۔"

"کیا مطلب؟" نمل نے ٹھٹک کر سنبل کو دیکھا۔

"مطلب یہ کہ وہ جو گفٹ تم آج واپس کرنے والی تھیں' وہ اپنے پاس ہی رکھ لو' خواہ مخواہ میں بات مت بڑھاؤ۔ تم ایک بار خرم کی کمپلین کر چکی ہو' اس لیے سمیر نے تمہیں ٹارگٹ بنایا ہو گا' خرم کے خلاف کوئی سازش کرنے کے لیے۔"

"کیا بکواس کر رہی ہو' میں اس سے کوئی گفٹ لے کر کیوں رکھ لوں؟" نمل چڑ گئی۔

"اچھا مت رکھو' کل تک دیکھ لو' بلکہ میرے خیال سے تو کل چھٹی کر لو' تاکہ......"

"تاکہ خرم اپنے ارادوں کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ فضول باتیں مت کرو' اسے اگر کچھ کرنا ہو گا تو کل نہیں' پرسوں کر لے گا۔" نمل نے جرح کرتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔

"اچھا چلو چھٹی مت کرو' لیکن ایک' دو دن دیکھ لو' اگر وہ ایسی کوئی حرکت کرتا ہے تو پھر اس کا گفٹ واپس کر دینا' ورنہ اچھا تو یہی ہے کہ خاموش رہو اور بات یہیں ختم کر دو۔" سنبل کے ناصحانہ انداز پر نمل زچ ہو کر رہ گئی۔ مگر اسے مزید نصیحت کرنے کے لیے منہ کھولتا دیکھ کر ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولی۔

"اچھا اچھا ٹھیک ہے' میں ایک' دو دن دیکھ لیتی ہوں' یہ خرم کیا کرنے والا ہے' مگر میں چھٹی نہیں کروں گی' اب کلاس میں چلیں۔" نمل کے تپے ہوئے لہجے پر سنبل نے مسکرا کر سر ہلایا۔

☼ ☼ ☼

ایک' دو دن تو کیا پورے چار دن بڑی خاموشی سے گزر گئے' اس بیچ مرزا صاحب تین' چار لوگوں کے ساتھ مٹھائی کے ٹوکرے لے آئے اور بات پکی کر کے چلے گئے۔

رومیلہ کی طرف سے چند قریبی رشتے داروں کے علاوہ کوئی شریک نہ ہوا' کیونکہ کسی کو مدعو ہی نہیں کیا تھا' اصل میں شادی کی تاریخ اتنی نزدیک کی رکھی گئی تھی کہ اس وقت کسی بڑے فنکشن کی ضرورت ہی نہیں تھی' محض ایک مہینے بعد شادی ہونا طے پائی تھی۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد جب رومیلہ کو پتا چلا تو وہ خود کو روک نہ سکی اور بابا جانی کے پاس چلی آئی۔

"میری پڑھائی کا کیا ہو گا بابا جانی۔" جب انہوں نے خود سے کوئی بات ہی نہیں کی تو آخر اسے ڈھیٹ بن کر پوچھنا ہی پڑا۔

"تم کینیڈا جا کر پڑھائی کر لینا' رشتہ بہت اچھا تھا رومیلہ اور انہیں بہت جلدی ہے' ورنہ میں نے تو تین' چار مہینے کے بعد کی تاریخ چاہی تھی' آج کل تو بزنس میں بھی اتنی مصروفیت چل رہی ہے کہ شادی کی تیاریوں کے لیے وقت نکالنا مشکل ہو جائے گا۔

مگر وہ لوگ مان ہی نہیں رہے' یہ ایک مہینہ بھی بڑی مشکل سے ملا ہے' ورنہ وہ تو دو ہفتے بعد کی بات کر رہے تھے۔

اصل میں گلفام کسی کام سے پاکستان آ رہا ہے اور وہ چاہتے ہیں اسی وقت شادی کر دیں' مگر پندرہ دن میں تو ہمارے لیے ممکن ہی نہیں تھا' اگلے ہفتے ابرار کچھ دنوں کے لیے شہر سے باہر جا رہا ہے۔

آخر بڑی مشکلوں سے گلفام نے پندرہ دن سے بڑھا کر اپنا ایک مہینے بعد کا ٹرپ رکھا ہے' اس سے زیادہ ڈیلے ہو نہیں سکتا تھا۔" بابا جانی اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خوشی خوشی بتاتے گئے تو رومیلہ کے پاس جیسے کہنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں' وہ صرف انہیں دیکھ کر رہ گئی' ذہن الجھ کر رہ گیا تھا۔

"ایک ماہ بعد شادی!"

☼ ☼ ☼

"لگتا ہے ہم سے سننے میں کوئی غلطی ہو گئی۔" سمیر کے ایک دوست نے خرم کو وکی' حمید' ہارون اور نادر کے ساتھ کلاس سے نکلتا دیکھ کر دور سے ہی بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

"غلطی تو خیر نہیں ہوئی میرے خیال سے تو خرم کا ارادہ ہی بدل گیا' وہ کرائے کے غنڈے نہیں مل سکے ہوں گے۔" ایک اور دوست نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"یا ہو سکتا ہے شرط ہار گیا ہو' نمل نے لفٹ ہی نہ کرائی ہو۔"

"اگر خرم شرط ہار گیا ہوتا تو اس کی گاڑی وکی اور حمید کے پاس ہوتی۔" سمیر نے بدستور دور کھڑے خرم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

اتنے دن ہو گئے تھے اس کے پلان پر عمل نہیں ہوا تھا۔ جبکہ سمیر فوراً" نمل کو ہوشیار کر آیا تھا' اب نمل اس کے بارے میں بھلا کیا سوچ رہی ہو گی کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔

"تو پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے اس خاموشی کی۔" سمیر کے ایک دوست نے بھنویں اچکاتے ہوئے سمیر کو دیکھا تو سمیر اسے بغور دیکھتے ہوئے یقین سے بولا۔

"خرم کو پتا چل گیا ہے کہ ہمیں سب خبر ہو گئی ہے' بلکہ شاید وہ یہ بھی جان گیا ہے کہ میں نے نمل کو سب بتا دیا ہے۔"

"تو پھر تو وہ کوئی اور پلان بنا رہا ہو گا یا پھر شاید اسی لیے خاموش ہو کر بیٹھ گیا ہے کہ تھوڑا وقت گزر جائے' پھر کوئی چال چلے۔"

"اب کچھ بھی ہو' ہم سمیر وغیرہ نمل کی نظر میں جھوٹے بن ہی گئے۔" اس کے ایک دوست نے مسکراتے ہوئے چڑانے والے انداز میں کہا تو سارے ہی دوست مسکرانے لگے۔

"اگر یہ جھوٹ بھی تھا تو اسے سچ کیا جا سکتا ہے۔" سمیر نے باری باری ان سب کو دیکھا۔

"کیا مطلب؟" وہ یک زبان بولے۔

"ان کا ارادہ غنڈے بھیج کر نمل کو تنگ کرنے کا تھا نا۔ تو یہ کام ہم کر دیتے ہیں۔" سمیر نے اطمینان سے کہا۔

"تو کیا ہیرو بن کر تم پہنچو گے۔" اس کے ایک دوست نے تعجب سے پوچھا۔

"ارے نہیں یار۔ اس طرح تو وہ سمجھے گی میں ہی اس پر لائن مار رہا ہوں۔"

"پہنچے گا تو خرم ہی' لیکن نمل کی نظر میں ہیرو نہیں بن سکے گا' کیونکہ اسے یقین ہو جائے گا کہ خرم یہ سب شرط جیتنے کے لیے کر رہا ہے۔" سمیر کے چہرے پر بدمعاشی سے بھرپور مسکراہٹ ابھر آئی۔

وہ تصور کی آنکھ سے وہ منظر دیکھ رہا تھا' نمل' خرم کی توقع کے مطابق مسکرا کر اس کا شکریہ ادا کرنے کی بجائے چلا کر اسے ذلیل کرے گی۔

(باقی ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼

عائشہ نصیر احمد

خضر ہمیشہ سے اپنے تاثرات کا اظہار بھرپور انداز میں کرنے کا عادی تھا اور اس وقت بھی میری بات سن کر وہ حیرت سے چیخ اٹھا تھا۔ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے اذان کی طرف دیکھا۔ اس کی کیفیت بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی لیکن بھوری آنکھوں میں کافی تحیر ابھر آیا تھا۔

"تم لوگ اتنے حیران کس بات پر ہو رہے ہو؟"

ان کی حیرت سے محظوظ ہوتے ہوئے میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔

"اس بات پر قطعی نہیں۔ جس کا ابھی کچھ دیر پہلے تم نے انکشاف کیا ہے۔" اذان نے جلد ہی خود کو کمپوز کر لیا۔

"مجھے تو تم پر تعجب ہو رہا ہے کہ تم ایک مرد ہو اور تمہیں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے۔ پھر تم اتنی فکر کیوں کر رہے ہو۔"

"کون کر رہا ہے فکر یار۔ کس کمبخت کو فرق پڑتا ہے یہاں۔" اس نے مجھے خاصا جوش دلا دیا۔

"لیکن مسئلہ میرا نہیں ہے۔ مسئلہ میرے گھر والے ہیں۔ بلکہ تم انہیں بھی چھوڑو سب سے بڑھ کر شہوار۔۔۔ میں اس سے یہ کیسے کہوں۔ وہ مجھے کیا سمجھتی ہے اور میں۔۔۔ میں اپنے دل میں اس کے لیے کیا کیا جذبات چھپائے بیٹھا ہوں۔" میرے لہجے میں شاید بے بسی کے ساتھ ساتھ یاسیت بھی گھل گئی تھی۔ خضر نے تسلی آمیز انداز میں میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھو تیمور! تم نے بنا بات کا ٹینشن اپنے سر لے رکھا ہے۔ عمروں کا تفاوت کوئی معنی نہیں رکھتا اور خصوصاً جب بات خاندان ہی میں رشتے کی ہو تم ایک بار اپنی امی سے بات تو کرو۔ ضروری تو نہیں کہ وہ ویسا ہی ری ایکٹ کریں جیسا کہ تم سوچ سوچ کے ڈر رہے ہو۔ اور ویسے بھی جب مرد خود سے پندرہ بیس سال چھوٹی لڑکی سے شادی کر سکتا ہے تو پانچ چھ سال بڑی لڑکی سے شادی کرنے میں کیا حرج ہے۔ لڑکیاں تو ہوتی بھی نازک اندام چھوٹی موٹی سی ہیں۔" خضر کی اس بات پر میرے تخیل کے پردے پر شہوار کی خوبصورت شبیہ لہرائی۔ اس کا بوٹا سا قد "نازک سا سراپا" ایک عجب سا نکھار تھا اس کی شخصیت میں کلیوں کی سی ترو تازگی اور دلکشی کا پیکر، میں نے بے اختیار آنکھیں بند کر لیں۔ حالانکہ اسے محسوس کرنے کے لیے مجھے کبھی بھی آنکھیں بند کرنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی کبھی کبھی تو یوں بھی ہوتا تھا کہ کھلی آنکھوں کے سامنے ارد گرد کے سارے مناظر دھندلا جاتے تھے۔ روشن ہوتا تو صرف اس ایک دشمن جاں کا چہرہ۔

"مجھے تو لگتا ہے کہ خود تیمور کو ہی عمروں کے اس فرق کا سب سے زیادہ احساس ہے ورنہ پھر دوسروں کے کچھ کہنے سننے سے پہلے ہی اس کا اتنا گھبرانا اور جھجکنا کیا معنی رکھتا ہے۔" اذان کی آواز مجھے اس کے تصور سے باہر کھینچ لائی۔

"میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں اذان۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر اسے دیکھا۔

"میں اس سے قطعی خائف نہیں ہوں کہ شہوار سے شادی کرنے کی میری اس خواہش پر میرے گھر والے کیا ردعمل ظاہر کریں گے۔ میری ذہنی الجھن شہوار ہے اس وقت اس کا رویہ میرے ساتھ کافی شفقت لیے ہوئے ہوتا ہے ہمیشہ سے۔۔۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ہر پل مجھے یہ جتانے میں کوشاں رہتی ہے کہ میں اس سے چھوٹا ہوں میری پڑھائی کے بارے میں معلومات رکھنا۔ مجھے گائیڈ کرنا، میری لاپروا ہوں "آوارہ گردیوں پر مجھے ڈانٹنا" گھر لیٹ آنے پر تفتیش کرنا۔" میں کافی گھبیرتا سے انہیں اپنا مسئلہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا اذان تو سنجیدگی سے سن رہا تھا لیکن خضر نے میرے آخری جملے پر بے اختیار قہقہہ لگایا۔

"کم آن یار! یہ تو خالص بیویوں والی ادا ہے۔" میں نے اسے گھور کر دیکھا۔

"اس کا رویہ میرے ساتھ بالکل ایسا ہوتا ہے جیسے وہ اپنے چھوٹے بھائی آزر کو ٹریٹ کرتی ہے۔" فائنلی میں نے ان کے ذہنوں میں اپنا نکتہ بٹھانے کی کوشش

کی۔

"تیمور یہ اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم اپنے کسی کزن سے بہت زیادہ اٹیچ ہو جاتے ہیں۔ اسے بھائی ماننے لگتے ہیں۔ لڑکی ہو تو بہن سمجھ بیٹھتے ہیں لیکن اس سے حقیقت بدل تو نہیں جاتی۔ اگر شہوار تمہیں اپنے چھوٹے بھائی کی طرح ٹریٹ کرتی ہے تو اس سے تم اس کے چھوٹے بھائی نہیں بن جاتے۔ تم اس کے کزن ہو اور کزن ہی رہو گے تم اس سے اپنے دل کی بات کہہ دو۔ وہ کیا سوچے گی۔ کیا سمجھے گی۔ ان اندیشوں میں مت پڑو۔ اپنی محبت پانے کے لیے تمہیں اتنی ہمت تو دکھانی ہی ہو گی۔" اذان کا لہجہ خلوص سے بھرپور تھا۔ میں دل ہی دل میں ممنون ہوا۔ اپنے ان دوستوں سے مل کر میری آدھی پریشانی تو ویسے ہی ہوا ہو جاتی تھی۔

"کبھی کبھی میں سوچتا ہوں۔ کیا تھا اگر میں دس سال پہلے پیدا ہوا ہوتا۔" میں نے پہلی بار ان کے سامنے اپنی اس حسرت کا اظہار کیا جواب مستقلاً ہی دل کا ایک کونا پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔

"کیا بات کرتے ہو دس سال پہلے۔" خضر کی آنکھوں میں شرارتی چمک ابھر آئی۔

"پھر تو اب تم صرف دس سال کے ہوتے اور وہ تمہیں گودوں کھلا چکی ہوتی پھر تو کوئی چانس ہی نہیں تھا میرے بھائی۔" اس کی اس بات پر تو اذان بھی ہنس پڑا۔ میں خجل ہو گیا۔

"پہلے پوری بات تو سن لیا کرو ذلیل انسان' میرے کہنے کا مطلب تھا کہ میں اس کے اس دنیا میں آنے سے دس سال پہلے پیدا ہوا ہوتا تو اب اس کے سامنے اپنا مدعا بیان کرنے میں اتنی مشکل تو نہ ہوتی۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے شہوار مجھ سے پانچ سال نہیں پانچ ہزار سال کے فاصلے پر ہو اور جب میں اپنے اور اس کے درمیان حائل اس پہاڑ کے سے فاصلے کو پاٹنے کا سوچتا بھی ہوں تو نا امیدی اور مایوسی اس کے حصول کے سارے ارادے بھلا دیتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح اپنی زندگی میں یہ پانچ سال ایڈ کر لوں۔"

یہاں آ کر میں واقعی خود کو انتہائی بے بس پانے لگتا تھا۔ کیا تھا اگر اللہ تعالیٰ مجھے اس کے ساتھ ہی اس دنیا میں بھیج دیتے کوئی ٹین ایجر تو میں اب بھی نہیں تھا۔ این ای ڈی یونیورسٹی میں میرا فائنل ایئر بھی اب ختم ہونے کو ہی تھا اور میرے ٹیچرز' میرے دوست اور میرے خاندان والوں کی نظروں میں علی تیمور ایک سنجیدہ' ذمہ دار اور انتہائی سلجھا ہوا انسان تھا لیکن شہوار جو کہ میری پھپھی زاد تھی مجھے ایک فرسٹ ایئر فول سے زیادہ اہمیت دینے پر تیار ہی نہیں تھی۔

"چھوڑو نا یار۔ پانچ سال انتظار کر لو۔ اس کے بعد اس تک حال دل پہنچا دینا۔ شاید کوئی فائدہ ہو جائے۔" خضر نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔

"کاش! تمہارے ان اوٹ پٹانگ کے مشوروں میں واقعی کوئی حقیقت ہوتی۔" میں ایک پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"کہاں؟" سوال تو دونوں کی آنکھوں میں تھا' پوچھنے کی زحمت صرف خضر نے کی۔

"رات کے نو بجے میں یہاں سے اٹھ کر اور کہاں جا سکتا ہوں۔" میں نے الٹا اسی سے پوچھ لیا۔ اس وقت میں ان دونوں کے مشترکہ فلیٹ میں موجود تھا۔

"ارے رک جاؤ نا کچھ دیر اور۔" خضر نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ذرا لیٹ جاؤ گے تو سب کی پوچھ گچھ کا سامنا بھی کر لو گے۔ اس کے سوالوں کے جواب دیتے ہوئے ذہن میں کافی اچھے' خوشنما خیالات بھی آئیں گے اور ان ہی سہانی سوچوں کے ساتھ بستر پر جاؤ گے تو پوری رات سنہری روپہلے سپنے دیکھتے ہوئے گزرے گی... اور ہماری دعاؤں کی بدولت اگر تمہارا کوئی سپنا سچ ہو گیا تو..." معنی خیز انداز میں کہتے خضر نے بات ادھوری چھوڑ دی اذان ہنسنے لگا تھا۔

"تو پھر یہ ساری زندگی ہمیں دعائیں دے گا۔"

"وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن دیر سے گھر جانے پر صرف وہی نہیں ابا جی بھی میری کلاس لیتے ہیں اور کسی تھانیدار سے سخت ان کی تفتیش میں پڑ کر سہانے

سپنے تو رہے ایک طرف میری رات کی نیند بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔" میں نے ان کی معلومات میں اضافہ کیا اور اذان کی طرف الوداعی مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ وہ میرا ہاتھ تھامتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"چلو یار! دادی کہتی ہیں گھر آئے مہمان کو اس کی گاڑی تک تو ضرور ہی چھوڑنا چاہیے۔"

"اور اگر اس کے پاس گاڑی ہی نہ ہو تو۔" خضر نے اعتراض کیا۔

"تو اسے بس اسٹاپ تک چھوڑ دینا چاہیے۔" میں بھی بول اٹھا۔

"اور پھر اس کے بس میں بیٹھنے اور بس کے روانہ ہونے تک وہیں کھڑے رہ کر اس کے واپس نہ آنے کا یقین بھی کر لینا چاہیے۔" خضر کی زبان رکنے والی نہیں تھی۔ میں اذان کے ساتھ باہر نکل آیا۔ پھر جب میں گاڑی میں بیٹھ رہا تھا تب اذان نے ایک بار پھر مجھے سمجھایا تھا۔

"دیکھو تیمور! اگر تمہارے دل میں واقعی شہوار کے لیے فیلنگز اتنی اسٹرونگ ہیں تو بنا ڈرے اس سے اپنی محبت کا اظہار کر دو اگر وہ ناراض ہو' خفگی جتائے تو تمہیں شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے یہ دل کے معاملے ہیں۔ اور ایسی چھوٹی موٹی باتوں میں پڑ کر اپنی زندگی کو پچھتاووں اور محرومیوں کے حوالے کر دینا عقلمندی نہیں ہے۔ ایک بار اس سے بات ضرور کرنا ٹھیک ہے' چاہے وہ جو بھی کہے۔" جاتے جاتے اس نے مجھ سے یہ وعدہ لے لیا تھا اور میں نے کر بھی لیا تھا۔ میں جانتا تھا انہیں مجھ سے زیادہ میری فکر تھی۔ خضر اور اذان آپس میں کزن بھی تھے اور بہت گہرے دوست بھی۔ فی الحال پڑھائی کے سلسلے میں یہاں مقیم تھے۔ میری دوستی ان کے ساتھ یونیورسٹی میں آ کر ہوئی تھی یعنی کچھ عرصہ پہلے ہی۔ اس کے باوجود میں انہیں اور یہ مجھے بہت اچھی طرح جاننے لگے تھے۔

درحقیقت ان سے ملنے کے بعد ہی مجھے دوستی کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ ہوا تھا۔ اور ساتھ ہی یہ احساس بھی کہ اگر دنیا میں دوستی کا رشتہ نہ ہوتا تو اس دنیا کا کیا ہوتا۔ بالکل ایسے ہی جیسے میں در شہوار کے دام الفت میں گرفتار ہونے کے بعد یہ سوچتا تھا کہ اگر دنیا میں محبت کا جذبہ نہ ہوتا تو ہم انسانوں کا کیا ہوتا۔

☼ ☼ ☼

میں گھر میں داخل ہوا تو ٹی وی لاؤنج سے آتی فروا کی آواز مجھے وہیں کھینچ لائی۔ جو کسی فلم کے بارے میں اظہار خیال کر رہی تھی۔

"لوگ بھی نجانے کیسی کیسی فلمیں دیکھ لیتے ہیں۔ اور مجھے یقین ہے کسی زمانے میں یہ فلم بھی لوگوں نے بڑے ذوق و شوق سے دیکھی ہو گی حالانکہ اس فلم میں ہے ہی کیا۔ دیکھنے کے لائق' بس نہیں چل رہا کہیں سے مجھے یہ ڈائریکٹر ملے اور میں اس کی گردن مروڑ دوں۔" فروا کچھ زیادہ ہی تپی بیٹھی تھی۔ یقیناً" اس کا کوئی ڈرامہ مس ہو گیا تھا۔ امی کلاسک موویز دیکھنے کی شوقین تھیں جو کہ ظاہر ہے انہی کے زمانے کی ہوتی تھیں اور لگتا تھا آج بھی ان کی پسند پر کوئی پرانی فلم دیکھی جا رہی تھی۔

"ہاں واقعی اس فلم میں ہے ہی کیا دیکھنے کے لائق... نہ تو اپنے حسن کے جلوے دکھاتی کوئی خوبصورت ہیروئن ہے اور نہ ہی اپنے مسلز کی نمائش کرتا' ٹھمکے لگاتا کوئی ادھیڑ عمر ہیرو... تمہیں تو یہ فلم بکواس لگے گی ہی۔"

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ آذر کی طرف سے کوئی جواب کیوں نہیں آیا اور اتنے میں ہی آذر بول اٹھا۔ فروا اور آذر ہم عمر تھے اس لیے ہر وقت ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔

"السلام علیکم۔" میں مزید انتظار کیے بغیر اندر داخل ہوا تھا۔ وہ تینوں ہی چونک گئے آذر نے تو خاصی بلند آواز میں سلام کا جواب دیا۔ میرا خیال تھا شہوار مجھے دیکھ کر کوئی نہ کوئی کمنٹ ضرور پاس کرے گی۔ لیکن وہ ایک نظر مجھ پر ڈال کر پھر سے ٹی وی دیکھنے لگی۔ مجھے عجیب سا احساس ہوا تھا۔

"کیا چل رہا ہے؟" میں نے فروا کے ساتھ ہی بیٹھتے

ہوئے پوچھا۔

"ہماری جانوں پر رحم۔" اس نے انتہائی لاچاری کے تاثرات چہرے پر سجا کر ٹی وی کی جانب اشارہ کیا۔ جہاں ایک بلیک اینڈ وائٹ فلم چل رہی تھی مجھے واقعی فروا پر ترس آنے لگا۔ اسے کہاں اچھا لگتا تھا یہ سب۔

"امی کہاں ہیں اور پھپھو؟" میں نے نظریں ادھر ادھر دوڑاتے ہوئے پوچھا۔ امی اس وقت وہاں نہیں اسی لیے تو فروا اتنی آسانی سے اس فلم کے بخیے ادھیڑ رہی تھی۔

"پھپھو تو دوا لے کر سو رہی ہیں اور امی چائے بنانے اٹھ گئی ہیں۔" فروا مجھے جواب دے کر آذر کی جانب متوجہ ہوئی۔

"آذر! ذرا ریموٹ تو دینا۔ جب تک امی نہیں آجاتیں۔ میں اپنے ڈرامے کا ایک سین ہی دیکھ لوں۔"

"سوری۔ یہ فلم میں بھی دیکھ رہا ہوں۔" آذر نے ایک ٹکا سا جواب دیا۔ شاید یہ صرف فروا کو چڑانے کی کوشش تھی ورنہ اس کی تمام تر توجہ تو ہاتھ میں پکڑے اپنے سیل فون پر تھی۔ میں خاموشی سے شہوار کو دیکھ رہا تھا۔ جو آج بہت گم سم بہت چپ چپ سی تھی۔ ورنہ جب بھی اس طرح سب مل بیٹھ کے کوئی ڈرامہ یا مووی دیکھتے تھے تو نہ تو اس کی باتیں ختم ہونے میں آتی تھیں اور نہ ہی اس کے تبصرے۔ مگر اب سینے پر ہاتھ باندھے اضطراری انداز میں اپنا بازو سہلاتے اس کی نظریں تو ٹی وی پر تھیں لیکن اس کے چہرے سے صاف پتا چل رہا تھا کہ اس کا ذہن کہیں اور بھٹک رہا ہے۔

"ارے تیمور! تم آگئے بیٹا۔" اس وقت امی اندر داخل ہوئیں۔

"ابھی تمہارے ابا جی تمہارے ہی بارے میں پوچھ رہے تھے۔" ان کی اس بات نے مجھے ٹھٹکا دیا۔

"میرے بارے میں۔"

"ہاں! اب ذرا وقت پر آ ہی گئے ہو تو جا کر ان کی بات سن لو۔ کچھ کہنا چاہ رہے ہیں تم سے۔" انہوں نے بتایا۔ میں کچھ پریشان سا ہو گیا آج تو خیر مجھے اتنی دیر نہیں ہوئی تھی کہ ان کی طرف سے گرج چمک کا امکان ہوتا۔ لیکن پھر بھی مجھے الجھن ہو رہی تھی کہ وہ مجھے کس لیے بلا رہے ہیں۔ کچھ فکر اس لیے بھی تھی کہ ابا جی تھے بھی بہت غصیلے اور سخت مزاج' میری تو چھوٹی سے چھوٹی غلطی بھی ان کی پکڑ میں آئے بغیر نہیں رہتی تھی۔ اس لیے میں اپنی کسی انجانی غلطی کو سوچتا۔ دل مضبوط کرتے ہوئے ان کے کمرے میں چلا آیا۔

ابا جی بیڈ پر نیم دراز کوئی میگزین پڑھ رہے تھے۔ میری آمد نے انہیں کچھ زیادہ نہیں چونکایا۔ بس انہوں نے میگزین ایک طرف رکھا اور اپنی عینک سائیڈ ٹیبل پر۔

"آؤ... آؤ صاحبزادے! چاند اور تاروں کی ڈیوٹی تو ابھی ختم نہیں ہوئی تمہیں یہ سر شام گھر آنے کا خیال کیسے آگیا۔" انہوں نے مجھے دیکھتے ہی اپنے مخصوص ڈھنگ لہجے میں یہ بات کی۔ مجھے ان سے اپنے ایسے ہی استقبال کی توقع تھی سو بنا کوئی ری ایکشن دیے ان کے پیروں کے پاس بیٹھ گیا۔

"آپ نے بلایا تھا ابا جی!"

"ہاں! ایک مشورہ کرنا تھا تم سے۔"

"مشورہ اور مجھ سے۔" میں چاہ کر بھی اپنی حیرت نہ چھپا سکا۔ انہوں نے میری کیفیت محسوس کرلی تھی اس لیے ایک مبہم سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر در آئی۔

"زیادہ حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ سیانے کہہ گئے ہیں۔ اگر مشورے کے لیے اگر کوئی ذی ہوش انسان دستیاب نہ ہو تو کسی دیوار سے بھی مشورہ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ تم تو پھر خاصی سمجھ بوجھ رکھنے والے انسان ہو۔"

کچھ دیر پہلے اہمیت ملے جانے پر جو خوشی مجھے ہوئی تھی ان کی اس بات پر شرمندگی میں بدل گئی۔ جبکہ وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"تمہیں تو معلوم ہی ہوگا کہ پچھلے دنوں شہوار کے لیے ایک رشتہ آیا تھا۔ کافی اچھے لوگ تھے بات چل نکلی تھی لیکن پھر جیسا کہ اس سے پہلے ہوتا آیا ہے۔ ان کے کانوں میں بھی کسی نے یہ بات پھونک دی کہ شہوار کی پہلے ہی ایک منگنی ٹوٹ چکی ہے۔ نتیجتاً" وہ لوگ بھی بات ختم کر گئے لیکن اس سے پہلے انہوں نے جو شکوک و شبہات ظاہر کیے۔ جو پوچھا کرید تا کیا وہ کسی بھی طرح معقولیت کے زمرے میں نہیں آتا۔"

ابا جی کے متاسف لہجے پر میرے تصور میں شہوار کا بجھا بجھا چہرہ آگیا۔ تو یہ تھی شہوار کی اداسی کی وجہ شاید اب وہ بھی اپنا ضبط کھوتی جا رہی تھی۔

"اس لیے میں نے سوچا ہے۔ اب یہ سلسلہ ختم ہو جانا چاہیے۔ شہوار بہت صبر والی بچی ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اس کے صبر کا اس طرح امتحان لیا جائے۔ لڑکیاں بہت حساس ہوتی ہیں اپنی عزت نفس پر پڑنے والی معمولی سی ضرب بھی ان کی پوری زندگی کے لیے ایک کسک بن جاتی ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ آئے دن ان کو تاہ نظر اور تنگ ذہن لوگوں کا اسے کٹہرے میں لا کھڑا کرنا اور عجیب عجیب طرح کے سوالات کرنا۔ اسے کس ذہنی اذیت سے دوچار کرتے ہوں گے۔" ابا جی کافی رنجیدہ تھے اور انہیں ہونا بھی چاہیے تھا کیونکہ اپنی اس بھانجی کو تو وہ اپنی بیٹی سے بھی زیادہ پیار کرتے تھے ان تمام باتوں میں خوشی کا کوئی پہلو نہیں تھا لیکن ابا جی کی طرح مجھے کوئی افسوس بھی نہیں تھا' تھی تو خود غرضی مگر شہوار کے رشتہ ختم ہو جانے کی خبر سے اطمینان کی ایک لہر میرے دل کو سنبھالا دے گئی تھی۔

"ناصر خود تو اس دنیا سے چلا گیا لیکن اپنے بھائی کی محبت میں در شہوار کی زندگی کا جو غلط فیصلہ اس نے کیا... اس کا خمیازہ آج شہوار بھگت رہی ہے۔" ابا جی اب شہوار کے مرحوم بابا کو یاد کرنے لگے تھے۔ جنہوں نے اپنے بھائی کے نکھٹو بیٹے سے شہوار کی منگنی کروائی تھی اور جو دو مہینے بھی نہیں چل پائی تھی۔

"خیر یہ تو اس دنیا کا دستور ہے کہ آنا کوئی اور ہے اور بھرنا کوئی اور ہے اب جس بات کے لیے میں نے تمہیں یہاں بلایا ہے وہ یہ ہے کہ میرا ایک دوست اپنے بیٹے کے لیے شہوار کا رشتہ چاہ رہا ہے۔" انہوں نے اپنی اس لمبی تمہید کا اختتام کرتے ہوئے اصل بات بھی بتا ہی دی۔ اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے دل سے چین' اطمینان اور سکون کے سارے سہارے ایک ایک کر کے چھوٹتے جا رہے ہوں۔

"بہت ہی ہونہار اور قابل نوجوان ہے احمر... تم تو مل ہی چکے ہو گے اس سے برسر روزگار ہے۔ اچھا خاصا کماتا ہے۔ میں انہیں اس منگنی کا بھی بتا چکا ہوں لیکن انہیں ماضی کی اس دبی ہوئی راکھ میں کوئی دلچسپی نہیں... جسے آئے دن کوئی نہ کوئی کریدنے چلا آتا ہے۔ تم بتاؤ... تمہاری کیا رائے ہے؟" وہ میری رائے پوچھ رہے تھے۔ میں کیا جواب دیتا... مجھے کیا کہنا چاہیے تھا۔ وحشت و اضطراب نے مجھے کچھ اس طرح اپنے گھیرے میں لیا کہ میں بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ابا جی تعجب بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے لیکن میں اس وقت اپنے آپ میں کہاں تھا۔ میرے ذہن و دل میں جنگ سی چھڑ گئی تھی۔

اذان نے مجھے پہلے شہوار سے بات کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ لیکن میں یہ کیسے کرتا۔ یہاں تو ابا جی یہ رشتہ فائنل کیے بیٹھے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کیا کروں۔ کبھی کبھی زندگی میں ایک لمحہ ایسا بھی آتا ہے جب آپ کے پاس سب کچھ پالینے یا پھر سب کچھ کھو دینے کا اختیار ہوتا ہے اور مجھے لگ رہا تھا کہ میں اپنی زندگی کا وہی لمحہ جی رہا ہوں یا تو مجھے احمر کے اس رشتے کو پرفیکٹ قرار دے کر ان کی ہاں میں ہاں ملانی تھی اور عمر بھر کی نارسائی اور ہجر کا عذاب اپنے سر لینا تھا یا پھر ان کو اپنے دل کی بات بتا کر انہیں اپنی محبت اور خوشی کے لیے رضامند کرنا تھا نجانے کیوں مجھے اس بات کا یقین سا تھا کہ ابا جی میرے جذبات سمجھیں گے اور تب ہی میں نے ان کے قدموں کے پاس بیٹھ کر ان کے ہاتھ تھام کر کہا۔

"ابا جی مجھے اس رشتے کے بارے میں کچھ نہیں کہنا کیونکہ... کیونکہ میں خود شہوار سے شادی کرنا چاہتا

ہوں۔"

ہاں۔ میں نے یہ جملہ کہہ دیا تھا۔ انتہائی آسانی سے اور اس پل یہ بات کہتے ہوئے میرا دل اتنا شانت تھا جیسے اباجی کے جواب کے انتظار میں دھڑکنا بھول گیا ہو۔ ٹھہر سا گیا ہو۔ جبکہ ان کی آنکھوں میں بے تحاشا حیرت اور بے یقینی تھی۔ وہ دیکھ تو میری طرف رہے تھے لیکن مجھے اندازہ تھا کہ ان کے ذہن میں اس وقت اور ہی سوچیں گردش کرنے لگی تھیں۔

☆ ☆ ☆

آج میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی میں یونیورسٹی سے جلد ہی گھر آ گیا تھا۔ کسی کام میں دل لگ رہا تھا نہ ہی کسی کا سامنا کرنے کا جی چاہ رہا تھا اسی لیے گھر آتے ہی میں سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا۔ لیکن میں نہیں جانتا تھا اس نے میری یہ کیفیت بھانپ لی تھی۔ اور اب وہ میرے بیڈ کے پاس ہی کھڑی تشویش بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"کیا ہوا تیمور! تم ٹھیک تو ہو نا۔"

میں بیڈ پر اوندھا لیٹا ہوا تھا اس کی میٹھی مہین آواز اور اس سے چھلکتی اپنے لیے فکرمندی محسوس کر کے دل چاہا۔ ہمیشہ کے لیے بیمار پڑ جاؤں۔

"ہوں میں ٹھیک ہوں۔" کروٹ بدل کے میں نے اسے دیکھا۔ نیلے رنگ کے لباس میں اپنے سیاہ بالوں کی ڈھلی سی چوٹی بنائے وہ پریشان سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی نجانے ایسی کیا بات تھی کہ اس کی مہربان سی ہستی کو دیکھ کر دل اپنے سارے دکھ درد بھول جاتا تھا۔ اس کی حلاوت آمیز باتیں اس کی ایک توجہ بھری نظر ہی بے چینی اور بے قراری کے معنی بھلا دیتی تھی۔

"مجھے لگ رہا ہے تیمور۔ تمہاری طبیعت زیادہ خراب ہے۔" پتا نہیں یہ میرا وہم تھا یا پھر واقعی وہ میری نظروں کے ارتکاز سے پزل سی ہو گئی تھی۔

"کھانا لاؤں یا پھر پینے کے لیے کچھ جوس وغیرہ۔"

"نہیں کچھ نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اسے شاید میری بات کا یقین نہیں آیا تھا اور اس نے اس کا اظہار بھی کر دیا۔

"لگتا تو نہیں ہے کہ تم ٹھیک ہو۔ خیر جب کہہ رہے ہو تو مان لیتی ہوں... کچھ چاہیے ہو تو بتا دینا۔" دھیرے سے کہتی وہ جانے کے لیے مڑی تھی اور اسی لمحے ہوا سے لہراتا اس کا نیلا آنچل میرے چہرے سے آ ٹکرایا۔ اس کے وجود کی خوشبو سمیٹے میں نے پوری شدت سے اس پل کو محسوس کرنے کی کوشش کی اور بلاارادہ ہی اپنی انگلیوں میں اس کا ایک کونا تھام لیا۔ وہ رکی اور پلٹ کر اس طرف دیکھنے لگی۔ میرے ہاتھ میں دبا اپنا آنچل دیکھ کر اس کی خوبصورت آنکھوں میں کافی حیرانی ابھر آئی تھی۔

"اف تیمور، تمہارا مسئلہ کیا ہے۔ کسی چیز کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ کچھ کہنا بھی نہیں ہے۔ طبیعت بھی تمہاری بالکل ٹھیک ہے۔ پھر اتنا عجیب سا بی ہیو کیوں کر رہے ہو۔" جھلا کر کہتے ہوئے شہوار نے ایک جھٹکے سے اپنا دوپٹہ میرے ہاتھ سے چھڑایا۔

"کہنا تو مجھے بہت کچھ ہے۔ لیکن جو میں کہنا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے ہمت کہاں سے لاؤں۔" اس کے حسین وجود سے نگاہیں چراتے میں نے دھیرے سے یہ جملہ کہا۔ اور وہ بھرپور طریقے سے چونک گئی۔

"کیا مطلب! ایسی کون سی بامشقت بات ہے جس کے لیے تمہیں ہمت اور حوصلے کی ضرورت آن پڑی۔ ویسے میں دیکھ رہی ہوں آج کل تم بہت بدلے بدلے لگنے لگے ہو۔ ایسے کون سے عجیب سے دوستوں کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے لگے ہو تم۔ پتا کرنا پڑے گا۔" اس کے لہجے میں اپنے بڑے ہونے کا رعب بولنے لگا تھا اور میرے دل کو اچانک ہی جھنجلاہٹ اور غصے کے غبار نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

"بس کرو شہوار۔ اب بہت ہوا۔ میرے برداشت کی حد ختم ہو چکی ہے۔" میں اچانک ہی جیسے پھٹ پڑا تھا اور وہ۔ میری اونچی آواز میرے لہجے کی تندی پر سہم کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔

"میں کن دوستوں میں اٹھتا بیٹھتا ہوں... اس سے تمہارا کیا تعلق، کیوں میرے معاملات میں مداخلت کرتی رہتی ہو تم کیوں میرے معمولات کے بارے میں جاننا اپنا فرض سمجھتی ہو۔ ہر وقت میری سرپرست بننے کا شوق کیوں چرایا رہتا ہے تمہیں۔" اپنے اندر کے سارے غصے کو لہجے میں سموتے میں نے آج تمام آداب اور تکلفات کو ختم کر دینے کا فیصلہ کر دیا تھا۔ جبکہ شہوار منہ پر ہاتھ رکھے آنکھوں میں تاسف اور بے یقینی کا ایک جہاں سمیٹے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"اللہ کے لیے مجھے ہر وقت یہ احساس دلانا چھوڑ دو کہ میں تم سے چھوٹا ہوں۔ جب جب بھی تم ایسا کرتی ہو مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی ہے مجھے نہیں چاہیے تمہارا یہ آپاؤں والا برتاؤ۔ میرے لیے تم صرف میری کزن ہو۔ ایک ایسی لڑکی جس سے میں محبت کرتا ہوں جسے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔"

میری آخری بات نے اس کے ضبط کے پیالے لبریز کر دیے تھے وہ جو خود پر قابو پائے کھڑی تھی بے تحاشا سسکیاں بھرتے ہوئے بنا میری طرف دیکھے طوفانی رفتار سے باہر نکل گئی تھی اور میں اپنے دل کی بکھرتی حالت سنبھالنے کی ناکام سی کوشش کرتے سر تھام کے بیٹھ گیا۔

آج شہوار کے رد عمل سے قطعی بے پروا ہو کر میں نے اس سے اپنی محبت کا اظہار کر دیا۔ وہ بات جو میں شہوار سے کرنے کا سوچتا بھی تھا تو سانس سینے میں اٹکنے لگتی تھی۔ آج جیسے کسی نادیدہ قوت نے مجھ سے وہ سب کچھ کہلوا دیا تھا۔ لیکن میرے دل میں کہیں کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ ہاں یہ خوف ضرور تھا کہ اب شہوار کیا فیصلہ کرے گی۔ اباجی شہوار کی مرضی جانے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتے تھے اسی لیے ان کے شہوار سے پوچھنے سے پہلے ہی میں نے یہ کار دشوار سرانجام دینے کا فیصلہ کیا اور اس میں کامیاب بھی رہا۔ لیکن اب دل ایک بار پھر آس و نراس کے درمیان ڈولنے لگا تھا۔ یہ کیسی محبت تھی جس میں ایک پل کی راحت نہیں تھی۔ ایک گھڑی کے لیے بھی چین نہیں تھا۔

بس بے یقینی تھی، اضطراب تھا، خدشے تھے اور اندیشے تھے، جتنی مضبوطی سے محبت دل کی زمین پر اپنے قدم جماتی ہے، اتنی مضبوطی ہمارے یقین میں کیوں نہیں ہوتی، اور مجھے تو یوں لگ رہا تھا کہ میری محبت میں اور سب کچھ ہے سوائے یقین کے۔

شہوار نے میرے اندیشوں کو صحیح ثابت کرتے ہوئے مجھ سے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی نہ جانے کیوں دل کو ایک دھکا سا لگا تھا۔ میں خوش فہمیاں پالنے کا قائل نہیں تھا، پھر بھی امید کی ایک ہلکی سی کرن ضرور موجود تھی، جس پر اب مایوسی کے اندھیرے غالب آ گئے تھے، اور اس وقت اذان میرے سامنے بیٹھا مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

"اب کیا کرو گے؟"

"اس کی شادی کی تیاریاں۔" مختصر میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

"ظاہر ہے اس کی شادی کی تمام تر انتظامات یہ ہی تو سنبھالے گا، دیکھو مجھے گھورو مت۔" وہ اذان کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"یہ جس طرح نائنٹین سکسٹی کے ہیروز کی طرح الم اداسی کی تصویر بنا بیٹھا ہے۔ اس سے تو یہ ہی لگتا ہے کہ تیمور اس کی شادی میں بینڈ باجے بجانے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو چکا ہے۔"

"تم اپنا منہ بند نہیں رکھ سکتے یار، چپ چاپ اپنا میچ دیکھو۔" اذان اس کی توجہ ٹی وی پر چل رہے فٹ بال میچ کی جانب کراتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔

"کیا شہوار کا کوئی دوسرا رشتہ فائنل ہو گیا ہے؟"

"نہیں۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔

"اباجی اپنے دوست کو منع کر چکے ہیں اور جہاں تک مجھے پتا ہے، فی الوقت کوئی رشتہ موجود نہیں ہے۔"

"تب تو تمہارے پاس موقع ہے، تم اسے ایک بار پھر سمجھا سکتے ہو۔" اذان نے کہا تو میں کچھ حیران ہو کر اسے دیکھنے لگا کہ وہ اب کس امید پر یہ بات کہہ رہا تھا۔

"پتا نہیں، تم کیا کہہ رہے ہو، میں تو اتنا بددل ہو گیا ہوں کہ اب کوئی ایسی کوشش بھی نہیں کرنا چاہتا۔" میرے لہجے میں کچھ زیادہ ہی شکستگی شامل ہو گئی تھی۔ ازان کو غصہ آگیا۔

"کمال کے انسان ہو یار، اس نے ایک شادی سے انکار کیا کر دیا، تم تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ہی بیٹھ گئے۔ لوگ کیا کچھ نہیں کرتے محبت میں، اور تم نے اتنی جلدی ہار مان لی۔ سچ میں تمہارے دل میں اس کے لیے محبت ہے بھی یا یونہی دل لگی کر رہے تھے۔" طیش میں اس نے مجھے اچھا خاصا لتاڑ ڈالا۔ میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

"اب کچھ پھوٹو گے بھی منہ سے، کیا بکواس کر رہا ہوں میں۔" میری خاموشی پر وہ مزید جھلا گیا۔

"اچھا ٹھیک ہے، کرتا ہوں بات۔" میں نے تو سیریس ہو کے یہ بات کہی تھی۔ ازان سمجھا کہ شاید میں اسے ٹال رہا ہوں۔

"کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم پر کوئی احسان نہیں کرو گے۔ پھرتے رہو یونہی مجنوں بن کر۔ لیکن اپنے یہ رونے لے کر پھر میرے پاس مت آنا۔"

وہ تپ کر بولا تھا۔ اور میں نہ چاہتے ہوئے ہنسنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کی روٹھی ہوئی شکل دیکھ کر ——

خضر نے برازیل اور ہالینڈ کے درمیان ہو رہے فٹ بال میچ کے بارے میں میری رائے جاننی چاہی، بلکہ شرط لگانی چاہی، ان دنوں جب پوری دنیا فیفا ورلڈ کپ کے بخار میں مبتلا تھی، میرے سر پر عشق کا بھوت سوار تھا۔

"اوئے عاشق نامراد، کون جیتے گا برازیل یا ہالینڈ؟" خضر نے ہانک لگائی۔

"ہالینڈ۔" میں نے ایک لمحہ بھی سوچنے میں نہیں لگایا۔

"اگر ہار گیا تو۔" اس کے سوال میں ایک اور سوال بھی پوشیدہ تھا، جسے سمجھ کر میں مسکرا دیا۔

"تو جہاں تم کہو ڈنر میری جیب سے۔"

"نہیں یار۔" وہ چونکتے ہوئے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"تم تو کچھ زیادہ ہی سیریس ہو گئے۔"

"کیوں؟ تم سیریس نہیں تھے کیا؟" میں نے پوچھا تو وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔

"کیوں نہیں۔ چلو یہ ہی وعدہ میری طرف سے بھی، اگر برازیل ہار گیا تو، جس کا امکان بہت کم ہے۔" آخری بات پر وہ مسکرا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

میں ایک بار پھر شہوار سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ اسی لیے گھر آتے ہی میں نے فروا سے شہوار کے بارے میں پوچھا۔ تو وہ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے مجھ سے ہی پوچھنے لگی۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں بھائی؟"

"کیا؟" میں اس کا سوال سمجھ کر بھی انجان بن گیا، کیونکہ مجھے اس کے خیالات جاننے تھے۔ امی تو ان دنوں مجھ سے کافی ناراض تھیں۔ ان کے خیال میں، میں پاگل ہو گیا تھا، وہ تو اپنی بھانجی کو بہو بنانے کا سوچے بیٹھی تھیں اور میں نے ایک الگ ہی راگ الاپنا شروع کر دیا، اور جیسا کہ میں نے سوچا تھا انہیں سب سے زیادہ اعتراض میرے اور شہوار کے درمیان عمروں کے فرق پر تھا، ابا جی تو غیر جانبدار تھے، اب صرف فروا ہی بچی تھی جس سے میں کوئی اچھی امید کر سکتا تھا۔

"آپ جانتے ہیں نا، اپنے اور شہوار آپی کے بیچ کا ایج ڈفرینس، پھر بھی آپ ایسا سوچ رہے ہیں۔"

"اوہ، تو تم بھی امی کی ہمنوا ہو۔" مجھے اس کی بات سے مایوسی ہی ہوئی۔

"جی نہیں۔ میں امی کی طرح بالکل نہیں سوچتی۔" اس نے سنجیدگی سے میری بات روکی۔

"میں تو بس اس حوالے سے آپ کا پوائنٹ آف ویو جاننا چاہ رہی تھی۔ مجھے تو شہوار آپی بہت اچھی لگتی ہیں، اور میں یہ ہی چاہتی تھی کہ وہ کبھی اس گھر سے نہ جائیں۔ ہمیشہ یہیں رہیں۔ لیکن پھر خیال آتا کہ ایسا کیسے ہو گا، نہ تو آپ ان کے بارے میں اس طرح سے سوچتے ہیں اور نہ ہی ان کے ذہن میں کبھی یہ بات آئی

ہو گی۔ مگر اب آپ نے تو اپنی خواہش ظاہر کر دی، اور شہوار آپی۔" اس نے پریشانی سے کہتے میری طرف دیکھا تو میں بے چین سا ہو گیا۔

"کیا؟" وہ دھیمے لہجے میں بتانے لگی۔

"ابا جی کے کسی جاننے والے کے توسط سے ان کے لیے ایک پچاس، پچپن سالہ شخص کا رشتہ آیا ہے۔ ویسے یہ میرا اپنا اندازہ ہے، کیونکہ جس کے دو جوان بیٹے ہوں، اس کی عمر اس سے زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔ پہلی بیوی مر چکی ہے اس کی، اور شہوار آپی ان کی دوسری بیوی بننے کے لیے تیار ہو گئی ہیں۔ ابا جی سے انہوں نے کہا ہے کہ اس رشتے کو اوکے کر دیں، انہیں کوئی اعتراض نہیں۔ میرا تو خیال ہے وہ یہ سب آپ سے بچنے کے لیے کر رہی ہیں۔"

میں۔۔۔ جو سانس روکے اسے سن رہا تھا، اس کی آخری بات نے میرے تن من میں بھونچال سا برپا کر دیا۔ مزید وہاں کھڑا رہنے کے بجائے میں نہایت تیزی سے اس کے کمرے کی طرف آیا اور ایک زوردار آواز کے ساتھ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے سے دبا دبا غصہ جھلکنے لگا۔

"کیا مسئلہ ہے تیمور۔۔۔ اس طرح سے کسی کے کمرے میں داخل ہوا جاتا ہے اور وہ بھی اس وقت، رات کے دس بجے، تمہیں یہاں آنے کی ضرورت کیا آن پڑی۔" اس نے اپنی ناراضی ظاہر کرنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا۔ لیکن مجھے اس وقت کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔

"میں صرف اتنا کہنے آیا ہوں کہ تم یہ جو کچھ بھی کر رہی ہو، ٹھیک نہیں کر رہی۔" بے بسی اور غصے کی ملی جلی کیفیت میں میری کنپٹیاں سلگنے لگی تھیں۔

"یہ تمہیں ہو کیا گیا ہے، تم میں کسی بھی قسم کا کوئی لحاظ باقی نہیں رہا۔" اسے شاید میرے طرز تخاطب نے تکلیف پہنچائی تھی۔

"تمہیں اندازہ بھی ہے، تم میرے ساتھ کس طرح سے بات کر رہے ہو، اگر میرے لیے تمہارے خیالات میں کوئی تبدیلی آ بھی گئی ہے تو اس سے ہمارا رشتہ تو نہیں بدل جاتا۔" تاسف بھرے لہجے میں کہتے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔

"کون سا رشتہ ہاں، کس رشتے کی بات کر رہی ہو تم۔" میں کاٹ دار لہجے میں کہتا اس کے قریب آیا۔

"کون لگتی ہو تم میری، کزن صرف اور صرف کزن۔۔۔ اگر اس سے بڑھ کر تم نے مجھے کچھ اور سمجھا ہو تو وہ تمہاری غلطی ہے، کبھی سنا ہے تم نے میرے منہ سے آپا، باجی یا اس ٹائپ کا کوئی دوسرا لفظ۔" اس وقت مجھ پر عجیب سی ہیجانی کیفیت سوار تھی۔ میری اس بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا اور ہوتا بھی کیسے، میرا پیار کوئی ایک، دو دن کا تو تھا نہیں۔ میں تو اسے تب سے چاہتا آ رہا تھا جب مجھے ٹھیک سے چاہت کے معنی بھی نہیں معلوم تھے۔

"یہ سب میں نہیں جانتی تیمور، لیکن جو تم چاہتے ہو وہ ناممکن ہے۔" وہ مجھ سے نگاہیں ملانے سے گریزاں تھی۔ میں چند لمحے اسے دیکھتا رہا، پھر اس کا رخ اپنی جانب موڑتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں ناممکن ہے؟"

"یہ تم مجھ سے بہتر جانتے ہو۔" برہمی سے کہتے اس نے اپنا بازو میری گرفت سے چھڑایا۔

"اور میری تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم خود کو سمجھتے کیا ہو آخر۔۔۔ مانا کہ یونیورسٹی میں پہنچ گئے ہو، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ تم خود سے بڑی عمر کی لڑکی سے عشق بگھارنے لگو، اپنا پاگل پن اس پر تھوپنے لگو۔ اچھی طرح جانتے ہو نا اپنے اور میرے بیچ کا ایج ڈیفرنس، پھر بھی ایسی احمقانہ ضد کر رہے ہو۔ ہم دونوں اچھے دوست تو رہ سکتے ہیں، لیکن شادی، یہ تو ناممکن ہے۔"

"ہاں! بدقسمتی سے میں تم سے چند سال چھوٹا ہوں، اسی لیے تمہیں مجھ سے شادی نہیں کرنی اور جو تم خود سے دگنے عمر کے بڑے شخص سے شادی کرنا چاہ رہی ہو، وہ کیا ہے؟" میرے طنزیہ لہجے پر اس کے چہرے کا رنگ متغیر سا ہو گیا۔

"وہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔"

"یہ میرا ہی مسئلہ ہے' میری زندگی اجاڑ کے تم اس قریب المرگ بڈھے کی زندگی بچانے نہیں جاسکتیں۔" میری آواز کچھ زیادہ بلند ہو گئی تھی۔ وہ بے بسی سے سر تھامتے ہوئے کرسی پر گر سی گئی۔

"تم میری بات سمجھ کیوں نہیں رہے ہو تیمور' یا پھر سمجھ کر بھی نا سمجھ بنے رہنا چاہتے ہو۔" اس کی آواز بھیگ سی گئی تھی۔ مجھے عجیب سا احساس ہوا' میں نے کچھ کہنا چاہا' لیکن الفاظ حلق میں ہی اٹک کر رہ گئے۔ وہ بھی چپ تھی' سر جھکائے شاید مجھ سے اپنے آنسو چھپا رہی تھی۔ اسی خاموشی میں کئی لمحے سرک گئے۔ پھر لفظ لفظ جوڑتے ہوئے میں کچھ کہنے کی کوشش میں اس کے پاس ہی کارپٹ پر پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔

"شہوار۔" میں نے دھیرے سے اسے پکارا تھا' اس نے اپنی بھیگی پلکیں اٹھا کر مجھے دیکھا تو میں ایک بار پھر سب کچھ بھول گیا تھا' اس کی گہری سرمئی آنکھوں میں گلابی ڈورے تیرنے لگے تھے اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا پورا وجود کسی ان دیکھی مقناطیسی شعاعوں میں جکڑا جانے لگا ہو۔ بے خودی میں اسے تکتے ہوئے ان گہری جھیلوں میں ڈوب کر پھر کبھی نہ ابھرنے کی ایک عجیب سی خواہش مچل اٹھی دل میں۔

"تمہیں کس بات کا ڈر ہے شہوار۔۔۔ لوگوں کی پروا ہے یا پھر۔۔۔ یا پھر میرے جذبوں میں کوئی کھوٹ دکھائی دیتا ہے۔" میں نجانے کتنی دیر بعد یہ کہنے کے قابل ہوا تھا۔ شہوار کچھ چونکی ضرور لیکن کہا کچھ نہیں۔

"میں کوئی سولہ سترہ سالہ جذباتی سا نوجوان نہیں ہوں کہ میری محبت کو تم ٹین ایج کی نادانی قرار دے کر دامن چھڑا لوگی' سچ ہے کہ میں تمہیں بہت پہلے سے چاہتا آرہا ہوں۔ لیکن اتنے عرصے ایک لمحے کے لیے بھی کہیں میری محبت کمزور نہیں پڑی۔ مجھے کبھی یہ نہیں لگا کہ میں کسی وقتی کیفیت کا شکار ہو رہا ہوں۔ تم اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہو شہوار۔" میں نے اس کے صبیح چہرے کو اپنی نگاہوں کی گرفت میں لیتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں کبھی میرے جذبوں کی خبر نہیں ہوئی' کبھی میری آنکھوں میں تمہیں اپنا آپ نظر نہیں آیا۔" نگاہیں جھکائے' ہونٹ کاٹتی وہ کسی کشمکش و پیچ کا شکار لگ رہی تھی۔ مجھے بے چینی ہونے لگی۔

"ہاں! میں جانتی تھی۔" اس نے کسی کشمکش سے آزاد ہو کر یہ بات کہی۔ اور میری رگوں میں لہو سنسنا اٹھا۔

"مجھے تمہارے جذبات کی تبدیلی محسوس ہو گئی تھی۔ اسی لیے مجھے ڈر لگنے لگا تھا تم سے۔" اس نے بات کرتے کرتے مجھے دیکھا میں بت بنا کھڑا تھا۔

"میں تمہیں ہر وقت اس لیے اپنی بڑائی جتاتی رہتی تھی کہ کہیں تم دل میں کوئی اور امید نہ پال بیٹھو لیکن دیکھو جس کا مجھے ڈر تھا وہی ہوا۔ تمہیں تو یہ سب کچھ بہت آسان لگتا ہو گا نا۔

تم نے اپنی زندگی میں کوئی مشکل جو نہیں دیکھی۔ جو چاہتے ہو وہ ملتا ہے' جو سوچتے ہو وہ ہوتا ہے۔" تلخی بھرا لہجہ لیے وہ پہلی بار میرے سامنے اس طرح سے بات کر رہی تھی میں نے بھی اسے کہنے دیا۔

"لیکن میرے ساتھ ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ مجھے آج تک ایسی کوئی خوشی نہیں ملی جو میں نے پورے دل سے محسوس کی ہو۔" شہوار کی آواز کپکپا رہی تھی۔ میرے دل کو کچھ ہونے لگا۔

"ابو کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد جب امی ہمیں لے کر یہاں آئیں تو مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے یہ ہماری بدقسمتی کی انتہا ہے' اپنی خودداری کو مار کر کسی اور کے در پر جا پڑنا۔۔۔ کوئی چھوٹی بات نہیں ہوتی اور وہ بھی تب جب آپ کی فطرت میں حساسیت بھی کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہو' سچ کہوں تیمور تو اس گھر میں رہتے ہوئے میں نے کبھی خود کو سیکیور فیل نہیں کیا۔ میں مانتی ہوں ماما جی مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ لیکن آخر کب تک میں ان کی بیٹی تو نہیں ہوں نا۔

اور پھر جب سے میری منگنی ٹوٹی ہے۔ اپنے لیے انہیں پریشان دیکھ کر میرے اندر کا گلٹ بڑھتا جا رہا ہے۔ میں ان کا ضبط نہیں آزمانا چاہتی تیمور' اسی لیے میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔" بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اس نے واقعی میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

"بھول جاؤ سب کچھ۔۔۔ میرا نہیں تو اپنے گھر والوں کا ہی کچھ خیال کر لو۔"

میں خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس لیے اس نے مجھ پر اپنی ذات کی ساری گرہیں کھول دی تھیں وہ بے یقینی کا شکار تھی اپنی ذات کے حوالے سے' اتنے عرصے سے اس گھر میں رہتے ہوئے شاید اب بھی اسے اپنی پوزیشن کمزور لگتی تھی نہ تو یہ گھر اسے اپنا گھر لگتا تھا اور نہ ہی یہاں کے لوگ' اور نہ ہی ان کی محبتوں پر اپنا کوئی حق محسوس ہوتا تھا مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ ایسا کیوں سوچنے لگی تھی جبکہ ہم میں سے کسی نے بھی اسے کبھی پرایا پن محسوس نہیں ہونے دیا تھا۔ پھر بھی اس کے اندر اتنے سارے کمپلیکس جمع ہو گئے تھے۔ شاید واقعی وہ ضرورت سے زیادہ حساس تھی۔۔۔ لیکن اب۔۔۔ مجھے اس کی بے یقینی اس کے تمام خدشات ختم کرنے تھے اور اسی لیے میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہایت مضبوط لہجے میں کہا تھا۔

"تمہیں یہ غلط فہمی کیونکر ہوئی شہوار کہ گھر والے ہمارے اس رشتے سے خوش نہیں ہوں گے۔ جانتی ہو جب میں نے ابا جی سے تم سے شادی کرنے کی بات کی تھی تو انہوں نے کہا تھا کہ وہ تمہاری مرضی جانے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کریں گے۔ انہیں ڈر تھا کہ کہیں تم اپنے دل میں ان کے لیے کوئی بدگمانی نہ پال لو۔ کہیں تمہیں یہ نہ لگے کہ وہ زبردستی تمہیں اپنے بیٹے کے لیے باندھنا چاہ رہے ہیں' حالانکہ وہ خود دل و جان سے تمہیں اپنی بہو بنانے کے لیے رضامند تھے۔ پھر بھی انہوں نے اس معاملے میں غیر جانبداری اختیار کیے رکھی صرف تمہاری وجہ سے اور تم نے۔۔۔ ان کی اس خاموشی کو کسی اور بات پر کر لیا۔ تمہیں لگا وہ اس رشتے سے خوش نہیں ہیں۔ دراصل شہوار' تم نے کبھی ان کی محبت کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تم نے کبھی خود کو ان کی بیٹی سمجھا ہی نہیں۔ اسی لیے اپنے خود ساختہ مفروضات میں الجھی تم نے انہیں کسی ان دیکھی پریشانی سے بچانے کے لیے اس جوان ہوتے بیٹوں کے باپ سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ سوچے بغیر کہ ابا جی تمہاری شادی وہاں کر دینے کے بعد بھی خوش اور مطمئن نہیں رہ پائیں گے تم انہیں ایک پریشانی سے نکال کر دوسری بڑی آزمائش میں ڈال دو گی شہوار وہ تمہیں فروا سے بڑھ کر چاہتے ہیں جب وہ فروا کے لیے ایسا کوئی رشتہ قبول نہیں کر سکتے تو تمہارے لیے وہ ایسا کیسے سوچ سکتے ہیں۔"

میں اپنی طویل بات کر کے کچھ دیر خاموش ہوا۔ وہ اپنے ہاتھوں پر نظریں جمائے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

"میں مانتا ہوں۔ امی ناخوش ہیں لیکن یہ صرف وقتی ناراضی ہے۔ وہ تمہیں بہت پسند کرتی ہیں یہ تو تم بھی جانتی ہو گی کہ وہ زیادہ عرصہ کسی بات کو دل میں نہیں رکھتیں۔۔۔ اور اگر پھپھو کو اس رشتے پر کوئی اعتراض ہے تو تم مجھے بتاؤ میں خود انہیں جا کے مناؤں گا لیکن پلیز شہوار۔۔۔ مجھ سے دامن چھڑانے کے لیے تم ان چھوٹی موٹی ناراضیوں اور فضول کے اعتراضات کو جواز مت بناؤ۔" میرے لہجے میں التجا سمائی تھی' اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور پھر نہ جانے کیا ہوا کہ فوراً ہی نگاہ چرا لی۔

"صرف ایک بار میرے بارے میں سوچو تم۔۔۔ صرف ایک بار مجھ پر یقین کر کے دیکھو میری محبت اتنی کمزور ہرگز نہیں ہے کہ تمہیں واہموں اور خدشات کے سوا اور کچھ نہ دے سکے۔ اپنی زندگی کا ہر پل میں نے تمہاری تمنا کرتے ہوئے گزارا ہے شہوار تم نہیں جانتیں۔ تم میرے لیے کیا ہو۔ تمہیں پانا میرا اولین مقصد ہے اور۔۔۔ تمہیں کھو دینا میری زندگی کا سب سے بڑا نقصان۔" میرا لہجہ بھاری ہونے لگا دل میں بھرا غبار میری باتوں میں حائل ہونے لگا تھا۔

"میں تمہیں مجبور تو نہیں کر سکتا۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ آج رات تم اچھی طرح سوچ لو' کل مجھے اپنا حتمی فیصلہ سنا دینا اور۔۔۔ کوئی بھی فیصلہ سنانے سے پہلے

اتنا ضرور یاد رکھنا کہ یہ میری زندگی اور خوشیوں کا سوال ہے۔" میں اپنی بات ختم کرکے اس کی طرف دیکھے بغیر باہر نکل آیا تھا۔

کل کیا ہونا ہے یہ میں نہیں جانتا تھا۔ لیکن آج رات میں سوتا کیسے۔ نیند تو جیسے آنکھوں کا رستہ ہی بھول گئی تھی۔ مجھے یاد تھا بچپن میں جب ہوم ورک نہ کرنے کے باعث ٹیچر کی مار کا خوف مجھے آدھی آدھی رات تک جگائے رکھتا تھا۔ تب مجھے اپنی پریشانی پوری دنیا کی پریشانیوں سے بڑی لگا کرتی تھی۔ لیکن آج اس وقت میری کیفیت اس قیدی کی طرح تھی۔ جس کی موت سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی اس کی منتظر ہو اور وہ پھر بھی کسی معجزے کے انتظار میں صبح کی راہ دیکھ رہا ہوں میری خوش امیدی بھی کچھ اسی طرح میرا دل سنبھالے ہوئے تھی انہی سوچوں میں ڈوبتے ابھرتے میں کب نیند کی وادی میں اتر گیا تھا مجھے پتا بھی نہیں چلا تھا۔

☼ ☼ ☼

صبح میری آنکھ کھلی تو دن کا اجالا پوری آب و تاب کے ساتھ میرے کمرے میں ڈیرا جما چکا تھا۔ میں فوراً ہی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"کیا بات ہے۔ میں اتنی دیر تک سویا رہا اور کسی نے مجھے جگایا تک نہیں۔" میری حیرت اپنے عروج پر تھی رات کو سوتے وقت نہ تو میں نے کھڑکی بند کی تھی نہ ہی پردے برابر کیے تھی اور شاید اسی لیے سورج کی اس چھبتی روشنی کے باعث میری آنکھ کھل گئی تھی ورنہ تو نجانے میں کب تک سویا رہتا۔

میں نے اٹھ کر حسب عادت سب سے پہلے سائیڈ ٹیبل سے اپنا سیل فون اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن اسے اٹھانے سے پہلے میری نظریں اس کے ساتھ رکھے ایک خوبصورت سے کارڈ پر پڑی تھیں میرے دل نے اچانک ہی بے تحاشا دھڑک کر مجھے کسی انہونی کی خبر دی چاہی۔ اس بات کا تو مجھے یقین تھا کہ کل رات یہ کارڈ اس ٹیبل پر نہیں تھا تو پھر... کوئی میرے سونے کے دوران۔ یا شاید کچھ دیر پہلے ہی اسے یہاں رکھ گیا تھا... اور وہ کون ہو سکتا تھا۔ اس سوچ نے ہی میرے انگ انگ میں برقی لہریں دوڑا دیں۔

میں نے لرزتے ہاتھوں سے وہ کارڈ اٹھایا اور اسے کھولتے ہی اس میں سے گلاب کی ایک ادھ کھلی کلی پھسل کر میرے قدموں میں جا گری۔ کارڈ کسی عبارت سے خالی تھا لیکن اب اس کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی اس میں رکھی گلاب کی وہ کلی ہی مجھ تک، شہوار کا جواب پہنچا گئی تھی میں نے کلی اٹھا کر ہونٹوں سے لگائی دل نے جیسے دھڑک دھڑک کر سینے میں طوفان اٹھا دیا تھا خوشی سے مرنے کی اصطلاح صحیح معنوں میں آج ہی میری سمجھ میں آئی تھی۔ کچھ نہیں سوجھ رہا تھا کہ کیا کر گزروں، چیخ چیخ کر ساری دنیا کو اپنی محبت کے سرخرو ہو جانے کی خبر دے دوں۔ ہاں... لیکن سب سے پہلے تو مجھے اذان اور خضر سے یہ خوشی شیئر کرنی تھی میں نے فوراً ہی سیل آن کیا تھا۔ لیکن کوئی نمبر ملانے سے پہلے ہی خضر کی کال آنی شروع ہو گئی۔ اپنی بے تحاشا ایکسائٹمنٹ کو دل ہی میں دباتے میں نے کال ریسیو کر کے کان سے لگایا تھا۔

"ہیلو۔"

"اوئے رانجھے کے ماے۔ یہ کل رات سے سیل کیوں آف کر رکھا ہے تم نے۔" وہ میری آواز سنتے ہی شروع ہو گیا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی پہلے میں نے سوچا تھا اسے فون پر ہی سب کچھ بتا دوں مگر اب میں نے اپنا ارادہ بدل دیا تھا۔

"مجھے تو تشویش ہونے لگی تھی کہ عشق نے تو مت پہلے ہی مار رکھی ہے۔ کہیں جوگی بن کے جنگل میں تو نہیں نکل گیا۔ ہم تو برداشت کر رہے تھے جانور بے چارے بھاگ کر کہاں جائیں گے۔"

"بکواس بند کرو اور یہ بتاؤ کہ کل رات کے میچ کا کیا ہوا؟" میں نے ہنسی دباتے ہوئے پوچھا۔

"چھوڑ یار۔ کچھ مت پوچھو۔" وہ ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولا۔

"برازیل اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے..." اس نے قدرے رک کر ڈرامائی توقف کیا۔ پھر بولا "میچ ہار گیا۔"

"کیا!" میں ششدر تھا "برازیل ہار گیا وہ بھی ہالینڈ سے۔"

"ہاں! میں نے شرط جو لگائی تھی۔ اس پر کبھی ایسا ہوا ہے کہ میں نے کسی ٹیم پر شرط لگائی ہو اور وہ میچ جیت گئی ہو۔" اس کے لہجے میں خفگی تھی جیسے اسے خود پر غصہ آرہا ہو۔

"اب تو میں نے سوچ لیا ہے کہ جب بھی انڈیا اور پاکستان کے درمیان کوئی کرکٹ میچ ہوگا میں انڈیا پر شرط لگاؤں گا... پھر چاہے شرط ہار جاؤں... کوئی غم تو نہیں ہوگا۔" اس کی منطق نرالی تھی۔ میں ہنس دیا۔

"پلیز اب تم میری جیب پر ترس کھاتے ہوئے کسی اچھے سے سستے ہوٹل یا پھر ڈھابے کا پتا بتا دو۔" اس کا انداز ملتجی تھا۔

"اذان بتا رہا تھا یہاں پاس ہی ایک کوئٹہ ہوٹل ہے وہیں سے کھلا دیں گے تمہیں باقی تمہاری مرضی کا۔" اب اس کے لہجے میں ہنسی بھی شامل ہو گئی۔

"تمہاری اس کنجوسی کو دیکھتے ہوئے تو جی چاہ رہا ہے کہ سچ مچ تمہاری جیب میں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ چھوڑوں لیکن جانے دو۔ آج کی ٹریٹ میری طرف سے۔"

"کیا مطلب؟" وہ الجھ گیا۔

"مطلب بہت خاص ہے آکر ہی سمجھاؤں گا۔"

میری اس معنی خیز بات پر وہ چند لمحے تو خاموشی سے سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر اچانک ہی پرجوش ہو کے نعرہ لگایا تھا۔

"یعنی ہمارے دوست کی نیا پار لگ گئی۔"

"ایسا ہی سمجھ لو۔ باقی باتیں آکر کرتا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کال ڈسکنیکٹ کر دی۔ جانتا تھا۔ اب یہ خبر اذان تک بھی پہنچ جائے گی اور پھر وہ دونوں ہی پوری بات جاننے کے لیے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ انہیں کسی طویل انتظار سے بچانے کے لیے میں تیار ہونے چل دیا۔ کہ اب یہ خوشی مجھ سے بھی اکیلے سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔

☼ ☼

ناولٹ

شگفتہ بھٹی

دسویں قسط

میں پچھلے دو روز سے ماتم کناں تھی۔۔۔ نہ کھانا نہ پینا۔ بس بستر میں منہ چھپائے پڑی تھی میرے تکیے کے نیچے وجیہہ کا وہ خط تھا جو میرے اور اس کے ختم ہو جانے والے رشتے کا پیامبر تھا اور تکیے کے اوپر میری بے قرار آنکھیں جو ساون بھادوں کی جھڑیاں لگائے ہوئے تھیں۔

"بیٹا! اٹھ جاؤ۔ اٹھ کر یہ دوائی لو۔" نوراں مائی پھر سے دوا اٹھائے میرے سرہانے کھڑی تھیں۔

"اٹھ جاؤ دوائی لو تاکہ آگ کی طرح تپتا ہوا تمہارا وجود کچھ تو سکون پائے۔" وہ میرے پاس بیٹھ کر میری پیشانی کو چھوتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ مجھے بخار تھا اور اس بخار نے عین وقت پر آکر میری بربادی کو ڈھانپ لیا تھا اور ان انگارہ آنکھوں سے بہتے ہوئے اشکوں کا بھرم بھی رکھ لیا تھا۔ نوراں مائی نے مجھے سہارے سے اٹھا کر دوا پلائی۔

"اوئے میرے اللہ۔۔۔ اتنا بخار۔" وہ میرے تیز بخار سے سخت پریشان تھیں۔

"ہم صاحب سے کہتے ہیں کہ ڈاکٹر کو بلالیں۔ ان دواؤں سے یہ بخار نہیں اترنے والا۔" وہ دوا کی شیشی واپس لے جاتے ہوئے بولیں۔

میں انہیں باوجود کوشش کے اتنا بھی نہ کہہ سکی کہ ڈاکٹر کو نہ بلائیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ میری زبان تو سوکھ کر میرے تالو سے لگ چکی تھی اور الفاظ کنکر بن کر دل پر برس رہے تھے۔

"وجیہہ! وجیہہ۔" میری روح تڑپ تڑپ کر پکار رہی تھی۔
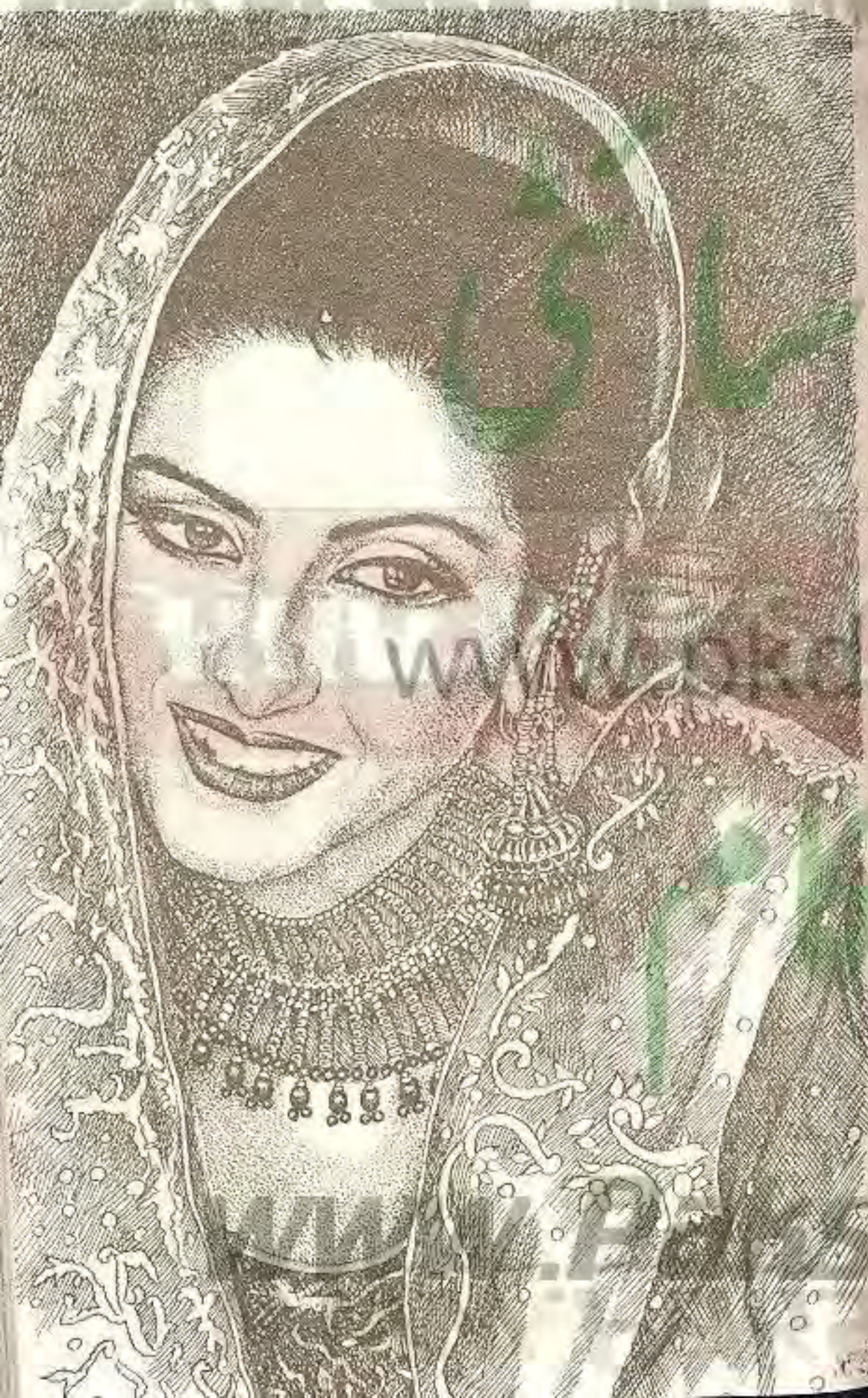
"تم مجھے نہیں چھوڑ سکتے۔ تم ایسا کر بھی کس طرح سکتے ہو؟

کیا تم جانتے نہیں ہو کہ میں تو اب بغیر تمہارے جی ہی نہیں سکتی۔۔۔ اور تم خود بھی تو۔۔۔ میرے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

میں نے بے چینی سے کروٹ بدلی اور تکیے کے نیچے رکھا ہوا خط نکال لیا۔

"کیا خبر یہ خط وجیہہ نے نہ لکھا ہو؟" ایک خیال نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیے۔

"ہاں ہاں ہو سکتا ہے یہ خط وجیہہ نے نہ لکھا ہو؟" میں نے جلدی جلدی اس تہہ کیے ہوئے کاغذ کو کھولا اور اس کی لکھائی کو اس امید سے دیکھنے لگی جیسے وہ وجیہہ کی نہ ہونے کی گواہی دے گی۔۔۔ میں نے اس کے ایک ایک نقطے کو ایک ایک لفظ کو شک کی نظر سے دیکھا کھوجنے والی آنکھوں سے دیکھا۔

ایک ایک لفظ کو بار بار گھورا۔ مگر وہ صاف شفاف جدا جدا موتیوں جیسے الفاظ وجیہہ ہی کے قلم سے نکلے ہوئے تھے۔ وجیہہ کی لکھائی تو بے حد منفرد اور حسین تھی اردو اور انگریزی دونوں ہی وہ بہت خوب صورت لکھتا تھا۔

اس کی شفاف آنکھوں کی طرح آئینہ ہوئے وہ الفاظ مجھے دیکھ رہے تھے۔ اور گواہ تھے کہ انہیں وجیہہ نے ہی تخلیق کیا تھا۔

"لیکن کیوں؟" میرا کلیجہ کٹ رہا تھا۔

"وجیہہ مجھے دوبارہ نہ ملتا مجھ سے جدا ہو جاتا مگر مجھے خود سے یوں علیحدہ تو نہ کرتا اپنے آپ سے مجھے کاٹ کر تو یوں الگ نہ کرتا۔"

میرا جی چاہا کہ میں وجیہہ سے پوچھوں۔۔۔

اس سے ایک بار ملوں اور مل کر اپنے اس سوال کا جواب تو ضرور لوں، میری خطا، میرا قصور تو بتائے کہ آخر میں نے ایسا کیا کر دیا تھا۔ اب میری بے قراری مجھے اکسانے لگی تھی۔ اور میں سوچنے لگی۔

"مجھے وجیہہ سے ملنا ہے۔ اس سے بات کرنی ہے۔ اسے دیکھنا ہے۔" وجیہہ کی یاد نے مجھے یوں ستانا شروع کر دیا کہ میں پاگل ہونے لگی۔

"مگر کیسے؟" وجیہہ کی خبر اس کا پتا، اس کا فون نمبر مجھے کون دے گا۔ یہ سارے کانٹے مل کر میرے راستے میں رکاوٹ بن رہے تھے۔

"مجھے یوں اس کاغذ کے ٹکڑے پر اعتبار کر کے نہیں رہنا چاہیے، مجھے اس سے ۔۔۔ بات کرنی چاہیے اور اپنے گھر واپس جانا چاہیے آخر کو میرا حق میرے گھر پر یوں تو ختم نہیں ہو سکتا۔"

"وہاں پر سب تمہاری جان کے دشمن ہیں۔" میرے دل پر گرنے والا ایک کنکر میرے دماغ پر پڑا۔

"دشمن ہیں تو کیا ہوا۔ زیادہ سے زیادہ مجھے بھی کوئی گولی مار دے گا۔ اچھا ہے مار دے۔ اس زندگی سے تو بہتر ہو گا کہ مر جاؤں۔" میرے اندر ازل سے وہی ضدی اور ہٹ دھرم عصمہ جھانکنے لگی جس نے سوائے اپنی ذات کے کبھی کچھ اور تو سوچا ہی نہ تھا۔

"اور یہ خط۔۔۔ یہ حقیقت کیا تم اسے بھی نظر انداز کر دو گی؟" دوسرا کنکر بھی ٹھیک اسی نشانے پر آ کر لگا اور میرا سن ہوا دماغ ذرا سا سنسنایا۔

"محبت اور جنگ میں کچھ بھی جائز ہے۔ محبوب کے وصل سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔" میں نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے سوچا۔

"یعنی۔۔۔ دین مذہب، رسم و رواج لوگ معاشرہ؟ کچھ بھی نہیں۔" اب تو مسلسل کنکر برسنے لگے تھے، مجھے چوٹ کے لگنے کا احساس بھی ہو رہا تھا۔

"وجیہہ! میرا وجیہہ، میری محبت، میرا عشق، میرا جینا، میرا مرنا، میرا وجیہہ اور صرف وجیہہ۔" میں نے اپنی ڈھٹائی کو بے غیرتی میں بدلتے دیکھا۔

میں نے جیسے ہی اس زاویے پر سوچا مجھے اپنے اندر اک توانائی اور ہمت کا عجیب سا احساس ہوا میرے دل میں پڑے سارے کنکر گویا پھول اور کلیوں میں بدلنے لگے نرم و گداز اجسام والے پھول۔

بے خود اور مدہوش کر دینے والی خوشبو میں رچے ہوئے پھول۔

"مگر اب وہ تمہارے لیے نامحرم ہے۔" پھر بھی کوئی نادیدہ ہاتھ تھا جو اب بھی مجھے کنکر مار رہا تھا۔

"میرے لیے تو مرتے دم تک وہی میرا محرم رہے گا۔" میرے دل میں کھلے پھولوں کی مہک میرے لہو میں رچنے لگی۔

"وہ تمہیں طلاق دے چکا ہے۔۔۔ اب اس کا اور تمہارا کوئی رشتہ نہیں رہا اور اگر اب تم دونوں کوئی بھی تعلق رکھو گے تو وہ حرام ہو گا۔ گناہ ہو گا۔" میرے دماغ پر پڑنے والے کنکر خاصے نوکیلے ہو رہے تھے۔

"محبت تو خود ایک عبادت ہے۔ میں پورے دل اور روح کی گہرائیوں سے اسے چاہتی ہوں اور یہ رشتہ کبھی بھی نہیں ٹوٹ سکتا۔۔۔ اس نے مجھے دل سے طلاق نہیں دی۔ کسی کے دباؤ میں مجبوری کے تحت دی ہو گی اور جب زبردستی کسی کا نکاح نہیں ہو سکتا تو پھر۔۔۔"

"یہ طلاق ہے عصمہ بی بی! مذاق نہیں اور نہ ہی تم اسے مذاق سمجھو۔" میں بڑی ہوشیاری سے دلیلیں دے کر اپنے دماغ کو بہکانا چاہتی تھی مگر وہ تو بے دار ہو چکا تھا۔ تن کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"میں نہیں مانتی۔ جب تک اس کے منہ سے خود میرے سماعتیں نہ سن لیں میں نہیں مانوں گی۔" میں بھی سر اٹھا کے اکڑ گئی۔

"تم قانون قدرت سے جھگڑو گی۔۔۔؟" میرا دماغ میرے اعصاب کو جھنجھوڑنے لگا۔

"نہ، نہیں بس اپنی تسلی کروں گی۔ اللہ کے واسطے مجھے پریشان نہ کرو مجھے اپنی تسلی کر لینے دو مجھے یقین تو

آ جانے دو کہ وجیہہ نے ایسا اپنے ہوش و حواس میں کیا ہے۔" اب میں خود اپنے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی تھی التجائیں کر رہی تھی۔

"تم اپنی تسلیاں کرتی پھرو۔۔۔ جہاں سے چاہے جا کر فتوے لے لو۔۔۔ مگر ہونے والی قیامت ہو چکی ہے۔۔۔ اس کی شدت اس کی حقیقت اب تمام عمر کے پچھتاووں کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

"اچھا بس ایک بار۔۔۔ صرف ایک بار مجھے اپنی تسلی کر لینے دو۔" میں نے پھر بھی یہی کہا اور اتنی ضد پر میرا دماغ پھر سے چپ ہو گیا یہ کہتا ہوا۔

"اس حقیقت کو مان لو عصمہ کہ زبان سے نکلے ہوئے الفاظ اور کمان سے نکلے تیر کبھی واپس نہیں آ سکتے۔" میں اسے نظر انداز کرتی ہوئی اٹھی اور خود کو گھسیٹتی ہوئی باتھ روم میں لے گئی میں شاور تلے کھڑی ہو گئی اور اسے پورا کھول دیا۔

سخت سردی کے باوجود مجھے ٹھنڈا پانی بھی ابلتا ہوا محسوس ہوا۔ میں اپنے سلگتے ہوئے دماغ کو پر سکون کرنا چاہتی تھی۔۔۔ مگر میں ناکام تھی۔

☆ ☆ ☆

میرے پاس فضل کا موبائل نمبر تھا۔ اس وقت فضل ہی مجھے امید کی ایک کرن دکھائی دیا میں نے فضل کا نمبر ڈائل کیا۔

دوسری ہی بیل پر اس نے میری کال ریسیو کر لی۔

"السلام علیکم دلنشیں بی بی!" مجھ سے پہلے وہ بولا اور مجھے یہ جان کر بے حد خوشی محسوس ہوئی کہ اس نے میرا موبائل نمبر پہلے سے اپنے موبائل میں فیڈ کر رکھا تھا۔

"وعلیکم السلام، کیسے ہو فضل۔" میں نے اپنی آواز میں بشاشت بھرتے ہوئے پوچھا دراصل میں اپنے اندر کی ٹوٹ پھوٹ کو کسی پر بھی واضح نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں نے تو اپنی ماں کو بھی خود پر ٹوٹنے والی قیامت کا علم نہ ہونے دیا تھا۔ حالانکہ میں اس وقت ان کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتی تھی۔ مگر میں نے خود پر جبر کر کے خود کو روک لیا تھا اور سیدھی

اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔

"جی میں ٹھیک ہوں بی بی! آپ کہیں آپ نے مجھے کیسے یاد کیا؟" وہ مودبانہ انداز میں پوچھ رہا تھا کہ اسے بھی تو علم نہ تھا کہ جو لفافہ وہ مجھے دو روز قبل دے کر گیا تھا وہ میری محبت کی موت کا پروانہ تھا۔

"میں ٹھیک ہوں فضل۔۔۔ شموں کیسی ہے؟" میں نے شموں کا حال پوچھا۔

"جی اب تو وہ ٹھیک ہو رہی ہے کافی بہتر ہے۔" اس کی آواز میں خوشی کھنک رہی تھی۔

"اچھا فضل! تم اب کیا کرو گے؟" میں نے اس کے دل کو کریدا۔

"جی میں نے شموں سے کہہ دیا ہے کہ میں اس کے ساتھ نکاح کرنا چاہتا ہوں۔" وہ ذرا جھجکتا ہوا بولا۔

"بہت ہی اچھا کیا تم نے جو شموں سے کہہ دیا۔ وہ کیا کہتی ہے؟" میں نے بات آگے بڑھائی۔

"جی وہ کہتی ہے کہ مجھے کچھ وقت دو میں ذرا اور ٹھیک ہو لوں۔" وہ مجھے بتا رہا تھا۔

"اچھا فضل! اگر شموں نے انکار کر دیا تو کیا کرو گے؟" میں نے جان بوجھ کر اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"جی میں پھر بھی اس سے ناراض نہیں ہوں گا اور اسی سے محبت کرتا رہوں گا۔" اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"کیوں ایسا کیوں؟ تمہاری عمر کیا برباد ہونے کے لیے ہے تم کو کیا لڑکیوں کی کمی ہے؟" میں نے اس کا دل کھنگالنے کی ٹھان لی تھی۔

"بی بی جی! میری عمر شموں کے نہ ملنے سے بھی برباد نہیں ہے۔ میں بہت خوش ہوں ابھی بھی۔" وہ محبت میں ڈوبا ہوا تھا اس کی آواز اس کی اتھاہ گہرائیوں کی گواہ تھی۔

"محبوب تمہیں حاصل نہیں ہے اور تم خوش ہو، مطمئن ہو کیسے؟" مجھے اس کے جواب پر سخت حیرت تھی۔

"محبوب تو مجھے حاصل ہے بی بی! میرے دل میں رہتا ہے۔" وہ پھر بھی مطمئن ہی تھا اور میں پہلے سے زیادہ بے چین۔

"اوہیں کملیاں نہ مارو فضل... اپنے آپ کو نہ بہلاؤ شموں تمہاری نہیں ہے وہ کسی اور کو چاہتی ہے اور تم خوامخواہ ہی..." میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ جیسے میں اسے ڈانٹ رہی ہوں۔

"دلنشیں بی بی! وہ کسی اور کو چاہتی ہے تو یہ اس کے اختیار میں نہیں تھا اور پھر میں نے کب اسے پابند کیا تھا کہ مجھے چاہے کسی اور کو نہ چاہے' میں اسے چاہتا ہوں مجھے تو بس اس سے غرض ہے۔" وہ میری ڈانٹ سے بھی نہ ڈرا اور اسی مان سے بولا... جو اسے اپنے آپ پر تھا۔

"دلنشیں بی بی! میں نے شموں کو صرف اتنا کہا ہے کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں اگر وہ مجھ سے نکاح کر لے تو میں اس خوش رکھوں گا اسے عزت دوں گا میں نے شموں سے شموں کو مانگا تو ہے زبردستی تو نہیں کی۔" وہ خود ہی بتاتا جا رہا تھا اور میں حیران و پریشان سی اس کی باتیں سن رہی تھی۔

"میں نے تو شموں کا سوال اپنے رب کے آگے ڈالا ہے۔ اس تقدیریں لکھنے والے سے التجا کی ہے کہ وہ شموں کو میرے مقدر میں لکھ دے اور مجھے یقین ہے بی بی جی! اگر میرے جذبوں میں کھوٹ نہ ہوا۔ تو مالک میری دعا کو رد نہ کرے گا پھر شموں خود میری طرف کھنچی چلی آئے گی۔

دلنشیں بی بی! وہ اللہ ہی تو ہے ہمارے کل کا مالک... ہمارے دل' ہمارے دماغ' ہماری جانیں سب اسی کی امانت ہیں اگر ہم ان میں خیانت نہ کریں تو اللہ بھی ہم سے راضی رہتا ہے اور ہمیں عطا کرتا جاتا ہے نوازتا جاتا ہے بس وہ غصے نہ ہو۔

بس وہ مکھ نہ موڑے وہ کہتے ہیں نا... رب راضی تے سب راضی۔ وہ راضی ہو گیا تو میری اور شموں کی کیا مجال ہے۔" وہ ایک ایک لفظ یوں ادا کر رہا تھا جیسے کہنے کے ساتھ لکھ رہا ہو اور پھر مجھے سنا تا ہو ٹھہرا ہوا واضح اور پر اثر مجھ پر جیسے اس کے لہجے نے اک چادر تان دی' میرے بے چین وجود کو یکبارگی اک سکون اک ٹھنڈک کا احساس ہوا۔

"فضل! تمہارے پاس وجیہہ کا نمبر تو ہو گا۔" میں اپنے مطلب پر آ گئی۔

"جی' جی ہے۔" وہ جھجکنے کے باوجود جھوٹ نہ بول سکا۔

"مجھے وجیہہ کا نمبر دے دو فضل۔" میں نے درخواست کے انداز میں کہا۔

"جی... وہ مالکوں نے مجھے اجازت نہیں دی۔" وہ اسی طرح سے بے دھڑک بولا۔

"کیا مطلب... وجیہہ نے تمہیں منع کیا تھا کہ تم مجھے بھی اس کا نمبر نہ دو۔" مجھے اپنی بے عزتی کا احساس ہو رہا تھا اس لیے میں ذرا غصے بولی۔

"جی... وہ ان کی مرضی... میری بھلا کیا مجال کہ میں ایسا سوچوں۔" وہ شرمندہ ہونے کے باوجود بہانہ نہ بنا رہا تھا بلکہ صاف کہتا جا رہا تھا۔

"لیکن تم پھر بھی مجھے اس کا نمبر دے دو۔ فضل! مجھے وجیہہ سے بات کرنی ہے اگر میں نے اس سے بات نہ کی تو میں مر جاؤں گی۔" میں اس سے التجا کرنے لگی۔

"مجھے کوئی اور حکم کریں دلنشیں بی بی! اگر یہ میرے بس میں نہیں مجھے آزمائش میں نہ ڈالیں۔" وہ اپنی مجبوری بتا رہا تھا لیکن میں اپنے دل کے ہاتھوں سے مجبور بھی کیا کرتی۔

"فضل! میرے بھائی! میری مدد کرو اللہ کے واسطے مجھے اس کا فون نمبر دے دو۔" میں سب کچھ بھول کر باقاعدہ منتیں کرنے لگی۔

"آپ نے مجھے بھائی کہا... آپ پر میری جان بھی قربان ہے۔" وہ گلوگیر آواز میں بولا۔

"تو پھر مجھے وجیہہ کا فون نمبر..."

"بی بی جی! میں جان ہار سکتا ہوں مگر قول نہیں... لاڈی سائیں نے وعدہ لیا تھا کہ میں خواہ کچھ بھی ہو ان کا پتا یا نمبر آپ کو نہیں دوں گا مجھے معاف کر دیں بی بی۔" اب وہ میرے سامنے التجا کر رہا تھا۔

"اچھا' تم یہ تو بتا دو کہ وہ کیسا ہے؟ کب آئے گا واپس؟" میں ہار کر ٹوٹنے لگی۔

"وہ بھی ٹھیک نہیں ہیں بی بی! اور جانے کب لوٹیں۔" وہ بتا رہا تھا۔

"وجیہہ ٹھیک نہیں ہے مگر کون ہے اس کے ساتھ۔" میں اس کا سوچ کر تڑپ اٹھی۔

"جی ان کے ساتھ سکندر ہے۔" اس نے ہمارے ڈرائیور کا نام لیا تو سکندر کا ہنستا مسکراتا چہرہ میری آنکھوں میں ابھرا... اور میرے جی کو ذرا سی تسلی ہوئی۔

"اچھا ٹھیک ہے فضل... لیکن تم سوچنا ضرور میرے بارے میں بھی سوچنا... میں بھی تمہاری طرح سے وجیہہ کو بہت چاہتی ہوں اور اس کے بغیر اب زندگی مجھے زیادہ دیر قبول نہ ہو گی۔" میں نے بڑے ہی دکھی اور جذباتی لہجے میں کہا۔

"جی اچھا جی... میں ضرور سوچوں گا مگر میں مالکوں کی مرضی کے بغیر... میں لاڈی سائیں کو آپ کا حال بتا دوں گا اور اگر انہوں نے اجازت دے دی تو پھر..." وہ ادھورے جملے پورے مفہوم کے ساتھ ادا کر رہا تھا۔

"ٹھیک ہے فضل اپنا اور شموں کا خیال رکھنا۔" میں نے ڈھیلے ڈھیلے لہجے میں کہا اور فون بند کر دیا۔ میری بندھی ہوئی امید میں ریخیں آ گئی تھیں اور وہ کمزور ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

میرا بخار اب اتر چکا تھا مگر مجھے کمزوری اور تھکن محسوس ہو رہی تھی اس لیے ابھی بستر سے نکلنے کو جی نہ چاہتا تھا میں ایسے ہی سستی سے لیٹی ہوئی تھی جب ابا جان میرے کمرے میں آ گئے۔

"عصمہ! بیٹے! اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" وہ پیار سے پوچھ رہے تھے۔

"جی اب تو بہتر ہوں۔" میں نے سیدھی ہو کر دوپٹہ سر پر لیتے ہوئے کہا۔

"چلو شکر ہے اللہ کا کہ اب تم ٹھیک ہو ورنہ میں اور تمہاری ماما تو ڈر ہی گئے تھے کہ یہ اچانک تمہیں کیا ہو گیا لگتا ہے تم نے اپنی نند کی موت کو دل پر لگا لیا ہے۔" وہ میرے پاس بیٹھ گئے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔

"ج... جی۔" میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"یہ باپ بیٹی میں کیا باتیں ہو رہی ہیں۔" ماما بھی وہیں میرے کمرے میں آ گئیں اور مسکراتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

"ارے نفیسہ! آ جاؤ تم بھی آ جاؤ... شکر ہے کہ تم نے بھی بستر چھوڑا ورنہ ایک طرف ماں اور دوسری طرف بیٹی بستر میں تو کھلا ہی گیا تھا۔" وہ ہنسنے لگے اور انہیں دیکھ کر ماما بھی۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ داماد جی کیسے ہیں؟ تمہاری تو بات ہوتی رہتی ہے نا؟" ابا جان نے ذرا سنجیدگی سے پوچھا۔

"جی... جی وہ ٹھیک ہے۔" میں نے بمشکل کہا۔

"عصمہ!" ابا جان نے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"جی ابا جان!" میرا دل ڈر رہا تھا کہ وہ اب کچھ اور پوچھیں گے اور یہی ہوا وہ پوچھنے لگے۔

"اب کیا ہوگا عصمہ؟ تم اس گھر میں تو واپس جا نہیں سکتیں جیسے حالات تم نے بتائے ہیں اور داماد جی ملک سے باہر ہیں۔ تو پھر اب تم لوگ...؟" وہ ادھوری بات چھوڑ کر میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگے اور میں مزید گھبرا گئی انہیں کیسے بتاتی کہ ابا جان! اب میں وجیہہ کے گھر تو کیا میں تو اس کی زندگی سے بھی نکال دی گئی ہوں۔

"اسے کہو بیٹا کہ وہ تمہیں بھی اپنے پاس بلا لے... یوں وہ وہاں پر اکیلا رہے اور تم یہاں یہ تو مناسب نہیں۔ میاں بیوی کو دکھ اور پریشانی کے دنوں میں ہمیشہ ساتھ ساتھ رہنا چاہیے۔ اس طرح دکھ کی شدت آدھی ہو کر کم رہ جاتی ہے یہاں تک کہ وہ مٹ جاتا ہے۔"

ماما مجھے سمجھا رہی تھیں میں تو خود ہی چاہتی تھی کہ میں پریشانی کے دنوں میں وجیہہ کے قریب رہوں۔ میں تو ہر وقت ہی وجیہہ کے قریب رہنا چاہتی تھی۔

"عصمہ! کیا ہوا بیٹی؟" ماما میرے چہرے پر لہراتے سیاہ سائے دیکھ کر پریشان تھیں۔

"کچھ نہیں ماما۔ بس میں بھی وجیہہ کی وجہ سے ہی پریشان ہوں۔" میں نے کہا اور سچ ہی کہا تھا۔

"وجیہہ کو سمجھاؤ اور زور دو کہ وہ تمہیں جلد از جلد اپنے پاس بلا لے۔" ابا جان نے اپنی بات دہرائی۔

"زور کیوں دینا عباسی صاحب! اگر وہ سہولت میں ہو گا تو خود ہی بلا لے گا وہ بھی جانے کس طرح سے وہاں رہ رہا ہو گا یہ ان زمینداروں کے یہی مسائل دیکھ کر تو جی ڈرتا ہے کہ ان میں زمین جائیداد کے جھگڑے اک دوجے کی جان کے بیری بنا دیتے ہیں، بہن بھائیوں کو۔" ماما نے اپنے خیالات کا برملا اظہار کیا۔

"ہاں یہ تو ہے۔ اچھا تم بچی کا دل پریشان نہ کرو اسے حوصلہ دو اور بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ تم کسی وقت وجیہہ بیٹے سے بات کر لو اور کہو کہ فکر نہ کرے عصمہ کو ہم خود بھیجنے کا انتظام کر دیتے ہیں اگر اس کا آنا ناممکن ہے تو۔" ابا جان نے میرے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔ میں ہی وجیہہ سے بات کر لوں گی اس کی بہن کی تعزیت بھی کرنی ہے بلکہ آپ کو چاہیے تھا کہ آپ اسے فون کرتے اور اس کی ماں کو بھی۔" ماما جان نے الٹا انہیں ہی کہنا شروع کر دیا۔

"نن نہیں ماما! آپ لوگ فون نہ کرنا۔" میں نے گھبرا کر کہا۔

"پتا نہیں ابھی حالات کیسے ہیں؟ ابھی تو وجیہہ مجھے بھی صرف SMS ہی کرتے ہیں بات نہیں کرتے۔"

میں نے ان دونوں کو سمجھایا جس پر وہ چپ کر گئے... پھر کچھ دیر ہم لوگ اکٹھے بیٹھے رہے اس کے بعد ماما اور ابا جان تو چلے گئے مگر میرے ذہن میں بہت سی باتیں چھوڑ گئے خاص طور پر ابا جان کی یہ بات کہ وہ مجھے وجیہہ کے پاس بھجوانے کا انتظام کر سکتے ہیں۔ اب مجھے کسی طرح سے وجیہہ کا پتا چلانا تھا کہ وہ کہاں ہے اور بس۔

میں سوچتے سوچتے بہت دور نکل گئی اپنے ہی خیالوں میں مست، وجیہہ کے پاس جیسے وہ مجھے دیکھتا ہے اور تڑپ کے آگے بڑھتا ہے۔

"مجھے معاف کر دینا ڈارلنگ میں مجبور تھا۔ میں نے مجبور ہو کر وہ خط لکھا تھا۔ ورنہ میں تو میں تو تم سے بے حد محبت کرتا ہوں۔" وہ مجھے گلے سے لگا کر رو رہا ہے اور میں اس کے آنسو صاف کرتی ہوئی کہتی ہوں۔

"مجھے یقین تھا وجیہہ! کہ تم مجھے پیار کرتے ہو اور مجھے چھوڑ نہیں سکتے۔"

☼ ☼ ☼

میری وہ ساری رات خیالوں اور خوابوں کی پگڈنڈیوں پر بھاگتے بھاگتے گرتے سنبھلتے گزر گئی۔ مجھے نیند نے چھوا تک نہ تھا پھر بھی میں نے کئی خواب دیکھ لیے تھے میرا ہر خیال، ہر خواب وجیہہ کو پا لینے پر ختم ہوا تھا یہاں تک کہ موذن نے اللہ کی بزرگی اور برتری کا اعلان کرنا شروع کر دیا۔

"بی بی جی! میں نے تو شموں کا سوال اپنے رب کے سامنے ڈال دیا ہے۔" فضل کی آواز نے میرے اعصاب کو جھنجھوڑ کر اٹھا دیا اور میں وضو کرنے چل دی۔

میرا مقصد نماز پڑھ کر اللہ سے یہ دعا مانگنا تھا کہ وہ وجیہہ کو مجھے لوٹا دے۔ آج میں اپنے اللہ کے حضور اس لیے جھک رہی تھی کہ اس سے اپنی غرض بیان کروں، فضل اتنے دعوے سے کہتا ہے کہ اللہ چاہے تو سب ممکن ہے۔

"اللہ راضی ہو گیا تو شموں میری طرف کھنچی چلی آئے گی۔"

شموں! جسے میں فضل سے زیادہ جانتی تھی اور اچھی طرح سے جانتی تھی کہ وہ صرف اور صرف وجیہہ کو چاہتی ہے اتنا چاہتی ہے کہ اس نے اپنا تن من کسی بھی نفع نقصان کا سوچے بغیر وجیہہ کو دان کر دیا تھا۔ جس نے وجیہہ کو راضی کرنے کے لیے مجھ سے بھی پیار کیا تھا۔

اور جس نے میری خاطر اپنی عزت، اپنی جان داؤ پر لگا کر خود کو زندہ درگور کروا لیا تھا مگر فضل کو پھر بھی امید تھی بلکہ یقین تھا کہ وہ شموں اک روز اس کی طرف کھنچی چلی آئے گی۔ اگر اللہ راضی ہو گیا تو؟

میں بھی تھکی تھکی سی اٹھی تھی اور وضو کر کے جائے نماز پر آ گئی تھی۔

آج میں کوئی پہلی بار نماز نہ پڑھ رہی تھی۔ نہ ہی میں ایسی تھی کہ مجھے اللہ وحدہ لا شریک و لازوال ذات کی قدرتوں پر کچھ شک تھا۔ (نعوذ باللہ) ایسا سوچنا بھی میرے لیے کفر تھا۔

بلکہ مجھے لگ رہا تھا کہ اللہ مجھ سے ناراض ہے تبھی وجیہہ بھی مجھ سے دور ہو گیا تھا لہٰذا میں اللہ کو راضی کر لوں تو وہ مجھے پھر سے مل جائے گا۔ ایک طرح سے میں وجیہہ کو مانگنے کے لیے اس کے در پر جھکی تھی۔

بس پھر تو میں نے اپنا آرام چین، سکھ اور نیندیں سب حرام کر دیں... میں نے گداز بستر اور گرم لحاف سے ناتا توڑ کے چٹائی سے رشتہ جوڑ لیا تھا پانچوں نمازیں میں اذان ہوتے ہی پڑھتی اور پھر تسبیحات اور وظائف شروع کر دیتی میں ماما سے یہی پوچھتی رہتی کہ اللہ کو منانے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ ماما نے مسکرا کر جواب دیا۔

"انسان اپنے رب کو خفا کرنے کے سارے کام چھوڑ دے وہ خود بہ خود راضی ہو جائے گا۔"

"اور ماما یہی تو میں پوچھ رہی ہوں کہ بندہ آخر کیا کرے... کہ وہ اس کی دعائیں سننے لگے۔" آج میں خود کو بہت اداس محسوس کر رہی تھی اس لیے عشاء کی نماز کے بعد آ کر ماما جان کے ساتھ لیٹ گئی۔

"دیکھو عصمہ! اگر تم اپنے اللہ سے محبت کرتی ہو تو اسے اندر محسوس کرنے کی کوشش کرو۔ وہ تمہارے اس قدر قریب ہے... جیسے یہ پھڑکتی ہوئی رگ کا ابھرنا اور ڈوبنا۔"

ماما نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی گردن کی دائیں جانب وہاں رکھ دیا جہاں ایک قدرے پھولی ہوئی رگ پھڑک رہی تھی بالکل اسی طرح سے جس طرح میرے سینے میں دھک دھک کرتا دل یقیناً" یہی شہ رگ تھی جس کے بارے میں میں نے سنا ضرور تھا مگر اسے محسوس آج کیا تھا میری انگلیاں جس کے پور اس رگ کی دھڑکنوں کو محسوس کر رہے تھے وہ ایک ہی لمحے میں سنسنا اٹھے اور میں نے اپنا ہاتھ ماما کی گردن سے کھینچ لیا۔

"ماما! مجھے نیند آ رہی ہے۔" پھر میں ان کے پاس زیادہ دیر لیٹ نہ سکی بہانے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہ رات بھی عجیب تھی میری انگلیاں بے ساختہ اٹھتیں اور جا کر میری گردن پر ٹھیک اسی جگہ ٹک جاتیں جہاں ماما نے اپنی گردن پر رکھی تھیں مجھے لگتا میری انگلیوں کی پوریں اس ٹک ٹک کرتی رگ کو چھو کر جیسے چارج ہو رہی ہوں اور میری دھڑکنیں ان پوروں پر آ کر دھڑکنے لگتیں اور ان کے ڈوبنے ابھرنے کے ساتھ ساتھ میں جینے اور مرنے کی کیفیت سے دوچار ہونے لگتی۔

تمام رات میرے ساتھ یہی کھیل جاری رہا میں تکیے پر سر رکھتی تو اس رگ کی ٹک ٹک میرے کانوں میں آ جاتی اٹھ کر بیٹھتی تو میرے پاؤں کے تلووں میں

گدگدی سی ہونے لگتی اور بستر چھوڑ کر کمرے میں چہل قدمی کرنے لگتی۔ مجھے صاف محسوس ہو رہا تھا میرے قدموں کے ساتھ ایک اور چاپ بھی ہے۔۔۔ میں قدم اٹھاتی تو وہ اٹھاتی اور میں زمین پر پاؤں رکھتی تو وہ چاپ زمین پر پڑتی۔ میں اتنا گھبرائی کہ خوفزدہ ہو کر کانپنے لگی۔ مجھے اپنے ساتھ کسی اور کی موجودگی کا احساس صاف طور پر تھا اور سردی کے باوجود میرے پسینے چھوٹ رہے تھے میں ہولے ہولے باتھ روم گئی اور وضو کرنے لگی۔

"سنو! یہ تم کیا کرتی ہو؟" وہ نادیدہ وجود سرگوشیاں کرنے لگا۔

"تمہیں ڈر لگتا ہے تو تم نماز کی طرف دوڑتی ہو۔
تمہیں کوئی یاد آتا ہے تو تم سجدے میں گرتی ہو۔
تم نے اپنی حاجت منوانی ہو تو ہاتھ دعا کے لیے اٹھاتی ہو۔ کیسی خود غرض اور عام سی ہو تم اور سوال کرتی ہو کہ رب کو کیسے پایا اور منایا جاتا ہے۔" کسی نے میرا مذاق اڑایا۔۔۔ میں سر سے پاؤں تک بھیگ گئی۔ مگر یہ پسینے بھی خوف کی بدولت تھے ندامت کے احساس کے نہ تھے میں تقریباً بھاگتی ہوئی آئی اور میں نے جائے نماز پر کھڑے ہو کر نفل نماز کی نیت باندھ لی۔

☼ ☼ ☼

اس وقت میں کچن میں تھی آج میں نے سوچا تھا کہ کھانا میں بناؤں گی کیا کرتی فراغت میں تو وقت اور بھی چیونٹی کی چال چلتا تھا میں اور نوراں ماسی اک دوسرے کی مدد کر رہی تھیں آج میں نے کھانے کا مینو اپنی مرضی کا بنایا تھا۔

دال چاول کے ساتھ 'سیخ کباب اور میٹھے میں رس ملائی۔ یہ مینو وجیہہ کے پسندیدہ کھانوں میں سے ایک تھا۔ وہ اگر گھر پر کھانا کھاتا تو ایک وقت دال چاول کے ساتھ کوئی سی ڈش خشک گوشت میں لیتا تھا کباب اسے ہر طرح کے پسند تھے یا پھر وہ یہ سویٹ ڈش بہت شوق سے کھاتا تھا جو شموں ہر وقت ہی تیار رکھا کرتی تھی۔

"شموں۔" مجھے شموں یاد آنے لگی جانے وہ کیسی ہو گی؟ اور اس نے فضل کو کیا جواب دیا ہو گا میں سوچنے لگی۔

"ارے بٹیا! دھیان کرو پیاز جل رہے ہیں۔" نوراں ماسی نے میرے قریب آ کر زور سے کہا اور چولہا بند کر دیا۔

"آں ہاں ' ہاں۔" میں نے دیکھا واقعی پیاز تو براؤن سے سیاہ ہو رہے تھے۔

"لاؤ ہم دوسری پیاز کاٹ دیں بلکہ آپ ہٹو ہم ہی تڑکا لگائے دیتے ہیں دال کو۔" نوراں ماسی نے مجھے نرمی سے ایک طرف کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں ' ہاں ماسی! آپ ہی لگا دیں تڑکا۔ میں سلاد بنا لیتی ہوں۔" میں نے بھی وہاں سے ہٹتے ہوئے کہا اور ایک طرف بیٹھ کر سلاد کاٹنے لگی۔ پیاز بہت کڑوی تھی چند ہی لمحوں میں میری آنکھیں جلنے لگیں اور میں سی سی کرنے لگی۔

"اے لو اب آنکھیں لال کیے دے رہی ہو۔" نوراں ماسی تڑکا لگا کر پلٹیں تو بولنے لگیں۔

"یہ بھی آپ کے بس کا روگ نہیں لاؤ ادھر کرو۔" انہوں نے چھری میرے ہاتھ سے لے لی اور آرام سے پیاز کاٹنے لگیں پتا نہیں ان کی آنکھوں سے پانی کیوں نہ نکلتا تھا میں انہیں حیرانی سے دیکھنے لگی۔

"عصمہ بی بی! باہر وہ آیا ہے وہ؟" اتنے میں چوکیدار چاچا نے کچن میں جھانکتے ہوئے بتایا۔

"کون آیا ہے؟" میں نے اپنے لرز جانے والے دل کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

"جی وہی جو آپ کو لے کر آیا تھا اور 'اور بعد میں بھی ایک روز آیا تھا آپ کا اٹیچی لے کر۔" چاچا نے مجھے یاد کرانا چاہا۔۔۔ اسے فضل کا نام یاد نہ آ رہا تھا۔

"فضل۔" میں نے کہا اور تیزی سے باہر کو بھاگی۔

"فضل آیا ہے تو ضرور وجیہہ کا کوئی پیغام لایا ہو گا وجیہہ کا پیغام۔" میں دیوانی ہو رہی تھی اور پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ گیٹ پر کھڑی تھی جہاں فضل اندر کی طرف کھڑا تھا۔

"السلام علیکم۔" مجھے دیکھتے ہی اس نے نظریں جھکا کر سلام کیا۔

"وعلیکم السلام! فضل کیسے ہو تم؟" میں نے اپنی بے ترتیب سانسیں درست کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"جی ٹھیک ہیں بی بی! اللہ کا بڑا کرم ہے۔" وہ ذرا سا مسکرایا۔

"اچھا آجاؤ۔۔۔ اندر ڈرائنگ روم میں آجاؤ۔ کوئی چائے پانی۔" میں نے اسے رسماً پوچھا وہ بے چارا ہر بار یہیں سے پلٹ جاتا تھا۔

"پھر کبھی سہی ابھی تو جلدی میں ہوں میں تو آپ کو لاڈی سائیں کا نمبر دینے آیا تھا۔" وہ مسکراتا ہوا مجھ پر ایک نظر ڈال کر مجھے خوشخبری دے رہا تھا۔

"وجیہہ کا فون نمبر۔" خوشی سے میرا برا حال ہو گیا اور مجھ سے پھر ایک لمحہ بھی صبر کرنا ناگزیر ہو گیا۔

"جی میں نے ان کو آپ کا حال سنا کر درخواست کی کہ وہ مجھے اجازت دیں کہ میں اپنی بہن کی اتنی معمولی سی خواہش پوری کر دوں۔" وہ بڑے ہی احترام سے مجھے بہن کہہ رہا تھا۔

"فضل بھائی۔۔۔ میں آپ کا یہ احسان کس طرح اتاروں گی۔" میں نے اس کے ہاتھ سے وہ کاغذ کا ٹکڑا پکڑتے ہوئے کہا جس پر وجیہہ کا موبائل نمبر درج تھا۔

"بہنیں تو بھائیوں کو فرمائشیں کرتی ہیں ترلے تھوڑی ڈالتی ہیں جیسے آپ نے اس روز ڈالے تھے سچ میرا جی بہت زخمی ہوا تھا کہ آپ کو میرے سامنے یوں۔" وہ تھوڑی سی ناراضی سے بولا اور تھوڑے سے مان سے مجھے اس وقت وہ سادہ سا آدمی اپنا ماں جایا ہی لگا۔

"اور بھائی کیا اپنی بہنوں پر احسان کر سکتے ہیں ان کا تو فرض ہوتا ہے بہنوں کو سکھ دینا۔ اب آپ تنہا نہیں ہو اس زمین پر مالک نے ایک بھائی کی نعمت آپ کو دے دی ہے اور مجھ سی کمین کم نصیب کو رب نے اپنی رحمت سے نوازا ہے جو آپ جیسی بہن مجھے مل گئی۔" وہ جذبوں سے اتنا کر رہا تھا یہ اس کے کانپتے ہوئے لہجے اور بھیگی ہوئی آواز سے صاف پتا لگ رہا تھا۔

"آپ لاڈی سائیں سے بات کر لیں۔۔۔ میں پھر حاضر ہو جاؤں گا۔" وہ مجھے کشمکش و پیچ میں دیکھ کر پلٹتے ہوئے بولا۔

"بھائی۔۔۔ نہیں نہیں بلکہ فضل بھاجی پھر کب آؤ گے؟" میں نے اسی کی زبان اور لہجے میں کہا تو وہ خوش ہو کر ہنس پڑا اور میرے سر پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔

"جب بھی آپ یاد کرو گی۔"

"آپ جناب نہیں تم بلکہ تو کہو بھاجی!" میں نے اس کا ہاتھ عقیدت و احترام سے تھام لیا۔

"کیا اپنے بھاجی کو آج ہی مار دو گی اتنا پیار دے کے۔" اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھڑایا اور تیزی سے مجھے "رب راکھا" کہتے ہوئے گیٹ سے نکل گیا۔

"اللہ کی امان میں۔۔۔ میرے بھائی۔" میں نے اس کی پشت پر اسے دعا میں دی اور اپنی نم آنکھیں صاف کرتی ہوئی واپس اپنے کمرے کی طرف بھاگی اب میری آنکھیں فضل کی محبت پا کر بھیگ گئی تھیں یا وجیہہ کے فون نمبر ملنے کی خوشی میں۔۔۔ یہ سوچنے کی مجھے اس وقت ضرورت بھی نہ تھی اور نا ہی میرے پاس اب وقت تھا۔۔۔ مجھے تو وجیہہ کو فون کرنا تھا۔

☼ ☼ ☼

"وجیہہ کا موبائل نمبر میرے وجیہہ کا۔" میں اپنی دیوانگی میں ایک بچی کی طرح خوش ہو رہی تھی جسے عین اس وقت چاکلیٹ کا ایک بڑا ڈبا مل گیا ہو جب اس نے محض سوچا ہی ہو کہ وہ چاکلیٹ کھائے۔ میں نے بھی تو وجیہہ کے فون نمبر کے مل جانے کے لیے چند ہی دعائیں مانگی تھیں۔

چند آنسو ہی تو بہائے تھے اس کے حضور۔
اور چند ہی نوافل تو ادا کیے تھے۔

اور اس نے میری سن لی' میری دعا قبول ہو گئی تھی' وہ میری حالت کو جان رہا تھا' وہ میرے گریے دیکھ رہا تھا اور وہ میری التجائیں سن رہا تھا کتنا اچھا تھا میرا اللہ' کتنا مہربان میں نے اس کاغذ کے ٹکڑے کو ہونٹوں سے لگایا پھر

آنکھوں سے اور پھر اپنے سینے سے۔

"وجیہہ! میرے وجیہہ۔" میرے اندر باہر شور مچ گیا ۔۔۔ میں نے اپنا موبائل اٹھایا اور اس نمبر کو فیڈ کرنے لگی جو مجھے فضل بھا نے دیا تھا تبھی میری انگلیوں کے پور جل اٹھے اور میرے لہو میں شعلے سے لپکنے لگے کسی کے نادیدہ لب میرے کانوں کے قریب آ گئے۔

"پہلے اپنے اس مہربان دوست کا شکریہ تو ادا کر دو جس کی مہربانی سے یہ نمبر تمہیں ملا ہے۔" ایک سرگوشی میری سماعتوں سے میرے دل کے صحن میں اتری اور وہاں کھلے ہوئے خواہشوں کے رنگ برنگے پھول جیسے پل بھر کے لیے جھلس سے گئے۔

"پہلے وجیہہ کو فون تو کر لوں۔ کتنے دنوں سے میرے کانوں نے اس کی آواز نہیں سنی۔" میں نے اس سرگوشی کا جواب دیا۔

"اچھا دیکھ لو تمہاری مرضی ہے، یہ نمبر تو اب تم نے فیڈ کر ہی لیا ہے یہ تو محفوظ ہو گیا۔ اچھا کیا تم یہ نہیں چاہو گی کہ وجیہہ تم سے کوئی امید افزا بات کرے۔" وہ سرگوشی مسلسل میرے کان میں ہو رہی تھی۔

"امید افزا بات۔۔۔؟"

میں نے اپنے صحن دل میں سر نیہوڑائے کھڑے ان پھولوں کو دیکھ کر سوچا۔

"ہاں، ہاں وجیہہ کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔ وہ یہی تو بتائے گا کہ وہ بھی میرے بغیر بے کل ہے اور تڑپ رہا ہے۔" وہ پھول ذرا سی ترچھی نگاہیں مجھ پر ڈالتے ہوئے سیدھے ہونے لگے۔

"ضروری تو نہیں، وہ اس کے برعکس بھی تو کہہ سکتا ہے۔" کوئی میری گردن پر ہاتھ رکھ کر بولا تو وہ پھولی ہوئی رگ لحہ بھر کو دب گئی اور میرا دم گھٹنے لگا۔

"اللہ نہ کرے ایسا ہو، اللہ نہ کرے۔" میں نے ایک جھرجھری سی لی اور اپنا موبائل سیٹ ایک طرف رکھ کر دو نفل شکرانے کے ادا کرنے کے لیے کھڑی ہو گئی۔

❋ ❋ ❋

"ت۔۔۔ج۔۔۔ی۔۔۔ی۔۔۔ہ۔"

"وجیہہ۔۔۔" میرے لبوں سے صرف سسکیاں نکل رہی تھیں جنہیں وہ دوسری جانب یقیناً سن رہا تھا اسی لیے تو تڑپ کے بولا تھا۔

"عصمہ! دیکھو! ایسا مت کرو۔ چپ کرو پلیز چپ کرو۔"

"وجیہہ! تم نے ایسا کیوں لکھا۔۔۔ کہہ دو کہ تم نے دل سے نہیں کہا۔ تم مجبور تھے۔" میں اس سے پوچھنے کی بجائے اسے ایسا ہی کہنے پر اکسا رہی تھی۔

"عصمہ! سنو! سمجھو ہمیں زندگی میں بہت سی تلخ حقیقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے بھلے ہم میں انہیں برداشت کرنے کی قوت ہو یا نہ ہو۔" اس کا لہجہ بے حد ٹوٹا ہوا تھا میں سمجھ سکتی تھی کہ وہ خود اس وقت کس کرب سے گزر رہا ہے۔

"وجیہہ! مجھے کچھ بھی اور نہیں سننا نہ ہی برداشت کرنا ہے مجھے صرف اور صرف تمہارے ساتھ رہنا ہے میں، میں تمہارے بغیر نہیں جی سکتی مر جاؤں گی یقین کرو وجیہہ میں مر جاؤں گی۔" میں جو کہہ رہی تھی وہ پورے سچ کے ساتھ کہہ رہی تھی میرے لیے وجیہہ کے بغیر جینا ممکن تھا ہی نہیں۔

"عصمہ!"

"دلنشیں کہو وجیہہ۔" مجھے اس کا عصمہ کہنا اچھا نہ لگ رہا تھا۔۔۔ میں نے اسے ٹوک دیا۔

"عصمہ! میں نے جو کیا وہ میرے لیے ایک قیامت سے گزرنے کے مترادف ہی تھا مگر اب تو وہ قیامت برپا ہو چکی ہے ہماری محبت کی دنیا اب اس زمین پر دوبارہ آباد نہیں ہو سکتی۔ تم سمجھو اس بات کو تسلیم کرو۔ اللہ کے واسطے۔" وہ مجھے اس طرح سے بہلا رہا تھا جیسے کسی بچے کو سمجھاتے ہیں جو کسی خطرناک چیز کو چھونے کی ضد کر رہا ہو۔

"وجیہہ! ایک بار پھر کہو کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔" میں اس کی نصیحتوں کو نظر انداز کر کے صرف اپنے دل کے کہے پر قائم تھی۔

"ہاں مجھے تم سے محبت ہے مجھے تم سے محبت تھی مگر، محبت اب کوئی وصل نہیں پا سکتی۔ وہ قربتیں

اب ہمارا مقدر نہیں رہیں۔۔۔ اس حقیقت کو ہمیں بہرحال ماننا ہو گا۔"

"وجیہہ! ابھی زندگی باقی ہے۔۔۔ ہم زندہ ہیں تو بھلا ہمارا ملنا ناممکن کیونکر ہو سکتا ہے؟" الٹا میں اسے سمجھانے لگی۔

"یہ اب اتنا آسان نہیں رہا عصمہ۔"

"تو مشکل کہو، ناممکن تو نہ کہو۔"

"میں اک قیامت کے بعد دوسری قیامت کا متحمل نہیں ہو سکتا عصمہ! مجھے مت آزماؤ۔" وہ خود اک کشمکش کا شکار تھا۔

"دیکھو! وجیہہ تم سوچو تو سہی۔۔۔ ہم پھر مل سکتے ہیں۔" میں نے اسے نرم پڑتے دیکھ کر دوبارہ چوٹ ماری۔

"کیسے، کیسے عصمہ؟" وہ الجھ رہا تھا۔

"تم صرف ایک بار کہہ دو کہ تم بھی میرے بغیر نہیں رہ سکتے۔۔۔ باقی تم تک آنے کا راستہ میں خود تلاش کر لوں گی۔" میں نے اس کا سہارا اسے تھامتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں تو تمہیں طلاق۔۔۔"

"مت کہو اللہ کے واسطے مت کہو۔۔۔ بھول جاؤ بھلا دو۔" میں نے تڑپ کر اس کی زبان کی نوک تھام لی۔

"وجیہہ! میں نے ابھی کسی کو یہ نہیں بتایا۔ یہ قیامت صرف میرے اور تمہارے اوپر بیتی ہے۔" میں اسے بتا رہی تھی۔

"مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے ہم اسے چھپائیں یا ظاہر کریں۔ اب جو میں نے کہہ دیا جو لکھ دیا وہ تو ثابت ہے حق ہے اور میں اس سے کس طرح پھر جاؤں؟" اسے کوئی چارہ نظر نہ آ رہا تھا وہ بے حد پریشان تھا۔

"اچھا تم مجھے یہ بتاؤ کہ اگر میں تمہیں دوبارہ سے مل جاؤں تو تم۔۔۔"

"کاش۔۔۔! کاش ایسا ہو سکتا۔۔۔ مگر اب یہ ممکن نہیں عصمہ؟" وہ رو رہا تھا۔

"کاش! میں اس وقت سوچ لیتا۔۔۔ مگر میں کیا کرتا میرے پاس بھی تو سوائے اس کے کوئی اور چارہ نہ تھا۔ میرے سامنے صرف ایک ہی بات رکھی گئی تھی یا تو میں تمہاری جان لے لوں یا پھر تمہیں طلاق دے دوں تو پھر میں کیا کرتا۔۔۔ کیا کرتا؟" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور میری جان پر بن گئی۔

"وجیہہ تم نے مجھے مجبوری میں طلاق دی ہے اور میرا دل کہتا ہے کہ یہ واقع نہیں ہوئی ہو گی ہمیں کسی عالم دین سے مشورہ کرنا چاہیے۔" میں نے اسے صلاح دی۔

"عالم دین سے مشورہ۔۔۔" وہ بھی سوچ میں پڑ گیا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں عالم دین سے مشورہ۔۔۔ مجھے امید ہے کہ ہمارے لیے کوئی نا کوئی گنجائش کی راہ ضرور کھلی ہو گی۔"

اب میں اسے امید دلا رہی تھی، جس پر وہ بھی کچھ پسیج گیا۔

"اچھا میں بھی کسی سے پوچھتا ہوں تم بھی پتا کرو۔" وہ راضی ہو گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ میرا بھروسہ میرا یقین پکا تھا میری محبت سچی تھی کہ اگر میں اس قدر بے چین تھی تو اسے بھی قرار کہاں نصیب تھا۔

اگر میں اس پر مرتی تھی تو اس کی بھی تو جان مجھ میں اٹکی ہوئی تھی۔

"وجیہہ!"

"ہاں دلنشیں۔۔۔"

"تم نے مجھے دلنشیں کہا وجیہہ۔" میں اس کے لبوں سے دوبارہ وہ نام سن کر خوشی سے پاگل ہو گئی جو اس نے مجھے سہاگ رات کے تحفے میں دیا تھا۔

"آئی لو یو۔" میں اس کی محبت کی شدت میں شرابور ہو گئی۔

"I Love you too۔" میرے وجیہہ کا لہجہ مجھے دوبارہ سنائی دیا اور میرے قدم زمین سے اٹھنے لگے۔

"اپنا خیال رکھنا وجیہہ۔"

"تم بھی دلنشیں۔" وہ میری فکر میں ٹھیک ویسا ہی

بے تاب تھا جیسی اس کی عادت تھی۔

"اب موبائل بند مت کر دینا۔" میں نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"ہرگز نہیں۔" اس کی آواز کا بھاری پن بھی شوخی میں بدل گیا۔

"شب بخیر۔"

"شب بخیر۔" ہم دونوں نے فون بند کر دیے۔

☼ ☼ ☼

میں دوبارہ سے خوش تھی میری دعائیں واقعی قبول ہونے لگی تھیں مجھے تو اب اپنے اللہ پر اور بھی پیار آنے لگا تھا کیسے وہ مجھ پر اپنی عنایتیں کرتا جا رہا تھا یقیناً میں نے اللہ کو منانے کا گر پا لیا تھا اور اللہ کو پانے اور منائے رکھنے کا گر ویسے بھی کون سا مشکل تھا۔

اللہ کو ایک مانو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا آخری نبی اور رسول مان کر دل و جان سے اس پر ایمان لاؤ۔

نماز پڑھو' روزے رکھو' زکوٰۃ دو اور اگر اللہ توفیق دے تو اس کے گھر کا طواف یعنی حج کرو۔

یہی تو تھا دین اسلام بالکل سادہ اور آسان اور ان سب کے ساتھ ایک چیز جو بے حد لازم تھی وہ تھی اللہ کے بندوں سے بے غرض محبت یعنی حقوق العباد میں نے یہ سارے کام باقاعدگی سے کرنے شروع کر دیے تھے۔

میں ہر وقت اللہ کو یاد کرتی تھی میری زبان پر کوئی نہ کوئی دعا یا سورۃ رہتی تھی میں نے درود پاک بھی کثرت سے پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اپنے آپ سے ایک عہد کر لیا تھا کہ اب نماز قضا نہیں کرنی خواہ کچھ بھی ہو بلکہ فرض نمازوں کے ساتھ ساتھ میں تو نوافل کا اہتمام بھی کرنے لگی تھی۔

روزہ تو میں نے کبھی بچپن میں بھی نہیں چھوڑا تھا اور حج کی نیت میری پکی تھی کہ میں اور وجیہہ تجدید نکاح کرتے ہی حج کرنے جائیں گے زکوٰۃ اور اللہ کی راہ پر مال خرچ کرنے کی عادت تو جیسا میں نے اپنے والدین میں پایا تھا اس سے بڑھ کر وجیہہ کو دیکھا تھا دوسروں کی مدد کرنا' کسی کا دل نہ دکھانا' خیال رکھنا وغیرہ وغیرہ۔ ارے میں تو پکی اور سچی مسلمان تھی اور اب تو اور بھی صفات مجھ میں آتی جا رہی تھیں میں اپنا ایک مکمل جائزہ لے کر ہٹی تو بے حد مطمئن اور خوش تھی وجیہہ کا حصول مجھے اب ہرگز بھی مشکل دکھائی نہ دے رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ماما! مجھے آج شموں سے ملنے جانا ہے چلی جاؤں؟" میں تیار ہو کر آئی تو ماما سے پوچھنے لگی۔

"شموں سے؟" ماما کچھ پریشان ہو گئیں۔

"ماما! وہ یہیں شہر میں ہے اور بہت بیمار ہے۔" میں نے ان کی پریشانی دور کرنے کو وضاحت کی۔

"بیمار ہے اچھا' اچھا چلی جاؤ مگر جاؤ گی کیسے؟" وہ ایک پریشانی سے نکل کر دوسری میں پڑ گئیں۔

"ماما جی! فضل بھائی مجھے لے جائیں گے آ کر۔ آپ فکر نہ کریں اور وہی چھوڑ جائیں گے۔" میں نے ماما کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور پیار سے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے مگر جانے سے پہلے پھر بھی وجیہہ کو فون کر کے بتا دینا اور جلدی واپس آ جانا؟" وہ نصیحت کرنے لگیں۔

"جی اچھا آپ فکر نہ کریں۔" میں نے انہیں تسلی دی۔

کچھ ہی دیر کے بعد فضل مجھے لینے آ گیا تھا میں نے اسے فون جو کر دیا تھا۔

"السلام علیکم کیسی ہے میری بہن؟" اس نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"بھائی! میں اللہ کے کرم سے بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"لگتا ہے لاڈی سائیں سے بات ہو گئی ہے تبھی تو میری بہن کے چہرے پر اطمینان کی مسکراہٹ دکھائی دے رہی ہے۔" وہ میرے چہرے کو ایسی محبت سے دیکھ رہا تھا جس میں احترام اور عزت تھی میں نے سر

اقرار میں ہلا کر اسے بتایا کہ ہاں وجیہہ سے میری بات ہو گئی ہے۔

"اچھا میں ماں جی کو سلام کر لوں؟" وہ مجھ سے درخواست کر رہا تھا۔

"ارے بھائی! ضرور آئیے نا۔" میں انہیں لے کر اندر کی طرف بڑھ گئی جہاں ماما موجود تھیں وہ بھی فضل سے مل کر بہت خوش ہوئیں ایک تو میں نے فضل کا ذکر ان سے اتنا زیادہ اور اچھا کیا ہوا تھا' دوسرا وہ اسے ملتے ہی پہچان بھی گئی تھیں میں اس بات پر اکثر حیران ہوتی تھی کہ ماما کسی بھی ملنے والے کا چہرہ دیکھ کر کیسے کہہ دیا کرتی تھیں۔

یہ نیک اور مخلص ہو گا اور یہ اچھا ثابت نہیں ہو گا۔ خواہ وہ کسی سے پہلی بار ہی مل رہی ہوتیں جیسے انہوں نے وجیہہ سے ملنے کے بعد کہہ دیا تھا کہ

"عصمہ! اس شخص کے اطوار بتاتے ہیں کہ یہ متلون مزاج ہیں۔۔۔ تم اس کا خیال اپنے دل سے نکال دو۔ ورنہ ایک دن روؤ گی بیٹھ کر۔" مجھے ان کے دیے ہوئے یہ تاثرات اس روز بھی بہت برے لگے تھے اور آج اچانک اور نادانستہ طور پر یاد آ جانے پر پھر میرا دل دکھی ہو گیا تھا۔

"ضروری تو نہیں ماما کا ہر اندازہ درست ہو جیسا کہ وجیہہ کے بارے میں غلط تھا۔" میں نے ایک زعم سے ہونہہ کیا۔

"عصمہ! جلدی واپس آ جانا۔" انہوں نے پھر مجھے یاد کرانے کو دہرایا۔

"جی ماما۔" میں نے پھر اسی سعادت مندی سے کہا اور فضل کے ساتھ جا کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

"فضل بھائی! کیا آپ کسی عالم دین کو جانتے ہیں؟" میں نے تھوڑی دور تک تو فضل سے شموں کا حال چال پوچھا پھر اصل بات کی طرف آ گئی۔

"عالم دین۔" فضل نے زیر لب دہرایا اور پھر ایک معنی خیز نظر مجھ پر ڈالی۔

"مجھے ان سے کچھ پوچھنا ہے۔" میں نے فوراً نظریں چرا کر کہا۔

"سب سے پہلی شوریٰ تو خود ہمارے باطن میں موجود ہوتی ہے اور وہ ہمیں کم از کم صحیح اور غلط سمت کا تعین ضرور کروا سکتی ہے۔ بہتر ہے کہ انسان پہلے اپنے آپ سے مشورہ کرے اگر دل میں کچھ کھٹک ہو تو سمجھے وہ راہ کھوٹی ہے جس پر وہ جانا چاہتا ہے اگر اندر سکون اور روشنی ہو تو پھر آگے بڑھ کر باہر والوں سے مشورے اور فتوے ضرور لے۔۔۔۔ علم حاصل کرے راہنمائی لے۔" فضل اپنے مخصوص انداز میں مجھے سمجھانے لگا۔

"میرے اندر کوئی کھٹک نہیں ہے فضل بھائی۔" میں نے بغیر اپنے اندر جھانکے جھٹ سے کہہ دیا۔ جس پر فضل نے گاڑی کو ایک دم سے فل بریک لگا دی۔ گاڑی کے ٹائر چرچرائے اور وہ ایک جھٹکے سے رک گئی۔

اب فضل میری طرف دیکھ رہا تھا اور میں جانے کیوں پانی پانی ہوتی جا رہی تھی۔

"اگر میری بہن برا نہ منائے تو ہم کچھ دیر کے لیے گھر چلیں۔۔۔ میرے غریب خانے پر تم بس ایک کپ چائے کا پی لینا اور میں اتنے میں اس عالم دین کا پتا کر لوں گا جسے میرا ایک دوست بہت اچھی طرح سے جانتا ہے۔ بلکہ اس کی تو اچھی خاصی سلام دعا ہے اس سے۔" فضل نے بڑی نرمی سے کہا۔ اس کے لہجے میں کہیں کوئی خفگی یا کسی اور بات کے جاننے کے اثرات نہ تھے۔

"ٹھیک ہے فضل بھائی۔" میں نے ڈھیلے سے انداز میں کہا اور فضل نے گاڑی کو دوبارہ اسٹارٹ کر کے موڑ لیا۔ کچھ ہی دیر کے بعد ہم ایک قدرے غیر آباد علاقے میں تھے جہاں فاصلے فاصلے پر کچے پکے سے گھر تھے تھوڑا آگے جا کر فضل نے ایک دروازے پر گاڑی روک دی۔

"تمہارے بھائی کا غریب خانہ آ گیا ہے۔" فضل نے دوسری طرف سے آ کر گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا میں ذرا جھجکتے ہوئے گاڑی سے نیچے اتر آئی ہڈیوں کا وہ ڈھانچہ شموں ہی تھی' جسے دیکھ کر میری چیخ

نکلتے نکلتے رہ گئی۔

"دلنشیں بی بی!" وہ گرم جوشی سے میری طرف بڑھی اور مجھے اپنے ساتھ لگا کر بھینچ لیا۔ اس کے وجود میں سوائے نوکیلی ہڈیوں کے واقعی کچھ نہ تھا۔ اس کے نرم و گداز جسم کی ساری بہاریں خزاں ہو چکی تھیں۔

"شموں! یہ تم ہو؟" میں نے اسے کندھوں سے تھام کر اپنے سامنے کیا۔ اس کی ستارہ سی آنکھوں کی چمک اب کوند کوند نہ پڑتی تھی، بلکہ دو سیاہ گہرے گڑھوں کے بیچ ہلکی سفیدی تھی جو ٹمٹما کر اپنے ہونے کا پتا دیتی تھی۔

"میں ہی ہوں دلنشیں بی بی!" اس نے مسکرا کر مجھے یقین دلانے کی کوشش کی۔

"ماشاء اللہ سے آپ تو اور بھی پیاری ہو رہی ہیں۔" وہ میری طرف پیار سے دیکھتی ہوئی میری تعریف کر رہی تھی۔

"کیا واقعی؟" مجھے اس کی تعریف پر یقین نہ آیا۔ میں تو خود جس قیامت سے گزر رہی تھی وہ شموں پر ٹوٹنے والے عذاب سے کہیں سخت تھی۔ مجھے تو خود رونے سے فرصت نہ تھی۔ نہ میں کھاتی، نہ خوش ہوتی تھی، پھر بھی شموں کہہ رہی تھی کہ میں پہلے سے بھی زیادہ پیاری ہو رہی ہوں، وہ یقیناً اپنی محبت میں کہہ رہی ہوگی۔

"کیا ہوا دلنشیں بی بی؟" اس نے مجھے کرسی پر بٹھا کر میری آنکھوں میں جھانکا۔

"کک... کچھ نہیں شموں۔" میں نے نظریں پھیر لیں۔ میں جانتی تھی کہ وہ اگر چند پل بھی میری آنکھوں میں دیکھ لے گی تو میرے اندر کے سارے راز جان لے گی۔

"اوہ... ہاں... یہ محبت بھی نا بندے کو ادھ موا کر کے رکھ دیتی ہے... زندوں میں رہنے دیتی ہے نہ مردوں میں۔" اس نے ایک سرد آہ کھینچتے ہوئے کہا۔

"لالڈی سائیں کیسے ہیں بی بی سین، آپ کی تو روز فون پر بات ہوتی ہوگی۔ وہ ٹھیک تو ہیں نا۔" اسے فوراً ہی وجیہہ کی فکر نے آن گھیرا۔

"آں... ہاں... ہاں وہ ٹھیک ہے بالکل ٹھیک، روز بات ہوتی ہے ہماری۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"روز بات ہوتی ہے، ان کی آواز، ان کی باتیں، ان کی ہنسی، آپ تو روز سنتی ہوں گی۔" وہ ایک دیوانی کی طرح مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی۔

آج وہ وجیہہ کے بارے میں جس انداز سے بات کر رہی تھی پہلے تو کبھی وہ ایسی بے باک، ایسی جرات مند نہ ہوئی تھی۔ مجھے آج بھی کچھ اچھا نہ لگا۔ میرے اندر اک جلن ہو رہی تھی۔

"پانی... پانی دینا شموں...." میرے حلق میں بیچ بیچ کانٹے چبھنے لگے تھے۔

"شموں! شموں! یہ لے ٹھنڈی بوتل، گلاس میں ڈال، جلدی کر۔" فضل نے اندر آتے ہوئے کوک کی بوتل شموں کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ شموں وہ بوتل گلاس میں ڈال کر لائی اور میں نے بلا تکلف اسے غٹ غٹ پی لیا۔

"فضل بھائی! چلیں۔" وہ وہاں سے اٹھنا چاہتی تھی، بلا کر ابھی تو آئی تھی۔

"ابھی بس دس منٹ ٹھہر جاؤ میرا دوست آرہا ہے جب وہ ہمارے ساتھ چلے گا نا۔" فضل نے مجھے سمجھایا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" میں ناچار دوبارہ بیٹھ گئی۔

"اچھا تو شموں اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟" میں نے اپنا وقت گزارنے اور اس کا دھیان بٹانے کو پوچھا، وہ تو مجھے ہی دیکھے چلی جا رہی تھی، اور مجھے اس کی آنکھیں اپنے لہو میں سرکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں، اس کے وجود کی ہڈیوں کی طرح شاید اس کی آنکھوں کے بھی کونے نکل آئے تھے، وہ میرے اندر چھید کر رہی تھیں۔

"میرے ارادے پر بھلا میرا کیا اختیار... کسی کا بھی نہیں ہوتا، ہم اپنے بس میں خود نہیں ہوتے، ہاں ہم پر کسی کا بس ہو جاتا ہے، ہم ضرور کسی نا کسی کے اختیار میں چلے جاتے ہیں اک دن۔" وہ کھوئی کھوئی سی بولی۔

"میرا مطلب ہے کہ تم شادی کر لو، دیکھو! فضل بھائی بہت اچھے انسان ہیں، تمہیں بہت خوش رکھیں

گے، تم ان سے شادی کر لو۔" میں نے ایک دم سے کہہ دیا یونہی بے ساختہ ہی۔

"شادی کر لوں، فضل سے، کیوں؟" اس نے الٹا مجھ سے ہی پوچھ لیا۔ ایک ایسا کیوں اس نے میری طرف لوٹا دیا جس کا جواب میرے پاس فی الحال تو یہ ہی تھا کہ۔

"فضل ایک اچھا انسان ہے، یہ اچھا شوہر ثابت ہوگا۔" میں نے پھر وہی بات دوسرے انداز میں کی۔

"فضل کو مجھ سے محبت ہے، وہ یقیناً میرا اچھا شوہر ثابت ہوگا۔ مگر میں اپنا کیا کروں... مجھے فضل سے صرف ہمدردی ہے، میں اچھی بیوی کیسے بن سکتی ہوں۔" اس نے پھر اسی جرات سے سچ بولا، میں دیکھ رہی تھی شموں میں جرات اور ہمت بہت تھی، اور ہمیشہ سے تھی اور میں ہمیشہ سے اسی فقدان کا شکار رہی، میں نے تو ہمیشہ ہی اپنے کمزور پہلوؤں کو چھپانے کے لیے حیلے بہانوں اور جھوٹ سے کام لیا تھا۔

"میرا دوست آگیا ہے دلنشیں بہن! آو چلیں۔" فضل نے آکر بتایا تو میں فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا شموں میں پھر آؤں گی۔" میں نے اسے گلے سے لگایا۔

"لالڈی سائیں کو میرا بھی سلام کہہ دینا۔" وہ میرے ہاتھ کو آنکھوں سے لگاتی ہوئی بولی۔

"اچھا کہہ دوں گی۔" میں نے برے سے دل سے کہا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

ہم ایک جامعہ مسجد کے امام کے پاس آگئے تھے۔ وہ ایک نامور عالم دین بھی تھے، اونچا قد، سفید داڑھی اور بارعب شخصیت، ان کے چہرے پر اک کشش تھی، مقناطیسی کشش، میری نگاہیں ان پر پڑیں تو میرا دل ہی بیٹھنے لگا۔

فضل اور اس کا دوست باہر بیٹھے تھے اور وہ چہرہ اور نگاہیں سامنے دیوار پر ٹکائے مجھ سے مخاطب تھے۔

"دیکھو بیٹی! جو بات تم نے بتائی ہے اس کی روشنی میں یقیناً تمہارے ساتھ بہت زیادتی اور ظلم ہوا ہے

ویسے طلاق تو خود ایک عظیم درجے کا ظلم ہے۔ یہ کبھی مرد عورت پر ڈھاتا ہے اور کبھی عورت خود اسے اپنے لیے لازم کر لیتی ہے، دونوں صورتوں میں یہ برباد کر دینے والا عمل ہے، دو دلوں کو جدا کر کے دو خاندانوں کو کاٹ دینے والا۔ ہمارے خاندانی نظام کو برباد کر کے اجاڑ دینے والا عمل ہے یہ۔" وہ دھیمے لہجے میں بڑی متانت اور سنجیدگی سے گویا تھے۔

"اس لیے تو اللہ تعالیٰ کو حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہی ہے۔" وہ مجھے سمجھا رہے تھے اور میرے دل میں اگنے والے وہ خودرو پھول مرجھائے جا رہے تھے۔

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼

رمشا خالد

"ارے ڈاکٹر مہران! آپ اس وقت اسپتال میں' آپ کی تو نائٹ ڈیوٹی تھی نا' کیا گھر نہیں گئے؟" ڈاکٹر عمیر صبح اسپتال آئے تو اسٹاف روم خالی تھا' سوائے کونے والی کرسی کے جہاں چہرے پر تھکن سجائے ڈاکٹر مہران اونگھنے میں مشغول تھے۔

"کہاں یار' نائٹ ڈیوٹی سے فارغ ہوا تو سرجن صاحب نے میٹنگ میں بلالیا' ابھی کچھ دیر پہلے ہی فارغ ہوا ہوں' گھر فون کردیا ہے' ڈرائیور لینے آتا ہی ہوگا۔" بھرپور انگڑائی لیتے ہوئے ڈاکٹر مہران نے تفصیلی جواب دیا' اور اپنی نیند سے بند ہوتی آنکھوں کو بمشکل کھول کر سیدھے ہو کر بیٹھے۔

"ڈاکٹر مہران! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" ڈاکٹر عمیر نے ان کی ضرورت سے زیادہ سرخ ہوتی نگاہوں کو دیکھ کر استفسار کیا۔

"کچھ نہیں یار' بس ذرا معمولی سا ٹمپریچر ہے ان شاء اللہ رات تک ٹھیک ہوجائے گا۔" ڈاکٹر مہران نے لاپروائی سے جواب دے کر اور بات چھیڑ دی۔ مبادا ڈاکٹر عمیر میڈیسن ہی نہ منگوالیں' کیونکہ ڈاکٹر ہونے کے باوجود وہ انجکشن اور ڈرپ بڑے آرام سے لگوالیتے تھے۔ مگر میڈیسن سے ان کی جان جاتی تھی۔

"اچھا بھئی اب میں چلتا ہوں' ان شاء اللہ رات کو ملاقات ہوگی۔" کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد' اپنے موبائل پر ڈرائیور کی مس کال دیکھ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ارے' آپ کو تو کافی ٹمپریچر ہو رہا ہے' تو کیا آپ رات کو ڈیوٹی پر آئیں گے۔" ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے ڈاکٹر عمیر حیرت کا اظہار کیے بنا نہ رہ سکے' ان کا ہاتھ بہت گرم تھا۔

"ڈاکٹر عمیر! طبیعت صرف میری ہی نہیں ان مریضوں کی بھی خراب ہے' جو روز میرے منتظر ہوتے ہیں' اس لیے میں ان شاء اللہ ضرور آؤں گا۔" متانت سے جواب دے کر ان کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے ڈاکٹر مہران آگے بڑھ گئے' تو وہ بھی اپنے سینئر کی فرض شناسی کو سراہے بغیر نہ رہ سکے۔

ڈاکٹر مہران کا تبادلہ کچھ عرصہ پہلے ہی اس اسپتال میں ہوا تھا' مگر اتنے قلیل عرصے میں ہی وہ اپنی فرض شناسی اور اخلاق کی بدولت پورے اسپتال کو اپنا گرویدہ بنا چکے تھے۔ ان کے جانے کے بعد ڈاکٹر عمیر بھی ایک ہی گھونٹ میں اپنی چائے ختم کرتے ہوئے اسٹیتھو اسکوپ سنبھال کر چلڈرن وارڈ کی طرف بڑھ گئے' جہاں ان کی ڈیوٹی تھی۔

☼ ☼ ☼

شہروز خان صاحب نے اپنی گھنی مونچھوں کو بل دینے کے بعد جلدی جلدی اپنی واسکٹ درست کی اور جیب سے ایک پھولا ہوا لفافہ نکال کر حمید بابا کی طرف بڑھایا اور اس کے ساتھ ہی کیمروں کی فلیش لائٹ چمکی اور چمکتی چلی گئی۔ پندرہ منٹ کے صبر آزما انتظار کے بعد وہ لفافہ حمید بابا کے ہاتھ میں منتقل ہوا۔ اس دوران خان صاحب گردن اکڑا کر ہر زاویہ سے اپنا فوٹو کھنچوا چکے تھے۔ فوٹو سیشن سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے ان رپورٹرز کا شکریہ ادا کیا جو ان کی دعوت پر یہاں

آئے تھے اور ہنس ہنس کر نہایت خوش اخلاقی سے ان کے سوالوں کا جواب دینے لگے۔ کیونکہ الیکشن پیریڈ کے دوران ہر قابل سیاستدان کی طرح وہ بھی میڈیا والوں کو خوش رکھنا اپنی اولین ذمہ داری سمجھتے تھے۔

اس دوران انہوں نے حمید بابا پر نگاہ غلط تک ڈالنے کا تکلف گوارا نہ کیا' جو مسلسل محبت پاش نگاہوں سے اپنے "رحم دل" اور "خدا ترس" صاحب کو تکے جارہے تھے۔

پینسٹھ سالہ لاوارث حمید بابا جو جوانی میں لازماً اپنے مالکوں کے لیے بڑے کام کی چیز رہے ہوں گے' مگر اب بڑھاپے میں ان کی حیثیت عضو معطل سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ رہی سہی کسر دل کے عارضے نے پوری کردی۔ ایسے میں ان کے خدا ترس صاحب کا (جن کے خاندان کی انہوں نے ساری عمر خدمت کی تھی)۔ انہیں سرکاری اسپتال میں پرائیویٹ روم دلوانا اور حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہوئے پورے بیس ہزار نقد

ان کے ہاتھ میں تھمانا کوئی چھوٹی بات نہیں تھی۔ ان کی اس مہربانی پر وہ کتنی دیر تک آنکھوں کو تشکر کے آنسوؤں سے آزاد نہ کرسکے، یہاں تک کہ نیند نے مہربان ہو کر انہیں اپنی کٹیا میں جگہ دے دی۔

☼ ☼ ☼

ڈاکٹر مہران پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھے تو ڈرائیور نے انہیں آتا دیکھ کر جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ ابھی وہ بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ ان کے قریب ایمبولینس آکر رکی، جس میں سے نکلتی مریضہ کی کرب ناک چیخوں نے ان سمیت بہت سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ وہ مریضہ اسٹریچر پر چند لمحے مرغ بسمل کی طرح تڑپتی رہی، پھر بے ہوش ہوگئی۔ ڈاکٹر مہران بہت قابل گائنا کالوجسٹ تھے۔ بغور مریضہ کی حالت دیکھتے ہوئے انہیں سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اس کا کیس انتہائی سیریس ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہیں یاد آیا کہ اندر اسپتال میں اس وقت ڈاکٹر فہمیدہ ہی واحد ایسی گائنا کالوجسٹ ہیں جو اس کیس کو ہینڈل کرسکیں گی مگر وہ تو خود اس وقت آپریشن میں مصروف تھیں اور اس مریضہ کی حالت بتا رہی تھی، اگر اسے فوری ٹریٹمنٹ نہ ملی تو بچہ تو دور کی بات اس کا اپنا بچنا محال ہے۔ یہ خیال آتے ہی ڈاکٹر مہران اپنی خراب ہوتی طبیعت کو نظر انداز کرکے ایک فرض شناس ڈاکٹر کی طرح گاڑی میں بیٹھنے کی بجائے ڈرائیور کو واپس جانے کی ہدایت کرتے ہوئے تیزی سے واپس پلٹ گئے۔ کیونکہ ان کے لیے ان کا پیشہ پیسے کمانے کا ذریعہ نہیں بلکہ عبادت تھا۔

☼ ☼ ☼

اسپتال کے انچارج سرجن فاروقی کی پریشانی اس وقت دیدنی تھی، ابھی ابھی ان کے سامنے جس مریضہ کو لایا گیا تھا اس کا کیس بہت سیریس تھا۔ بقول اس کے شوہر کے سیڑھیوں سے گرنے کی وجہ سے اس کی یہ حالت ہوئی ہے۔ مگر انہیں مریضہ کی حالت سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ ان کے سامنے اصل مسئلہ اسپتال کی ریپوٹیشن کا تھا۔ ڈاکٹر مہران نائٹ ڈیوٹی دے کر جاچکے تھے، جبکہ ڈاکٹر فہمیدہ آل ریڈی آپریشن میں مصروف تھیں، جبکہ دو لیڈی ڈاکٹر چھٹی پر تھیں۔ اس رسکی کیس کو ہینڈل کرنے کے لیے اس وقت کوئی بھی گائنا کالوجسٹ موجود نہیں تھا۔ اس وقت ان کی پریشانی کی بڑی وجہ وہ رپورٹر بھی تھے جو خان صاحب کے ہمراہ دوسرے وارڈ میں موجود تھے۔ اگر انہیں اس بات کی بھنک بھی مل جاتی تو بات کا بتنگڑ بننا لازمی تھا اور چونکہ وہ اس اسپتال کے انچارج تھے اس لیے ایسی کسی صورت حال میں ان کی ذات کا نشانہ بننا بعید القیاس نہ تھا۔

یہ سوچ سوچ کر ابھی وہ نہ جانے کتنا پریشان ہوتے، مگر ڈاکٹر مہران نے اچانک آکر ان کا ہر تخمینہ غلط کردیا۔ انہیں ڈاکٹر مہران کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں پر پورا بھروسہ تھا اس لیے اطمینان سے کیس انہیں سونپ کر اپنے آفس میں چلے گئے، جہاں بیسیوں کام ان کے منتظر تھے۔

☼ ☼ ☼

"دیکھو اس کے ساتھ جو تم تمہاری بیوی کوئی سیڑھیوں سے نہیں گری، تم نے مار مار کر اس کی یہ حالت کی ہے۔ مگر یاد رکھو اگر اسے کچھ ہوگیا تو تم پر پولیس کیس بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ میں خود پولیس کو بلواؤں گا، اس لیے اپنی خیریت چاہتے ہو تو اس کی زندگی کی دعا کرو اور جلدی اس پیپر پر سائن کرو۔" مریضہ کا چیک اپ کرکے ڈاکٹر مہران کو یہ جاننے میں دیر نہ لگی کہ اسے بری طرح سے زدوکوب کیا گیا ہے۔ اوپر سے اس کے شوہر کو سائن کرنے میں پس و پیش کرتا دیکھ کر ان کا طیش میں آنا یقینی بات تھی۔ ڈاکٹر کو یوں غضب ناک ہوتا دیکھ کر رشید عرف شیدے نے سائن کرنے میں اپنی عافیت جانی۔ آپریشن تھیٹر کے باہر ٹہلتے ہوئے اس کی حالت ڈاکٹر مہران کی ڈانٹ سن کر ایک تو ویسے ہی پتلی ہورہی تھی کہ رہی سہی کسر اماں نے فون پر رجو کے بھائیوں کی اسپتال روانگی کی اطلاع دے کر پوری کردی۔ اسے کچھ نہیں

آرہا تھا کرے تو کیا کرے، رجو کو کچھ ہونے کی صورت میں اس کے بھائیوں سے تو چلو جیسے تیسے نبٹا جاسکتا تھا۔ مگر پولیس۔ یہیں آکر اس کی سوئی اٹک جاتی تھی۔

ایک بار تو اسے فرار ہوجانے کا خیال بھی آیا مگر نہ تو اس کے پاس فرار ہو کر چھپنے کا ٹھکانہ تھا اور نہ ہی جیب میں آنا ٹکا۔ اس لیے وہ کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگا جس سے سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ اچانک آپریشن تھیٹر کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا، کسی انہونی کے پیش نظر وہ سانس تک لینا بھول گیا۔ مگر آنے والی نرس تھی جو اسے میڈیسن کی پرچی تھما کر جتنی تیزی سے آئی تھی اتنی تیزی سے واپس پلٹ گئی۔ اس کے جانے کے بعد ایک طویل سانس خارج کرکے شیدا ابھی مرے مرے قدموں سے باہر کو چل دیا۔ میڈیکل اسٹور اسپتال سے دو منٹ کی دوری پر تھا۔ پرچی دکان دار کو تھما کر بے زاری سے ارد گرد کا جائزہ لینے لگا۔

"سرکاری اسپتال میں ڈاکٹر کے غلط انجکشن لگا دینے پر ایک مریض چل بسا مزید تفصیلات جاننے کے لیے چلتے ہیں اپنے نمائندے نعیم الحسن کی جانب، جی نعیم کیا تفصیلات ہیں۔" نیوز کاسٹر کی مترنم آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تو وہ بڑے انہماک سے خبر سننے لگا۔

"اے ہیلو، بھائی صاحب۔" دکان دار نے اسے کاؤنٹر بجا کر متوجہ کیا تو وہ ٹی وی اسکرین سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کے ہاتھ میں موجود دوائیوں کا لفافہ لے کر بل ادا کرکے پژمردہ قدموں سے واپس اسپتال چل دیا۔ پارکنگ کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کی نگاہ موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتے ریان بابو پر پڑی۔ ریان ایک پرائیویٹ نیوز چینل کا رپورٹر تھا۔ شیدے کی اس سے اچھی خاصی سلام دعا تھی۔ وہ اسے ان دیکھا کرکے اندر بڑھنے ہی لگا تھا کہ ایک خیال برق کی سی تیزی سے اس کے شاطر ذہن میں کوندا، وہ ٹھٹک کر رک گیا اور اندر جانے کی بجائے ریان کی طرف بڑھ گیا۔

"ریان بابو! آپ یہاں اسپتال میں؟ خیریت تو ہے نا۔" سلام دعا کے بعد شیدے نے مصنوعی حیرت لہجہ میں سموتے ہوئے دریافت کیا۔

"الحمدللہ سب خیر ہے یار، تو، تو جانتا ہے ان سیاست دانوں کی بھیڑ چالوں کو مجال ہے جو کوئی نیکی کیمرے کی آنکھ کو دکھائے بغیر کریں۔ شہروز خان کو تو تو جانتا ہی ہوگا آج کل جگہ جگہ ان کے پوسٹر ایستادہ ہیں، ضمنی انتخاب کے امیدوار ہیں موصوف اپنے بوڑھے ملازم کی عیادت کو آتے ہوئے حسب روایت رپورٹرز کا ٹولہ بھی ساتھ لائے تھے۔ میں بھی ان کی دعوت پر ان کی اس نیکی کی رپورٹنگ کے لیے آیا تھا۔" ریان نے تفصیلی جواب دیتے ہوئے کہا۔

"پر تم یہاں کیا کررہے ہو؟" اس نے ازراہ مروت شیدے سے پوچھا اور شیدا تو تھا ہی اسی انتظار میں فوراً سے بیشتر اپنی آنکھوں میں آئے نادیدہ آنسو رگڑتے ہوئے درد ناک انداز میں اپنی من گھڑت داستان مظلومیت شروع کردی۔

"بس ریان بابو کیا بتاؤں، غریب کا تو کوئی پرسان حال نہیں مہنگائی کا تو کا غریب کی کھال کاٹنے کو کم تھا کہ ڈاکٹروں نے بھی قصائیوں کا کام شروع کردیا۔ رجو میری وہٹی جی، اس نمانی کی طبیعت صبح سے ہی خراب تھی۔ بڑی صابر عورت ہے جی، جہاں تک ہوسکا درد برداشت کرتی رہی۔ مگر جب درد حد سے سوا ہوا تو اماں کو بتایا۔ اب دائیوں کا دور کہاں جی اماں کے کہنے پر میں اسے لے کر فوراً اسپتال بھاگا مگر ان اسپتالوں میں ہم غریبوں کی جگہ کہاں جی، پورے ایک گھنٹے تک میں چیختا رہا تب کہیں ڈاکٹر نے آکے اسے چیک کیا۔"

"اب کیسی ہے وہ؟" جان چھڑانے کو ریان نے بے زاری سے پوچھا بھلا اس کی بیوی کی طبیعت سے اسے کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔

"کچھ مت پوچھو جی، کچھ مت پوچھو گھر سے تو اس نمانی کو اچھا بھلا لایا تھا۔ مگر ڈاکٹر نے نہ جانے کیسا غلط ملت ٹیکا (انجکشن) لگایا۔ وہ تو ہاتھوں سے نکلنے لگی۔ نیلی پڑ گئی اور آنکھیں یوں باہر کو ابل آئیں جیسے زہر کھا لیا ہو۔"

"اچھا پھر کیا ہوا؟" ریان کی حس صحافت اچانک پھڑکی تو وہ بے صبری سے بولا۔ ڈاکٹروں کی غفلت کے کارنامے ویسے بھی آج کل نیوز میں کافی ان جا رہے تھے۔ شاید کوئی مسالے دار خبر مل جائے' یہ ہی سوچ کر اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

"پھر کیا جناب! میں نے تو واویلا کر دیا مگر ڈاکٹر اپنی غلطی تسلیم کرنے کی بجائے مجھ پر چلانے لگا کہ میں نے مار مار کر رجو کی حالت خراب کی ہے۔ مجھے تو جیل بھجوانے کی دھمکی تک دی' پھر رجو کو تو لے کر آپریشن تھیٹر چلے گئے اور مجھے دوائیوں کے بہانے وہاں سے ہٹا دیا۔" اپنی اس بودی کہانی میں رنگ بھرنے کو بڑی محنت سے اس نے دو آنسو بھی ٹپکائے' بلاشبہ اس کی اوور ایکٹنگ اس وقت عروج پر تھی۔

شیدے کی بات ختم ہوتے ہی ریان نے جھوٹ سچ کی تحقیق کیے بنا فوراً" اپنے آفس فون کر کے واقعے کی اطلاع دی' تاکہ یہ خبر سب سے پہلے نشر کرنے کا اعزاز ان کے چینل کو ملے۔ اور جلد از جلد کوریج ٹیم بھجوانے کا کہہ کر اندر کو لپکا جہاں اب شیدا اپنی من گھڑت داستان رجو کے بھائیوں کو باور کرانے کے چکر میں تھا۔

☼ ☼ ☼

منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے ڈاکٹر مہران اس وقت مینٹلی طور پر بے حد ڈسٹرب تھے۔ وہ ابھی ابھی آپریشن تھیٹر سے لوٹے تھے جہاں وہ اپنی سر توڑ کوششوں کے باوجود مریضہ (رجو) کو بچانے میں ناکام رہے تھے۔ یہ ان کی دس سالہ پیشہ ورانہ زندگی میں پہلا کیس تھا۔ جس میں وہ زچہ اور بچہ دونوں کو بچانے میں ناکام رہے تھے۔ ورنہ لوگ دور دور سے ان کے پاس علاج کے لیے آتے تھے۔

اللہ نے ان کی مسیحائی میں بڑی شفا رکھی تھی۔ وہ ہاتھوں پر سر گرائے چیئر پر بڑے دلگرفتہ سے انداز میں بیٹھے تھے۔ جب کسی نے بڑے خلوص سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا انہوں نے مڑ کر دیکھا تو ڈاکٹر عمیر تھے۔

"آپ ڈاکٹر ہو کر بھی ایسی باتوں کو دل پر لیتے ہیں۔" ان کے قریب بیٹھتے ہوئے ڈاکٹر عمیر نے استعجاب سے سوال کیا۔

"کیا ڈاکٹر انسان نہیں ہوتے۔" کوئی جواب دینے کی بجائے ڈاکٹر مہران نے الٹا ان سے سوال کیا تو وہ لاجواب ہو کر رہ گئے۔

"میرے کہنے کا مطلب یہ تھا ڈاکٹر مہران کہ یہ تو ہمارے پروفیشن میں روز مرہ کا معمول ہے' روز نہ جانے کتنے ایسے تقدیر و تدبیر کے جھمیلے دیکھنے کو ملتے ہیں کہ ہم ڈاکٹرز باوجود انتہائی اعلا تدبیر کے تقدیر کے آگے ہار جاتے ہیں۔ تقدیر تو ہمارے بس میں نہیں نا۔" ڈاکٹر عمیر ان کا دکھ سمجھتے تھے۔ اس لیے دھیرے دھیرے انہیں سمجھانے لگے۔

دراصل چند برس پہلے ڈاکٹر مہران کی بیوی بھی زچگی کے دوران باوجود انتہائی پرزور تدبیر کے تقدیر کے ہاتھوں ہار گئی تھیں۔ حساس تو وہ پہلے ہی بہت تھے۔ مگر اس واقعے نے گویا ان کی دنیا ہی بدل دی تھی۔ آج بھی وہ جب بھی تقدیر کے ایسے کھیل دیکھتے ان کے زخم ہرے ہو جاتے۔

"ڈاکٹر مہران! آپ کی طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہیں تھی' اوپر سے یہ تھکا دینے والا آپریشن۔ اب آپ یوں کیجیے کہ گھر جا کر آرام کریں' میں نے آپ کے ڈرائیور کو فون کر دیا ہے' وہ آتا ہی ہوگا۔" چائے کی پیالی انہیں تھماتے ہوئے ڈاکٹر عمیر ہمدردی سے بولے تو وہ بھی اثبات میں سر ہلا کر گرم گرم چائے سے ہونٹ جلانے لگے' کیونکہ جب دل جل رہا ہو تو کوئی اور جلن معنی نہیں رکھتی۔ ابھی انہوں نے آدھی پیالی ہی ختم کی تھی کہ اچانک باہر سے ابھرنے والے شور نے انہیں چونکنے پر مجبور کر دیا۔

"آپ بیٹھیں میں دیکھتا ہوں۔" انہیں اٹھتا دیکھ کر ڈاکٹر عمیر جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے' مگر جب پانچ منٹ گزر جانے کے باوجود ان کی واپسی نہ ہوئی تو کسی انہونی کے خدشے کے تحت وہ بھی شور کا تعاقب کرتے

ہوئے ڈاکٹر فاروقی کے آفس کے باہر پہنچ گئے۔ جہاں میڈیا کے نمائندوں میں گھرے ڈاکٹر فاروقی بہت اشتعال میں لگ رہے تھے۔

"میں آپ کو کیسے سمجھاؤں' مریضہ (رجو) کی موت قدرتی تھی۔ اس میں ہماری کوئی کوتاہی' کوئی غفلت' کوئی قصور نہیں۔ ارے اسے تو جس حالت میں لایا گیا تھا' ایسے میں اس کا بچ جانا ہی ایک معجزہ ہوتا۔"

"مگر سر! مریضہ کے شوہر کا کہنا ہے کہ وہ اسے ٹھیک ٹھاک حالت میں لایا تھا۔ اس کی موت ڈاکٹرز کی لاپروائی اور غلط انجکشن لگا دینے سے ہوئی ہے؟" اتنا سمجھانے کے باوجود پھر وہی سوال سن کر ڈاکٹر فاروقی حقیقتاً" اپنا سر پیٹ کر رہ گئے۔ ان کا ذہن اس قدر ماؤف ہو رہا تھا کہ وہ انہیں پوسٹ مارٹم رپورٹ کا انتظار کرنے کو بھی نہ کہہ سکے۔ جس کے ذریعے ساری بات صاف ہو جاتی۔

اس شور شرابے کے باعث اسپتال کا تمام اسٹاف وہاں جمع ہو چکا تھا اور کسی سنسنی خیز خبر کے لالچ میں تقریباً" تمام بڑے اخبارات اور نیوز چینلز کے نمائندے بھی اکٹھے ہو چکے تھے یوں کہ......

"ہر چھوٹی بڑی خبر عوام تک پہنچانا ہمارا فرض ہے۔" یہ ہی ان کا موٹو تھا' اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں ایک ہی سوال الفاظ بدل بدل کر کیے جا رہے تھے جن کا جواب دیتے دیتے ڈاکٹر فاروقی تنگ آ چکے تھے۔ شیدے کا دوست ریان جو سوالات کرنے میں پیش پیش تھا۔ ڈاکٹر مہران کو وہاں دیکھ کر فوراً" ان کی طرف لپکا اور سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ ڈاکٹر مہران جو آنکھوں میں حیرت سجائے صورت حال سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے' اس کے سوالات کم الزامات سن کر دنگ رہ گئے۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے ان بے بنیاد الزامات کی تردید کریں۔

"آپ کا یوں لب سی لینا کہیں اعتراف جرم تو نہیں۔" ڈاکٹر مہران جنہوں نے بڑی مشکل سے اپنا غصہ کنٹرول کر رکھا تھا۔ یہ سوال سن کر خود پر سے ضبط کھو بیٹھے اور بے اختیار ہی زوردار تھپڑ سوال کرنے والے کو کھینچ مارا۔ جس کی گونج نے وہاں سناٹا طاری کر دیا اور پھر۔ اس سناٹے کے بعد جو طوفان اٹھا وہ کسی کے وہم و گمان میں نہ تھا۔ ڈاکٹر فاروقی کو مجبوراً" پولیس بلانی پڑی' جبکہ شیدا تو بہت پہلے ہی وہاں سے کھسک گیا تھا' تھوڑی ہی دیر میں۔

"ڈاکٹر کا صحافی پر تشدد۔" کی خبر ہر نیوز چینل پر بریکنگ نیوز کا عنوان بن گئی اور آنے والے پورے ہفتے میں لوگوں کے درمیان زیر بحث رہی۔ مگر نہ تو کسی نیوز چینل نے اور نہ ہی کسی سچائی کے علمبردار نیوز پیپر نے اس خبر کا پس منظر جاننے کی کوشش کی اور نہ ہی کہیں کمرہ نمبر دس کے مریض حمید بابا کی موت کی خبر چھپی جو ڈاکٹرز اور صحافیوں کے جھگڑے کے عین دوران (جب ہر طرف سے جھانکتے کیمروں کی وجہ سے ڈاکٹرز کا کمرے سے نکلنا تک دشوار ہو چکا تھا۔) دل کا دورہ پڑنے پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔ اگر اسپتال میں یہ ہنگامہ نہ ہوتا اور اسے فوری ٹریٹمنٹ ملتی تو شاید چند دن وہ اور جی لیتا۔

حمید بابا کی بے نور کھلی آنکھوں میں مرنے کے بعد بھی یہ سوال مچل رہا تھا کہ......

"میں اپنی موت کا قصوروار ڈاکٹر کی غفلت کو ٹھہراؤں یا میڈیا والوں کی حد سے بڑھتی فرض شناسی کو؟"

■ ■ ■

نبیلہ عزیز

درد دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں، مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے، وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے، جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے، جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے، مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصے سے نوکری کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز مایوسی اور ناامیدی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے، جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھی بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے، وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے، وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے، اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا، اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دلاتی ہیں۔

پورا دن اکٹھے گزارا تو ٹائم گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا' مدحیہ اس وقت ٹھٹک کے رہ گئی جب نگارش نے اسے تیار ہونے کا کہا۔

"تمہارے بھائی صاحب کہہ رہے ہیں کہ ٹائم کم رہ گیا ہے' ایئرپورٹ بھی پہنچنا ہے پھر سامان وغیرہ کی چیکنگ میں بھی ٹائم لگے گا' اٹھو جلدی سے چینج کرکے آؤ اور ایک بار پھر اپنی تمام چیزیں یاد کرلو کہ تم نے بیگ میں رکھ لی ہیں نا؟" نگارش سمجھدار بہنوں جیسا برتاؤ کر رہی تھی زری مسکرائی۔

"چلو جاؤ اب۔" زری نے مدحیہ کو اٹھایا اور وہ خاموشی سے چپ چاپ اوپر آگئی کپڑے چینج کیے' اپنا بیڈ روم دیکھا' بیڈ روم کی سیٹنگ دیکھی اور سر جھکا کر اپنا بیگ اٹھا لیا۔ باقی کا سامان وہ لوگ پہلے ہی گاڑی میں رکھوا چکے تھے۔

"کوئی گفٹ نہیں بھیجا تم نے؟" گھر سے نکلتے ہوئے نگارش نے زری سے سرگوشی کی۔

"کیا بھیجتی؟" زری بھی آہستگی سے بولی۔

"اپنا دل۔"

"ہونہہ! دل کو دل بھیجتی؟"

"ہاں! تاکہ دل کو دل سے راہ ہو جاتی۔"

"میرا دل نرم ہے اور وہ دل سخت۔" زری اس کا تصور کرتے ہوئے بولی۔

"سخت کو نرم ہونے میں بھی دیر نہیں لگتی' بس اثر ہونا چاہیے۔" نگارش نے گہرائی سے کہا۔

"اثر ہونے کے لیے وقت چاہیے' جو فی الحال نہیں ہے۔" زری جواب دیتی باہر نکل آئی لیکن باہر کا موسم ہنوز خراب تھا' باہر روڈ کی اسٹریٹ لائٹس بھی اپنی برفانی موسم کی وجہ سے دھندلی سی لگ رہی تھیں اور اسی دھند کی وجہ سے تمام لائٹس کی روشنی سرخ نظر آرہی تھی۔

"مدحیہ کہاں ہے؟" زری نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے پوچھا۔

"وہ ہم سب سے پہلے جاکر بیٹھ گئی ہے' تم بھی بیٹھ جاؤ قلفی بن جاؤ گی۔" نگارش نے خفگی سے کہا تھا اور یوں وہ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے ایئرپورٹ کے لیے روانہ ہوئی تھیں انہیں ایئرپورٹ پہنچتے ہوئے ایک گھنٹہ لگ گیا تھا اور فلائٹ کا ٹائم بھی کم رہ گیا تھا۔

"میڈی۔" مدحیہ سر جھکائے چپ چپ سی بیٹھی تھی جب ایک شناسا سی آواز پہ چونک کر سر اٹھایا۔

"جیزی؟" اس نے حیرت سے جیزی کو دیکھا۔

"تم واقعی جارہی ہو؟" وہ بے یقینی سے پوچھ رہا تھا لہجے کی افسردگی نمایاں تھی۔

"آف کورس۔"

"واپس نہیں آؤ گی؟" سوال میں آس تھی۔

"شاید۔" وہ کوئی بھی جواب ٹھیک سے نہ دے پائی۔

"تم ہم سے ملے بغیر جارہی ہو؟ ہمیں بتایا بھی نہیں؟ آج بھی اگر کرسٹینا نہ بتاتی تو ہمیں پتا ہی نہ چلتا۔؟" وہ شکوہ کر رہا تھا۔

"جب چھوڑ کر جانا ہی ہے تو پھر اتنے اہتمام سے چھوڑ کر جانے کا کیا فائدہ؟ دو گھڑی کا یہ ملنا بھی کس کام کا؟" مدحیہ کے لہجے میں تلخی در آئی پانچ قدم کے فاصلے پہ نگارش' زری اور فائزہ بیگم کھڑی تھیں البتہ نبیل اور عبداللہ سامان وغیرہ کلیئر کروا رہے تھے۔

"تو تم ہمیں مس نہیں کرو گی؟"

"شاید۔" وہ عجیب سی بے حسی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

"باقی سب سے نہیں ملو گی؟" جیزی افسردہ لگ رہا تھا فائزہ بیگم نے بلیک لانگ کوٹ پہنے اور لانگ شوز چڑھائے جیزی کو ناگواری سے دیکھا تھا۔

"باقی سب؟" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"میڈی؟" اچانک نہ جانے کہاں سے برائن' شیٹے' کرسٹینا اور جیسمین نمودار ہوئے تھے اور مدحیہ کو دیکھ کر چلا اٹھے تھے مدحیہ ان لوگوں کو اچانک دیکھ کر خوش بھی ہوئی اور اداس بھی۔

"موڈ کیوں آف ہے؟" شیٹے اس کی بیسٹ فرینڈ تھی اس لیے اس کی اداسی اور افسردگی بھی شیٹے نے ہی محسوس کی تھی۔

"تو کیا اس وقت اس جگہ پہ کھڑے ہو کر میرا موڈ آن ہونا چاہیے؟" مدحیہ نے شیٹے کو خفگی سے دیکھا۔

"ڈونٹ وری یار ہم لوگ ضرور ملیں گے۔" برائن نے انہیں تسلی دی وہ شیٹے کا بھائی تھا اسی وجہ سے مدحیہ کی اس کے ساتھ بھی کافی اچھی فرینڈشپ تھی دونوں بہن بھائی بے حد سوفٹ نیچر کے تھے۔

"ان شاء اللہ۔" مدحیہ بے ساختہ بولی۔

"یہ کیا کہا؟" برائن نے الجھ کر پوچھا۔

"میں نے کہا ہے کہ اللہ نے چاہا تو ہم ضرور ملیں گے۔" مدحیہ نے انگلش میں بتایا تو وہ سر ہلا کر رہ گئے۔

"ہوں! ان شاء اللہ۔" برائن نے دہرا کے کہا اور مدحیہ مسکرا دی۔

"مدحیہ چلو۔" فائزہ بیگم نے قریب آکر سختی سے کہا۔

"جسٹ ون منٹ ماما پلیز۔" اس نے انہیں روکا اور کرسٹینا کو دیکھا۔

"کرسٹی! تم کچھ نہیں کہو گی؟" مدحیہ نے خاموش کھڑی کرسٹینا کے قریب آکر نرمی سے پوچھا۔

"سب کچھ تو کہہ ہی رہے ہیں' میرا کہنا ضروری تو نہیں ہے؟" وہ لاپروائی سے بولی۔

"اگر ضروری نہیں ہے تو اتنی دور سے' اتنی ٹھنڈ میں یہاں کیوں آئی ہو؟" مدحیہ کے استفسار پہ کرسٹینا لاجواب ہوگئی۔ اور نظر چرالی تھی۔

"میں جانتی ہوں کرسٹینا تمہاری فیملی کسی پاکستانی کی دی ہوئی چوٹ سے بلبلائی ہوئی ہے اور یہی چوٹ تم لوگوں کو باقی پاکستانیوں کی طرف بڑھنے نہیں دیتی لیکن ایک بات سوچو' جس طرح تمام یورپین ایک جیسے نہیں ہیں اسی طرح تمام پاکستانی بھی ایک جیسے نہیں ہیں' اچھے برے لوگ ہر جگہ' ہر ملک میں پائے جاتے ہیں ایک کی سزا دوسرے کو دینا کہیں سے بھی انصاف نہیں کہلاتا۔ اور تمہیں آج چپ نہیں بلکہ خوش ہونا چاہیے کہ تمہارے گروپ کی وہ لڑکی جارہی ہے جو تمہیں ہمیشہ ناگوار گزرتی تھی۔؟" مدحیہ اس کے روبرو کھڑی کہہ رہی تھی اور کرسٹینا کا چہرا فق ہوگیا تھا۔ تو کیا مدحیہ اس کی ناگواری اور فیملی کی تلخی کے متعلق بھی جانتی تھی؟ حالانکہ اس نے کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ کرسٹینا کے اندر کا حال جانتی ہے۔

"میڈی تم...... تم۔" کرسٹینا بول ہی نہ پائی۔

"مدحیہ چلو بھی۔" اب کی بار زیادہ سختی سے پکارا گیا تھا۔

"آئی مس یو میڈی۔" کرسٹینا نم آنکھوں سے اس کے گلے لگ گئی اور مدحیہ کا گال چوم لیا شیٹے اور جیزی مسکرا دیے۔

"اینڈ ایم سوری فار مائی بی ہیویئر۔" کرسٹینا نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"اٹس اوکے یار، مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ تم مجھ سے ملنے کے لیے آئی ہو بلکہ ان سب کو لے کر آئی ہو۔ تھینک یو سو مچ......" اس نے خوشی کا اظہار کیا تھا پھر باقی سب سے مل کر ہاتھ ہلاتی وہ زری اور نگارش کے پاس آ رکی۔

"پتا نہیں ان سب سے دوبارہ ملنا ہو گا بھی یا نہیں اس لیے جلدی جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ تم سے تو ملاقات ہوہی جائے گی اس لیے امید ہے کہ تم نے مائنڈ نہیں کیا ہو گا۔" اس نے زری کے گلے ملتے ہوئے کہا۔

"اور بھابھی آپ بھی جلدی پاکستان آنے کی کوشش کیجیے گا۔" وہ نگارش سے ملی تو ساتھ تاکید بھی کر ڈالی۔

"پہلے تم تو جاؤ......"

"اتنی جلدی ہے آپ کو؟"

"ہاں! جلدی تو ہو گی ایک گھنٹے سے اتنی سردی میں کھڑے کھڑے ہڈیوں کا گودا بھی جیسے جم گیا ہے۔" نگارش مصنوعی خفگی سے بولی۔

"فکر نہ کریں میں عبداللہ بھائی سے کہتی ہوں گھر جاتے ہی آپ کی ہڈیاں اوون میں رکھ دیں۔" مدیحہ شرارت سے بولی اس کا موڈ پہلے سے قدرے خوشگوار ہو چکا تھا۔

"اوون میں رکھنے کی کیا ضرورت ہے وہ خود کسی اوون سے کم ہیں کیا؟" نگارش کا ذو معنی لہجہ مدیحہ اور زری کو ہنسنے پہ مجبور کر گیا تھا۔

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے جناب۔" مدیحہ نے سراہا۔

"مدیحہ۔" نبیل نے قریب آ کر کہا اور پھر نگارش اور زری کو دیکھا بس ایک طائرانہ سی نظر کا موقع تھا اور ایک نظر میں اس کے چہرے کا ایک آخری لمس تھا وہ لمس سمیٹ کر مدیحہ کے ساتھ اللہ حافظ کہتا آگے بڑھ گیا سب سے آخر میں عبداللہ سے ملاقات ہوئی تھی دونوں دیر تک بغل گیر ہوئے تھے پھر سب چلے گئے۔ جہ ذی بھی وہیں کھڑا تھا اور زری وغیرہ بھی۔ شاید جہاز پرواز کر چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

ہسپتال میں میڈیا والے مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہے تھے اور اسرار آفندی ان کے گھیرے میں تنگ آئے ہوئے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ انہیں کی ناک میں بیٹھے ہوئے ہیں جیسے ہی وہ خیرو بابا کی خیریت معلوم کرنے کے لیے ہسپتال پہنچے وہ سب بھی سمندری ریلے کی طرح امڈ آئے انہوں نے لاکھ کوشش کی وہاں سے نکلنے کی مگر اتنے ہجوم میں راستہ ملنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔

"کل آپ کی بھتیجی پہ فائرنگ ہوئی' آپ لوگوں کا ڈرائیور زخمی ہو گیا' کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ کام کس کا ہو سکتا ہے؟ آپ کو کسی پہ شک ہے؟" ایک صحافی نے مائیک سامنے کرتے ہوئے سوال کیا تھا۔

"آفندی صاحب سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ آپ کی بھتیجی کیوں زخمی نہیں ہوئی؟" دوسرے صحافی نے اپنی سوچ کا اظہار کیا تھا۔

"کل سے وقار آفندی صاحب کہیں بھی نظر نہیں آئے کیا وہ خوف کی وجہ سے ملک چھوڑ گئے ہیں؟ یا پھر اپنے کمرے میں بند ہو چکے ہیں؟"

"شٹ اپ! یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے آپ لوگوں نے؟" آذر جیسے ہی سب کو ہٹاتا ہوا سامنے آیا اس کے کانوں میں اس صحافی کا تمسخرانہ سا سوال گونجا تھا۔

"بند کرو یہ کیمرے۔" اس نے غصے سے خونخوار آنکھوں سے دیکھا۔

"سر کیمرے بند کر دینے سے آپ پورے شہر کی آنکھیں تو بند نہیں کر سکتے نا؟" صحافی کچھ زیادہ ہی تیز تھے۔

"سر ہم نے تو سنا ہے کہ آپ نے یہ معاملہ دبانے کی پوری پوری کوشش کی ہے؟" آذر کا جی چاہا ایک زوردار مکا ان کے منہ پہ دے مارے لیکن اسرار آفندی نے اس کا بازو پکڑ کر اس کو ایسی کسی بھی حرکت سے باز رکھا تھا وہ خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔

"چلیں ڈیڈی۔" وہ اسرار آفندی کو ساتھ لے کر اس ہجوم کو چیرتا ہوا وہاں سے نکل گیا تھا اسرار آفندی کا ڈرائیور تیار کھڑا تھا ان کے آتے ہی گاڑی اسٹارٹ کر دی اور خود آذر بھی اپنی گاڑی نکال لے گیا تھا کیوں کہ اگر یہاں ٹھہرتا تو بھی یہی کچھ ہوتا تھا بہتر تھا کہ کچھ دیر نظروں سے اوجھل رہتے۔

اس نے اپنا سیل نکالتے ہوئے وقار آفندی کا نمبر ڈائل کیا تھا۔

"السلام علیکم۔" وہ کال ریسیو کرتے ہوئے بولے۔

"وعلیکم السلام۔" وہ غصہ ضبط کرتے ہوئے آہستگی سے بولا۔

"خیریت؟"

"خیریت آپ کو ڈیڈی بتا دیں گے' آپ ایسا کریں کہ مبارک خان کو خیرو بابا کے پاس بھیج دیں وہ ان کی دیکھ بھال کرے گا۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تھا۔

"مبارک خان کو؟ مگر حویلی میں بھی تو کوئی کام۔"

"ڈیڈ حویلی کے کام ہم سنبھال لیں گے آپ اسے ہسپتال بھیج دیں' دانیال تو صبح ہی ہسپتال سے گھر چلا گیا تھا اب ان کے پاس احمد اور زین بیٹھے ہوئے ہیں' احمد بھی رات سے تھک چکا ہو گا اسے گھر بھیج دیتا ہوں تاکہ وہ ریسٹ کر لے۔" آذر کا دھیان ہر طرف رہتا تھا اسی لیے احمد کے آرام کا خیال کرتے ہوئے مبارک خان کو طلب کیا تھا۔

"ٹھیک ہے میں اسے بھیجتا ہوں۔ لیکن تم کہاں ہو؟"

"میں اظہار انکل کے پاس آفس جا رہا ہوں' واپسی پہ خیرو بابا سے مل کر آؤں گا لنچ گھر پہ ہی کروں گا۔"

"او کے اللہ حافظ۔" انہوں نے فون رکھ دیا تھا اور فون بند ہونے کے بعد آذر کی سوچ کا در کھل گیا تھا اس کا دھیان اس نمبر کی طرف چلا گیا جس نمبر سے کل وقار آفندی کو کال آئی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے آفس جانے کا ارادہ بدلا اور گاڑی ٹیلی فون ایکسچینج کی طرف موڑ دی وہ اس نمبر کی پوری انکوائری کروانا چاہتا تھا اس کے لیے اس نے ایک بار دل سفارش بھی کروائی تھی کیونکہ کسی کے نمبر کی معلومات حاصل کرنا اتنا آسان بھی نہیں تھا۔

ٹیلی فون ایکسچینج پہنچ کر اس نے سپروائزر سے ملنے کا کہا اور تھوڑی دیر بعد ہی وہ ان کے سامنے بیٹھا تھا۔

"پچھلے دس منٹ سے میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا۔" سپروائزر خوشدلی سے بولا۔

"تھینک یو سر۔ دراصل کل ہمیں ایک نمبر سے کال موصول ہوئی تھی۔ میں اس نمبر کی ڈیٹیل اور لوکیشن وغیرہ جاننا چاہتا ہوں' ہمارا مقصد کسی کو نقصان پہنچانا نہیں ہے' بس ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہمارا دشمن کون ہے؟ جس سے ہم خود بھی بے خبر ہیں' لیکن وہ ہم پہ وار کیے جا رہا ہے۔" آذر نے تمہید باندھی۔

"جی۔ جی میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں آپ وہ نمبر دے دیں میں تھوڑی دیر تک آپ کو اس نمبر کی تمام ڈیٹیلز فراہم کر دوں گا۔" سپروائزر بھی اس کی پرابلم سمجھ چکا تھا آذر چاہتا تو یہ کام پولیس کے ذریعے بھی کروا سکتا تھا لیکن اگر یہ بات بھی سامنے آ جاتی کہ علیزے آفندی پہ فائرنگ کرنے والے نے وقار آفندی کو فون کال کر کے خود

فائرنگ کی اطلاع دی تھی تو نہ جانے اور کتنے افسانے بنائے جاتے؟ اس لیے آذر نے یہ نمبر پولیس کو انکوائری کے لیے دینے کی بجائے خود اس کی پوچھ گچھ کرنا ہی مناسب سمجھا تھا تبھی وہ اس کام کے لیے خود آیا تھا کسی اور کو نہیں بھیجا تھا۔

"سررات کو ایک موبائل نمبر سے کچھ میسجز بھی تھے اس نمبر کا کچھ پتا چل سکتا ہے؟" آذر نے "ایک" میسج کہنے کی بجائے "کچھ" میسجز کا اضافہ کیا تھا۔

"سوری آذر صاحب آپ کو اس نمبر کا وہیں سے پتا چل سکتا ہے جس موبائل کمپنی کا وہ نمبر ہے آپ اس کمپنی کے سروس سینٹر کال کریں یا پھر اس کے کسی قریبی فرنچائز میں جا کر ساری صورت حال سے آگاہ کریں۔ وہ آپ کو اس کا حل بتاویں گے" سپروائزر نے آذر کو مشورہ دیا اور پھر لینڈ لائن کا نمبر لے کر اپنے کسی ملازم کو دیا "اس نمبر کا ریکارڈ نکلواؤ" انہوں نے ملازم کو کام سونپا وہ کاغذ پہ لکھا ہوا نمبر لے کر چلا گیا تھا تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو آذر سمیت وہ بھی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

"سر اختر صاحب کہہ رہے ہیں اس نمبر کا ریکارڈ کچھ دیر بعد ملے گا۔" اس نے آکر پیغام دیا۔

"کتنی دیر بعد؟" آذر نے گھڑی دیکھی۔

"گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تو لگ ہی جائے گا۔"

"وہ پھر تو کافی لیٹ ہو جائے گا؟" آذر کو پریشانی ہوئی۔

"ڈونٹ وری آذر صاحب میں یہ ریکارڈ آپ کے گھر یا آپ کے آفس بھجوادوں گا یا پھر آپ اپنا آئی ڈی دے جائیں آپ کو میل کر دوں گا۔" سپروائزر کافی اچھے مزاج کا تھا آذر مل کر خوش ہوا تھا اور پھر اپنا کارڈ نکال کر تھما گیا تاکہ وہ اسے میل کر سکے۔

☼ ☼ ☼

"اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" وہ آفس کا ایک چکر لگا کر واپسی پہ ہسپتال آیا تھا۔

"اللہ کا بڑا کرم ہے صاحب۔"

خیرو بابا نے نقاہت سے کہتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔

"کیسا محسوس کر رہے ہیں؟ کہیں درد وغیرہ تو نہیں ہے؟" آذر نے ان کے بازو پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کافی اپنائیت اور ہمدردی سے پوچھا تھا۔

"صاحب چوٹ لگی ہے تو درد تو ہو گا نا؟"

"اگر زیادہ درد ہے تو میں ڈاکٹرز سے بات کرتا ہوں وہ کور کریں۔"

"نہیں صاحب جب تک زخم نہیں بھرے گا درد ٹھیک نہ ہو گا' آپ فکر نہ کرو آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا۔" خیرو بابا کافی باہمت اور بہادر تھے اتنی تکلیف سہہ کر بھی ان کے ماتھے پہ شکن تک نہیں تھی۔

"ان شاء اللہ آپ جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔" وہ انہیں تسلی دے رہا تھا۔

"علیزے بی بی کیسی ہیں؟ وہ ٹھیک ہیں نا؟" انہیں اب بھی علیزے کی فکر تھی۔

"اللہ کا شکر ہے کہ وہ ٹھیک ہے' اس کو بچاتے بچاتے آپ خود زخمی ہو گئے' آپ کو اپنے لیے بھی احتیاط کرنی چاہیے تھی۔"

"نہ صاحب! یہ تو میرا فرض بنتا تھا' بی بی کی حفاظت میرے ذمے ہی تو تھی' ساری زندگی بڑے صاحب کا نمک کھایا ہے' ان کی بیٹی کو کچھ ہو جاتا تو میں ان کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا' اور میری زندگی کا کیا ہے؟ آج ہے کل نہیں ہو گی۔ علیزے بی بی تو ابھی بچی ہے اس نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے؟ میں تو اپنی پوری زندگی برت چکا ہوں۔"

انہوں نے آذر کے ہاتھ پہ اپنا کمزور سا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں خیرو بابا' اپنی اپنی جگہ ہر ایک کی زندگی ضروری اور اہم ہے آپ ہمارے لیے قابل احترام ہیں' علیزے کی جان بچا کر آپ نے ہم سب کو اپنا احسان مند کر لیا ہے' ہم لوگ آپ کا یہ احسان کبھی نہیں اتار سکتے۔"

"یہ احسان نہیں ہے صاحب یہ تو میرا فرض اور محبت ہے' آپ سب کو تو میں نے اپنے ہاتھوں سے پالا پوسا ہے' کھلایا' سکھایا ہے' اپنے بچوں کی طرح پیار کیا ہے' اور کون ایسا انسان ہے جو اپنے بچے کو چوٹ لگتے خاموشی سے دیکھ سکتا ہے؟ انسان چاہتا ہے اس کے بچے کو لگنے والی چوٹ بھی اسے لگ جائے۔" خیرو بابا کی بات پہ آذر کو اطمینان کے ساتھ ساتھ خوشی ہوئی تھی۔

"واقعی آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں یہ آپ کی محبت اور خلوص ہے کہ آپ اس طرح سمجھتے ہیں ورنہ آج کل اتنی محبت اور خلوص ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتے۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"بڑے صاحب نے کچھ کہا تو نہیں؟"

"نہیں وہ بھلا کیا کہیں گے؟ آپ کی خیریت پوچھ رہے تھے کافی پریشان بھی تھے آپ کے لیے' آپ کی دیکھ بھال کے لیے مبارک خان کو بھیجا ہے انہوں نے۔" اس نے خیرو بابا کو اطمینان دلایا۔

"یہی تو ان کی اچھائی ہے' وہ ہر ایک کا خیال رکھتے ہیں اپنے ملازموں کو بھی نہیں بھولتے۔" انہوں نے وقار آفندی کی تعریف کی آذر مسکرا دیا۔

"اگر آپ کچھ بہتر محسوس کر رہے ہیں تو آپ سے کچھ سوال پوچھ سکتا ہے؟" اس نے تھوڑا جھجک کے کہا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں صاحب' آپ پوچھو کیا پوچھنا ہے؟" خیرو بابا نے بشاشت ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کو کیا لگتا ہے وہ موٹر سائیکل سوار آپ کے پیچھے گاڑی کو فالو کرتے ہوئے آئے تھے یا پھر سامنے سے آکر حملہ کیا تھا؟"

"صاحب وہ ہمارا پیچھا کرتے ہوئے نہیں آئے تھے اور نہ ہی سامنے سے آکر حملہ کیا تھا' آپ کو پتا ہو گا کہ علیزے بی بی کے کالج روڈ پہ جائیں تو ایک روڈ مغرب کی طرف سے بھی نکلتا ہے' وہ لوگ اسی روڈ سے اچانک نکلے اور گاڑی پہ فائرنگ کر دی لیکن میں نے گاڑی پھر بھی نہیں روکی اور علیزے بی بی کو کہا کہ وہ سیٹ پہ لیٹ جائیں وہ یکدم چیخنے چلانے لگی تھیں میری بات پہ دھیان نہیں دیا اور اسی طرح سیٹ پہ بیٹھی رہیں۔ میں نے پھر مڑ کر انہیں کہا کہ سیٹ پہ لیٹ جائیں ان کو گولی لگ جائے گی اور علیزے بی بی یکدم سیٹ پہ گر گئیں لیکن میں سیدھا ہو کر بیٹھا تو سامنے ایک گولی میرے آ لگی اور گاڑی میرے قابو سے باہر ہو گئی میں نے فوراً "بریک لگا دیے تھے اور میں بریک نہ بھی لگاتا تو گاڑی رک جاتی کیوں کہ انہوں نے آخر میں ٹائروں پہ بھی فائر کر دیے تھے اور وہاں سے بھاگنے سے پہلے انہوں نے ایک بار رک کر علیزے بی بی کو دیکھا تھا وہ رو رہی تھیں وہ ان کو دیکھ کر چلے گئے تھے وہ چاہتے تو علیزے بی بی کو مار سکتے تھے' ان کے ہاتھ میں اسلحہ بھی تھا لیکن انہوں نے کچھ نہیں کہا اور چلے گئے' مجھے ہوش نہیں رہا کہ بعد میں کیا ہوا؟" خیرو بابا نے تفصیل سے بتایا تھا۔

"کیا آپ ان کو پہچان سکتے ہیں؟"

"نہیں صاحب ان کے چہرے پہ رومال بندھے ہوئے تھے۔" خیرو بابا نے نفی میں سر ہلایا۔

"آپ کی نظر ان کی موٹر سائیکل یا نمبر پلیٹ پہ گئی ہو؟" وہ ہر طرح سے تصدیق اور تسلی چاہتا تھا۔

"صاحب! جب موت سر پہ کھڑی ہو تو ان چیزوں کا ہوش کسے رہتا ہے؟" وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے آذر چند ثانیے کے لیے خاموش ہو کے رہ گیا تھا اس کے ذہن میں یہ چبھ کے رہ گئی تھی کہ ان لوگوں نے کچھ دیر رک کر'

گاڑی میں جھانک کر علیزے کو دیکھا اور کچھ بھی کیے بغیر چلے گئے؟ اگر وہ چاہتے تو علیزے کو مار سکتے تھے' زخمی یا نقصان پہنچا سکتے تھے۔ اس کی جان لے سکتے تھے مگر.... ؟ اور اس مگر نے آذر کی الجھنوں میں اضافہ کردیا۔ مگر انہوں نے کچھ نہیں کیا اور علیزے کی زندگی بخش کر چلے گئے؟ آخر کیوں؟ کیا وجہ تھی؟ کیا مقصد تھا ان کا؟

وہ جتنا ہی سوچتا اتنا ہی الجھتا کوئی سرا ہاتھ نہیں آرہا تھا۔

"ایک سوال اور...."

"کیا پہلے کبھی علیزے کو پک اینڈ ڈراپ کرتے ہوئے ڈرائیونگ کے دوران یا کالج کے آس پاس کوئی مشکوک آدمی نظر آیا؟ جس کو آپ نے دو تین بار لگاتار دیکھا ہو؟"

"صاحب ان ہی لوگوں کو دیکھا تھا جو اپنی بچیوں کو چھوڑنے آتے تھے کسی کے ساتھ بھائی ہوتا تھا کسی کے ساتھ باپ' کوئی گاڑی پہ آتے تھے کوئی موٹر سائیکل پہ.... میں بھلا کس کس کو یاد رکھ سکتا ہوں؟" آذر کو آخری سوال کا جواب بھی مل گیا مگر وہ بھی باقیوں جیسا۔

"ہوں! کوئی بات نہیں آخر پتا چل ہی جائے گا۔" آذر کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"آپ آرام کریں' میں مبارک خان کو اندر بھیجتا ہوں۔" وہ ان کا ہاتھ تھپک کر باہر نکل آیا۔ باہر کشادہ راہداری میں رکھے بینچ پہ بیٹھا مبارک خان اخبار پڑھ رہا تھا آذر ست قدموں سے مبارک خان کے پاس آکھڑا ہوا مبارک خان اسے دیکھ کر فوراً کھڑا ہوگیا تھا۔

"جی صاحب! حکم؟" وہ سر جھکا کے مودب کھڑا تھا۔

"اندر جاؤ خیرو بابا کے پاس۔" آذر نے آہستگی سے کہا پیشانی پہ شکنیں تھیں مبارک خان اسے دیکھ کر متفکر ہوا تھا۔

"خیریت تو ہے نا صاحب؟ آپ بہت پریشان لگ رہے ہیں؟"

"ہوں! نن نہیں کوئی پریشانی نہیں' تم خیرو بابا کا خیال رکھو اور کسی بھی چیز کی ضرورت پڑے مجھے فون پہ بتا دینا' شام کو دانیال اور جودت چکر لگائیں گے' تم آج رات یہیں رکو گے۔" اس نے اپنے خیالات اپنی سوچوں کے دائرے سے نکلتے ہوئے اسے ہدایات دیں۔

"ٹھیک ہے صاحب جیسے آپ کا حکم۔" وہ فوراً "حکم بجالایا۔ اور آذر ہسپتال کے احاطے سے نکل آیا تھا اس کا رخ بڑی حویلی کی طرف تھا لیکن سوچوں کے رخ نجانے کہاں سے کہاں جا رہے تھے کوئی کہیں تو کوئی کہیں پہنچا ہوا تھا۔ ریشم کی گتھی تھی جو سلجھ ہی نہ رہی تھی الٹا دماغ شل ہو کے رہ گیا تھا۔

یہ تو اس کی ہمت تھی کہ کل سے لگاتار الجھ بھی رہا تھا اور بھاگ دوڑ بھی کر رہا تھا یہاں تک کہ سب کا خیال بھی رکھ رہا تھا ہر اونچ نیچ پہ نظر تھی' ہر اچھے برے کا احساس تھا' کیا ظاہر کرنا تھا اور کیا چھپا کے رکھنا تھا اس پہ بھی اس کا دھیان تھا اور یہ سب اس کی خوبیوں اور بلند حوصلے کی نشانی تھی وہ گھر پہنچا تو وہ لوگ لنچ پہ اس کا ویٹ کرتے نظر آئے تھے لیکن جتنا فریش وہ صبح نظر آرہا تھا اس وقت اتنا ہی ست اور الجھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

"آذر بھائی اتنا لیٹ کردیا آپ نے؟ مجھے کب سے بھوک لگ رہی تھی۔" علیزے اسے دیکھتے ہی بے چارگی سے بولی۔

"تو تم کھالیتیں نا؟" آذر سوچوں کا بوجھ تھوڑی دیر کے لیے جھٹکتے ہوئے نرمی سے بولا۔

"آپ نے صبح میرے بغیر ناشتا نہیں کیا تو میں لنچ کیسے کرلیتی؟" علیزے کا جواب بھی کھرا تھا آذر اتنی ٹینشن کے باوجود مسکرا دیا۔

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

"تھینک یو سویٹی' تم نے مجھے یاد رکھا' میرا انتظار کیا' بھوک برداشت کی' تھینک یو سو مچ۔" وہ آہستگی سے اس کا گال چھوتے ہوئے کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا تھا وقار آفندی' اسرار آفندی اور ان کی بیگمات بھی وہیں موجود تھیں۔ حرمت' مدحت' جویریہ' انیہ اور احمد بھی وہیں بیٹھے ہوئے تھے' آذر نے کلاک کی سمت دیکھا تین بج رہے تھے گویا وہ بھی اپنے وقت پہ کالج اور یونیورسٹی سے آئے تھے بس وہ لیٹ پہنچا تھا۔

"دانیال کہاں ہے؟" اس نے کھانا شروع کرنے سے پہلے پوچھا۔

"ٹیکسی میں۔" جواب احمد نے دیا تھا۔

"کیوں کیا کر رہا ہے؟" آذر نے اپنے سامنے نیپکن پھیلاتے ہوئے کہا۔

"آرام۔" اس نے آرام پہ زور دیا۔

"ابھی تک تھکن نہیں اتری؟"

"رات کی تھکن رات ہی اتار سکتی ہے' دن میں چاہے جتنا بھی آرام کرو وہ کمی پوری نہیں ہوتی۔" احمد نے جواز پیش کیا۔

"اگر آج کی رات دوبارہ جانا پڑ گیا تو؟" آذر نے احمد کو بوکھلا کے رکھ دیا تھا۔

"نن۔ نہیں آذر بھائی ایک رات میں ہی کمر تختہ بن گئی ہے اگر آج کی رات بھی لگ گئی تو سمجھیں ہم آپ کو "تختہ" ہی نظر آئیں گے' سیدھے' اکڑے ہوئے' اور ٹھنڈے۔" احمد نے ہولناک سا نقشہ کھینچا تھا۔

"بد۔ اچھا تو سوچ سمجھ کر بولا کرو۔" ثمرہ بیگم نے بیٹے کو سرزنش کی۔

"ممی آپ بھی تو دیکھیں ہم پہ کون سا ظلم ہو رہا ہے۔" احمد نے منمنا کے کہا۔

"یہ ظلم ہے؟" وہ گھورنے لگیں۔

"تو اور کیا ہے؟" وہ روہانسا ہونے لگا۔

"یہ کسی بیمار کی عیادت اور خدمت کا موقع ہے' فائدہ اٹھاؤ اور ثواب حاصل کرو۔"

"یہ فائدہ اور ثواب پوری حویلی میں کوئی اور کیوں نہیں حاصل کر رہا؟" اس کا انداز ایسا تھا کہ آذر ہنسی چھپانے کے لیے پانی کا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگانے پہ مجبور ہوگیا تھا جبکہ حرمت وغیرہ ہنسی نہیں روک سکی تھیں وقار آفندی بھی مسکرا رہے تھے کیونکہ ان کی علیزے جو ہنس رہی تھی اس کی ہنسی ان کی رگوں میں زندگی دوڑا دیتی تھی۔

وہ لوگ ہنسی مذاق میں لنچ کر رہے تھے اتنی ٹینشن اور پریشانیوں کے باوجود تھوڑی دیر کے لیے خوشگوار ماحول کافی اچھا لگ رہا تھا جب اچانک آذر کے سیل پہ میسج ٹیون بجی۔ اس نے فوراً "سیل نکال کر دیکھا۔

"آذر آفندی کیا خیرو بابا نے یہ نہیں بتایا کہ جن لڑکوں نے فائرنگ کی تھی وہی ان کو ہسپتال میں لے کر گئے تھے؟" وہ میسج پڑھ کر دنگ رہ گیا تھا۔

اس کا دماغ چکرا گیا تھا اور کانوں میں سے جیسے دھواں نکلتا ہوا محسوس ہوا تھا وہ ششدر سا بیٹھا موبائل اسکرین پہ نظر آتے الفاظ کو دیکھ رہا تھا' اس کے ایک ہاتھ میں کھانے کا چمچہ تھا اور ایک ہاتھ میں موبائل فون۔ لیکن دونوں چیزوں کو تھامنے کے باوجود اس کے دونوں ہاتھ اپنی اپنی جگہ پہ ساکت ہوئے لگ رہے تھے اور یہی حال اس کی نظروں کا بھی تھا جو موبائل اسکرین پہ جمی ہوئی تھیں۔

"آذر! کیا بات ہے؟ کیا ہوا ہے؟" اس کی یہ منجمد سی کیفیت سب سے پہلے وقار آفندی نے ہی نوٹ کی تھی جس پہ باقی سب بھی آذر کی سمت متوجہ ہوئے تھے اور آذر یکدم چونک گیا تھا۔

"خیریت تو ہے نا؟" آذر کے چہرے پہ پریشانی اور الجھن کے سائے صاف نظر آرہے تھے۔

"جی' سب خیریت ہے' ڈونٹ وری۔" اس نے بمشکل اپنے آپ کو کمپوز کیا تھا۔

"میسج کس کا تھا؟"

"میرے ایک دوست کا تھا۔" اس نے بہانا بنا دیا۔

"تو پھر اتنے پریشان کیوں لگ رہے ہو؟" وقار آفندی اسے کرید رہے تھے۔

"اس کی طبیعت ٹھیک نہیں' اس لیے پریشانی ہو رہی ہے۔" آذر کو اپنا جھوٹ نبھانے کے لیے مزید جھوٹ بولنا پڑا۔

"اوہ! تو اس سے مل آؤ جا کر۔"

"ابھی میں تھکا ہوا ہوں' آرام کروں گا۔" آذر لاپروائی سے کہتا چمچہ رکھ کر پانی پیتے ہوئے فوراً" ہی کھڑا ہو گیا تھا ان کی حیران سی نظریں آذر پہ ہی تھیں لیکن ان میں سے صرف علیزے کی نظریں ایسی تھیں جن میں حیرانی نہیں بلکہ خوف اور وحشت کی لہریں تیر رہی تھی۔ آذر اس کی نظروں سے تھوڑی دیر کے لیے نظریں چراتا وہاں سے چلا آیا تھا اس کا رخ اپنے بیڈ روم کی طرف تھا وہ بڑی تیزی سے سیڑھیاں طے کرتا اپنے بیڈ روم میں آیا تھا اور سب سے پہلے موبائل نکال کر دانیال کا نمبر ڈائل کیا تھا۔

"ہیلو۔۔۔" دانیال کی نیند سے بوجھل آواز سنائی دی۔

"دانیال! میں آذر بات کر رہا ہوں۔"

"ہاں میں نمبر دیکھ چکا ہوں' کہاں ہو تم؟"

"میں حویلی میں ہی ہوں' تم ابھی بیڈ روم میں آؤ' میں نے تم سے بات کرنی ہے۔" آذر کا لہجہ عجلت بھرا تھا۔

"کیا؟ تم حویلی میں ہو؟" اب کی بار دانیال کو اچنبھا ہوا تھا کہ وہ حویلی میں موجود ہو کر بھی فون پہ رابطہ کر رہا ہے آخر کیا وجہ ہے؟

"ہاں حویلی میں ہوں' تم جلدی آؤ' اور ہاں کسی کو بتانا مت کہ میں نے تمہیں بلایا ہے۔" آذر نے فون بند کرنے سے پہلے تاکید کی تھی۔

"اوکے۔" دانیال نے فون بند کر دیا اور آذر اپنے بیڈ روم میں بے چینی سے ٹہلتے ہوئے اس کا انتظار کرنے لگا تھا اور اگلے دس منٹ میں دانیال اس کے بیڈ روم میں اس کے سامنے تھا۔

"سب خیریت تو ہے نا؟" دانیال نے چھوٹتے ہی سوال کیا۔

"خیریت ہوتی تو تمہیں نیند سے نہ جگاتا۔" آذر کے انداز و اطوار سے اضطراب جھلک رہا تھا۔

"کیوں؟ کیا ہوا ہے؟" دانیال بھی متفکر سا ہو چکا تھا۔

"میں آج خیرو بابا سے ملنے ہسپتال گیا تھا۔" اس نے جیسے اپنے اضطراب کو بیان کرنے کے لیے تمہید باندھی۔

"پھر؟"

"پھر میں نے ان سے حال چال پوچھنے کے بعد ان سے چند سوال پوچھے اور انہوں نے وہی جواب دیے جو وہ جانتے تھے۔"
"کیسے سوال پوچھے تھے؟"
"یہی کہ جن دو لڑکوں نے فائرنگ کی وہ ان کو پہچان سکتے ہیں یا نہیں؟"
"پھر کیا کہا انہوں نے؟"
"وہی جو ہم پہلے ہی جانتے ہیں کہ ان کے چہروں پہ رومال بندھے ہوئے تھے اس لیے پہچاننا بہت مشکل کام ہے۔ بلکہ وہ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ ان کو ہسپتال کون لے کر گیا تھا؟"
"تو اب تمہیں کیا بات پریشان کر رہی ہے؟" دانیال آذر کے پریشان چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔
"یہ دیکھو۔" اس نے موبائل دانیال کے سامنے کر دیا۔
"آذر آفندی کیا خیرو بابا نے یہ نہیں بتایا کہ جن لڑکوں نے فائرنگ کی تھی وہی ان کو ہسپتال بھی لے کر گئے تھے؟" دانیال بھی میسج پڑھ کر شاید شاکڈ رہ گیا تھا۔ یہ میسج اب سے بیس منٹ پہلے کا تھا یعنی تازہ ترین۔۔۔ اس کے کانوں سے بھی دھواں اسی طرح نکلا تھا جیسے آذر کے کانوں سے نکلا تھا۔
"اس نمبر پہ ٹرائی کیا تم نے؟" دانیال نے اسکرین پہ نظر آتے نمبر کو دیکھا۔
"یقیناً" آف ہوگا۔" آذر کو یقین تھا۔
"ٹرائی تو کرو۔"
"تم خود کر کے دیکھ لو۔" اس نے موبائل دانیال کو پکڑا دیا۔ اور پھر سچ مچ وہ نمبر پاور آف ملا تھا۔
"اب کیا سوچ رہے ہو تم؟" دانیال اس کا پر سوچ انداز بھانپ چکا تھا۔
"میں سوچ رہا ہوں کہ صرف فائرنگ ہی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اور مسئلے بھی سامنے آ رہے ہیں یا ایک ہی مسئلے کی کئی شاخیں نکل رہی ہیں۔" آذر کا انداز ہنوز پر سوچ سا تھا۔
"کیا مطلب ہے تمہارا؟" دانیال الجھا۔
"یار مطلب کو نہ دیکھو' تم غور کرو' علیزے پہ فائرنگ ہوئی لیکن علیزے کو نقصان نہیں پہنچا' فائرنگ کے فوراً" بعد ڈیڈ کو ان کے پرسنل نمبر پہ اطلاع دی گئی۔ حالانکہ ڈیڈ کا نمبر حادثے کے وقت نہ علیزے نے کسی کو دیا تھا نہ خیرو بابا نے' یعنی نمبر پہلے سے موجود تھا؟ پھر میڈیا والوں کو خرید لیا گیا' یعنی جتنا پیسہ میں نے دیا تھا' اس سے زیادہ پیسہ اس آدمی نے دیا ہوگا؟ ڈیڈ صبح خیرو بابا کی عیادت کے لیے ہسپتال گئے تو میڈیا والے بھی ان کے پیچھے پہنچ گئے' یعنی انہیں خبر کی گئی تھی؟ پھر میں ہسپتال گیا تو بھی خبر ہو گئی کہ میں خیرو بابا سے ملنے گیا ہوں یہاں تک کہ میرے پرسنل نمبر پہ میسج بھی بھیج دیا ہے۔ اور اس ساری صورت حال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ آدمی کس حد تک باخبر ہے اور کس حد تک ہم پہ نظر رکھے ہوئے ہے؟" آذر نے اپنی سوچ کا اظہار کافی تفصیل سے کیا تھا۔
"یہ تو تم واقعی ٹھیک کہہ رہے ہو' لیکن کیا کیا جا سکتا ہے اب؟" دانیال بھی اس کی سوچ پہ متفق تھا۔
"یہی کہ ہم حد سے زیادہ محتاط ہو جائیں' کوئی بات کسی سے ڈسکس نہ کریں' ہر بات اپنے تک محدود رکھیں' اور جو بھی قدم اٹھائیں اس کا کسی کو بھی علم نہ ہو۔ یہاں تک کہ ہمارے بڑوں کو بھی نہیں' کیونکہ ہمارے بڑے کسی بات کو نہیں چھپا سکتے اور آج کے بعد ہر بات میرے اور تمہارے درمیان رہے گی' کوئی تیسرا کچھ بھی نہ جانے۔" آذر نے اسے اچھی طرح سمجھایا۔
"اوکے ایز یو وش۔" دانیال نے سر جھکا دیا۔
"اور اب میرا خیال ہے کہ جو بھی پوچھ گچھ کرنی ہے وہ تم کرو گے' تم ہسپتال جاؤ اور پتا کرنے کی کوشش کرو کہ

جن لڑکوں نے خیرو بابا کو ایڈمٹ کروایا تھا انہوں نے اپنا نام پتا درج کروایا تھا؟" آذر نے اسے کام سونپا۔
"اوکے میں پتا کرتا ہوں۔"
"ٹھیک ہے پھر مجھے بتا دینا۔" آذر نے تاکید کی۔
"اس نمبر کا کیا بنا جس سے کل ڈیڈ کے نمبر پہ کال آئی تھی؟" دانیال جاتے جاتے پھر واپس پلٹا۔
"میں ٹیلی فون ایکس چینج گیا تھا۔ سپروائزر سے ملاقات ہوئی تھی وہ کہتے ہیں کچھ دیر تک ساری انفارمیشن میل کر دیں گے۔" آذر نے تسلی دی اور دانیال باہر نکل گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کومل۔۔۔!" وہ سیڑھیاں چڑھ رہی تھی جب پیچھے سے حرمت کی آواز سنائی دی۔
"ہوں؟" اس نے پلٹ کر دھیمے سے کہا۔
"لنچ نہیں کرو گی؟"
"نہیں بھوک نہیں ہے۔"
"کیوں آج بھوک کہاں اڑ گئی؟" حرمت کا لہجہ معنی خیز تھا۔
"کیوں؟ میری بھوک کیوں اڑے گی؟" کومل نے اسے گھورتے ہوئے دیکھا۔
"بس ویسے ہی۔۔۔" اس نے کندھے اچکائے
"تم ملازمہ سے کہو کھانا لگائے میں چینج کر کے آ رہی ہوں۔" کومل کہہ کر اوپر بیڈ روم چلی گئی تھی اور حرمت حسب توقع ملنے والے جواب پہ مسکراتی ہوئی کچن میں آ گئی۔ کچھ ہی دیر کومل بھی وہیں چلی آئی۔
"کھانے میں کیا بنا ہے آج؟" وہ کرسی کھینچتے ہوئے بولی۔
"مٹن رائس اور مٹن کڑاہی اور ساتھ میں باقی لوازمات۔"
"اف یار آج پھر مٹن؟" کومل کو کھانے میں چکن پسند تھا۔
"آذر بھائی اور ڈیڈ نے گھر پہ ہی لنچ کرنا تھا اس لیے ان کی پسند کو مدنظر رکھا گیا تھا۔" حرمت نے آگاہ کیا۔
"اور علیزے نے؟" کومل کو آذر اور ڈیڈ کے بعد علیزے کا خیال آیا۔
"اس کا کھانا تو پہلے ہی رجو نے تیار کرنا ہوتا ہے یقیناً" کوئی ویجی ٹیبل ہی بنائی ہوگی' یہ مٹن اور چکن تو اسے پسند ہی نہیں ہیں۔" حرمت سلاد کی پلیٹ میں سے مولی کی قاش اٹھاتے ہوئے بولی۔
"ہاں! یہ تو میں بھول ہی گئی۔" کومل مسخرانہ سا بولی اور کھانا نکالنے لگی۔
"تم بتاؤ سفر کیسا رہا؟" حرمت بالآخر اپنے مطلب کی بات پہ آ ہی گئی تھی۔
"کون سا سفر؟" وہ انجان بنی۔
"جس پہ تمہیں بھیجا تھا۔"
"آخری سفر؟" کومل بے ساختہ بولی۔
"بکو مت' صاف صاف بتاؤ' سفر کیسا رہا اور کیا کیا باتیں ہوئیں؟" حرمت کو بے چینی ہو رہی تھی۔
"یار کیسا سفر اور کیسی باتیں' یہ چھوڑو کوئی اور بات کرو۔" کومل کھانا کھانے میں مصروف تھی۔
"کیوں کوئی اور بات کروں تم کچھ تو بتاؤ نا۔" وہ اصرار کر رہی تھی۔
"تمہیں مایوسی ہوگی۔" کومل کا انداز لاپروا سا تھا اور بات بھی خاصے نارمل سے انداز میں کر رہی تھی۔
"وہ کیوں؟ آخر تمہیں کس لیے بھیجا تھا؟" حرمت کو تاؤ آ گیا تھا۔

"کس لیے بھیجا تھا؟" کومل نے پانی گلاس میں انڈیلتے ہوئے پوچھا۔
"باتیں کرنے کے لیے۔" وہ زور دے کر بولی۔
"کیسی باتیں؟" پھر وہی انجان پن۔
"کومل پلیز۔" حرمت جھنجلا گئی۔
"یار پوچھ رہی ہوں ناکہ کیسی باتیں؟" کومل نے پھر سوال دہرایا۔
"تمہاری باتیں اور ان کی باتیں۔" اب کی بار حرمت چبا کر بولی تھی۔
"ہوں! یعنی ہماری باتیں؟ دیکھو حرمت میری باتیں یہ تھیں کہ میری اسٹڈی کیسی جا رہی ہے اور میں کون سے ایئر میں ہوں؟ اور ان کی باتیں یہ تھیں کہ وہ علیزے کے لیے بہت پریشان ہیں اور علیزے آج کل ڈسٹرب ہے۔ بس اس کے بعد فون کال آ گئی اور باتیں ختم۔" کومل نے کافی استہزائیہ سے لہجے میں بتایا تھا۔
"بس یہ باتیں؟" حرمت کو افسوس ہوا۔
"بس یہ سفر۔" کومل نے ساتھ لقمہ دیا۔
"لیکن کومل۔"
"پلیز حرمت اب کوئی صفائی مت دینا میں سب جانتی ہوں۔" وہ کرسی دھکیل کر کھڑی ہو گئی۔
"کومل یار سنو تو۔" حرمت نے پکارا۔ مگر وہ وہاں رکے بغیر چلی گئی تھی اس کا موڈ آف ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼
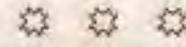
"استاد میں بڑے دنوں سے ایک بات سوچ رہا ہوں لیکن مجھے سمجھ نہیں آ رہی۔" چھوٹا پرانے کپڑے سے اپنے تیل سے اٹے ہاتھ پونچھتا ہوا عدیل کے پاس آ بیٹھا۔ عدیل ورکشاپ کے لیے نئے پرزے منگوانے کے لیے لسٹ بنا رہا تھا لیکن چھوٹے کی بات پہ ٹھہر گیا۔
"کیا بات سوچ رہے ہو۔" عدیل نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"پہلے وعدہ کرو کہ جواب ضرور دو گے۔" چھوٹے نے پہلے وعدہ لیا عدیل کو حیرت ہو رہی تھی۔
"او کے ضرور دوں گا۔"
"تو پھر یہ بتاؤ کہ "منی کیوں بدنام ہوئی؟" چھوٹا سنجیدہ سا منہ بنا کے بولا تھا۔
"ہیں؟" عدیل کو مزید حیرت نے آ گھیرا اور دور کھڑے سلو اور جیدی کو دیکھ کر وہ چھوٹے کی شرارت سمجھ گیا تھا وہ دونوں ہنس رہے تھے۔
"بتاؤ نا استاد منی کیوں بدنام ہوئی۔" چھوٹے نے اصرار کیا۔
"ڈارلنگ تیرے لیے۔" اس نے بے ساختہ کہا تھا اور چھوٹا خوشی اور فتح کے احساس سے قہقہے لگاتا اٹھ کر سلو کے پاس جا کھڑا ہوا تھا۔
"دیکھا استاد کو بھی پتا ہے "منی میرے لیے بدنام ہوئی ہے" تم تو صرف نام کے سلمان خان ہو۔" اس نے سلو کو چڑایا تھا۔
"تیرے لیے بدنام ہونے سے بہتر تھا کہ منی مر ہی جاتی۔" سلو چھوٹے کو پرے دھکیلتا ہوا گاڑی کے انجن پہ جھک گیا تھا۔
"یار تو شیلا کی جوانی گانا شروع کر دے۔" جیدی نے سلو کو تھپکی دی۔
"اور یہ پھر کہے گا کہ شیلا تو اس کی منگیتر رہی ہے۔" سلو نے چھوٹے کو گھور کے دیکھا تھا اور عدیل ان کی

شرارتوں اور چھیڑ چھاڑ پہ مسکراتا ہوا دوبارہ لسٹ کی طرف متوجہ ہوا تھا ان لوگوں کی پورا دن کسی نہ کسی گانے یا فلم پہ بحث اور نوک جھوک ہوتی ہی رہتی تھی اور کچھ نہ بس چلتا تو ایکٹریس اور ایکٹرز کو گفتگو میں گھسیٹ لاتے تھے اور جو جس کا دیوانہ ہوتا تھا اس کے بارے میں معلومات کا خزانہ بھی رکھتا تھا۔ اور ایسے چکروں میں اگر ورکشاپ کا کوئی کام ادھورا رہ جاتا تو باؤ امتیاز کے ہاتھوں ان کی شامت آ جاتی تھی اس وقت بھی کچھ ایسا ہی حال نظر آ رہا تھا۔
"یار باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ کام بھی کر لیا کرو یہ گاڑی آج ہی ٹھیک کر کے شیخ صاحب کے گھر پہنچانی ہے استاد تاکید کر کے گئے ہیں۔" عدیل نے بالا خران کو ٹوک ہی دیا تھا۔
"اور استاد نے یہ بھی تاکید کی ہے کہ شیخ صاحب پیسے نہ دیں تو گاڑی اسی طرح واپس ورکشاپ ہی لے آنا۔" چھوٹے نے ہنستے ہوئے کہا۔
"پھر شیخ صاحب خود گاڑی کی طرح بھاگتے ہوئے پیچھے آئیں گے۔" سلو نے بھی حصہ لیا اور عدیل چاہتے ہوئے بھی اپنی مسکراہٹ نہیں روک سکا تھا۔
"چلو اب باتیں بعد میں کرنا پہلے کام ختم کرو۔" اس نے سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا۔
"استاد سارا دن کام ہی تو کرتے رہتے ہیں۔" جیدی نے بے زاری سے کہا۔
"اوئے کم بخت سارا دن کام کرتے ہو تو کیا کام کے پیسے نہیں لیتے؟" باؤ امتیاز نے اندر آتے ہوئے اس کی بات سن لی تھی اور جیدی یکدم اچھل پڑا تھا۔
"نہیں استاد میں تو ویسے ہی کہہ رہا تھا۔" اس نے فوراً صفائی پیش کی۔
"میں اچھی طرح جانتا ہوں تو کتنا ہڈ حرام ہے کام چور ہے تو۔" باؤ امتیاز کو موقع مل گیا اسے کھری کھری سنانے کا جیدی سر جھکائے سنتا رہا اور باقی دونوں بڑی شرافت اور محنت کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود بہ خود اپنے اپنے کام میں لگ گئے تھے ان کو باتیں سنا کر باؤ امتیاز عدیل کے قریب آ گئے۔
"بن گئی لسٹ؟"
"جی بن گئی ہے۔" عدیل اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔
"کتنا خرچہ آئے گا؟" وہ ٹوٹل حساب پوچھ رہے تھے۔
"تقریباً بیس سے پچیس ہزار کا سامان ہو گا یہ سارا۔" عدیل نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔
"ہوں! تو پھر ایسا کرو کہ یہ سامان کل گوجرانوالہ جا کر لے آؤ" باؤ حمید کی مارکیٹ میں جانا اور میرا نام لینا" وہ سارا سامان سستے ریٹ میں دیں گے۔" انہوں نے اسے سمجھایا۔
"ٹھیک ہے میں جا کر لے آؤں گا" آپ سب کچھ سمجھا دیجیے گا۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہوں! شام تک سب سمجھا دوں گا اور سامان کے لیے رقم بھی دے دوں گا۔" باؤ امتیاز کو اس پر بھروسہ تھا اسی لیے اب ہر چھوٹے موٹے کام کی ذمہ داری اسے ہی سونپتے تھے۔
"جیسے آپ کی مرضی۔" وہ سعادت مندی سے بولا۔
"اور ہاں ایک بات بتاؤ" تمہارے ابا جی کیسے ہیں؟" باؤ امتیاز کچھ یاد آنے پہ واپس مڑتے ہوئے ٹھہر گئے تھے۔
"اب ابا جی کی طبیعت کے لیے میں کیا کہوں؟" عدیل نے بے بسی سے مسکراتے ہوئے کہا۔
"کیوں؟"
"کیونکہ ان کی طبیعت ویسی ہی ہے جیسی پچھلے دو سالوں سے چلی آ رہی ہے اب کون سا علاج کروا رہے ہیں جو اتنی جلدی فرق آ جائے گا؟" عدیل جیسے اپنے آپ پہ طنز کر رہا تھا حالانکہ وہ بڑا صابر و شاکر سا بندہ تھا۔
"تو علاج کیوں نہیں کروا رہے؟" باؤ امتیاز کا سوال بہت بے ساختہ سا تھا۔ عدیل باؤ امتیاز کو دیکھتا رہ گیا۔ "چپ

کیوں ہو گئے ہو؟"

"استاد آپ صرف اتنا جانتے ہیں کہ میرے ابا جی بیمار ہیں' نہ چل پھر سکتے ہیں' نہ خود کچھ کھا پی سکتے ہیں لیکن آپ یہ نہیں جانتے کہ میری پانچ بہنیں بھی ہیں جن کی ذمہ داری بھی ظاہر ہے کہ میری ہی ذمہ داری ہے ایسے میں گھر کا نظام چلے یا پھر کسی بیماری کا علاج؟" عدیل نے ان کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا باؤ امتیاز چپ کے چپ رہ گئے تھے اور انہیں یہ بھی احساس ہو گیا تھا کہ عدیل اتنا خاموش خاموش اور سنجیدہ سنجیدہ سا کیوں رہتا ہے؟

"دیکھیے استاد میں ورکشاپ میں کام کر رہا ہوں' جہاز کا انجینئر نہیں ہوں کہ ایک دم سے میرے گھر کے سارے مسئلے حل ہو جائیں' پورا مہینہ گاڑیوں کی مرمت ہوگی تب جا کر تنخواہ ملے گی' اپنی وے آپ پریشان نہ ہوں' اللہ بہتر کرے گا بس اللہ سے بہتری کی دعا کرنی چاہیے۔" اس نے باؤ امتیاز کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے الٹا انہیں تسلی دی تھی۔

"باؤ عدیل! تو تو واقعی بڑے حوصلے اور بڑے صبر والا ہے؟" باؤ امتیاز آہستہ سے سراہنے والے لہجے میں بولا تھا۔

"استاد مشکلیں اور مصیبتیں خود ہی انسان کو صبر اور حوصلہ سکھا دیتی ہیں اس میں کسی کی تسلی اور ہدایت کی ضرورت بھی نہیں پڑتی' سب کچھ خود بہ خود آجاتا ہے۔" عدیل کا انداز ٹھہرا ہوا تھا۔

"اللہ تمہیں اس صبر کا اجر دے گا۔" انہوں نے اس کا کندھا تھپکا۔

"آمین۔" وہ آہستہ سے کہہ کر کام کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن باؤ امتیاز کا دھیان کافی دیر اسی کی طرف لگا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ آج صبح کافی جلدی اٹھ گیا تھا اور جاگنگ پہ جانے کی بجائے شاور لینے باتھ روم میں چلا گیا۔ دس منٹ بعد شاور لے کر باہر نکلا تو دروازے پہ دستک ہوئی تھی۔

"ہوں! آجاؤ۔" اسے پتا تھا باہر کون ہو گا؟

"جی صاحب کس وقت نکلنا ہے؟" گلاب خان حکم کی تعمیل کے لیے تیار کھڑا تھا۔

"سات بجے ایئرپورٹ پہنچنا ہے' آٹھ بجے کی فلائٹ ہے اور صبح صبح اتنا رش ہوتا ہے کہ راستے میں لیٹ ہونے کی بجائے بہتر ہے کہ ہم ذرا پہلے پہنچ جائیں۔" وہ اپنے بالوں میں تولیہ رگڑتے ہوئے بولا۔

"جی صاحب یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" گلاب خان نے اتفاق کیا۔

"او کے تم گل سے کہو کہ وہ جلدی سے ناشتا بنا کر تیار ہو جائے' ہم راستے میں اسے نبیل کے گھر ڈراپ کر جائیں گے۔" اس نے وارڈروب کھول کر اپنے کپڑے نکالے۔

"جی صاحب کہہ دیتا ہوں۔" گلاب خان سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"اور زلفی سے کہو اب تمہاری صرف نائٹ ڈیوٹی نہیں بلکہ فل ٹائم جاب ہو گی۔" اس نے ایک اور حکم دیا۔

"فل ٹائم؟" گلاب خان کو حیرت ہوئی۔

"ہاں یار! تمہیں ہزاروں کاموں کے لیے ادھر سے ادھر بھاگنا پڑتا ہے اور آج کل کے حالات ایسے ہیں کہ ذرا دیر کے لیے بھی گیٹ کو خالی نہیں چھوڑا جا سکتا' اس لیے بہتر ہے کہ زلفی کو پکا پکا واچ مین رکھ لیا جائے' تمہاری پرابلم اور بھاگ دوڑ کم ہو جائے گی اور وہ بھی ایک جگہ ٹک جائے گا۔ کیا خیال ہے تمہارا؟" اس نے آخر میں گلاب خان سے استفسار کیا۔

"صاحب میرا خیال آپ کے خیال سے اچھا نہیں ہو سکتا' آپ نے جو بھی سوچا ہے بہتر سوچا ہے۔" اسے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا؟

"ٹھیک ہے جاؤ تم گاڑی تیار کرو میں آرہا ہوں بس۔" اس نے گلاب خان کو اجازت دی اور خود تیار ہونے لگا دس منٹ میں وہ تیار ہوا اور ناشتا کیا تھا۔ جب تک وہ گاڑی میں بیٹھا گل بھی چادر لے کر آگئی تھی۔ گلاب خان اس کے لیے بیک ڈور کھول رہا تھا وہ پیچھے بیٹھ گئی اور خود آگر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ آج گیٹ پہ گلاب خان کی بجائے زلفی تھا جیسے ہی گاڑی اسٹارٹ ہوئی اس نے گیٹ کھول دیا تھا۔ اور ساتھ ہی ہاتھ کے اشارے سے ول آور شاہ کو سلام کیا جواباً وہ بھی اشارے سے والسلام کہنا نہیں بھولا تھا۔

"اسپیڈ بڑھاؤ یار۔" اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"صاحب ہم سات بجے ان شاء اللہ ایئرپورٹ پہ ہوں گے۔" گلاب خان کو اپنی ڈرائیونگ پہ یقین تھا۔ ول آور اپنا موبائل نکال کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔

"السلام علیکم سر۔" دوسری طرف اس کا منشی قادر تھا۔

"میں آج کورٹ نہیں آرہا' تم آفس کا چکر لگا لینا۔"

"سر آج تو بہت اہم کیس۔۔۔"

"قادر! میں جانتا ہوں یہ کیس کتنا اہم ہے؟ لیکن میرے دوست نبیل سے زیادہ اہم نہیں ہے' میں اگلی تاریخ پہ سب ہینڈل کرلوں گا۔ تم بس تاریخ لے لو۔" اس نے منشی کو سمجھایا۔

ول آور شاہ نے کبھی بھی اپنے کسی کام میں کوتاہی نہیں کی تھی اور نہ ہی اپنے کلائنٹس کو خوار کرتا تھا بس آج کل اس کی مصروفیت ہی ایسی بڑھ گئی تھی کہ اسے یہ سب کرنا پڑ رہا تھا۔

"آپ کل تو کورٹ آئیں گے نا؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا' کل کا کام تمہیں کل ہی بتاؤں گا۔"

"سر! وہ مومنہ بی بی۔۔۔"

"پلیز قادر میں اس وقت کسی بھی مومنہ بی بی کو ڈسکس نہیں کر سکتا' یہ کام پھر کبھی پہ اٹھا رکھو۔" اس نے قادر کو روک دیا۔

"سوری سر!"

"او کے رات کو مجھے فون کر کے ساری تفصیل بتا دینا۔"

"ٹھیک ہے سر اللہ حافظ۔" اس نے فون بند کر دیا تھا۔

اور اگلے پانچ منٹ میں گل کو نبیل کے گھر ڈراپ کرنے کے بعد وہ لوگ ایئرپورٹ کی سمت روانہ ہو چکے تھے اور گلاب خان کے قول کے مطابق ٹھیک سات بجے وہ لوگ ایئرپورٹ پہ موجود تھے۔ گلاب خان گاڑی میں ہی بیٹھا رہا جبکہ وہ اندر چلا گیا فلائٹ کی ٹائمنگ کا ایک بار پھر پتا کرنا تھا۔

☼ ☼ ☼

آذر نے صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے اپنا لیپ ٹاپ آن کرتے ہوئے اپنی میلز چیک کی تھیں اور ایک میل پہ اس کی نظریں جم گئی تھیں وہ بری طرح چونکا تھا۔ یہ میل ٹیلی فون ایکسچینج کے سپروائزر فیضان حامد نے کی تھی جس میں انہوں نے آذر کے مطلوبہ نمبر کا ڈیٹا بتایا تھا' وہ نمبر اس ہسپتال کا نمبر تھا جہاں اس وقت خیرو بابا ایڈمٹ تھے۔

آذر اس نئے انکشاف پہ ایک بار پھر ساکت سا بیٹھا رہ گیا تھا یہ ساری گتھی اس قدر الجھی ہوئی تھی کہ سلجھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی کوئی سرا ہاتھ ہی نہیں آرہا تھا۔

"اف! اب کس کس چیز کا پتا کیا جائے؟" وہ لیپ ٹاپ اسی طرح چھوڑ کر بیڈ سے کھڑا ہو گیا تھا اور کمرے میں کافی اضطراری انداز میں ٹہلنے لگا تھا پھر نجانے کیا سوچ کر بیڈ روم سے باہر نکل آیا۔ اس وقت صبح کے چھ بجے کا وقت تھا اور حویلی میں چہل پہل کی خاصی کمی تھی آسیہ آفندی ڈرائنگ روم میں قرآن پاک پڑھ رہی تھیں۔

"السلام علیکم۔" اس نے آہستگی اور احترام سے سلام کیا۔ جواباً انہوں نے ایک نظر اسے دیکھ کر سر ہلایا تھا۔ آذر کا ارادہ انیکسی میں جا کر دانیال کو جگانے کا تھا لیکن پھر اس کے آرام کا خیال کر کے رک گیا اور اپنا ذہن کچھ ریلیکس کرنے کے لیے چائے پینے کا سوچا۔

وہ وسیع و عریض کچن کے دروازے سے اندر داخل ہوا ہی تھا کہ قدم وہیں ٹھٹک گئے۔ کومل چولہے پہ چائے کے لیے پانی رکھ رہی تھی۔

"کیا ایک کپ چائے کا مجھے بھی مل سکتا ہے؟" آذر کی آواز پہ کومل یکدم اس کی سمت پلٹی تھی آذر دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا تھا ڈھیلے ڈھالے ٹراؤزر شرٹ میں ملبوس سادہ سلیپر پہنے بے ترتیب سے ہیئر اسٹائل کے ساتھ وہ اس کے دل کو اور بھی دھڑکا گیا تھا۔

"یہ کیا پاگل پن ہے؟" آذر نے آگے بڑھ کے جھٹکے سے کومل کو اپنی سمت کھینچ لیا تھا کومل چکرا گئی تھی' وہ اس حملے کے لیے تیار نہیں تھی۔ آذر نے اس کا دوپٹہ کھینچ کر پرے پھینک دیا تھا۔

"کھڑے کھڑے کہاں گم ہو جاتی ہو؟" آذر تختی سے اسے جھڑک رہا تھا اور کومل پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی آذر کو اور کبھی فرش پہ جلتے اپنے دوپٹے کو دیکھ رہی تھی جب آذر کی سمت پلٹی تو دوپٹے کا پلو چولہے سے جا ٹکرایا تھا۔

"دوپٹے کی بجائے کپڑوں کو آگ لگ جاتی تو؟ کچن میں آتی ہو تو احتیاط کیا کرو۔" اس نے ہاتھ بڑھا کے چولہا بھی بند کر دیا تھا۔

"یہ کیا ہوا ہے؟" ثمرو بیگم کچن میں داخل ہوئیں لیکن وہاں کی صورت حال دیکھ کر تڑپ گئیں۔

"دوپٹے کو پیچھے سے آگ لگ گئی تھی۔ وہ تو شکر ہے کہ میں نے دیکھ لیا۔" آذر نے ان کو بتایا۔

"اف خدایا۔ کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟" انہوں نے آگے بڑھ کے کومل کو تھام لیا۔

"اسے پانی پلائیں اس کے حواس ٹھکانے پہ نہیں ہیں۔" اس نے خود ہی گلاس میں پانی انڈیل کر ثمرو بیگم کی سمت بڑھایا۔

"یہ بدبو کیسی ہے؟ کیا جل رہا ہے؟" ثروت بیگم بھی اندر آ گئیں۔

"ڈونٹ وری کچھ نہیں ہوا۔" آذر ان کو تسلی دیتا ہوا باہر نکل گیا اور کومل اسے پیچھے تک دیکھتی رہ گئی۔

اپنے لیے اس کو اس قدر فکر مند ہوتا دیکھ کر جیسے دل کو ایک قرار سا آ گیا تھا' اپنی ذات کے لیے اس کی پریشانی کومل کو روح تک سرشار کر گئی تھی' ایک لمحے میں ہی وہ کتنا کانشس ہو گیا تھا؟ ثمرو بیگم' ثروت بیگم اور باقی سب اس کے لیے متفکر ہو رہی تھیں لیکن وہ اندر ہی اندر خوشی سے رقص کر رہی تھی۔ اور وہ جو کسی ارادے سے اپنے بیڈ روم سے نکلا تھا' جوں کا توں واپس لوٹ آیا تھا۔ اب اسے آٹھ نو بجے تک دانیال کے اٹھنے کا انتظار کرنا تھا لیکن اس انتظار کے دوران اس کے دماغ میں طرح طرح کی سوچیں ناچتی رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"امی۔! مریم کہاں ہے؟"

"کچن میں....."

"فارغ ہے؟"

"وہ بھلا کب فارغ ہوتی ہے؟" عابدہ خاتون مسکرائیں۔

"یمن وغیرہ کہاں ہیں؟"

"کالج کے لیے نکل گئی ہیں۔ کیوں کیا کام ہے؟" انہوں نے عدیل کو تذبذب کا شکار دیکھا تو پوچھ لیا۔

"یہ کپڑے استری کروانے تھے۔" وہ شرمندگی سے بولا۔

"کون سے کپڑے؟" مریم فوراً" کچن سے نمودار ہوئی۔

"یہ کرتے۔" اس نے کپڑے برآمدے میں نکال کر رکھے ہوئے تھے۔

"یہ کیا کرنے ہیں؟ وائٹ پہن جائیں۔"

"نہیں وائٹ خراب ہو جائیں گے۔"

"خراب؟"

"ہاں سفر کے دوران گاڑیوں میں ہزاروں داغ لگ جاتے ہیں ایک ہی نیا سوٹ ہے وہ بھی خراب ہو جائے گا۔" عدیل نے مریم کو آنکھوں ہی آنکھوں میں چپ رہنے کا اشارہ کیا' وہ سمجھ گئی تھی۔

"جانا کہاں ہے؟" عابدہ خاتون نے بے ساختہ پوچھ لیا۔

"وہ امی دراصل آفس کے کسی کام سے گوجرانوالہ جانا ہے' شام تک واپس آ جاؤں گا۔" اس نے فوراً" ماں کو تسلی دی۔

"آپ سچ مچ گوجرانوالہ جا رہے ہیں؟" مریم اس کے کپڑے اٹھا کر اندر آئی تو مشکوک سے لہجے میں پوچھا تھا۔

"سچ مچ سے کیا مطلب ہے تمہارا کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟" عدیل نے اسے خفگی سے دیکھا۔

"آپ سچ بھی تو نہیں بول رہے نا؟"

"مریم میں واقعی گوجرانوالہ جا رہا ہوں۔"

"میں کیسے مان لوں؟" وہ بے یقین ہو رہی تھی۔

"یہ دیکھو پیسے' یہ استاد نے دیے ہیں ورکشاپ کے لیے کچھ ضروری سامان لانا ہے وہاں سے۔" اس نے اپنے تکیے کے نیچے رکھا پیسوں کا لفافہ نکال کر سامنے کیا۔

"اوکے اوکے مجھے یقین آ گیا ہے۔" مریم پیسے دیکھ کر فوراً" مان گئی تھی۔ اور استری کا پلگ لگا کر کپڑے استری کرنے بیٹھ گئی۔

"کچھ منگوانا ہے گوجرانوالہ سے؟" عدیل نہا کر آیا تو وہ کپڑے استری کر چکی تھی اور فرش سے استری اور کھیس اٹھاتے ہوئے وہ یکدم ہنس پڑی تھی۔

"آپ تو اس طرح پوچھ رہے ہیں جیسے انگلینڈ یا امریکہ جا رہے ہوں؟"

"یار ہم غریبوں کے لیے یہی انگلینڈ اور امریکہ ہے۔"

"ہاں یہ غریبوں کا انگلینڈ یا امریکہ ہے نا اسی لیے یہاں نہ بجلی مل رہی ہے' نہ پانی' نہ آٹا نہ چینی' یہاں موت بھی ملتی ہے تو بم دھماکے کی صورت میں۔" مریم دیکھتے ہی دیکھتے تلخ ہو گئی تھی عدیل جواباً" کچھ نہ کہہ سکا' وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی۔

"ناشتا بنا چکی ہو؟"

"جی' آپ جلدی سے آ جائیے۔" وہ سر جھٹکتی ہوئی باہر نکل گئی عدیل کو پتا تھا مریم حد سے زیادہ حساس ہے اس لیے وہ اس کا خیال سب سے زیادہ رکھتا تھا البتہ وہ خود بھی کافی کیئرنگ تھی ہر ایک کا خیال رکھتی تھی ہر ایک کے لیے ہلکان ہوتی رہتی تھی۔

"اچھا امی میں چلتا ہوں۔" عدیل ماں سے مل کر اباجی کے پاس گیا پھر مریم کو اللہ حافظ کہتے ہوئے گھر سے نکل گیا تھا۔

"فی امان اللہ۔" مریم دھیمے سے کہتی ہوئی دروازے بند کر کے برآمدے میں آگئی۔

"مریم۔" ساتھ والے گھر سے کوثر کی آواز سنائی دی۔

"جی باجی؟" مریم نے فوراً "پوچھا۔

"تمہاری سہیلی کا فون ہے جلدی آؤ ہولڈ پہ رکھا ہے۔" کوثر بلند آواز سے پیغام دے رہی تھی۔

"امی وہ فاطمہ کا فون ہے؟" مریم نے ماں کو دیکھا۔

"جاؤ سن آؤ جا کر۔" عابدہ خاتون نے اجازت دی اور مریم دوپٹہ پھیلا کر اوڑھتی ہوئی دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ وہ گلی میں بہت کم نکلتی تھی' اس کا کسی کے گھر بھی آنا جانا نہیں تھا' کبھی کبھار ضرورت کے وقت ہی کوثر باجی کے گھر آتی تھی۔

"السلام علیکم۔" اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی سامنے صحن میں کھڑی کوثر باجی کو سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام' جلدی جاؤ۔" انہوں نے کمرے کی طرف اشارہ کیا جہاں ان کا فون سیٹ رکھا تھا۔

"ہیلو......"

"کہاں مر گئی تھیں؟ دوبارہ دنیا میں آتے آتے دیر ہو گئی کیا؟" فاطمہ اس کی آواز سنتے ہی چڑ گئی تھی۔

"یار آج تک دوبارہ دنیا میں کون آیا ہے جو میں آؤں گی؟" مریم ہنسی تھی اسے پتا تھا کہ فاطمہ غصے میں ہے۔

"مجھے تو یہی لگ رہا تھا کہ تم دنیا سے رخصت ہو گئی ہو؟"

"چلو یار یہی سمجھ لو کہ میں دنیا سے رخصت ہو گئی ہوں اب بولو تمہیں میری یاد کیسے آگئی؟" مریم نے مطلب کی بات پوچھی۔

"مریم کیا واقعی تم میری دوست ہو؟" فاطمہ نے ذرا افسوس سے پوچھا۔

"تمہیں کوئی شک ہے؟" مریم سنجیدہ ہو چکی تھی۔

"ہاں۔" فاطمہ نے اثبات میں جواب دیا۔

"صرف اس لیے کہ پرسوں تمہارا برتھ ڈے ہے اور میں بھولی ہوئی ہوں؟" مریم نے سوال کیا اور فاطمہ حیرت سے گنگ رہ گئی' مریم کو اس کا برتھ ڈے یاد تھا۔

"تمہیں یاد تھا؟" وہ آہستگی سے بولی۔

"یاد تو مجھے پچھلے سال بھی تھا بس کسی مجبوری کی وجہ سے بھولنا پڑا۔" مریم کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

"لیکن اس بار میں کوئی مجبوری نہیں دیکھوں گی میں نے تمہیں انوائٹ کرنے کے لیے فون کیا ہے' تم نے پرسوں شام کو میرے گھر آنا ہے۔" فاطمہ نے حکم دیا۔

"لیکن فاطمہ......"

"لیکن ویکن کچھ نہیں میں گاڑی بھجوا دوں گی۔"

"مگر یار!" مریم نے بولنا چاہا۔

"میں نے کہا نا یار میں کوئی بہانا نہیں سنوں گی۔" فاطمہ اپنی مرضی چلا رہی تھی۔

"لیکن فاطمہ مجھے امی اور بھائی سے تو پوچھ لینے دو۔"

"ان سے بھی میں ہی پوچھ لیتی ہوں۔"

"نن..... نہیں' امی تو اباجی کے پاس بیٹھی ہوئی ہیں اور بھائی گھر میں نہیں ہیں۔" مریم نے اطلاع دی۔

"بھائی صاحب کہاں ہیں تمہارے؟" فاطمہ کو ذرا ٹھہر کر اس کا خیال آیا تھا۔

"وہ کسی کام سے گوجرانوالہ گئے ہیں۔"

"گوجرانوالہ میں کون سا کام نکل آیا؟" فاطمہ کو حیرت ہوئی۔

"آفس کا کوئی کام تھا شاید۔" مریم کو بہانا بنانا پڑا۔

"آفس کا کام گوجرانوالہ میں؟ یقیناً" کوئی لوہا وغیرہ خریدنا ہوگا؟ لوہا وہاں سے سستا مل جاتا ہے نا اس لیے۔" فاطمہ نے مذاق اڑایا۔

"پتا نہیں یار۔" مریم کو کوفت ہونے لگی۔

"اچھی وے' تم باقی باتوں کو چھوڑو اور میرے گھر آنے کی تیاری کرو' اور ہاں کسی گفٹ وغیرہ کے چکر میں مت پڑنا ورنہ جوں کا توں تمہارے ساتھ واپس بھیج دوں گی' بس میرے لیے تمہارا میری پارٹی میں چلے آنا ہی سب سے بڑا تحفہ ہوگا۔" فاطمہ بہت اپنائیت سے بولی تھی اور مریم اس کی بات پہ مسکرا دی۔

"تھینک یو۔"

"او کے اللہ حافظ' میں ویٹ کروں گی تمہارا اور گاڑی بھی بھجوا دوں گی۔" فاطمہ نے تاکید کرتے ہوئے فون بند کر دیا تھا اور مریم ریسیور ہاتھ میں لیے چپ چاپ سی بیٹھی رہ گئی تھی۔

وہ تو کوئی انکار' کوئی بہانا بھی سننے کو تیار نہیں تھی اور گھر کے حالات اقرار بھی نہیں کرنے دے رہے تھے وہ خاموشی سے اٹھ کر گھر آگئی۔

"خیریت ہے نا؟ فاطمہ نے فون کیوں کیا؟" عابدہ خاتون مریم کو چپ چپ سا دیکھ کر پریشان ہو گئی تھیں۔

"جی خیریت ہے۔"

"پھر تم کیوں پریشان ہو؟"

"پرسوں فاطمہ کی سالگرہ ہے اس نے آنے کی دعوت دی ہے' پچھلی بار بھی میں نہیں گئی تھی اور نہ اسے وش کیا تھا۔" مریم اندر ہی اندر متفکر سی تھی۔

"کوئی بات نہیں بیٹا چلی جانا۔"

"چلی جاؤں؟ مگر کیسے؟" مریم خفگی سے بولی۔

"کیسے جانا چاہتی ہو؟"

"خالی ہاتھ نہیں جانا چاہتی۔" وہ تلخی سے کہتی چارپائی پہ بیٹھ گئی۔

"تو میں کب کہہ رہی ہوں کہ خالی ہاتھ جاؤ' اللہ بہتر سبب نکالے گا' میں عدیل سے بات کروں گی۔"

"نہیں امی بھائی سے کچھ مت کہیے گا۔" اس نے منع کر دیا۔

"کیوں؟"

"خوامخواہ ان کو پریشان کریں گی۔"

"چلو اللہ بہتر کرے گا ابھی کل کا دن تو ہے نا۔" وہ مریم کا سر تھپکتے ہوئے بولیں اور اٹھ کر اندر چلی گئیں لیکن مریم وہیں بیٹھی سوچوں میں گم ہو گئی تھی اسے فکر نے گھیر رکھا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼

رات سے مسلسل بارش ہو رہی تھی، سردی ایک دم سے بہت بڑھ گئی تھی۔ ہڈیوں میں اترتی یخ بستہ ہوائیں سارے ماحول کو سرد کر رہی تھیں۔

صائمہ نے اجڑے بکھرے صحن پر ایک طائرانہ نظر ڈالی، جابجا بکھرے کاغذ اور تنکے جو کہ مسلسل ہونے والی بارش کی وجہ سے گیلے ہو کر اپنی اپنی جگہ پر جم سے گئے تھے، پہلے بہت تیز ہوا کے جھکڑ چلنے کی وجہ سے ہر چیز گرد آلود ہو گئی تھی۔ سرخ اینٹوں والے مختصر سے صحن میں پڑی گرد بارش نے جما دی تھی۔

بارش جب تھم چکی تو صائمہ نے نہایت ناگواری سے الجھے بکھرے گھر کو دیکھا، اماں نماز سے فارغ ہو کر پھر سے سو چکی تھیں۔ بھابھی (روبا) بھی ابھی تک سوئی ہوئی تھیں۔ صائمہ نے صحن میں جھاڑو لگائی اور ہاتھ دھو کر کچن میں آ گئی۔

آٹا گوندھ کر اپنے لیے ایک کپ چائے بنائی اور وہیں چیئر پر بیٹھ کر گھونٹ گھونٹ چائے اپنے اندر اتارنے لگی، چائے کی وجہ سے سردی کا احساس کچھ کم ہوا تو اٹھ کر ناشتا بنانے لگی، جب تک وہ ناشتے سے فارغ ہوئی تب تک روبا بھی جمائیاں ہاتھ سے روکتے ہوئے سیدھی کچن میں ہی چلی آئی تھی۔ وہ دیر سے اٹھنے کی وجہ سے کچھ شرمندہ سی تھی۔

"کھل گئی آپ کی آنکھ۔" صائمہ نے قدرے ناگواری سے کہا۔

"صائمہ وہ رات کو سر میں شدید درد تھا اور دیر سے سوئی تھی نا تو اس لیے۔" روبا نے اپنی صفائی قدرے جھجکتے ہوئے دی۔

"نہیں، نہیں آپ شرمندہ کیوں ہوتی ہیں۔ میں ہوں نا کام کرنے کے لیے۔"

"صائمہ باقی کام میں کرلوں گی، پلیز موڈ ٹھیک کرلو۔" روبا نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"ہونہہ۔ میری صاف گوئی بری لگتی ہے اگر کچھ کہوں گی تو منہ پھٹ کہلاؤں گی۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی کچن سے نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

حالانکہ روزانہ ناشتا روبا ہی بنایا کرتی، لیکن رات کو دیر سے سونے اور سر درد کی وجہ سے اس کی آنکھ دیر سے کھلی تھی تو صائمہ کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ روبا نے ارمان کو ناشتا کروایا، موسم خراب ہونے کی وجہ سے اسے خود اسکول چھوڑ کر آئی، ورنہ وہ "تقریباً" روز ہی اسرار احمد کے ساتھ ہی جایا کرتا تھا۔ اب پچھلے دو روز سے اسرار کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو روبا ہی اسے اسکول چھوڑنے جایا کرتی۔ روبا نے کچن سے باہر جھانکا، ہلکی ہلکی دھوپ نکل آئی تھی یا مدھم سی سردی کا اثر زائل کرنے کی ناکام کوشش کرتی دھوپ۔

تائی اماں اپنے نئے نویلے شادی شدہ بیٹے اور بہو رانیہ کے ساتھ کراچی گھومنے آئی ہوئی تھیں۔ روبا کی کچن کی ذمہ داریاں اور بڑھ گئی تھیں۔ تائی اماں کی فیملی کے لیے اپنی بساط سے بڑھ کر کھانے کا انتظام کیا جاتا تھا۔ کیونکہ صائمہ کی اماں کو امید سی تھی کہ شاید ان کے حسن سلوک اور خاطر مدارات سے جٹھانی جی متاثر ہو کر صائمہ کو اپنی بہو بنالیں، ان کی نک چڑھی اور عام سی شکل و صورت کی بہو کو ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا تھا۔

وہ لوگ گھومنے پھرنے کے لیے جا رہے تھے۔ رانیہ روز ہی خوب بن ٹھن کر گھر سے نکلتی تھی اور اپنے متعلق رانیہ، صائمہ سے رائے ضرور لیتی تھی۔

"کیسی لگ رہی ہوں؟"

صائمہ خوامخواہ کی تعریفیں شروع کر دیتی جو زیادہ تر خوشامد اور چاپلوسی ہی لگا کرتیں۔

اب بھی رانیہ اپنی سانولی رنگت کی پروا کیے بغیر اورنج کلر کا سوٹ پہنے بال کھولے اپنے میاں کے ساتھ جانے کو تیار کھڑی تھی اور صائمہ، رانیہ کو ستائش بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اسے مسلسل سراہے جا رہی تھی جبکہ روبا کو عجیب سی وحشت ہو رہی تھی رانیہ کو دیکھ کر، وہ لوگ تفریحی مقامات پر جا رہے تھے، مگر رانیہ کے تھوپے گئے میک اپ اور ڈھیروں جیولری سے گماں ہو رہا تھا کہ جیسے کسی شادی کی تقریب میں جا رہی ہو۔ سب لوگ ہنستے مسکراتے گھر سے نکل گئے۔ صائمہ بھی ان کے ساتھ ہی چلی گئی تھی، لنچ کا پروگرام بھی آج باہر ہی تھا۔ روبا نے صائمہ کی مبالغہ آرائی کی حد تک کی گئی تعریف سنی تو بہت سے درد اس کے اندر رونے لگے۔ وہ حیران ہوئی تھی صائمہ کی اس منافقت پر۔

روبا اس گھر کی اکلوتی بہو ہونے کا شرف رکھتی تھی۔ ایک پڑھی لکھی اور سلجھی ہوئی لڑکی ہونے کی وجہ سے ہر طرح کے ماحول میں خود کو ایڈجسٹ کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اسرار احمد بھی ایک بہت مہذب نوجوان ہونے کے ناتے روبا کے لیے بہت اچھے شوہر ثابت ہوئے، ساس صاحبہ بھی بظاہر بے ضرر سی خاتون تھیں، لیکن روبا محسوس کرتی کہ صائمہ اکثر روبا سے بدتمیزی کر جاتی ہے، اس کا لہجہ انتہائی گستاخ سا ہوتا تو ماں بجائے اسے سرزنش کرنے کے ایسے بن جاتیں جیسے کچھ دیکھا سنا نہ ہو اور اگر روبا اسے سمجھانے کی غرض سے کچھ کہتی تو اسرار اور اماں صائمہ کی ہی طرف داری کرتے ناچار روبا کو خاموشی اختیار کرنی پڑتی۔

روبا کو اچھی طرح سے یاد تھا کہ شادی کے بعد دونوں میاں، بیوی اسرار کے دوست کے ہاں انوائیٹ تھے۔ روبا نے بلیو کلر کی ساڑھی کے ساتھ ہلکی پھلکی جیولری ہی پہنی تھی اور بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ ہلکے ہلکے میک اپ کے ساتھ جب روبا نے بال سمیٹ کر کیچر لگایا اور آئینے میں اپنے سراپے کو دیکھا تو خوب سے خود ایک ستائش بھری مسکان اس کے ہونٹوں پر پھیلنے لگی، کمرے میں آتے اسرار نے اس کا کیچر اتار کر اچھال دیا تو روبا کے گھنے سلکی بال اس کی نازک کمر پر آبشار کی مانند پھیل گئے۔ اسرار مسحور کن سی مسکراہٹ لبوں پر سجائے روبا کو دیکھ رہا تھا۔

دونوں ساتھ ہی کمرے سے نکلے، لاؤنج میں صائمہ بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

"کیسی لگ رہی ہوں۔" روبا نے مسکرا کر صائمہ کو مخاطب کیا۔ صائمہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اسکرین پر ایسے نظریں جمائے بیٹھی تھی گویا یہ دنیا کا سب سے ضروری کام ہو، روبا کو سبکی کا احساس ہوا، پھر

بھی اس نے دوبارہ پوچھا۔

"صائمہ ذرا دیکھنا میں کیسی لگ رہی ہوں؟"

صائمہ نے ٹی وی سے ہٹا کر روبا پر ایک سلگتی ہوئی تنقیدی نظر ڈالی۔

"بھابھی آپ اتنی کمزور سی ہیں ساڑھی کچھ خاص نہیں جچ رہی اور جیولری بھی بہت معمولی سی لگ رہی ہے۔" صائمہ آرام سے کہہ کر دوبارہ ٹی وی شو میں منہمک ہو چکی تھی۔ روبا چند لمحے وہاں شرمندہ سی کھڑی رہی' پھر ٹوٹے پھوٹے قدموں سے باہر نکلی تو اماں ملامتی انداز میں صائمہ کو ڈانٹ رہی تھیں۔

"بیٹا ایسے نہیں کہتے' اتنی تو اچھی لگ رہی تھی۔" اماں کی مدھم سی آواز ان تک آئی۔

"اماں میں تو صاف گو ہوں جو مجھے جیسا لگے گا میں اسے ویسا ہی کہوں گی۔"

روبا جانتی تھی کہ اس کے ظاہری یا باطنی حسن میں کوئی کمی نہیں ہے' وہ ہر لحاظ سے مکمل لڑکی ہے۔ لیکن شاید صائمہ کی ذات کا کمپلیکس تھا یا کوئی اور مسئلہ کہ وہ جان بوجھ کر روبا کے ساتھ تلخ رویہ اپناتی تھی اور پھر بہت دھڑلے سے اپنی گستاخی اور بدتمیزی کو "صاف گوئی" کا نام بھی دیتی تھی۔

روبا بہت رکھ رکھاؤ والی لڑکی ہونے کی وجہ سے ہر معاملے کو عقل مندی سے ہینڈل کر لیتی تھی۔ صائمہ کے لیے بھی اس کے دل میں کوئی کینہ اور بغض نہیں تھا۔ اسے اچھی طرح علم تھا کہ اماں اور اسرار کی بے جا طرف داری نے صائمہ کو احساس برتری میں مبتلا کر دیا ہے اور اسے اپنی کہی ہوئی ہر بات ٹھیک لگتی ہے۔

رویوں اور گفتگو میں اعتدال بہت ضروری ہوتا ہے' لیکن روبا محسوس کرتی کہ صائمہ کا رویہ صرف روبا کے لیے ہی ایسا تلخ ہوتا ہے' ورنہ باقی لوگوں سے تو وہ بہت خوش اخلاقی سے پیش آتی تھی۔

جب ارمان پیدا ہوا تو کچھ کمزور سا تھا' اماں بہت خوش تھیں مگر صائمہ نے کبھی اسے ہاتھ لگانا بھی گوارا نہیں کیا۔ وہ دوسروں کے بچوں کی تعریفیں کرتی رہتی

"فلاں کا بچہ بہت صحت مند اور خوب صورت ہے۔" کبھی کہتی۔

"کاش ہماری بھابھی صاحبہ بھی ایک تندرست بچے کو جنم دیتیں' مگر جیسی وہ خود ہیں ویسے ہی بچے ہوں گے۔" وہ اٹھتے بیٹھتے ایسی باتیں کرتی رہتی' اچھی بھلی اسمارٹ اور خوب صورت روبا میں کیڑے نکالتی رہتی' روبا شکوہ کناں نظروں سے اپنی ساس کی طرف دیکھتی تو وہ نظریں چرانے لگتیں۔

"پیار تو اپنے خون کے رشتوں پر ٹوٹ کر آتا ہے۔ ارمان ذرا کمزور ہے۔ مگر بیٹا آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا' مگر بچے یہ تمہارا بھتیجا ہے' تمہارے لاڈلے بھائی کا بیٹا۔" اماں صائمہ کو سمجھاتیں' مگر نہ جانے کیوں صائمہ کو ارمان سے اتنی چڑ تھی۔

☆ ☆ ☆

صائمہ' روبا کی ماموں زاد بہن تھی۔ اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک ہر معاملے میں روبا ہمیشہ صائمہ سے آگے رہا کرتی' ایکٹو' اسمارٹ اور خوب صورت سی روبا' صائمہ کو بہت بری لگتی تھی۔ روبا کے مقابلے میں صائمہ قدرے دبی ہوئی شخصیت کی مالک تھی اور روبا سے دل ہی دل میں نفرت کرتی تھی اور جب وہ اس کی بھابھی بن گئی تو اسے بھی سارے بدلے لینے کا موقع مل گیا تھا۔ صائمہ ہر وہ بات اور ہر وہ کام کرتی جو روبا کے لیے تکلیف کا باعث بن سکتا تھا۔ وہ روبا کی تذلیل کرتی رہتی' پہلے پہل اس نے اپنا دفاع کرنے کی کوشش ضرور کی تھی۔ لیکن اسرار اور ممانی کی بے جا طرف داری نے روبا کو بددل سا کر دیا تھا اور اس نے ایک چپ مستقل ہونٹوں پر ثبت کر لی تھی۔ صائمہ کچھ بھی کہتی رہے وہ بس ٹکر ٹکر صائمہ کی شکل دیکھتی رہتی۔

روبا خیالات سے چونکی' وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی۔ دو آنسو غیر محسوس طریقے سے روبا کے گالوں پر بہہ نکلے' روبا نے بے دردی سے انہیں صاف کیا' ایک تلخ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

☆ ☆ ☆

صائمہ کی منگنی تایا ابا کے بیٹے اسجد سے ہو گئی تو وہ خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کرنے لگی' روبا کو تایا ابا کی فیملی عجیب سطحی سی لگا کرتی تھی' اپنی ہی بڑائی بیان کرتے رہنا' خود کو عقل کل سمجھنا' مگر اس رشتے کے سلسلے میں کسی نے روبا سے مشورہ کرنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ وہ بھی غیروں کی طرح سے ہی شامل ہوئی تھی۔ ایک ملال روبا کے دل میں ابھرا' مگر اس نے اس ملال و رنج کو شکوے کی صورت لبوں سے ادا کرنے کی کوشش نہیں کی اور ایک جامد چپ سادھ لی۔

آج کل صائمہ زیادہ تر "خود" پر توجہ دینے میں ہی لگی ہوئی تھی۔ روبا پر سے اس کی توجہ ہٹ چکی تھی۔ صائمہ کی شادی جلد ہونے والی تھی۔ تایا ابا کا گھرانہ بھی کوئی متمول گھرانہ تو نہیں تھا۔ اسرار کی طرح اسجد میں یا اس کے گھرانے میں ایسی بات نہیں تھی جو قابل ستائش ہو۔

شادی میں بہت ساری چیزیں روبا کو اچھی نہیں لگی تھیں۔ عام سی بری' ہلکا سا زیور' مگر روبا کو تو کوئی حق ہی نہیں تھا اپنی رائے کا اظہار کرنے کا۔

صائمہ نے سارا جہیز اپنی پسند سے بنوایا تھا۔ ہر چیز قیمتی تھی۔ اسرار نے اپنی بساط سے بڑھ کر صائمہ کی شادی پر پیسہ خرچ کیا تھا۔

لڑکی چاہے عام سی شکل و صورت کی ہو' لیکن دلہناپے کا روپ ہر لڑکی کو پری بنا دیتا ہے۔ صائمہ بھی بھاری کلمدار لہنگے میں بہت پیاری لگ رہی تھی۔ وہ بیڈ پر بیٹھی دروازے پر نظریں مرکوز کیے ہوئے تھی۔ کافی دیر بعد دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو وہ سمٹ کر بیٹھ گئی۔ اسجد نے صائمہ کی تعریف کی تھی۔ مگر جیسی والہانہ تعریف و توصیف کی وہ توقع کر رہی تھی' اسجد نے ویسا کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ الٹا اپنی ہی تعریفیں اور بڑائی بیان کیے جا رہا تھا۔

"میں یہ پسند نہیں کرتا' میں وہ پسند کرتا ہوں۔"

"مجھے زبان دراز لڑکیاں پسند نہیں ہیں۔"

"میری اماں' میری بہنیں' میرے لیے بہت اہم ہیں۔"

صائمہ کا دل بجھ سا گیا' اس نے ارمانوں بھری رات سلگتے ہوئے گزاری تھی۔

صبح اس کی نند نے اسے بیوٹی پارلر نہیں جانے دیا۔ اس نے بیوٹیشن کا کورس کیا ہوا تھا اور ولیمہ کی تقریب کے لیے وہ اپنے ہاتھوں سے بھابھی کو سنوارنا سجانا چاہتی تھی۔

"تانیہ!"

صائمہ نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو دنگ رہ گئی۔ تانیہ نے اتنا گہرا میک اپ کیا تھا کہ اس کے سارے نقش دب کر رہ گئے تھے۔

"یہ کیسا فضول سا میک اپ کر دیا ہے تم نے۔ چڑیل لگ رہی ہوں میں خود کو۔" صائمہ نے غصے سے کہا اور باتھ روم میں گھس گئی۔

جب وہ اچھی طرح سے چہرہ صاف کرکے باہر نکلی تو بھونچکی رہ گئی۔ تانیہ زور و شور سے رو رہی تھی' اس کے پاس تائی اماں اور اسجد کھڑے تھے۔

"کیا بکواس کی ہے تم نے تانیہ سے۔" اسجد غراتے ہوئے بولا۔

"کچھ نہیں' وہ میں۔۔۔" صائمہ' تائی اماں اور اسجد کے چہروں پر ناگواری اور غصہ دیکھ کر رک کر بولی' مگر اسجد نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی تھی۔

"میری لاڈلی بہن کو رلا دیا' چلو معافی مانگو تانیہ سے اور اس کی پسند کا میک اپ کرواؤ۔" اسجد کی آنکھوں میں برپا قہر نے اسے سہما دیا' وہ جو صاف گو ہونے کا ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے روبا کا دل دکھاتی تھی' چپکے سے اپنے آنسو دل میں اتارتی تانیہ سے معافی مانگ رہی تھی کہ سامنے لاڈلی تانیہ تھی' صائمہ نہیں۔

تانیہ سے دوبارہ اپنا میک اپ کرواتے ہوئے صائمہ سوچ رہی تھی۔ صاف گو میں صرف روبا کے لیے تھی' وہ میری صاف گوئی تھی یا حسد۔ اور اندر سے جو جواب آیا تھا اس نے اسے گہرے پاتال میں اتار دیا تھا۔

☆ ☆

سعدیہ راجپوت
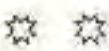
"جب سب کچھ طے کر چکے ہو تو یہ غصہ کس لیے ہے۔" ان کی بات سن کر بابا جان کے چہرے کے عضلات ڈھیلے پڑ گئے' سر کو ذرا سا جھکا کر کنپٹی مسلتے ہوئے انہوں نے سست لہجے میں کہا۔

"مجھے ملیحہ پر اتنا غصہ نہیں آ رہا جتنا اپنے آپ پر' جس بیٹی سے کبھی اونچی آواز میں بات نہیں کی' آج

چوتھا حصہ

مکمل ناول

کتنی سفاکی سے اسے کہہ دیا کہ مر جاؤ گی تو دفنا دوں گا' اتنی بڑی بات پتا نہیں کیسے میرے منہ سے نکل گئی۔ ملیحہ بھی حیران رہ گئی ہو گی بھلا کب اس نے میرے سخت لہجے کو سنا ہے' کبھی اس نے نوبت بھی تو نہیں آنے دی۔ پتا ہے وہ رو رہی تھی۔" وہ لب بھینچ کر چپ ہوئے' پھر کہنے لگے۔

"بس ایک بار میں نے ملیحہ کو روتے دیکھا تھا۔ جس دن فریال کا انتقال ہوا تھا وہ ماں کی لاش سے لپٹ کر اونچی آواز میں رو رہی تھی۔ میرا دل بہت چاہا کہ اس کے پاس جاؤں' آنسو پونچھ کر اسے گلے سے لگا کر کہوں ماں مری ہے' مگر باپ تو زندہ ہے۔ اس طرح رو کر باپ کو تکلیف نہ دو۔ مگر کیسے اسے رونے سے منع کرتا۔ اس کا رونا مجھ سے برداشت نہیں ہوا تو کمرے میں بند ہو گیا' تاکہ اس کی روتی آنکھیں نہ نظر آئیں۔ اس کی بین کرتی آواز میرے کانوں تک نہ پہنچے اور اس وقت تک کمرے میں رہا جب تک وہ روتے روتے تھک کر سو نہیں گئی۔" وہ درد کے بھرپور دکھ سے بولے۔

"اور آج میں نے خود اسے رلایا ہے' آج بھی میرا دل چاہ رہا ہے کہ اس کے پاس جاؤں' اسے چپ کراؤں' مگر آج بھی مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ اس کے آنسو دیکھ سکوں۔" ملک ناصر کو ان کے الفاظ اور ان کے بکھرے بکھرے انداز پر کوئی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ فریال کے بعد ملک ناصر ہی وہ دوسرے شخص تھے جو اس راز سے واقف تھے کہ باہر سے سخت نظر آنے والے اظہر فاروقی اندر سے بہت نرم تھے اور انہیں بھی اپنی نرمی کا احساس نہیں تھا۔

قصر فاروقی پہنچ کر بھی بابا جان ایک پل کے لیے چین سے نہیں بیٹھ سکے' مگر اس کے باوجود وہ اپنے فیصلے پر قائم تھے۔ باقی رات انہیں اپنے فیصلے کو مضبوط کرنے میں لگی۔ فجر کی نماز پڑھ کر وہ کمرے سے باہر آئے اور دھیرے دھیرے ملیحہ کے کمرے کو جاتی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ دروازہ کھول کر انہوں نے نماز پڑھتی ملیحہ کی پشت کو دیکھا۔ وہ وہیں رک کر اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگے' ملیحہ نے سلام پھیرا اور وہ کہنے لگے۔

"آج سے تین دن بعد یعنی جمعے کے روز تمہارا نور الہدیٰ کے ساتھ نکاح ہے۔ تمہیں جو بھی تیاری کرنی ہو آج اور کل میں مکمل کر لینا۔ بڑا فنکشن نہیں ہے' بس تمہارے ننھیال والے اور میرے کچھ

دوست ہوں گے۔ شاید کچھ مہمان نورالہدیٰ کے بھی ہوں، تم جن کو بلانا چاہو ان کے ناموں کی فہرست بنا کر میرے کمرے میں لے آؤ۔" اپنی بات کہہ کر انہوں نے ملیحہ کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی پر وہ آدھا چہرہ ہی دیکھ پائے، مگر وہ آدھا چہرہ پوری رات کی کہانی سنا رہا تھا۔ بابا جان کے اندر کشمکش چھڑ گئی تھی، مگر وہ اب بھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھے۔ لیکن انہیں احساس تھا کہ وہ کمزور پڑتے جا رہے ہیں، اسی لیے جب نورالہدیٰ سے بات کرکے اسٹڈی میں آئے تو خود اپنے فرار کی راہیں روکنے کے لیے عزیزوں، رشتے داروں کو فون کرکے ملیحہ اور نورالہدیٰ کی شادی کی اطلاع دے کر شام میں منگنی کے لیے دعوت دے ڈالی۔

افتخار حسن اس اطلاع پر حیرت سے مبارک باد دیتے ہوئے بولے۔

"مبارک ہو بھائی صاحب ویسے یہ خبر غیر متوقع تو نہیں ہے، لیکن کافی اچانک ہے۔"

"آپ کو بھی مبارک ہو اور شام میں سب گھر والوں کو لے کر آجایئے گا، منگنی کی چھوٹی سی تقریب ہے۔" بابا جان نے دانستہ ان کی اگلی بات ان سنی کردی تھی۔

"ضرور۔" افتخار حسن نے کہا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے ملیحہ کا فون آیا تھا، لیکن اس نے نہ شادی کے بارے میں بتایا، نہ منگنی کے بارے میں۔" بابا جان چونکے۔

"ملیحہ کا فون آیا تھا۔"

"ہاں۔ سمیرا سے بات ہوئی تھی۔ اس نے سمیرا کو فوراً" بلوایا تھا، مگر شادی کے بارے میں یقیناً" نہیں بتایا، ورنہ سمیرا ضرور ذکر کرتی۔ ابھی تک آپ کی طرف پہنچی نہیں۔" آخر میں انہوں نے پوچھا۔

"راستے میں ہوگی۔ اچھا افتخار میں فون رکھتا ہوں، باقی سب کو بھی اطلاع دینی ہے۔"

"جی بھائی صاحب! اللہ حافظ۔" فون رکھ کر بابا جان سوچنے لگے کہ ملیحہ نے سمیرا کو کیوں بلوایا ہوگا، پھر جب سمیرا ان کے پاس آئی اور ان سے ملیحہ کو ساتھ شاپنگ پر لے جانے کی اجازت مانگی تو وہ فوراً" ہی سمجھ گئے کہ ملیحہ نے سمیرا کو کیوں بلوایا تھا۔ انہوں نے سمیرا کو اجازت دے دی اور سمیرا کے جاتے ہی انہوں نے ریسیور اٹھا کر ایک نمبر ڈائل کیا۔

"ہیلو۔" دوسری طرف سے ملک ناصر نے فون اٹھا کر کہا۔

"ملک تم ابھی آسکتے ہو۔" ان کی آواز سن کر بابا جان نے کہا۔

"ہاں، لیکن کیا بات ہے۔"

"فون پر نہیں بتا سکتا، تم آجاؤ، پھر بات ہوگی۔" اتنا کہہ کر انہوں نے ریسیور رکھ دیا۔ بہادر ان کی چائے لے کر آیا تو وہ ہنوز سوچ میں ڈوبے تھے۔ وہ کپ رکھ کر پلٹنے لگا تو بابا جان نے اسے روک کر کہا۔

"بہادر ڈرائیور آجائے تو اسے میرے پاس بھیجنا۔"

"جی کرنل صاب۔" وہ سر ہلا کر چلا گیا۔ ملک ناصر چند منٹوں بعد قصر فاروقی میں تھے۔ انہوں نے لاؤنج میں سے گزرتے بہادر سے اظہر فاروقی کا پوچھا اور اسٹڈی میں آگئے۔ بابا جان کے مقابل میز کے دوسری طرف رکھی کرسی پر بیٹھنے کے بعد انہوں نے پوچھا۔

"اب بتاؤ کیا بات ہے۔"

"ملیحہ، وجدان سے ملنے گئی ہے۔" وہ پرسکون لہجے میں بولے تھے۔ ملک ناصر کچھ دیر خاموش رہے، پھر پوچھا۔

"تمہیں بتا کر گئی ہے۔"

"نہیں، بس میرا اندازہ ہے۔"

"غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔"

"ہاں ہو سکتا ہے، مگر اس کا کوئی چانس نہیں۔" ابھی وہ بول ہی رہے تھے کہ ڈرائیور آگیا۔

"ملیحہ کو لے کر آئے ہو۔"

"نہیں کرنل صاحب، بی بی لائبریری کے پاس اتر گئی تھیں اور کہا تھا کہ سمیرا بی بی کو ان کے گھر چھوڑ کر واپس آجاؤں۔" بابا جان۔ "ہوں۔" کہہ کر خاموش

ہو گئے تو ملک ناصر نے ڈرائیور سے کہا۔

"تم جاؤ۔" وہ چلا گیا تو بابا جان نے ہلکی آواز میں کہا۔

"میری بیٹی نافرمان بھی ہو گئی ہے، لیکن میں اسے خود سے بغاوت نہیں کرنے دوں گا۔"

"تو کیا کرو گے۔" ملک ناصر سرسراتے لہجے میں بولے۔

"وجدان کو قبول کرلوں گا۔" ملک ناصر کے لیے یہ جملہ اس قدر غیر متوقع تھا کہ وہ حیرت سے بول بھی نہ سکے اور بابا جان رکے بغیر بول رہے تھے۔

"ملیحہ میری جان ہے اور کوئی کتنی دیر اپنی جان پر عذاب برداشت کر سکتا ہے۔ اسے تکلیف پہنچا کر ایک رات کاٹنا مشکل ہو گیا تھا۔ ساری عمر اس احساس کے ساتھ کیسے گزار پاؤں گا کہ وہ میری وجہ سے دکھ میں ہے۔ کل وہ بار بار مجھ سے کہہ رہی تھی کہ وجدان سے مل لوں اگر آج وہ وجدان سے ملی تو اسے میرے پاس ضرور لائے گی اور وہ لڑکا اگر ملیحہ سے اتنی محبت کرتا ہے کہ اس کا ہاتھ مانگنے میرے پاس آجائے تو میں باخوشی ملیحہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دوں گا۔"

"اور نورالہدیٰ۔" ملک ناصر نے مبہم سا سوال کیا۔

"وہ پہلے ہی کہہ چکا ہے کہ ملیحہ کی مرضی کے بغیر اس سے شادی نہیں کرے گا اور اگر اسے پتا چل جائے کہ ملیحہ، وجدان سے شادی کرنا چاہتی ہے تو سب سے پہلے وہ ہی ان دونوں کی وکالت کرے گا۔ اسے واقعی ملیحہ کا بہت خیال ہے، بلکہ وہ بدمعاش تو ملیحہ کی خاطر مجھ سے جھوٹ بولنے سے بھی نہیں چوکتا۔" کچھ یاد کرکے وہ مسکرانے لگے۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی بھاری بوجھ ان کے سر سے سرک گیا ہو۔

☆ ☆ ☆

وجدان کی صبح بھاری سر کے ساتھ ہوئی تھی۔ رات نیند بھی بہت دیر سے آئی تھی اس لیے آنکھ بھی دیر سے کھلی، روز وہ آٹھ بجے لائبریری کے گیٹ پر ہوتا تھا۔ آج گھڑی میں نو بجتے دیکھ کر وہ اچھل کر بستر سے باہر آگیا اور چکراتے سر کی پروا کیے بغیر پندرہ منٹ میں تیار ہو کر بائیک کی چابی پکڑے وہ نیچے تھا۔ عائشہ ابھی تک اس سے ناراض تھیں، پر اسے خالی پیٹ گھر سے باہر جاتا دیکھا تو بول پڑیں۔

"جہاں جانا ہے ناشتا کرکے جاؤ۔" وجدان نے لاؤنج میں رک کر ڈائننگ ٹیبل کی طرف دیکھا۔

"امی مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

"دیر آفس کے لیے نہیں ہو رہی جو ناشتے کے لیے پانچ منٹ رک نہ سکو۔ سب جانتی ہوں اسی لڑکی کے

پیچھے جا رہے ہو۔" ان سے تو کچھ بولنا فضول تھا۔ ڈائننگ ٹیبل کے پاس آکر آفس کے لیے تیار ناشتا کرتے مصطفیٰ عظیم سے کہا۔

"ابو بس آج کا دن ہے کل سے میں واپس فارم جوائن کرلوں گا۔"

"آج کیا معجزہ ہونے والا ہے۔" عائشہ نے طنز کیا تو مصطفیٰ عظیم ٹوک کر بولے۔

"بس کرو عائشہ۔" پھر وجدان کی طرف رخ کیا۔

"بیٹے ناشتا کرلو۔"

"سوری ابو میں بہت جلدی میں ہوں۔" پھر اللہ حافظ کہہ کر باہر نکل گیا۔ وہ تیزی سے بائیک اڑائے جا رہا تھا۔ مگر اس کے خیال کی رو اس سے بھی تیز بہہ رہی تھی، کبھی اس کا دھیان ملیحہ کی طرف مڑ جاتا، کبھی اپنی امی کی طرف ان کا رویہ وجدان کو پریشان کر رہا تھا۔ مین روڈ پر آگے جا کر ایک کٹ تھا جس سے سیدھے ہاتھ پر مڑ کر سامنے ہی لائبریری والی گلی تھی۔ وجدان کو اس کٹ سے مڑ جانا تھا۔ مگر اپنے خیالات میں الجھے اسے ذرا آگے جا کر دھیان آیا۔ بجائے اس کے کہ وہ اگلے کٹ سے مڑ جاتا اس نے موڑ مڑنے کے لیے بائیک کا ہینڈل پوری طرح سے گھما دیا۔ رفتار کافی زیادہ تھی۔ بائیک لہرائی اور سلپ ہوگئی۔ وجدان سڑک پر گر کر بے ہوش ہو گیا تھا۔

پل بھر میں وہاں لوگوں کا مجمع لگ گیا۔ کوئی ایمبولینس بلوانے کی بات کر رہا تھا اور کوئی پولیس کو اطلاع کرنے پر زور دے رہا تھا، پھر ایک بھلے مانس نے ایک ساتھ دونوں کام کیے۔ اس ہجوم سے کوئی بھی وجدان کے قریب جانے کو تیار نہیں تھا، بس ایک شخص نے بڑی احتیاط کے ساتھ اس کی نبض چیک کی اور۔ "زندہ ہے۔" کی خوشخبری سنا کر پیچھے ہٹ گیا۔ لوگوں کی نظریں اس کے بے ہوش چہرے پر تھیں، یہاں سے ہٹتیں تو بائیک پر ٹھہر جاتیں، جس کا اگلا وہیل مڑ چکا تھا، مگر اسی ہجوم میں شامل ایک فقیر کی نظریں بائیک سے آگے فٹ پاتھ کے پاس پڑے اس چھوٹے سے بیگ پر تھیں جس میں وجدان کے شناختی کارڈ اور لائسنس کے علاوہ کچھ رقم بھی موجود تھی اور جو کچھ دیر پہلے وجدان کی کمر سے بندھا تھا، مگر گرنے کے دوران بالکل ٹوٹ جانے کی وجہ سے کھل کر الگ جا پڑا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا فٹ پاتھ تک آیا، پھر نظریں بچا کر وہ بیگ اٹھا کے اپنے کپڑوں میں چھپا لیا۔

"کوئی اندھے فقیر کی مدد کرتا جائے بابا۔" کی صدا لگاتا لاٹھی ٹیکتا ہوا اپنی راہ ہو لیا۔ کچھ دیر میں ہی پولیس موبائل کے ساتھ ایمبولینس آگئی۔ جو تھوڑا بہت ٹریفک چل رہا تھا وہ بھی رک گیا۔ ملیحہ کی کار بھی اس ٹریفک جام میں پھنس گئی تھی۔ آخر اس نے پیدل چلنے کا فیصلہ کیا اور کار سے اتر گئی۔ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے اس نے ایک اچٹتی سی نظر جائے حادثہ پر ڈالی، جہاں وجدان کو اسٹریچر پر ڈال کر ایمبولینس میں چڑھایا جا رہا تھا، مگر ہجوم کی وجہ سے ملیحہ اس کا چہرہ نہ دیکھ سکی۔

ایمبولینس کو بھیج کر پولیس نے وہاں موجود کچھ لوگوں کے بیان ریکارڈ کیے۔ پھر موقع کا جائزہ لے کر بائیک موبائل میں ڈال کر چلے گئے اور ٹریفک بحال ہو گیا۔ لائبریری کی سیڑھیوں پر بیٹھی لمحہ لمحہ گنتی ملیحہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ چند کلو میٹر کے فاصلے پر بے ہوش وجدان کے دماغ کا ایکسرے لیا جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼
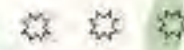
سمیرا نے ہال میں قدم رکھا تو سب گھر والوں کو وہاں جمع دیکھا۔ افتخار حسن اور منیر حسن بھی ابھی تک گھر میں موجود تھے۔

"آپ تو آفس چلے گئے تھے۔" وہ آفاق کو دیکھ کر حیرت سے بولی جو اسے قصر فاروقی ڈراپ کر کے آفس چلا گیا تھا۔

"ہاں مگر امی نے فون کر کے ملیحہ کی شادی اور شام میں انگیجمنٹ کا بتایا تو رہ نہیں سکا اور اصل صورت حال جاننے کے لیے چلا آیا۔"

"پر تمہاری تو ملیحہ سے بات ہو چکی تھی، تو تم نے بتایا کیوں نہیں۔" چچی سمیرا سے بولیں۔

"ملیحہ نے فون پر بتایا ہی کہاں تھا چچی جان وہ تو جا کر پتا چلا۔"

"لیکن واپس کیوں آگئیں دوپہر کے بعد ہم بھی وہاں جانے والے ہیں، تم وہیں ملیحہ کے پاس رہ جاتیں ایسے وقت میں وہ اکیلی ہے۔" اب اس کی امی نے کہا تو سمیرا بولی۔

"وہ گھر پر نہیں ہے، شاپنگ کے لیے گئی ہے۔ آج اور کل کا دن ہی تو ہے، پرسوں تو مہندی ہے، کہا تو اس نے مجھے بھی تھا، پر پوچھ کر نہیں گئی تھی، یوں بھی اتنی صبح شاپنگ کے خیال سے ہی مجھے چکر آگئے تھے۔"

"پوچھنے کا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا فون پر بتا دیتیں، کافی ہوتا۔" منیر حسن نے کہا۔

"لیکن سمجھ نہیں آرہا پھوپھا جان نے ملیحہ کی شادی اتنی جلد بازی میں کیوں طے کی۔" صمد نے وہ سوال پوچھا تھا تو جو آفاق کو پریشان کر رہا تھا اور جس کا جواب سوچ کر سمیرا ایک بار پھر پریشان ہو اٹھی۔

"ہمارے لیے یہ اطلاع اچانک ہے، مگر بھائی صاحب نے تو پہلے سے ہی طے کر رکھا ہو گا، پھر جب وقت قریب آیا تو اعلان کر دیا۔" اپنے بابا کی بات پر آفاق کی گردن دھیرے دھیرے نفی میں ہلنے لگی، اسے پتا نہیں کیوں یقین تھا کہ ملیحہ نے اپنے بابا جان سے بات کر لی ہو گی اور اب یہ شادی اسی کا ری ایکشن ہے، مگر اس نے خود کو بولنے سے باز ہی رکھا۔ صمد نے البتہ اختلاف کیا۔

"اگر ایسا ہوتا تو ملیحہ ضرور اس بات کا ذکر کرتی کہ درون خانہ اس کی شادی کی تیاریاں چل رہی ہیں۔" سمیرا کی امی بولیں۔

"جب بھائی صاحب نے ہی منہ سے بھاپ نہیں نکالی تو ملیحہ خود سے کیا کہتی، میرا تو خیال ہے نور الہدیٰ کے پاکستان واپس آتے ہی سب معاملہ فٹ ہو گیا ہو گا، پھر تم نے دیکھا نہیں تھا جب نور الہدیٰ ملیحہ کو لینے آیا تھا کیسے بھٹک بھٹک کر اس کا دھیان ملیحہ کی طرف جا رہا تھا۔ اب آیا زاد، چچا زاد، حسن بھائی تو ہمارے گھر میں بھی ساتھ رہتے آئے ہیں، پر ایسی یگانگت تو کبھی نہیں دیکھی، ہاں رشتہ اگر منگیتر کا ہو تو ایسا ہوا کرتا ہے۔"

ان کے تجزیے سے کسی کو بھی اختلاف نہیں تھا اسی لیے سب "ہاں" میں سر ہلانے لگے۔ آفاق لاتعلق سا بیٹھا سوچ رہا تھا کہ وجدان کو فون کر کے ساری صورت حال کے بارے میں بتائے، پر گھڑی میں دس بجتے دیکھ کر اس نے ارادہ بدل دیا اسے معلوم تھا کہ دس بجے وجدان کو ملیحہ سے لائبریری میں ملنا تھا اس لیے اس وقت اس کا گھر پر ملنا مشکل تھا۔ وہ آفس جانے کے ارادے سے کھڑا ہوا۔

"میں آفس جا رہا ہوں۔" اس نے سوچا سمیرا اسے باہر تک حسب معمول چھوڑنے آئے گی تو اس سے بات کر کے اندازہ لگائے گا کہ اسے ملیحہ نے اپنے اور وجدان کے بارے میں کچھ بتایا ہے یا نہیں، پر اعصابی طور پر تھک چکی سمیرا نے اسے بیٹھے بیٹھے ہی "اللہ حافظ" کہہ دیا۔ آفاق نے سوچا اسے باہر آنے کو کہے پھر خیال آیا ملیحہ پورے سیاق و سباق کے ساتھ واقعہ وجدان کے گوش گزار کر ہی دے گی جس کے بعد وجدان یقیناً اسے کنٹیکٹ کرے گا تو پھر سمیرا سے پوچھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ممکن ہے ملیحہ نے اسے نہ بتایا ہو اور آفاق کی باتوں سے وہ مشکوک ہو جائے۔ سمیرا سے بات کرنے کا خیال ترک کر کے وہ آفس کے لیے نکل گیا مگر آفس میں بھی وہ الجھا ہی رہا ہر بار جب اس کے ڈیسک پر رکھا فون بجتا تو وہ یہ سوچ کر فون اٹھاتا کہ شاید وجدان کا فون ہو آخر تین گھنٹے بعد اس نے وجدان کے گھر فون ملا دیا جسے ابیقہ نے ریسیو کیا تھا۔

"بھابھی السلام علیکم آفاق بات کر رہا ہوں وجدان گھر پر ہے۔"

"وعلیکم السلام اور آج کل آپ کے دوست کا کوئی ٹھکانہ نہیں اتنا تو آپ بھی جانتے ہیں۔"

"مطلب وہ گھر پر نہیں ہے۔"

"صحیح سمجھے۔"

"اچھا۔" آفاق نے اچھا کو لمبا کھینچا۔

"بھابھی اگر وہ گھر آئے یا اس کا فون ہی آجائے تو اس سے کہیے گا فوراً مجھ سے بات کرے یوں سمجھیں

ایمرجنسی ہے۔"
"ٹھیک ہے اسے بتادوں گی۔ اللہ حافظ۔" فون رکھ کروہ پلٹی تو عائشہ مصطفیٰ نے پوچھا۔
"کس کا فون تھا۔"
"آفاق کا۔ کہہ رہے تھے وجدان سے ضروری کام ہے گھر آئے تو اس سے کہیں کہ مجھ سے بات کرلے۔"
"ایسا کیا ضروری کام پڑ گیا۔" وہ اچنبھے سے بولیں۔
"ہوگا کوئی کام میں نے پوچھا نہیں۔" انیقہ نے شانے اچکا دیے۔

☼ ☼ ☼

وجدان کے ایکسرے کلیئر تھے اسے کوئی گہری چوٹ نہیں آئی تھی مگر اب تک وہ بے ہوش تھا۔ اس کے پاس سے ایسی کوئی چیز نہیں مل سکی جس سے اس کی شناخت ہوپاتی۔ جائے حادثہ سے بھی پولیس کو ایسی کوئی چیز دستیاب نہیں ہوئی۔ اب ایک ہی طریقہ تھا کہ بائیک کے رجسٹریشن نمبر کے ذریعے اس کا اتا پتا معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی۔

یہ 18 دسمبر 1981ء کا سرد دن تھا آج کا کمپیوٹرائزڈ دور نہیں تھا۔ اس وقت ریکارڈ ہاتھ سے تیار کیے جاتے تھے اور اگر کہیں کوئی فائل نکالنی ہوتی تو گھنٹوں اسٹور روم میں فائلوں کے انبار کے ساتھ سر کھپانا پڑتا۔ وجدان کی شناخت بھی ایسا ہی سردرد ثابت ہونے والی تھی جس میں گھنٹوں لگ جاتے۔

☼ ☼ ☼

آفاق سب کام چھوڑ کر بس وجدان کے فون کا انتظار کررہا تھا' آخر تھک کر اس نے خود وجدان سے ملنے کا فیصلہ کیا اور آفس سے اٹھ گیا۔ لائبریری کے گیٹ سے دور کار روک کر بیٹھا آفاق سوچ رہا تھا کہ اسے وجدان یہاں ملے گا یا نہیں۔ وہ ملیحہ سے دس بجے ملنے والا تھا اور اب پانچ بج رہے تھے ضروری نہیں تھا کہ وہ دونوں اب تک لائبریری میں ہوتے پھر اس کے ساتھ ملیحہ بھی ہوتی...... ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے ملیحہ کو لائبریری سے نکل کر سڑک کراس کرکے جنرل اسٹور میں جاتے دیکھا۔ آفاق کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں کچھ دیر بعد ملیحہ اسٹور سے نکل کر باہر آئی اور ٹیکسی میں بیٹھ کر چلی گئی۔
"وجدان کہاں رہ گیا۔" آفاق ملیحہ کی پریشانی بھانپ چکا تھا اس نے زیر لب کہا تھا پھر وہ کار سے اتر کر اسی اسٹور میں آیا جہاں سے کچھ دیر پہلے ملیحہ نے فون کیا تھا اور اپنے پاپا کے آفس کا نمبر ملادیا۔
"پاپا وجدان آفس میں ہے۔"
"کیا بات ہے آج ہر کوئی اسے میرے آفس میں کیوں فون کررہا ہے ابھی دو منٹ پہلے کسی لڑکی کا فون بھی آیا تھا۔ وجدان کا پوچھ رہی تھی۔ اب تم بھی اس کا پوچھ رہے ہو چکر کیا ہے۔"
"کوئی چکر نہیں ہے پاپا اچھا میں رکھتا ہوں۔"
پھر اللہ حافظ کہہ کر اس نے فون رکھ دیا۔
"میرا شک ٹھیک نکلا۔ وجدان ملیحہ سے ملنے نہیں آیا۔ پر کیوں؟" آفاق پیشانی مسلتے ہوئے سوچنے لگا۔ پھر آرٹس کونسل میں اس کی تلاش کرنے کے بعد وہ ساجد کی طرف آگیا۔
"یار ساجد وجدان کا کوئی پتا ہے۔"
"وہ وہیں لائبریری میں ہوگا۔" ساجد نے لاپروائی سے کہا۔
"وہ وہاں نہیں ہے۔ بلکہ کہیں بھی نہیں ہے۔" آفاق نے کہا پھر پریشانی سے بولا۔
"ساجد اس کا ملنا خود اس کے لیے بہت ضروری ہے کہیں سے بھی اسے ڈھونڈنا ہوگا۔"
"سب ٹھیک تو ہے۔" اس کے انداز پر وہ پریشان ہوگیا۔ آفاق لب بھینچ کر خاموش ہوگیا۔ ساجد اس کا دوست سہی پر وہ اس کے سامنے ملیحہ کا نام نہیں لینا چاہتا تھا۔ ساجد بھی اس کی خاموشی سے سمجھ گیا کہ کوئی ایسی بات ہے جو آفاق اسے بتانا نہیں چاہتا تو اس نے پھر کوئی سوال نہیں کیا اور اس کے ساتھ اٹھ آیا۔

☼ ☼ ☼

خوش قسمتی سے اس نئے ماڈل کی بائیک جسے

خریدے ہوئے بھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ کی فائل توقع سے کم وقت میں اسٹور روم سے برآمد ہوگئی۔ بائیک کی رجسٹریشن مزمل مصطفیٰ کے نام پر تھی۔ فائل میں مزمل کی تصویر بھی موجود تھی تصویر میں نظر آرہا چہرہ زخمی کے چہرے سے تھوڑی مشابہت تو رکھتا مگر پھر بھی کافی الگ تھا۔ رجسٹریشن فائل سے زخمی کی شناخت تو نہیں ہوسکی پر اس امید پر کہ مزمل مصطفیٰ اس نوجوان کی شناخت کرسکے۔ ایس ایچ او نے کاغذات سے ملنے والے اس کے آفس کے نمبر پر اسے فون کیا اور حادثے کی اطلاع دے دی۔ مزمل ایک پل میں سمجھ گیا کہ زخمی نوجوان کون ہوگا بائیک کی رجسٹریشن تو مزمل کے نام پر تھی مگر اس کا استعمال صرف وجدان ہی کیا کرتا تھا۔ فون پر بتائے گئے حلیے کو پہچان کر بھی مزمل نے خود جاکر تصدیق کرنا ضروری سمجھا اور اپنے گھر والوں کو حادثے کی اطلاع کیے بغیر ہسپتال آگیا جس کا نام اسے ایس ایچ او نے بتایا تھا جنرل وارڈ کے بیڈ پر وجدان کو دیکھ کر مزمل سکتے میں رہ گیا۔
اس نے فوراً ڈاکٹر سے اس کی حالت کے بارے میں پوچھا۔
"ہی از فائن۔ بائیک سے گرنے کی وجہ سے دونوں گھٹنے چھل گئے ہیں اور بائیں پنڈلی پر بھی کچھ چوٹیں آئی ہیں مگر وہ سب معمولی ہیں۔ ہیلمٹ نہ ہونے کی وجہ سے سر پر چوٹ آئی ہے مگر وہ زیادہ گہری نہیں لیکن ان کی بے ہوشی اسی چوٹ کی وجہ سے ہے۔"
"کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے۔" وہ فکر مندی سے بولا بالکل نہیں۔ "ہوش میں آتے ہی ان کا ہلکا پھلکا چیک اپ ہوگا اس کے بعد یہ گھر جاسکتے ہیں۔"
"اور اسے ہوش کب تک آئے گا۔"
"آپ کے بھائی کو دو تین گھنٹے میں ہوش آجائے گا مگر میں نے آپ سے کہا نا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔"
ہر طرف سے مطمئن ہوکر مزمل نے اسے روم میں شفٹ کرنے کا بندوبست کیا اب اسے مصطفیٰ عظیم کو اطلاع کرنی تھی۔ اسے فون پر ایسی پریشان کن خبر دینا مناسب نہیں لگا تو ان کے آفس آگیا۔
"ابو میں آپ کو لینے آیا ہوں۔"
"کیوں۔" وہ حیران ہوئے۔ مزمل ہچکچایا پھر سوچا بتانا تو پڑے گا۔
"وجدان کا چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔"
"کیا کہہ رہے ہو۔" مزمل نے کوشش کی تھی کہ خبر سناتے وقت وہ ریلیکس رہے مگر مصطفیٰ عظیم پھر بھی پریشان ہوگئے۔
"ابو پلیز پریشان مت ہوں وہ ٹھیک ہے۔ آپ آرام سے بیٹھ جائیے۔" مزمل نے ان کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں بیٹھنے کو کہا۔ وہ اس کے ہاتھ ہٹا کر بولے۔
"مجھے اس کے پاس لے چلو مزمل۔"
"لے جانے ہی آیا ہوں مگر آپ بیٹھ تو جائیں۔"
اس بار مزمل نے انہیں زبردستی بٹھادیا پھر پانی کا گلاس ان کے ہاتھ میں دے کر کہا۔
"آپ خود کو ریلیکس کریں وہ بالکل ٹھیک ہے۔ تب تک میں گھر پر اطلاع کرتا ہوں۔" وہ پانی کا گلاس پکڑے فکر فکر اسے دیکھتے رہے۔ مزمل نے پھر ان سے کچھ نہیں کہا اور گھر پر فون کرنے لگا۔ بیل جانے کی آواز سن کر وہ دعا کرنے لگا کہ فون انیقہ ہی اٹھائے پھر ایسا ہی ہوا۔
"انیقہ مجھے تم سے خاص بات کرنی ہے اس لیے پہلے تو تم آرام سے بیٹھ جاؤ۔"
"ایسی کیا بات ہے۔" انیقہ جو فون سننے سے پہلے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گئی تھی مزمل کی آواز سن کر گھبراہٹ میں کھڑی ہوگئی۔ مزمل نے نرمی سے ٹوکا۔
"دیکھو اگر تم اس طرح کروگی تو میں بات کیسے کروں گا۔" انیقہ کو لگا وہ ٹھیک کہہ رہا ہے اس نے اپنے حواس قابو میں کرکے کہا۔
"ہاں اب بتائیں کیا بات ہے۔"
"وجدان کا معمولی ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔"
"ایکسیڈنٹ۔" وہ خود کو پریشان ہونے سے روک نہیں پائی۔

"ہاں مگر چھوٹا سا۔ وہ ہسپتال میں ہے لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ اسے صرف معمولی چوٹیں ہی آئی ہیں۔ میں ابو کو لے کر کچھ دیر بعد گھر آجاؤں گا۔ تم امی کو حادثے کا بتا کر ذہنی طور پر تیار کرلو ورنہ ہسپتال میں وجدان کو دیکھ کر وہ پریشان ہوجائیں گی ٹھیک ہے۔"

"جی۔" اس نے کہہ کر فون رکھ دیا۔

عائشہ مصطفیٰ نے ایکسیڈنٹ کا نام سن کر ہی ہاتھ پاؤں چھوڑ دیے۔ انیقہ کو انہیں سنبھالنے میں کافی دقت ہوئی پھر چادر انہیں پکڑا کر ان کے بیٹھنے کے لیے کرسی اندر سے لاکر پورچ میں رکھی اس کے بعد بیٹے کو تیار کرکے ان کی گود میں دیا اور بھاگ بھاگ کر گھر کے دروازے لاک کرنے لگی تبھی بیل بجی تھی۔ انیقہ نے بے ساختہ ہی دوڑ کر گیٹ کھول دیا۔ اس کا خیال تھا کہ گیٹ پر مزمل ہوگا پر وہاں تو کوئی لڑکی تھی۔ اس لڑکی نے کاغذ پر لکھا ایڈریس اس کی طرف بڑھا کر تصدیق چاہی تصدیق کرتے ہوئے انیقہ نے پوچھا۔

"ایڈریس تو یہی ہے پر آپ کو کس سے ملنا ہے۔"

"وجدان مصطفیٰ سے۔" انیقہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ آج تک تو کوئی لڑکی وجدان کا پوچھنے نہیں آئی پھر یہ کون تھی۔ انیقہ نے غور سے اس خوش شکل لڑکی کو دیکھا جس نے کالی ساڑھی پر میرون شال سلیقے سے اپنے گرد لپیٹ رکھی تھی۔

"آپ کون ہیں اور وجدان سے کیوں ملنا چاہتی ہیں۔"

"میرا نام ملیحہ فاروقی ہے۔" اور اتنا سن کر ہی انیقہ کے اندر ابال اٹھنے لگے۔

"تو یہ ہے ملیحہ فاروقی جس کی وجہ سے وجدان میری بہن کو ریجیکٹ کررہا ہے۔ ہے ہی کیا اس میں ہر لحاظ سے ایک عام سی لڑکی ہے۔" اس نے تنفر زدہ آنکھیں ملیحہ کے چہرے پر گاڑ دیں جہاں بدحواسی پھیلی ہوئی تھی وہ منت بھرے انداز میں کہہ رہی تھی۔

"پلیز وجدان کو بلا دیجیے میرا ان سے ملنا بہت ضروری ہے۔"

"وہ گھر پر نہیں ہے۔" انیقہ نے کہہ کر گیٹ بند کرنا چاہا پر ملیحہ نے اسے ایسا کرنے نہیں دیا اور گیٹ پر ہاتھ رکھ کر روکتے ہوئے بولی۔

"آپ کو معلوم ہے وہ کہاں گئے ہیں اور کب تک آئیں گے۔"

"نہیں۔" جانے وہ کون سا جذبہ تھا کہ انیقہ نے اسے بے خبر رکھنا چاہا حالانکہ وہ دیکھ سکتی تھی کہ ملیحہ بہت پریشان ہے شاید یہ ملیحہ کو وجدان سے نہ ملنے دینے کی لاشعوری کوشش تھی۔ ملیحہ نے اپنا نمبر اسی چٹ کے پیچھے لکھ کر انیقہ کو دیا اور کہا۔

"وجدان جیسے ہی گھر آئیں ان سے کہیں اس نمبر پر مجھ سے بات کرلیں۔" انیقہ نے چٹ لے کر گیٹ بند کردیا۔ بیل کی آواز سن کر عائشہ بھی پوتے کو اٹھائے گیٹ کی طرف بڑھی تھیں پر انیقہ کو بات کرتے دیکھ کر سمجھ گئیں کہ مزمل نہیں آیا اور وہیں رک کر انیقہ کو دیکھنے لگیں۔ گیٹ بند کر کے وہ واپس مڑی تو انہوں نے پوچھا۔

"کون تھا۔"

"کوئی لڑکی تھی۔ غلط پتے پر آگئی تھی۔" مختصر سے کہہ کر اس نے کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے ہوا میں اچھال دیے۔

☼ ☼ ☼

وجدان ابھی تک بے ہوش تھا۔ عائشہ اس کے ماتھے سے بال سمیٹ کر سر پر بندھی پٹی کو ہلکے ہاتھ سے چھو کر فکر مندی سے بولیں۔

"اسے ہوش کیوں نہیں آیا۔"

"امی سر پر چوٹ لگی ہے کچھ تو اثر ہوگا۔ ویسے میری ڈاکٹر سے بات ہوئی تھی وہ کہہ رہے تھے وجدان شاک کی وجہ سے بے ہوش ہے۔ سر پر چوٹ لگنے سے اکثر ایسا ہوجاتا ہے اس میں پریشان ہونے والی کوئی بات نہیں پھر ایکسرے بھی تو کلیئر ہیں۔" مزمل نے رسان سے انہیں سمجھایا۔

ساجد اور آفاق وجدان کو پورے شہر میں ڈھونڈنے کے بعد اس امید پر کہ شاید وہ گھر چلا گیا ہو۔ اس کے گھر آگئے۔ آفاق گاڑی میں بیٹھا رہا۔ ساجد اتر کر گیٹ تک آیا۔ بیل بجاتے ہوئے اس کی نظر گیٹ سے جھولتے تالے پر پڑی۔ آنکھوں میں تفکر لیے وہ گاڑی میں آبیٹھا۔ آفاق نے اسے دیکھا۔

"کیا ہوا۔"

"گیٹ پر تالا لگا ہوا ہے۔" آفاق چپ سا ہو گیا پھر ساجد نے ہی پوچھا۔

"اب کہاں چلنا ہے۔" آفاق نے کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھا پھر کہا۔

"سات بجنے والے ہیں اب اور وقت نہیں بچا۔" اس کا لہجہ عجیب سا ہو گیا تھا۔ ساجد نے الجھ کر اسے دیکھا لیکن کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔

"تمہیں کہاں ڈراپ کروں۔"

"آفس ہی ڈراپ کردو وہاں سے گاڑی لے کر گھر جاؤں گا نہیں تو صبح پیدل آفس جانا پڑے گا۔" ساجد اپنی عادت کے مطابق ایٹ سے موڈ میں بولا تھا۔

اسے آفس چھوڑ کر آفاق نے کار اپنے گھر کی طرف موڑ دی۔

☼ ☼ ☼

نور الہدیٰ کو آج پتا چلا تھا کہ غم جاناں کے ساتھ غم روزگار کا کمبینیشن کتنا برا لگتا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ ملیحہ کے لیے کچھ سوچنے سے خود کو باز رکھا تھا پر آج انہیں ملیحہ کے سوا کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ یوں بھی خوش باش انسان تھے پر آج ان کی خوشی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ محبت کو پالینے کا نشہ بھی کیسا سحر انگیز ہوتا ہے اور یہ سحر پوری طرح سے انہیں جکڑے ہوئے تھے۔ وہ سر شام ہی گھر لوٹ آئے۔ بابا جان اور ملک ناصر لاؤنج میں آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھے تھے پر آج شطرنج کی بساط نہیں بچھی تھی نور الہدیٰ اس تبدیلی کو نوٹ کیے بغیر بابا جان کے پاس آگئے۔

"دیکھیے بابا جان۔ حسب وعدہ سات بجنے سے پہلے میں گھر پر ہوں۔"

"لیکن ملیحہ گھر پر نہیں ہے۔" بے ساختہ بابا جان کے منہ سے نکلا تو وہ سرسری سے انداز میں پوچھنے لگے۔

"کہاں گئی ہے۔" بابا جان نے ذرا توقف کیا پھر کہا۔

"شادی کی شاپنگ کے لیے۔"

"ابھی تک آئی نہیں۔" پھر دھیان آنے پر پوچھنے لگے۔

"اور گئی کس کے ساتھ ہے۔"

"اکیلی ہی گئی ہے کچھ دیر میں آجائے گی۔"

"اچھا میں فریش ہو کر آتا ہوں پھر ساتھ میں چائے پییں گے۔" نور الہدیٰ نے کہا پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

"تم نے اسے بتایا کیوں نہیں اظہر۔" ملک ناصر نے نور الہدیٰ کے جانے کے بعد بابا جان سے کہا۔

"بتانے کے لیے کیا رکھا ہے ملک صبح سے شام ہوگئی ہے اور ملیحہ ابھی تک گھر نہیں آئی۔"

"ہوسکتا ہے ابھی تک ملیحہ کی وجدان سے ملاقات نہ ہوئی ہو۔" ملک ناصر نے خوش گمانی کی تو بابا جان بولے۔

"اور یہ بھی ہوسکتا ہے اس نے ملیحہ کی بات ماننے سے انکار کردیا ہو۔" پھر اپنے ہی قیاس پر پریشان سے ہوگئے۔

"ملک دعا کرو میری بچی کا دل نہ ٹوٹے۔" مگر سات بجے اہتمام سے تیار ہوئی ملیحہ کو ڈرائنگ روم میں آتا دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ ان کی دعا رائیگاں گئی تھی۔ بابا جان تو کچھ بھی بولنے کی پوزیشن میں نہیں تھے البتہ ملک ناصر فوراً اس کی مدد کو آئے۔

"چھوڑیے بھابھی اب باتوں میں مزید وقت کیا گنوانا۔ آؤ بٹی رسم کرلی جائے۔" سب رسم کے خیال سے ایکسائٹڈ ہوگئے اور کسی کو پھر اس طرف دھیان نہیں آیا۔ ملیحہ سے کہہ کر وہ بابا جان کے پاس آئے جو ماتھے پر شکنیں لیے ملیحہ کو گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"چلو اظہر۔"

"اس نے میری بیٹی کو دھوکہ دیا ہے۔" بابا جان نے آنسوؤں لہجے میں گھٹی ہوئی آواز کے ساتھ کہا تو ملک ناصر نرمی سے ٹوک کر احساس دلانے لگے۔

"یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ آؤ بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دو۔" پھر نور الہدیٰ نے بابا جان سے اجازت لے کر ملیحہ کے بائیں ہاتھ کی انگلی میں ڈائمنڈ رنگ پہنادی۔ پلکیں جھکا کر بیٹھی ملیحہ کو دیکھ کر بابا جان نے دل ہی دل میں دعا دی۔

"یا اللہ جو دکھ میری بیٹی نے جھیل لیا اس کی شکایت نہیں مگر آئندہ ملیحہ کی زندگی میں کوئی غم نہ آئے۔"

☼ ☼ ☼

سات بجے کہیں جا کر وجدان کو ہوش آیا تو وہ آنکھیں کھول کر چھت کو دیکھنے لگا پھر اس نے گردن ہلا کر دائیں بائیں دیکھا اپنے گھر والوں کو اپنے پاس دیکھ کر اس نے پوچھا۔

"میں کہاں ہوں۔"

"تم ہاسپٹل میں ہو۔" مصطفیٰ عظیم اس کے پاس آکر بولے مگر اسے فوری طور پر کچھ یاد نہیں آیا تو حیرت سے بولا۔

"ہاسپٹل میں۔"

"ہاں تمہارا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔"

"ایکسیڈنٹ۔" وجدان کو سب یاد آگیا یہ بھی کہ وہ ملیحہ سے ملنے جارہا تھا وہ جھٹکے سے اٹھ کر بیڈ سے کھڑا ہو گیا۔ مگر چکر آگئے اور ساتھ ہی سر میں ٹیس بھی اٹھی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر وہ واپس بیڈ پر بیٹھ گیا۔

"آرام سے بیٹا۔" عائشہ نے قریب آکر اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

"کیا ٹائم ہو رہا ہے۔" وجدان کے پوچھنے پر مزمل نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

"شام کے سات بج رہے ہیں۔"

"کیا؟" اسے یقین ہی نہیں آیا۔ پھر وہ چکراتے سر اور درد کرتے گھٹنوں کی پروا نہ کرتے ہوئے بیڈ سے اٹھ کر مزمل کے پاس آکر بولا۔

"مزمل بھائی اپنی گاڑی کی چابی دیں مجھے جانا ہے۔"

"کہاں جارہے ہو۔ ابھی تو ہوش آیا ہے تمہارا چیک اپ ہونا باقی ہے۔" عائشہ مصطفیٰ پریشان ہو گئیں۔

"تمہاری ماں ٹھیک کہہ رہی ہے وجدان چیک اپ سے پہلے تم کہیں نہیں جاسکتے پھر تم نے صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں ہے۔"

"ابو پلیز یہاں میرا دم رک رہا ہے اور آپ کو کھانے کی پڑی ہے۔" اس کے لہجے کی بے قراری محسوس کرکے مصطفیٰ عظیم خاموش ہو گئے اور وہ پھر سے مزمل سے بولا۔

"بھائی چابی دیں۔" مزمل سمجھ گیا تھا وہ رکے گا نہیں اس لیے نرمی سے بولے۔

"دیکھو تم اس حالت میں ڈرائیو نہیں کرسکتے۔ جہاں جانا ہے میں تمہیں لے جاتا ہوں۔ بتاؤ کہاں جانا ہے۔" وجدان اس سوال پر الجھ گیا۔

سات بجے لائبریری بند ہو جاتی تھی اور اگر میٹنگ بھی اس وقت تک ختم ہو چکی ہو گی پھر ملیحہ سے ملنے کی کیا صورت ہو۔ سوچتے سوچتے اس کی نظر انیقہ پر پڑی تو یوں ہی پوچھنے لگا۔

"بھابھی میرے لیے کوئی فون آیا تھا یا گھر پر کوئی میرا پوچھنے آیا ہو۔" انیقہ اندر ہی اندر گھبرا گئی مگر اس کے بولنے کی نوبت ہی نہیں آئی اور عائشہ نے کہا۔

"ہاں آفاق کا فون آیا تھا کہہ رہا تھا ضروری کام ہے تم اسے فون کرلو۔" وجدان کو پتا نہیں کیوں لگا کہ آفاق ملیحہ کے بارے میں بات کرنا چاہ رہا ہو گا۔ وہ تیزی سے بولا۔

"مزمل بھائی مجھے آفاق کے گھر لے چلیں۔"

"ٹھیک ہے چلو۔" وجدان کو سہارا دے کر ساتھ لے جاتے مزمل سے مصطفیٰ عظیم متفکر ہو کر بولے۔

"اس کا خیال رکھنا۔"

"جی ابو۔" اس نے کہا اور وجدان کے ساتھ باہر

نکل آیا جو لڑکھڑاہٹ کے باوجود سیدھا چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آفاق کے گھر پہنچے تو وہاں کوئی نہیں تھا۔

"اب کیا کرو گے۔" مزمل نے پوچھا۔

"انتظار۔" اس نے کہا تو مزمل بولا۔

"دیکھو ساری فیملی کہیں گئی ہے اور واپسی میں یقیناً دیر ہو جائے گی تو چوکیدار کی طرح گیٹ پر بیٹھے رہنے سے کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم کسی ہوٹل میں جاکر کھانا کھالیں۔ مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔" آخر میں وہ بے چارگی سے بولا تو وجدان ہنس پڑا۔

"ٹھیک ہے لیکن بل آپ دیں گے۔"

"وکیلوں کی نظر دوسروں کی جیب پر کیوں ہوتی ہے۔"

"کیونکہ دوسروں کی جیب سے ہی وکیلوں کی جیب میں مال آتا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تو مزمل نے کہا۔

"پیٹ باتوں سے بھرلیں گے تو کھائیں گے کیا۔ چلیں۔" اور دونوں بھائی پاس کے ہی ہوٹل میں کھانا کھانے چل پڑے۔

☼ ☼ ☼

کھانے کے بعد افتخار حسن نے رخصت کی اجازت چاہی تو ملیحہ سمیرا سے گلے مل کر منت سے بولی۔

"آج رک جاؤ سمیرا۔" صبح تو آفاق نے سمیرا سے بات کرنے کو ٹال دیا تھا مگر اس وقت اسے سمیرا سے بات کرنے کی بہت جلدی تھی اس لیے ملیحہ کی حالت کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے اشارے سے سمیرا کو منع کردیا۔ اس کا اشارہ سمجھ کر سمیرا نے ملیحہ سے نا چاہتے ہوئے بھی معذرت کرلی۔

"آج تو نہیں رک سکتی مگر کل میں صبح سے ہی آجاؤں گی۔" پھر اسے اپنا خیال رکھنے کا کہہ کر گاڑی میں جا بیٹھی۔ آفاق بھی بابا جان کو اللہ حافظ کہہ کر نور الہدیٰ سے گلے ملنے کے بعد گاڑی میں آگیا۔

"تم ملیحہ اور وجدان کے بارے میں کیا جانتی ہو۔" گاڑی میں وہ دونوں ہی تھے اسی بات کا فائدہ اٹھا کر ڈرائیونگ کرتے آفاق نے چپ بیٹھی سمیرا سے اچانک ہی پوچھا۔ وہ براہ راست سوال پر گڑبڑائی پھر اسے سچ بولنا بہتر لگا۔

"سب کچھ۔ مگر ایک بات نہیں جانتی کہ وعدہ کرنے کے بعد وجدان لائبریری کیوں نہیں آیا۔"

"یہ تو میں بھی جاننا چاہتا ہوں۔" اس نے دھیرے سے کہا پھر پوچھا۔

"یہ شادی کا کیا معاملہ ہے۔"

"ملیحہ کی شادی نہیں ہو رہی آفاق اسے زندہ دیوار میں چنوایا جارہا ہے۔ کل رات اس نے پھوپھا جان سے وجدان کے لیے بات کی تھی اور وہ بھڑک گئے پھر صبح اسے نکاح کی خبر دے دی۔"

"یعنی میرا شک صحیح تھا۔ لیکن نور الہدیٰ اس شادی کے لیے کیسے راضی ہو گیا وہ بھی فوراً۔"

"پھوپھا جان کو جانتے نہیں ہیں کہ کوئی تیس مار خان بھی ان کے سامنے دم نہ مارے نور الہدیٰ کیا چیز ہے پھر ملیحہ میں کس چیز کی کمی ہے جو وہ انکار کرتا۔" بے زار سے لہجے میں کہہ کر وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

جب یہ قافلہ اپنی منزل پر پہنچا تو وجدان کو وہاں دیکھ کر حیران رہ گئے جو سر پر پٹی لپیٹے کار کے بونٹ پر چڑھ کر بیٹھا تھا اور مزمل اس کے سامنے کھڑا جوتے کی نوک سے زمین کھرچ رہا تھا کسی نے بھی گاڑی گیٹ سے اندر جانے کا انتظار نہیں کیا اور دروازے کھول کر وہیں اتر گئے۔ سمیرا کی امی اس کی پٹی اور چہرے پر خراشوں کو دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔

"یہ سب کیا ہے وجدان ہے تمہیں چوٹ کیسے لگی۔"

"کچھ نہیں خالہ بس بائیک سلپ ہو گئی تھی۔"

"مگر یہ ہوا کیسے؟" افتخار حسن بھی اس طرف چلے آئے۔

"آپ اندر تو چلیں پھر بتاتا ہوں۔" کہتے ہوئے اس نے کار میں بیٹھے آفاق کو دیکھا جو کار گیٹ کے اندر لے گیا۔ پورچ میں کار روک کر وہ باہر آگیا۔

"وجدان اندر آجاؤ باہر بہت ٹھنڈ ہے۔ مزمل بھائی آپ بھی آجائیں۔" پھر سب آگے پیچھے اندر چلے گئے۔ آفاق کی آنکھوں کا غیر معمولی تاثر دیکھ کر وجدان ٹھٹک گیا تھا پر یہ بھی جانتا تھا کہ حادثے کی تفصیل جانے بغیر کوئی چین سے نہیں بیٹھے گا ہال میں سب کے بیچ بیٹھ کر وہ حادثے کے بارے میں سب بتا چکا تو آفاق نے اسے مخاطب کیا۔

"وجدان میرے کمرے میں آجاؤ ضروری بات کرنی ہے۔" وجدان آفاق کے ساتھ اٹھ گیا تو ان کے پیچھے سمیرا بھی وہاں سے چلی آئی۔

"تمہارا ایکسیڈنٹ آج نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وجدان۔" کمرے میں آتے ہی آفاق نے اسے دیکھ کر متاسف لہجے میں کہا تو وجدان اس کے انداز پر چونک کر بولا۔

"ہوا کیا ہے۔"

"ہم ملیحہ کی انگیجمنٹ اٹینڈ کر کے آرہے ہیں اور تین دن بعد اس کی شادی ہے۔" وجدان کے سر پر بم پھٹا تھا۔

"سمیرا کمرے میں آئی تو اسے دیکھ کر آفاق نے کہا۔

"باہر سے فون لے آؤ اور آتے ہوئے دروازہ بند کرلینا۔" سمیرا الٹے پیروں مڑ گئی اور کاریڈور میں رکھا فون اٹھا کر کمرے میں لے آئی۔ وہ دونوں الگ الگ صوفوں پر بیٹھے تھے جن کی بیچ میں ٹیبل رکھا تھا۔ سمیرا نے فون ٹیبل پر رکھا پھر دروازہ بند کرتی وہ آفاق کے برابر بیٹھ گئی۔ اور کسی کے کہے بنا ہی ریسیور اٹھا کر ملیحہ کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

ملیحہ پر بے حسی کی کیفیت طاری تھی وہ روانی سے قلم چلاتے ہوئے دل کے اندر وہ راز ڈائری پر لکھتی جارہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ بیڈ پر بیٹھی سر جھکا کر لکھتی ملیحہ نے ہاتھ روک کر دروازے کی طرف دیکھا۔

"دروازہ کھلا ہے آجاؤ۔" اس کی آواز پر بہادر نے دروازہ کھول کر اندر دیکھا۔ "کہو کیا بات ہے۔" "بی بی صاحب آپ کے لیے فون آیا ہے۔" ملیحہ کی نظروں میں کائنات گھوم گئی تھی۔

"کس کا۔" دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے پوچھا۔

"سمیرا بی بی کا۔" اور ملیحہ نے بے دردی سے نچلا ہونٹ دانتوں سے کاٹ ڈالا۔

"اسے کہو میں صبح بات کروں گی۔" بول کر وہ پھر سے ڈائری میں کچھ لکھنے لگی پھر خود ہی کچھ سوچا اور ڈائری بند کر کے تکیے کے نیچے رکھی اور باہر آگئی۔

سیڑھیوں کے اختتام پر ریلنگ کے ساتھ آبنوس کا اونچا اسٹول رکھا تھا جس پر فون رکھا رہتا تھا۔ بہادر نے ریسیور اٹھایا ہی تھا کہ ملیحہ نے ریسیور اس کے ہاتھ سے لے کر کہا۔

"تم جاؤ۔" پھر فون پر ہیلو۔ کہا۔

"تمہیں معلوم ہے آج وجدان کیوں نہیں آیا تھا۔" ملیحہ بھلا کیا کہہ سکتی تھی سمیرا نے اس کے بولنے کا انتظار بھی نہیں کیا۔

"وجدان کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔" ملیحہ کو ریلنگ تھامنا پڑی ورنہ وہ گر جاتی پھر ریلنگ کے سہارے وہ دھیرے دھیرے آخری سیڑھی پر بیٹھ گئی۔

"وہ صبح لائبریری ہی آرہا تھا کہ موڑ کاٹتے ہوئے بائیک سلپ ہوگئی تمہیں یاد ہے صبح جب ہم ٹریفک جام پھنس گئے تھے اور ڈرائیور نے بتایا تھا کہ کسی موٹر سائیکل والے کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ وہ وجدان تھا۔"

"وہ ٹھیک تو ہے۔" ملیحہ کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔۔۔

"شکر ہے۔" ملیحہ نے بے ساختہ شکر ادا کیا تو سمیرا پوچھنے لگی۔

"اب تمہارا فیصلہ کیا ہوگا۔"

"میرا فیصلہ۔" اس نے گم سم سی سرگوشی کی تبھی وجدان نے سمیرا کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا مگر ملیحہ کو بولتا سن کر چپ ہی رہا جو کہہ رہی تھی۔

"فیصلہ کرنے کا اختیار کبھی بھی میرے پاس نہیں رہا۔ میرے فیصلے کا کیا پوچھتی ہو فیصلہ تو ہو بھی چکا اب تو بس عمل کرنا باقی ہے اور میرے پاس کوئی راہ فرار نہیں اگر کوئی تھی بھی تو اب نہیں رہی۔ جانتی ہو ہادی بھائی نے مجھ سے کیا کہا۔" اس کی آنکھیں یکدم ڈبڈبا گئیں۔ وجدان سناٹوں میں گھرا اس کی آواز سن رہا تھا۔ ملیحہ نم آواز میں بولی۔

"انہوں نے کہا وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ میں بھی ہادی بھائی سے محبت کرتی ہوں اور اس محبت کے ساتھ میں نے ایک دعا بھی کی تھی کہ میری خوشی کی خاطر اپنا دکھ سہنے کا حوصلہ رکھنے والے کو کبھی دکھ نہ ملے۔ اگر میں ابھی جا کر ان سے کہوں کہ مجھے وجدان مصطفیٰ کا ساتھ بخش دیں تو وہ زمانے سے لڑ جائیں گے۔ مگر میں اس شخص کا ساتھ چھوڑنے کا حوصلہ کہاں سے لاؤں جو مجھے ساتھ چھوڑ کر جانے کی اجازت دے رہا ہے۔" حوصلہ تو وجدان میں بھی نہیں تھا کہ ملیحہ کو اس کا ساتھ چھوڑ کر اپنا ہاتھ تھامنے کو کہے جس کا ساتھ چھوڑنے کی طاقت ملیحہ میں نہیں۔ بے اختیاری بے بسی نہیں ہوتی بلکہ بے بسی تو یہ ہے کہ انسان کی بے اختیاری اس کے اختیار کی پابند ہو جائے۔ ملیحہ کی بے بسی وجدان کو بے بس کر رہی تھی۔ جو ست آواز میں کہہ رہی تھی۔

"محبت بوجھ نہیں ہوتی پھر بھی جھکا دیتی ہے۔ میں جھکتی جارہی ہوں ہادی بھائی نے میرے کاندھوں پر محبت کا بوجھ اتنا بڑھا دیا ہے کہ میری پیشانی زمین سے جا لگی ہے میں نظر نہیں اٹھا پارہی سر کیسے اٹھاؤں اور وجدان۔" اس کی آواز میں درد گھل گیا۔

"جب ملا تھا تو سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ شخص میرے دل کا درد بن جائے گا۔" وجدان کے اپنے دل میں درد اٹھا تھا جسے محسوس کیے بغیر وہ کہے جارہی تھی۔

"اگر چوبیس گھنٹے پہلے کوئی مجھ سے پوچھتا تم وجدان سے محبت کرتی ہو تو میں کہتی ہاں میں وجدان سے محبت کرتی ہوں لیکن اگر اس وقت کوئی مجھ سے یہ سوال پوچھے گا تو کہوں گی میں وجدان سے محبت نہیں کرتی۔" وجدان کو لگا وہ سانس نہیں لے پائے گا۔

"مجھے وجدان سے عشق ہے۔" وجدان کو لگا وہ اب کبھی سانس نہیں لے پائے گا۔ اس نے اس بے دردی سے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا کہ خون رسنے لگا ادھر ملیحہ کی آواز میں سسکیاں گھل گئی تھیں۔

"پر وہ چیز جو میں زندگی میں کبھی نہیں سیکھ پائی محبتوں کو کیٹگرائز کرنا ہے۔ میں ابھی جان نہیں پائی کیسے کسی محبت کو سب سے اوپر والے خانے میں رکھتے ہیں اور کسے دوسری محبت کو نیچے والے خانے مجھے بس محبت کرنا آتا ہے اور وہی میں نے بابا جان سے ہادی بھائی سے اور وجدان سے جب نبھانے کی باری آئی تو کوئی ایک محبت بھی ڈھنگ سے نبھا نہیں پائی۔" اس کی آواز سسکیوں میں ڈوب گئی کھنچے ہوئے چہرے کے ساتھ وجدان کی گرفت ریسیور پر سخت ہوتی جارہی تھی۔ بے بس سی آواز ابھری۔

"کاش میری زندگی میں ایک معجزہ ہو جائے میں آنکھیں بند کر کے کھولوں تو سامنے وجدان ہو۔" اس نے اصل میں آنکھیں بند کر کے کھولیں پھر غیر مرئی نقطے کو دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"میں اسے وہ سب کہہ دیتی جو میرے دل میں ہے۔ کہ اس کے بغیر میں مرجاؤں گی وہ میری زندگی کا حاصل ہے۔ بہت چاہا ہے اسے اتنا کہ اب اس چاہت سے دستبردار نہیں ہوا جاتا اس سے الگ ہونے کا خیال میرے جسم سے روح کھینچ رہا ہے۔

کاش وہ کہیں سے آجائے۔ ایک بار سہی۔ آخری بار سہی۔ میں اسے جی بھر کے دیکھ تو لوں۔ اب ایک عمر اس کے بغیر گزارنی ہے کوئی تو سہارا ہو۔ اس نے ایک بار کہا تھا۔ آپ اپنے چوبیس گھنٹوں میں سے ایک پل مجھے نہیں دے سکتیں۔ آج کوئی جا کر اس سے پوچھے اپنی پوری زندگی میں سے ایک پل مجھے نہیں دے گا۔ ایک پل۔ صرف ایک پل مجھے دے دے۔ ایک بار مجھ سے ملنے آجائے۔ بس ایک بار۔" وہ دونوں ہاتھوں سے ریسیور تھامے تڑپ تڑپ روتے ہوئے فریاد کرتی جارہی تھی۔ وجدان کا پورا وجود اس بارش میں بھیگ گیا۔

"ملیحہ۔" اس نے بے چین ہو کر اسے پکارا ملیحہ ایک دم چپ ہوگئی وہ دم سادھے بیٹھی تھی۔ وجدان کی

آواز پہچاننے میں اسے سیکنڈ کی دیر نہیں لگی۔ کچھ دیر پہلے وہ کہہ رہی تھی کہ وجدان کہیں سے آجائے اور اب جب وہ اس کی آواز سن رہا تھا تو ملیحہ سے کچھ بولا ہی نہیں گیا اس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد چپ چاپ ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

آفاق' وجدان کے تناؤ بھرے چہرے کو دیکھ رہا تھا جو لب بھینچے خاموش بیٹھا تھا نہ جانے ملیحہ کیا کہہ رہی تھی کہ ریسیور پر اس کی گرفت سخت ہوتی جا رہی تھی۔ ضبط کی کوشش میں اس آنکھیں دہکنے لگیں — پھر ایک دم ہی اس نے بے قراری سے ملیحہ کا نام لیا اور کچھ پلوں کی خاموشی کے بعد جب ملیحہ نے لائن ڈس کنیکٹ کردی تو وجدان نے فون رکھ دیا۔

"ملیحہ کیا کہہ رہی تھی۔" آفاق نے پوچھا تو وہ تھکے تھکے سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

"ملیحہ اتنا حق تو رکھتی ہیں کہ مجھے سولی پر لٹکا کر سانس لینے کی سزا سنا دیں۔" پھر اس نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے آفاق کو دیکھا۔

"آفاق میں ملیحہ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

☆ ☆ ☆

ملیحہ نے فون رکھا اور ریلنگ کا سہارا لے کر آہستہ سے اٹھی اوپر کمرے میں آگئی اور چلتے ہوئے اس نے بالکونی کا دروازہ کھول دیا پھر سست قدموں کے ساتھ وہ جھولے میں آبیٹھی۔ سرد ہوائیں چل رہی تھیں جن کے زور سے چائم زلے میں بج رہے تھے سردی کی شدت نے پل بھر میں ملیحہ کے گال گلابی کر دیے تھے اور ہاتھ پیر برف کی مانند ٹھنڈے مگر اس کی ہر حس جیسے مر چکی تھی وہ وہیں پاؤں اوپر رکھ کر لیٹ گئی۔ ملیحہ نے آسمان کی طرف دیکھا۔ اسے چودھویں کا چاند پسند تھا۔ ملیحہ نے چاند کو دیکھ کر اندازہ لگایا ابھی چودہ تاریخ میں کچھ دن باقی تھے۔

"کیا میں بس چاندنی کا انتظار ہی کرتی رہ جاؤں گی' کڑی دھوپ میری زندگی کا سایا کب تک بنی رہے گی۔" اس نے تھک کر سوچا پھر بست دل سے دعا کی۔

"یا اللہ مجھے اس آزمائش سے نکال دے۔ انتخاب میرے بس کی بات نہیں۔" اس کی وہ رات بھی آنکھوں میں کٹ گئی اور وہ پلک تک جھپک نہ پائی۔

فجر کی اذان کے ساتھ اس کے بے جان جسم میں حرکت ہوئی اور وہ اٹھ بیٹھی۔ نماز پڑھ چکی تو اس کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھ گئے مگر دعا نہیں کر سکی۔ ہاتھ اٹھاتے ہی جو دعا اس کے لب پر آنے کو مچلی تھی وہ نور الہدیٰ کے لیے بددعا تھی۔ اور ملیحہ کبھی نور الہدیٰ کو بددعا نہیں دے سکتی تھی۔ اس نے دعا کے لیے اٹھے ہاتھ گرا دیے اور جائے نماز سے اٹھ گئی۔ ملیحہ کو پانی حلق سے اتارنا مشکل ہو گیا تھا نوالے کیا نگلتی لیکن بابا جان اور نور الہدیٰ ناشتے پر آئے تو نور الہدیٰ اس کی غیر موجودگی کو محسوس کرکے بولے۔

"ملیحہ ناشتا نہیں کرے گی۔ اٹھ تو گئی ہوگی دیر تک سونے کی اسے عادت نہیں ہے۔" بابا جان نے یہ نہیں بتایا کہ وہ ناشتے کے لیے منع کر چکی ہے بلکہ کہا۔

"ملیحہ اپنے کمرے میں ناشتا کرے گی۔" اس جھوٹ کی وجہ بھی تھی وہ جانتے تھے کہ یہ سن کر کہ ملیحہ نے ناشتا کرنے سے منع کر دیا ہے نور الہدیٰ سیدھے اس کے پاس پہنچ جائیں گے اور پھر شاید اس کے ستے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کچھ اخذ بھی کرلیں اور اب ملیحہ کا مستقبل ان کے ہاتھ میں تھا بابا جان نہیں چاہتے تھے ملیحہ کی طرف سے ان کے دل میں کبھی بال آئے وہ ایک باپ کی طرح اپنی بیٹی کی نادانی پر پردہ ڈالے رکھنا چاہتے تھے۔

ملیحہ کے لیے نور الہدیٰ کا دل بہت کشادہ تھا مگر بابا جان جانتے تھے بیوی کے لیے اکثر مردوں کا دل تنگ ہو جاتا ہے اسی لیے بابا جان نہیں چاہتے تھے کہ وہ مشکوک ہوں لیکن نور الہدیٰ کے لیے یہ تبدیلی بھی حیران کن تھی۔

"کمرے میں کیوں؟" بابا جان قصداً مسکرا کر بولے۔

"بھئی ہمارے ہاں جب شادی کی تاریخ طے ہو جاتی ہے تو لڑکی کا لڑکے سے پردہ کروا دیا جاتا ہے۔ اب شادی

تک ملیحہ تمہارے سامنے نہیں آسکتی۔"

"اوکے۔" نور الہدیٰ زیر لب مسکرائے۔

ناشتے سے فارغ ہوئے کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ ملیحہ کی خالہ اور ممانیاں اس کی کزنز کے ساتھ آگئیں۔ بابا جان نے خوشدلی سے انہیں ویلکم کرتے ہوئے ملیحہ کی خالہ سے کہا۔

"فریال ہوتی تو ملیحہ کی شادی بہت دھوم دھام سے کرتی اب تمہیں سب انتظام کرنا ہے میں تو ان معاملات میں بالکل اناڑی ہوں۔"

"فکر مت کریں بھائی صاحب ملیحہ میری اپنی بیٹی ہے میں اور بھابھیاں مل کر سب سنبھال لیں گے۔" آمنہ نے خلوص سے یقین دلایا۔

"ان شاء اللہ کہیں کوئی کسر نہیں رہے گی بھائی صاحب۔" بڑی ممانی نے کہا۔ پھر واقعی انہوں نے سب انتظامات خوش اسلوبی سے سنبھال لیے۔

لان کافی کشادہ تھا صرف چوڑائی ہی پانچ سو گز تھی اور بیک یارڈ نے قصر فاروقی کے گرد دائرے کی شکل میں چاروں طرف پھیلا تھا اور مہمانوں کی تعداد محدود تھی۔ افتخار حسن اور منیر حسن کے خاندان اور آمنہ کی فیملی کے علاوہ گنے چنے کچھ خاص لوگ ہی تھے اس لیے ڈیسائڈ ہوا کہ فنکشن قصر فاروقی میں ہی ارینج کیا جائے گا۔

مہندی کا دن آگیا مگر ملیحہ کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا اس کے احساسات پر برف جم چکی تھی شام ڈھل چکی تھی اور قصر فاروقی جگمگاتی روشنیوں سے بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ پیلے کاٹن کے سلور گوٹا لگے شلوار قمیص میں ملیحہ کے کانوں میں موتیوں کے بالے جھول رہے تھے۔ دونوں کلائیوں میں بھر بھر کر پیلی کانچ کی چوڑیوں کے آگے موتیے اور گلاب کے مہکتے گجرے اس کے دودھیا کلائیوں میں سجے تھے اس کے لمبے بالوں کو موتیے کی لڑیوں سے گوندھ کر چوٹی کی شکل میں سنوار گیا تھا کاٹن کا پیلا دوپٹہ اس نے سر پر اوڑھ رکھا تھا۔ لڑکیاں اپنی ہمراہی میں لیے اسے کمرے سے باہر آئیں جو دو دن سے اس کی مستقل قیام گاہ بنا ہوا تھا اور سیڑھیاں اتر کر ہال کے باہر والے دروازے سے ہوتی لان میں آگئیں۔ ملیحہ کو نور الہدیٰ کے برابر میں بٹھا دیا گیا۔ لڑکوں نے ابٹن کا کھیل شروع کر دیا مگر لڑکیوں کو اپنے کپڑے بہت عزیز تھے وہ اس کھیل میں شامل نہیں ہوئیں اور گانے گاتی رہیں۔ سارے لڑکے سفید کاٹن کے شلوار قمیص پہنے ہوئے تھے جن کا حال اب بے حال ہو چکا تھا۔ وہ اپنے چہرے ہی رنگنے میں لگے رہے کسی کو ملیحہ کے برابر بیٹھے اس تماشے کو دیکھ کر ہنستے نور الہدیٰ کا خیال ہی نہیں آیا۔ حمد سے خود کو بچاتے جنید کی نظر ان پر پڑی تو وہ چلایا۔

"بھائیوں اسے کہتے ہیں بے گانی شادی میں عبداللہ دیوانہ تم سب اپنا ستیاناس کیے جاؤ ادھر نور الہدیٰ آرام سے ہونے والی بیگم کی بغل میں بیٹھا دانت نکال رہا ہے۔" پھر تو سب ہی مٹھیوں میں ابٹن بھرے نور الہدیٰ کی طرف دوڑے۔ نور الہدیٰ نے جو اس جم غفیر کو اپنی طرف آتا دیکھا تو محاورتاً "نہیں حقیقتاً" ملیحہ کے سر کے اوپر سے چھلانگ لگا کر پیچھے کی طرف دوڑے مگر صمد نے انہیں جا لیا پھر سب انہیں گھسیٹتے ہوئے بیچ ہال میں لے آئے اب نور الہدیٰ گھاس پر دراز تھے اور ہر طرف سے ان پر ابٹن تھوپا جا رہا تھا۔ وہ چلانے لگے۔

"بس کرو یار کل میری شادی ہے کیوں شکل بگاڑ رہے ہو' بڑا نازک دل ہے تمہاری بھابھی کا بے چاری ڈر جائے گی۔" مگر کوئی بھی انہیں چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔ گھونگھٹ میں لاتعلق بیٹھی ملیحہ نے نور الہدیٰ کی آواز سنی تو سر اٹھا کر دیکھا۔ واقعی نور الہدیٰ کے چہرے پر اتنا ابٹن ملا گیا تھا کہ لڑکوں کے شکنجے میں ملیحہ کو انہیں پہچاننے میں دقت ہوئی اور جب پہچان لیا تو وہ بے ساختہ ذرا سا مسکرائی۔ تین دن بعد سمیرا نے ملیحہ کے بے جان چہرے پر کچھ دیکھا تھا اور وہ بھی مسکراہٹ اسے اپنا سانس بحال ہوتا محسوس ہوا۔

"جیسے لوہا لوہے کو کاٹتا ہے اور زہر زہر کا علاج ہوتا ہے خدا کرے نور الہدیٰ کی محبت وجدان کی محبت کے زخم کا مرہم بن جائے آمین۔" اس نے دل میں دعا کی

سر اٹھانے کی وجہ سے ریشمی آنچل ملیحہ کی پیشانی سے پیچھے کو سرک گیا تھا پل بھر کے لیے نور الہدیٰ کی نظر اس پر پڑی تھی تھی بعد اس کا چہرہ دکھائی دیا تھا وہ اسے دیکھتے رہ گئے۔ ملیحہ اب بھی غائب دماغی کی حالت میں تھی اسے چہرہ چھپانے کا خیال ہی نہیں آیا اس ان کی حالت پر مسکرادی۔ اسے مسکراتا دیکھ کر تو نور الہدیٰ اندر تک شانت ہو گئے تھے پھر ہنستے ہوئے زور سے بولے۔

"اب اور تو میری درگت نہ بناؤ وہ دیکھو میری دلہن ہنس رہی ہے۔" ان کے "میری دلہن" کہنے پر ایک دم سے ملیحہ کی مسکراہٹ غائب ہو گئی اور اس نے سر کو جھکا کر چہرہ چھپاتے ہوئے سمیرا سے گھونگھٹ ٹھیک کرنے کو کہا۔ نور الہدیٰ کو اس کا گریز بھی اچھا لگا تھا۔

"آج گھونگھٹ گرا لو کل تو میں ہی گھونگھٹ اٹھاؤں گا۔" انہوں نے ملیحہ کے ڈھکے چھپے وجود کو دیکھ کر دل میں محظوظ سی سرگوشی کی۔

☆ ☆ ☆

سمیرا تکیہ گود میں لیے بیڈ پر بیٹھی تھی۔ ایک بجنے والا تھا اور نیند کا دور دور تک کوئی پتا نہیں تھا یوں بھی آج کل وہ اور ملیحہ جاگنے کا شغل ہی کیا کرتے تھے۔ دونوں چپ چاپ بیڈ کے دور دراز کونوں پر لیٹیں چھت کو اندھیرے میں گھورتی رہتیں۔ ملیحہ باتھ روم سے باہر آئی تو ہاتھوں اور پیروں پر لگی مہندی دھل چکی تھی۔ سمیرا نے دیکھا تو ملامت کرنے لگی۔

"مہندی ابھی کیوں دھو دی صبح دھوتیں تو رنگ نکھر جاتا۔"

"رنگ تو اب بھی نکھرا ہوا ہے۔" اس نے ہاتھ سمیرا کے آگے کیے جن پر مہندی کا رنگ بہت گہرا تھا۔ سمیرا نے اس کے ہاتھ پکڑ کر دیکھے پھر مسکرا کر بولی۔

"نور الہدیٰ تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔"

"اس میں تو کوئی شک نہیں۔" اس کے عام سے لہجے میں ناز مفقود تھا۔ سمیرا نے اسے دیکھا۔

"تمہیں اس بات کی کوئی خوشی نہیں ہے کہ جس شخص سے تمہاری شادی ہو رہی ہے۔ وہ اس دنیا میں سب سے زیادہ تمہیں چاہتا ہے۔"

"خوشی کیوں نہیں ہو گی ہر لڑکی چاہتی ہے کہ شوہر کی من چاہی ہو۔" اب بھی اس کے لہجے میں کوئی غیر معمولی پن نہیں آیا تھا پھر بات بدلنے کو بولی۔

"چائے پیو گی۔ اپنے لیے بنانے جا رہی ہوں۔"

"تم اور چائے۔" سمیرا حیران ہو کر بولی۔

"ہاں۔" ملیحہ نے آرام سے کہا۔

"اصل میں نور الہدیٰ کو چائے بہت پسند ہے۔"

"تم کچھ زیادہ ہی ان کی پسند ناپسند کا دھیان نہیں رکھنے لگیں۔" سمیرا تیکھے لہجے میں بولی۔

"جب ان کی خاطر اپنی پسند ہی چھوڑ دی تو ان کی پسند اپنانے میں کیا حرج ہے۔" اس نے وجدان کا نام نہیں لیا تھا پھر بھی سمیرا سمجھ گئی وہ وجدان کی بات کر رہی ہے۔ اب اس نے یہی عادت اپنا لی تھی کہ کہیں بے اختیاری میں وجدان کا ذکر زبان سے سرزد ہو بھی جاتا تو بھی اس کا نام نہیں لیتی تھی۔

منگنی والے دن کے بعد سمیرا نے اس کی زبان سے وجدان کا نام نہیں سنا تھا۔ وہ گہری نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر سانس بھر کر کہا۔

"تم بیٹھو میں چائے بنا کے لاتی ہوں۔" وہ چائے بنانے کے لیے اٹھ گئی تو ملیحہ فارغ بیٹھنے کے بجائے اپنے اسٹوڈیو میں آ گئی اس نے نیا کینوس اٹھا کر ایزل پر رکھا برش ہاتھ میں لے کر سوچنے لگی کہ کیا بنائے پھر کسی شعوری کوشش کے بغیر ہی اس کا ہاتھ کینوس پر چلنے لگا۔ سمیرا آئی تو وہ پوری طرح کینوس میں کھوئی ہوئی تھی اور اس کا ہاتھ بہت تیزی سے چل رہا تھا اسے مگن دیکھ کر آواز دینے کے بجائے کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے سمیرا اسٹوڈیو میں آ گئی اور اس کی پشت سے آگے ہو کر دیکھا کہ وہ کیا بنا رہی ہے مگر کینوس پر نظر پڑتے ہی اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا سمیرا نے وحشت زدہ نظروں سے ملیحہ کے چہرے کو دیکھا تو اس کے ٹھٹکنے کو محسوس کر کے ملیحہ نے اسے دیکھ کر کہا۔

"تمہیں کیا ہوا ہے۔" سمیرا نے کچھ بولے بغیر سکتے کی سی کیفیت میں کینوس کی طرف دیکھا تو ملیحہ کی حیران نگاہیں بھی اس کی نظروں کے تعاقب میں کینوس پر اٹھ گئیں سمیرا کو جو محسوس کر کے حیرت ہوئی اس پر خود ملیحہ بری طرح چونک گئی تھی۔

وہ ادھورا پورٹریٹ اتنا تو واضح تھا کہ وجدان کا چہرہ اس میں نظر آ جاتا ملیحہ کو دھیان بھی نہیں تھا کہ وجدان کا چہرہ پینٹ کر رہی ہے اپنی بے بسی پر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے وہ لب کچلتی ہوئی برش رکھ کر وہاں سے ہٹ گئی سمیرا اس کے پیچھے بالکونی میں آئی تو وہ گھٹنوں پر چہرہ ٹکائے جھولے میں بیٹھی تھی سمیرا آہستگی سے اس کے ساتھ بیٹھ گئی جو پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ایک ٹک سامنے دیکھے جا رہی تھی اس کی خاموشی نے سمیرا کو اداس کر دیا تھا مگر خود وہ بھی کوشش کے باوجود بول نہیں پا رہی تھی کئی بوجھل پل گزر گئے تو ملیحہ کی خوابیدہ آواز سنائی دی سمیرا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا جو کہہ رہی تھی۔

"میں مرنا نہیں چاہتی مگر کچھ دنوں سے لگ رہا ہے کہ میرے اندر سب کچھ مرتا جا رہا ہے یہاں تک کہ زندگی بھی۔" یہ کہہ کر وہ اپنے ہی لفظوں پر گھبرا اٹھی اور گم سم بیٹھی سمیرا کا ہاتھ پکڑ کر ٹوٹ کے فریاد کرنے لگی۔

"میں مرنا نہیں چاہتی سمیرا پلیز مجھے بچاؤ۔ میری سانسیں سمیرا دل گھٹ رہا ہے۔ ہر دھڑکن کے ساتھ دل رکتا جا رہا ہے مگر میں مرنا نہیں چاہتی اور۔ اور اس شخص کا خیال مجھے جینے نہیں دے گا۔ مجھے بچالو سمیرا۔ بچالو مجھے نہیں تو میں مر جاؤں گی۔" سمیرا کے دل کو کچھ ہوا تھا وہ یکدم ہی ملیحہ سے لپٹ کر رونے لگی پھر خود ہی اس سے الگ ہو کر روتی ہوئی اٹھ گئی۔

☆ ☆ ☆

"میں ملیحہ کی طرف سے بہت فکر مند ہوں اظہر مجھے وہ ٹھیک نہیں لگتی۔" مہندی کی تقریب کے دوران ملک ناصر نے ملیحہ کے بے حس سے رویے کو خاص طور سے محسوس کیا تھا اور اب اسٹڈی میں بیٹھے وہ بابا جان سے اپنی پریشانی کا اظہار کر رہے تھے۔

"ہوں۔" بابا جان نے ہنکار ابھرتے ہوئے ان کو دیکھا۔

"میں نے بھی محسوس کیا ہے کہ وہ آج کل بجھی بجھی سی رہتی ہے مگر یہ سب اس کی اپنی حماقت کا صلہ ہے جو دوسروں پر آسانی سے اعتبار کر لیتے ہیں انہیں دھوکے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔" وہ پریشان تو تھے مگر ان کے لہجے میں ہلکا پھلکا غصہ بھی تھا۔

"جو معاملہ اپنے آپ ہی ختم ہو گیا اس کے ذکر سے کیا فائدہ۔" ملک ناصر ان کے غصے کو محسوس کیا۔

"لیکن اس شادی کو ملتوی کیا جا سکتا تھا ابھی وہ ایک صدمے سے نہیں سنبھلی اور تم نے اس کے سامنے دوہری آزمائش کھڑی کر دی ہے۔"

"شادی یقیناً ملتوی ہو سکتی ہے لیکن اس التوا کی وجہ کیا بیان کی جائے۔ کیا یہ کہ میری بیٹی جس سے شادی کرنا چاہتی تھی اس نے میری بیٹی کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا اور اب میری بیٹی کو اس صدمے سے نکلنے کے لیے وقت چاہیے۔" انہوں نے تپے تپے لہجے میں کہا پھر پست آواز میں بولے۔

"کیا لگتا ہے تمہیں کیا میں اپنی بیٹی کا دشمن ہوں جو جان بوجھ کر اسے تکلیف دے رہا ہے۔ نہیں ملک۔" ان کے بولنے سے پہلے بابا جان خود ہی بولے۔

"لیکن اگر سب طے ہو جانے کے بعد اب میں اپنے فیصلے میں کوئی رد و بدل کرتا ہوں تو ملیحہ شکوک کی زد میں آ جائے گی اور شک کی ایک نگاہ بھی پڑ جائے تو پارسائی کی چادر میلی ہو جاتی ہے۔ حماقت تو کی ہے اس نے مگر میں نہیں چاہتا کہ ملیحہ کو اس حماقت کی سزا ملے لیکن کچھ نہ کچھ تکلیف تو اسے اٹھانی ہی ہو گی۔" وہ اپنے مخصوص سپاٹ انداز میں کہہ رہے تھے لیکن ملک ناصر جانتے تھے اندر سے وہ کتنے پریشان تھے۔

"دیکھ لو اظہر کہیں یہ تکلیف ملیحہ کی بساط سے بڑھ کر نہ ہو۔"

"ایسا نہیں ہو گا اور اگر ہوتا تو وہ شادی سے انکار

کررہی۔ یوں چپ چاپ نور الہدیٰ کے نام کی مہندی ہاتھوں میں نہیں لگالیتی۔"

"تم بھول رہے ہو ظہرا اسے چپ رہنے کی عادت ہے۔"

"میں یہ نہیں بھول سکتا ملک کہ ایک شخص نے اسے بولنا سکھا دیا ہے اور اگر وہ مجھ سے یہ کہنے کی جرات کرسکتی ہے کہ اسے وجدان سے شادی کرنی ہے تو یہ بھی کہہ سکتی ہے کہ اسے نور الہدیٰ سے شادی نہیں کرنی لیکن اس نے ایسا کچھ نہیں کہا تو اس کا مطلب یہی ہوا ہے کہ اسے اعتراض نہیں یوں بھی خاموشی نیم رضامندی ہوتی ہے۔" انہوں نے کہہ کر بات ختم کردی۔

☆ ☆ ☆

ملیحہ کی زندگی کا سب سے کڑا دن طلوع ہو گیا تھا۔ سمیرا منتظر رہی اب وہ رو پڑے گی۔ اب وہ ضبط کا دامن چھوڑ دے گی۔ اب وہ چیخ چیخ کر فریاد کرے گی۔

"کوئی ہے جو میری زندگی لے کر مجھے وجدان دے دے۔" مگر ملیحہ کے ہونٹوں سے اف تک نہیں آئی ہاں مگر اس کی نمازیں آج کچھ زیادہ طویل ہو گئی تھیں۔ نماز پڑھ کر پچھلے تین دن کی طرح دعا مانگے بغیر ہی ملیحہ نے جائے نماز اٹھا دیا تو سمیرا نے دیکھ کر ٹوکا۔

"دعا تو مانگ لو۔" وہ تھکن بھرے انداز میں مسکرائی۔

"ایک کا سکھ۔ دوسرے کا دکھ تم ہی بتا دو کس کے لیے کیا مانگوں۔" ملیحہ تو آج نیم جاں ہو چکی تھی چہرہ تھا کہ انگارے کی طرح دہک رہا تھا اور ہاتھ پاؤں برف کی مانند ٹھنڈے ہو رہے تھے بڑی ممانی نے اس کے ہاتھوں کی ٹھنڈک محسوس کی تو پریشان ہو گئیں۔

"دیکھو ذرا آمنہ اس کے ہاتھ کیسے ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔" آمنہ خالہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر نرمی سے دباتے ہوئے بولیں۔

"ہاتھ تو واقعی بہت ٹھنڈے ہو رہے ہیں مگر شادی کے خیال سے اکثر لڑکیوں کا حال ایسا ہو جاتا ہے آپ پریشان نہ ہوں۔"

"لیکن اس نے کھانا پینا بھی تو چھوڑ رکھا ہے سمیرا ہی زبردستی کچھ کھلا دے تو کھلا دے اور آج تو وہ بھی منتیں کرتی رہ گئی مگر ملیحہ نے پانی کا گھونٹ تک نہیں بھرا۔ اب شادی کو ایسا بھی کیا ہوا بنا دیا پھر یہ کون سا دور جانے والی ہے ایک کمرے سے دوسرے کمرے کا سفر ہے۔" گوہر نے کہا جو خود بھی کراچی سے بیاہ کر لاہور گئی تھی۔

"لیکن یہ مختصر سا سفر زندگی بدلنے والے ہیں اور زندگی کا بدلاؤ تو اچھے اچھوں کو ہلا دے جب کہ ملیحہ تو ویسے بھی حساس ہے۔" چھوٹی ممانی نے مدبرانہ انداز میں کہا تھا شام سے ذرا پہلے ہی شہر کی ماہر ترین بیوٹیشن ملیحہ کو سنوارنے آپہنچی۔ گہری افسردگی کی چادر اوڑھے آنکھوں میں ویرانی لیے سجتے ہوئے چہرے کے ساتھ بھی ملیحہ پر روپ ٹوٹ کر برسا تھا۔ صائمہ نے اسے دیکھا تو نظر اتارتے ہوئے کہا۔

"نور الہدیٰ واقعی قسمت کا دھنی ہے ملیحہ خوبصورت بھی ہے اور خوب سیرت بھی۔"

"اب تو مجھے بھی ان کی خوش قسمتی کا یقین ہونے لگا ہے۔" سمیرا نے اس کی بات سنی تو بت کی مانند بے حس و حرکت بیٹھی ملیحہ کو دیکھ کر ہولے سے کہا ایک بارات ہی تو نہیں آئی تھی مگر باقی رسمیں تو ہو سکتی تھیں ادھر نور الہدیٰ نیوی بلیو کلر کے ڈنر سوٹ میں نک سک سے تیار ہو کر لان میں بنے اسٹیج پر جلوہ افروز ہوئے ادھر ملیحہ کو گھیرے میں لیے بیٹھیں لڑکیاں "دودھ پلائی" اور "جوتا چھپائی" جیسی رسموں کے لیے بھاگ کھڑی ہوئیں۔

"تم نہیں جاؤ گی۔" دونوں ممانیاں تو میزبانی کے لیے پہلے ہی لان میں تھیں بس آمنہ خالہ ہی ملیحہ کے پاس بیٹھی تھیں۔ سب لڑکیاں رسموں کے لیے اٹھ کھڑی گئیں مگر سمیرا وہیں بیٹھی رہی تو انہوں نے سمیرا سے کہا۔ وہ سر جھکائے ملیحہ سے فاصلے پر بیٹھی تھی آمنہ خالہ کی آواز پر سر اٹھا کر انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

"دل نہیں چاہ رہا پھپھو۔" اس کی بات وہ ہنس

پڑیں۔

"تمہارے دل کو کیا ہوا ہے۔" سمیرا نے کچھ کہنا چاہا پر اس سے پہلے ہی ارم آدھمکی۔

"پھپھو امی کہہ رہی ہیں آپ نیچے آجائیں۔"

"دیکھو ذرا دلہن کو اکیلا چھوڑ کر آجاؤں۔" انہوں نے خود کلامی کرتے ہوئے اپنی بھابھی کی عقلمندی کو سلام کیا پھر ارم سے بولیں۔

"کام کیا ہے انہیں۔"

"وہ تو نہیں پتہ۔" ارم نے بھول پن سے سر دائیں بائیں ہلاتے ہوئے کہا۔

"آفاق بھائی نے بس اتنا کہا تھا کہ جا کر آپ سے کہوں کہ امی آپ کو بلا رہی ہیں۔ کام کا تو نہیں بتایا پوچھ کر آؤں۔"

"رہنے دو میں خود دیکھ لیتی ہوں۔" وہ بول کر اٹھیں اور ارم بھی ان کے ساتھ ہی واپس چلی گئی۔

ملیحہ خاموش بیٹھی اپنی چوڑیوں کو دیکھ رہی تھی پھر یوں ہی اس نے سمیرا کی طرف دیکھا۔ سمیرا اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ ملیحہ قصداً ذرا سا مسکرائی اور پوچھا۔

"کیسی لگ رہی ہوں۔" سمیرا خاموش بیٹھی اسے دیکھتی رہی اور کچھ نہ کہا۔ ملیحہ مسکراہٹ کو کچھ اور پھیلا کر بولی۔

"سب کہہ رہے تھے میں دلہن بن کر بہت اچھی لگ رہی ہوں۔"

"ہاں۔" آخر سمیرا بول پڑی۔

"اچھی تو لگ رہی ہو مگر ٹھیک نہیں لگ رہیں۔"

"میں ٹھیک ہوں۔" وہ مستقل مسکرا رہی تھی۔ سمیرا چڑ سی گئی۔

"یوں مسکرا کر تم دھوکہ کس کو دینا چاہ رہی ہو۔ مجھے یا اپنے آپ کو۔"

"اپنے آپ کو۔" اس نے آرام سے تسلیم کرلیا۔

"تمہارے رونے پر مجھے اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی اس وقت تمہاری مسکراہٹ کو دیکھ کر ہو رہی ہے۔" اس کی آواز میں دکھ تھا ملیحہ کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی سمیرا ترحم آمیز نظروں سے اسے دیکھ کر بولی۔

"میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ تمہارا فیصلہ غلط ہے لیکن تم نے اچھا نہیں کیا۔ نہ اپنے ساتھ۔ نہ وجدان کے ساتھ۔" وجدان کا نام برچھی کی طرح اس کے اندر اتر گیا تو وہ جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی کچھ پل خود کو سنبھالنے میں لگا۔

"نکاح کا وقت ہو چکا ہے آؤ نیچے چلتے ہیں۔" پھر اس کے انتظار میں رکی نہیں بھاری شرارے کو اٹھائے تیز قدموں سے چلتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے دھکیل کر دروازے کے پٹ وا کر دیے اور اسی پل پتھر کی ہو گئی۔ اس کے بالکل سامنے وجدان کھڑا تھا۔ بلیک ڈریس پینٹ پر بلیک شرٹ پہنے کلین شیو چہرے پر شیو بڑھی ہوئی تھی اس کی آنکھیں دیکھ کر لگ رہا تھا کہ کئی راتوں سے نہیں سویا۔ اس کے سر پر پٹی نہیں بندھی تھی مگر کچھ دن پہلے لگنے والی چوٹ کا نشان فراخ پیشانی پر بکھرے سیاہ بالوں میں سے ابھار کی صورت جھانک رہا تھا وہ لب بھینچے ملیحہ کو دیکھ رہا تھا گولڈن کلر کے اور سے نفیس کام والے سرخ شرارہ سوٹ میں زیورات سے سجی ملیحہ کے وجود سے بھینی بھینی خوشبو اٹھ رہی تھی مہندی لگے ہاتھوں میں بھر بھر کر کانچ کی چوڑیاں پہنے وہ مکمل دلہن کا روپ لیے ہوئے تھی۔

وجدان کو حق نہیں تھا ورنہ وہ اس دلہن کو منہ دکھائی میں اپنی جان دے دیتا۔ دروازے کے پٹوں پر رکھے ہاتھ ملیحہ کے پہلو میں آگرے تھے وجدان نے محسوس کیا ملیحہ کی سانسیں بے ترتیب ہو رہی ہیں خود اس کی دھڑکنیں کہاں بس میں تھیں۔

"رک کیوں گئیں۔" اسے بت کی مانند دروازے میں کھڑے دیکھ کر پیچھے سے سمیرا نے کہا پھر کوئی جواب نہ پا کر اس سائیڈ سے نکل کر سامنے دیکھا اور چپ سی رہ گئی پھر ان کے گم صم چہروں پر نظر ڈال کر وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی ملیحہ نے وجدان سے نگاہ ہٹا کر سیڑھیاں اترتی سمیرا کو دیکھا پھر خود بھی اس کے پیچھے جانے کے لیے قدم بڑھا دیے سیڑھیوں تک جانے کے لیے وہ وجدان کے برابر سے گزری تو

اختیار ہی وجدان نے اس کی کلائی تھام کر اسے روک لیا۔ اس کی مضبوط گرفت میں آکر ملیحہ کی کلائی میں سرخ اور سنہری کانچ کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔

ان ٹوٹی چوڑیوں نے ملیحہ کی کلائی کے ساتھ ساتھ وجدان کی ہتھیلی کو بھی زخمی کر دیا تھا جس سے نکلتا خون ملیحہ کی کلائی پر بہتا اس کے خون سے مل کر پتلی سی لکیر بناتا ملیحہ کے ہاتھ کی شہادت کی انگلی کی پور سے قطرے کی صورت سفید ماربل کے ٹھنڈے فرش پر ٹپک گیا کوئی سمجھتا تو یہ محبت کی فریاد تھی۔

وجدان ملیحہ کے ہر نقش کو دیکھ رہا تھا اور پلکیں جھکائے ملیحہ اپنے چہرے پر اسی حدت کو محسوس کر رہی تھی جس نے ایک دن لائبریری میں بیٹھے بیٹھے اچانک ہی اسے بے چین کر دیا تھا۔ ملیحہ آج بھی بے چین ہو گئی اس بے چینی میں ایک کسک بھی کھو دینے کا ملال پوری شدت سے اس کے اندر جاگا تھا کئی دنوں سے برف میں لپٹی اس کی حسیات کو جیسے کسی نے بھٹی میں جھونک دیا تھا۔ اس نے چہرہ موڑتے ہوئے پلکیں اٹھا کر وجدان کی سرخ ہوتی آنکھوں کو دیکھا اور ایک آنسو کا قطرہ اس کی آنکھ سے ٹپک کر گال پر پھسلتا چلا گیا ایک ہاتھ میں اس کی کلائی پکڑے دوسرے ہاتھ سے وجدان نے اس آنسو کو سمیٹنا چاہا تھا۔

اس نے ہاتھ اٹھایا ہی تھا ملیحہ نے آنکھیں میچتے ہوئے چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔ نارسائی کی تیز دھار تلوار نے وجدان کے وجود کو دو حصوں میں کاٹ ڈالا تھا۔

"یہی پل زندگی کی موت ہے۔" اس کے دل نے کہا۔

اسے لگا اگر ایک پل اور وہاں رکا تو اس کے وجود کی دیوار ڈھے جائے گی۔ ملیحہ کی کلائی چھوڑ کر وہ مڑا پھر تیز قدموں سے ایک ایک کرتا سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔ ملیحہ کا دل چاہا دوڑ کر اسے تھام لے مگر دل کی اس خواہش کو دباتی بجائے آگے قدم بڑھانے کے وہ الٹے پیروں چلتی کمرے کی دیوار سے جا لگی وہ دھندلی آنکھوں سے دور جاتے وجدان کو دیکھ رہی تھی وہ جیسے جیسے سیڑھیاں اتر رہا تھا ملیحہ کے بدن سے جان نکلتی جا رہی تھی وہ دیوار کے سہارے بیٹھتی چلی گئی۔ وجدان لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہال کے دروازے سے باہر نکل گیا۔۔۔ یہ وہ منظر تھا جسے دیکھنے کے بعد ملیحہ کی آنکھوں نے اور کچھ نہیں دیکھا آنکھوں کو بھینچتے ہوئے وہ گھٹنوں کے بل گر پڑی پھر اس کا وجود کٹے ہوئے شہتیر کی مانند بائیں طرف ڈھے گیا۔

وجدان نے دور سے نور الہدیٰ کو دیکھا جو بڑے مسرور سے انداز میں سب سے ہاتھ ملاتے ہوئے مبارک بادیں قبول کر رہے تھے اور ایک دم سے اس کا دل چاہا کہ اس شخص کو قریب سے دیکھے جس کی خاطر ملیحہ خود کو مٹانے کے لیے تیار ہے۔ وہ چلتا ہوا اسٹیج پر آ گیا۔

"ہادی بھائی۔" وہ جانے کس سے گفتگو میں مشغول تھے کہ ایک آواز نے انہیں پکارا۔ وہ چونکے اس نام سے بس ملیحہ ہی انہیں پکارا کرتی تھی پھر پلٹ کر دیکھا۔ پکارنے والے کی آواز میں ہی نہیں چہرے پر بھی ویسی ہی تعظیم تھی جو ملیحہ کے چہرے پر انہیں اپنے لیے نظر آتی تھی۔

"شادی مبارک ہو ہادی بھائی۔" وجدان کے پورے وجود پر مردنی چھائی تھی مگر وہ خلوص سے متبسم لہجے میں بولا۔

"شکریہ۔" نور الہدیٰ پوچھنا چاہتے تھے کہ وہ کون ہے اور انہیں اس نام اور اس انداز سے کیوں پکار رہا ہے پر وہ شکریے کے سوا کچھ نہ بول پائے۔

"میں آپ سے یہ نہیں کہوں گا کہ ملیحہ کو خوش رکھیے گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ان کا خیال رکھے بغیر آپ رہ ہی نہیں سکتے۔"

"ان نیک خیالات کا شکریہ مگر معافی چاہتا ہوں میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔" انہوں نے وہ سوال کر دیا جو انہیں الجھا رہا تھا۔

"ہم پہلی بار مل رہے ہیں ہادی بھائی۔" نور الہدیٰ اور بھی چونک گئے۔

"پھر اپنا تعارف بھی کروا دیجیے۔"

"میرا تعارف غیر ضروری ہے بلکہ بہتر ہو گا کہ اس ملاقات کے بعد آپ مجھے بھول جائیں لیکن میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔" پھر خود ہی آگے بڑھ کر نور الہدیٰ سے بغلگیر ہو گیا۔

"اللہ حافظ ہادی بھائی۔" وجدان نے کہا پھر الگ ہو کر ان سے ہاتھ ملا کر اسٹیج سے اتر گیا۔

نور الہدیٰ آنکھوں میں حیرت لیے اس اجنبی کو دیکھ رہے تھے جس کی آنکھوں کی ویرانی انہیں عجیب سے انداز میں چونکا گئی تھی پھر سر جھٹک کر وہ بابا جان کی طرف متوجہ ہوئے جو انہیں کسی سے ملوانا چاہ رہے تھے۔ جس وقت وجدان نور الہدیٰ سے مل کر اسٹیج سے اترا آفاق وہیں موجود تھا۔ وجدان کے اترنے کے بعد وہ بھی اسٹیج سے اتر کر وجدان کے پیچھے چل پڑا اور اس کے قریب جا کر ہلکی آواز میں پوچھا۔

"ملیحہ سے ملاقات ہو گئی۔" وجدان نے اسے دیکھا پھر۔ "ہوں۔" کہہ کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دوسری طرف دیکھنے لگا جہاں ہنستے مسکراتے لوگوں کی چہل پہل تھی۔ آفاق سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس سے کیا کہے پھر اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر حوصلہ دیا تھا مگر دوست کی غم گساری پا کر وجدان کا حوصلہ ٹوٹنے لگا اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر آفاق کو دیکھا اور کہا۔

"اچھا دوست اب اجازت دو۔" آفاق اس کی کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔ دھیمے سے بولا۔

"میں اس حالت میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔" وجدان دلگرفتی سے مسکرایا۔

"میری یہ حالت تو اب مستقل رہنے والی ہے تمہیں جب فرصت ملے غم گساری کو آ جانا مگر اس وقت تمہاری بہن کی شادی ہو رہی ہے اور تمہارا یہاں رہنا زیادہ ضروری ہے۔" آفاق سمجھ گیا تھا کہ وہ اس وقت تنہائی چاہ رہا ہے اس لیے پھر کچھ نہ کہا۔

"چلتا ہوں۔" وجدان نے کہا پھر جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔ وجدان نے کار اپنے گھر کے گیٹ پر روکی پھر اتر کر گیٹ کھولنے کے بعد کار پورچ میں لے جانے کے بجائے وہیں اس کا انجن بند کر دیا اور چابی سے چھوٹا گیٹ کھول کر اندر آ گیا۔ سامنے سے ساجد مزمل کے ساتھ گھر سے باہر نکل رہا تھا۔ وجدان کو دیکھ کر مزمل نے ساجد سے کہا۔

"لو بھئی وجدان بھی آ گیا اب تم لوگ باتیں کرو۔" پھر ساجد سے ہاتھ ملا کر واپس اندر چلا گیا۔ ساجد گہری نظروں سے وجدان کا جائزہ لے رہا تھا۔

"ٹینس لگ رہے ہو۔" اس نے کہا تو وجدان اپنی پیشانی مسلتے ہوئے بولا۔

"بس ایسے ہی۔" پھر فوراً بشاشت سے کہا۔

"تم سناؤ۔" اور ساجد فوراً سنجیدگی کا چولا اتار کر اپنی جون میں آ گیا۔

"ضرور سنائیں گے بھائی کہو کیا سننا چاہو گے۔ قوالی غزل یا پھر ٹھمری سے کام چلے گا۔ الحمدللہ اس وقت سب کچھ سنانے کی پوزیشن میں ہیں البتہ نہ رہتے اگر میں نے اپنے کیمرے کا رول دھلوائے بغیر ایڈیٹر صاحب کو دے دیا ہوتا۔" بولتے ہوئے اس نے ہاتھ میں پکڑی فائل میں سے ایک لفافہ نکال کر اس کے سینے پر مارتے ہوئے جھڑک کر کہا۔

"لے پکڑ اپنی سوغات اور آئندہ میرے کیمرے کو ہاتھ نہ لگانا۔ میں تو تجھے شریف آدمی سمجھتا تھا اور تو چوری چھپے لڑکیوں کی تصویریں اتارتا ہے۔ سدھر جا نہیں تو کسی کے بھائی کے ہاتھوں پٹے گا۔" وہ جانے کیا کیا بول رہا تھا وجدان نے دھیان بھی نہیں دیا اور نا سمجھی کے عالم میں اس لفافے کو کھولنے لگا جو ساجد نے اسے پکڑایا تھا۔

لفافہ کھلا اور ملیحہ کی تصویریں وجدان کے ہاتھ میں آ گئیں۔ تصویروں میں مسکراتی ہوئی ملیحہ اس ملیحہ سے کتنی الگ تھی جسے وہ ابھی مل کر آ رہا تھا۔ ایک ایک کر کے تصویروں کو دیکھتے ہوئے وہ اندر جانے لگا۔

"او بھائی میں یہاں کھڑا ہوں۔" اسے غائب دماغی کی کیفیت میں اندر جاتے دیکھ کر ساجد اپنی ناتندری پر بلبلایا۔

وجدان سست روی سے چلتا لاؤنج میں آگیا جہاں روز کی طرح سب موجود تھے اور چائے پی رہے تھے لیکن وجدان نے کسی کی طرف دیکھا بھی نہیں اور اپنے کمرے میں جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ مصطفیٰ عظیم خاموشی سے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

سمیرا مہمانوں کے درمیان مگر اس رخ سے بیٹھی تھی کہ کوئی بھی اگلے دروازے یا پچھلے لان کی طرف جاتا تو فوراً اس کی نظر میں آجاتا۔ اس نے وجدان کو آتے دیکھا تو ملیحہ کے پاس جانے کے خیال سے کھڑی ہوگئی لیکن پھر وجدان کو نورالہدیٰ کے پاس جاتے دیکھ کر رک گئی۔ کچھ سیکنڈ کے بعد وہ اسٹیج سے اترا اس کے پیچھے ہی آفاق بھی اسٹیج سے اتر گیا پھر دونوں میں مختصر بات چیت ہوئی۔ وجدان چلا گیا تو سمیرا نے مایوسی سے سر جھٹک دیا اک پل کو اسے لگا تھا کہ شاید وجدان نورالہدیٰ کو سب بتا دے گا لیکن..... خود کو نارمل کرتے ہوئے وہ پچھلے لان کی طرف آگئی۔ اس نے آبنوسی دروازے کی چوکھٹ پر قدم رکھا ہی تھا کہ اوپر زینے پر کمرے کے دروازے کے سامنے بے ہوش پڑی ملیحہ پر اس کی نظر ٹھہر گئی۔ نہ جانے وہ کیا احساس تھا جس نے سمیرا کو دہلا دیا۔

"پھوپھا جان۔" کسی خوف کے زیر اثر وہ چلائی اور بجائے ملیحہ کے پاس جانے کے الٹے پیروں باہر کو دوڑ پڑی۔

"پھوپھا جان ملیحہ....." اتنا بول کر ہی ہانپنے لگی تو بابا جان پریشانی بھری عجلت سے بولے۔

"کیا ہوا ملیحہ کو۔" سینے پر ہاتھ رکھ کر دل کو قابو کرتے ہوئے اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"ملیحہ اپنے کمرے کے باہر بے ہوش پڑی ہے۔" اس کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ نورالہدیٰ گلے میں پڑی پھولوں کی مالا کھینچ کر اتارتے اندر کی طرف بھاگے بابا جان بھی ان کے پیچھے تھے۔ نورالہدیٰ نیچے سے ہی ملیحہ کے بے ہوش وجود کو دیکھ چکے تھے وہ کئی کئی سیڑھیاں ایک ساتھ پھلانگتے ملیحہ کے پاس آبیٹھے اور پھرتی سے اسے اپنے بازو پر سیدھا کیا۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر تھا پلکیں نم ہو رہی تھیں نیم وا ہونٹوں میں مدھم ارتعاش تھا۔ اس کی سانسیں اٹک رہی تھیں اور دل اتنے زور سے دھڑک رہا تھا کہ نورالہدیٰ اس کی بے ترتیب دھڑکنوں کو اپنے سینے پر محسوس کر رہے تھے انہوں نے ملیحہ کی نبض ٹٹولی جو ڈوبتی جا رہی تھی پھر سیڑھیوں پر بھاگتے آفاق کو دیکھ کر چلائے۔

"آفاق گاڑی نکالو۔" اور وہ سر ہلاتا پلٹ گیا۔ نورالہدیٰ کی چھٹی حس خطرے کا اشارہ دے رہی تھی پاس ہی بیٹھے پریشان سے بابا جان کو کوئی دلاسا دیے بغیر انہوں نے آناً فاناً ملیحہ کو بازوؤں میں اٹھالیا اور تیزی سے سیڑھیاں اترتے چلے گئے۔ مہمانوں میں افراتفری مچی تھی ہر طرف سے "کیا ہوا کیا ہوا" کی آوازیں آرہی تھیں۔

آفاق کار کا انجن اسٹارٹ کرچکا تھا۔ صمد نے پھرتی سے آگے بڑھ کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا اتنے میں بابا جان دوسری طرف کا دروازہ کھول کر بیٹھ چکے تھے۔ نورالہدیٰ نے ملیحہ کو ان کی گود میں لٹا دیا اور خود اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

نورالہدیٰ کے بیٹھتے ہی آفاق نے کار کو طوفانی رفتار سے آگے بڑھا دیا۔ چند لمحوں کی افراتفری کے بعد فضا ایک دم ساکت ہوگئی تھی۔ حیرت کی زیادتی سے ہر شخص جیسے پتھر کا ہوگیا تھا۔ کچھ دیر پہلے جہاں رنگ و بو کا سیلاب تھا، قہقہوں اور مسکراہٹوں کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا وہاں اب یک لخت اندیشوں کے سائے لہرانے لگے تھے۔

"یا اللہ۔" دروازے کے آگے بنے چھوٹے سے برآمدے کی سیڑھیوں پر بے دم ہو کر بیٹھتی سمیرا کے لبوں سے دعا کی صورت ایک پکار نکلی تھی۔ ہمیشہ نپے تلے انداز میں برتاؤ کرنے والے بابا جان ہاتھ پیر چھوڑ بیٹھے تھے کبھی وہ ملیحہ کے ہاتھ چومتے کبھی اس کے چہرے کو پھر اس کے گال تھپکتے ہوئے آوازیں دینے لگتے اور جب پکار رائیگاں جاتی تو اسے خود میں بھینچ کر سسکنے لگتے۔

"اے اللہ میرے حوصلے کو نہ آزما۔" یہ دعا ان کی زبان کا ورد بنی ہوئی تھی۔ نورالہدیٰ بار بار مڑ کر دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ اچانک بابا جان کو دھیان آیا کہ ملیحہ دلہن بنی ہوئی ہے تو وہ آنکھیں جھپک کر دھند کو صاف کرتے ہوئے اس کا چہرہ دیکھنے لگے بابا جان نے زندگی میں کئی صدمے جھیلے تھے مگر کبھی ان کی آنکھ نم نہیں ہوئی لیکن ملیحہ کو دیکھتے دیکھتے ان کی آنکھیں بھر آئیں تو وہ اس کی پیشانی پر ہونٹ رکھ کر رو پڑے۔ تبھی انہیں احساس ہوا کہ ان کے ہاتھ میں پکڑا ملیحہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ سے سرک گیا ہے وہ ٹھٹک کر اپنے خالی ہاتھ کو دیکھنے لگے پھر گھبرا کر ملیحہ کی بند پلکوں کو دیکھا اور زور سے چلائے۔

"آفاق گاڑی تیز چلاؤ۔" آفاق پہلے ہی بہت اسپیڈ میں ڈرائیو کر رہا تھا ان کے لہجے کی سرسراہٹ کو محسوس کرکے اس نے رفتار مزید بڑھا دی۔

ہسپتال کے ایمرجنسی ڈپارٹمنٹ کے گیٹ پر گاڑی رکتے ہی نورالہدیٰ اترے اور پچھلی طرف کا دروازہ کھول کر ملیحہ کو نکالنے لگے۔

"اسٹریچر لاؤ۔" کی آواز لگاتا پیچھے آیا اور ملیحہ کو نکالنے میں نورالہدیٰ کی مدد کرنے لگا۔ کوئی شخص تیزی سے اسٹریچر دوڑاتا ہوا آیا تھا ان دونوں نے ملیحہ کو کار سے نکال کر اسٹریچر پر ڈال دیا۔ اس دوران باقی لوگ بھی پہنچ گئے تھے ایک ہجوم ملیحہ کے اسٹریچر کے ساتھ ہسپتال میں داخل ہوا تھا ایمرجنسی کی اطلاع پاکر ایک ڈاکٹر تیزی سے اس طرف چلا آیا اور رکے بغیر اسٹریچر کو

چلاتے رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ خود بھی اسٹریچر کے ساتھ تیز تیز چلتا ملیحہ کی نبض چیک کرنے لگا۔۔۔ اسے شک سا ہوا۔

"ایک منٹ۔" ڈاکٹر کی آواز پر سبھی تھم گئے ڈاکٹر نے اسٹیتھسکوپ کانوں پر لگا کر ملیحہ کی دھڑکنیں چیک کیں پھر کوٹ کی جیب سے چھوٹی ٹارچ نکال کر اس کی روشنی باری باری ملیحہ کے پپوٹوں اٹھا کر اس کی آنکھوں میں ڈالی پھر سیدھا ہوتا ہوا میں سر ہلاتا پیچھے ہٹ گیا۔

"کیا ہوا۔" بابا جان نے سرسراتی آواز میں پوچھا ڈاکٹر انہیں دیکھ کر تاسف سے بولا۔

"She is dead" اس نے کہا تھا وہ مر جائے گی۔۔۔ اور وہ مر گئی۔

☼ ☼ ☼

سمیرا کے اندر عجیب سی بے کلی پھیلی تھی اس نے نظر گھما کر اپنے آس پاس دیکھا لان میں مہمانوں کے لیے ڈیکوریٹڈ کرسیاں اور میزیں لگی تھیں مگر مہمان جا چکے تھے انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ شادی غیر اعلانیہ طور پر کینسل ہو چکی ہے پھر وہ رک کر کیا کرتے سامنے ہی تازہ پھولوں کے ساتھ خوب صورتی سے سجا اسٹیج تھا جو ویران پڑا تھا لان میں تیز روشنیاں جل رہی تھیں جنہوں نے رات کو دن میں بدل دیا تھا۔

قصر فاروقی کی بیرونی دیواروں پر چھت سے رنگین برقی قمقمے لٹکتے ہوئے جھلملا رہے تھے یہ جھلملاہٹ لان میں لگے پودوں اور درختوں کے تنوں سے بھی لپٹی تھی۔ کسی کو بھی ان روشنیوں کو گل کرنے کا خیال نہیں آیا۔ آتا بھی کیسے سبھی تو شاک میں تھے۔ صرف باہر سے ہی نہیں قصر فاروقی اندر سے بھی دلہن کی طرح سجا تھا گلاب اور موتیے کے پھولوں کی لڑیاں ہر طرف بانہیں پھیلائے کھڑی تھیں مگر اس سج دھج کے باوجود اچانک ہی ویران لگنے لگا تھا۔ سجا سنورا مگر اداس ۔۔۔ بالکل ملیحہ کی طرح ۔۔۔ سمیرا نے سوچا اور سر گھٹنوں میں چھپا لیا ٹھنڈ میں بیٹھے بیٹھے اس کا جسم

اکڑنے لگا تھا جب کہیں جا کر ہارن کی آواز سنائی دی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا آفاق کی گاڑی پورچ میں آگے جا کر رک گئی تھی۔ بچے کھچے مہمانوں نے گاڑی کو گھیرے میں لے لیا مگر اس میں سے آفاق اور صمد ہی برآمد ہوئے تھے وہ بھی نظر چراتے ان کے نرغے میں سے نکل گئے۔

سمیرا نے دیکھا آفاق نے ہاتھوں میں لال رنگ کی پوٹلی اٹھا رکھی تھی اور وہ اسی کی طرف آ رہا تھا وہ پاس آ کر کھڑا ہوا تو سمیرا سر اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولی۔

"ملیحہ کہاں ہے؟" سمیرا کو لگا اس کے سوال پر آفاق کی آنکھیں نم ہوئی ہیں اس نے کوئی جواب دیے بغیر وہ پوٹلی سمیرا کے ہاتھوں پر رکھ دی۔ سمیرا دیکھتے ہی پہچان گئی کہ یہ وہی سلیف اور کنزا کا لال کامدانی دوپٹہ تھا جو ملیحہ شام سے اوڑھے بیٹھی تھی اس نے کانپتے ہاتھوں سے دوپٹے کی تہہ ہٹائی تو اس میں رکھا زیورات کا ڈھیر دیکھ کر اس کا دل بیٹھنے لگا اسے کسی چیز کو ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں تھی اسے معلوم تھا یہ ملیحہ کے زیور ہیں۔ صائمہ نے گھبرا کر دوپٹہ سمیرا سے لے لیا پھر زیور الٹ پلٹ کر سرسراتے لہجے میں بولی۔

"یہ تو ملیحہ کے زیور ہیں میں نے خود سمیرا کے ساتھ مل کر اپنے ہاتھوں سے اسے پہنائے تھے۔" آفاق کچھ کہہ نہ سکا۔

"جو زیور تم نے ملیحہ کو پہنائے تھے میں انہیں لاش سے اتار کر لا رہا ہوں۔" بدستور نظریں چراتے ہوئے اس نے صمد کو دیکھا اور سر کے اشارے سے کچھ کہا وہ بھی سر ہلاتا اس کے پیچھے لان میں آ گیا۔

دونوں ٹیبل کرسیاں اٹھا کر سائیڈ میں جمع کرتے لان خالی کرنے لگے گھر کے نوکروں نے جو انہیں اس کارروائی میں مشغول دیکھا تو ایک ایک کر کے ان کا ہاتھ بٹانے لگے۔ جنید کی گاڑی ملیحہ کی خالہ اور ممانیوں کو لے کر آ پہنچی تھی ان روتی بلکتی خواتین کا وہ حال تھا کہ خود سے گاڑی سے بھی نہ اتر پائیں ان کی بیٹیوں نے انہیں گاڑی سے اتارا پھر سہارے دیتی کرسیوں تک

لے آئیں۔

"کیا بات ہے۔ آپ لوگ رو کیوں رہی ہیں۔ ملیحہ کو کیا ہوا تھا وہ کیسی ہے۔ آپ لوگ اسے ساتھ کیوں نہیں لائے۔" وہ سب سوال کر رہی تھیں اور ہر سوال کے ساتھ ان کے رونے میں شدت آتی جا رہی تھی یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ نور الہدیٰ کی گاڑی بھی آ گئی اور اس کے پیچھے ہی ایک ایمبولینس بھی آ کر رکی تھی۔ ایمبولینس کو دیکھ کر سبھی کے دل رک سے گئے نور الہدیٰ اتر کے پیچھے آئے اور سہارا دے کر بابا جان کو گاڑی سے اتارا جو اپنے پیروں پر کھڑے بھی نہ ہو پا رہے تھے۔ ملک ناصر اور منیر حسین نے گاڑی سے نکل کر انہیں دونوں بازوؤں سے تھام لیا تو نور الہدیٰ خاموشی سے پیچھے ہٹ گئے وہ دونوں انہیں لان میں لے کر آ گئے اور کرسی پر بٹھا دیا۔

نور الہدیٰ بابا جان کو چھوڑ کر ایمبولینس کی طرف آ گئے۔ پھر نور الہدیٰ اور آفاق اسٹریچر اٹھائے ایمبولینس سے نکل آئے جس پر سفید چادر سے ڈھکا ہوا وجود لیٹا تھا جس کسی نے بھی یہ منظر دیکھا اس کی چیخیں نکل گئیں نڈھال ہوتے بابا جان نے اسٹریچر کو دیکھا جسے نور الہدیٰ ملیحہ کے کزنز کے ساتھ لان میں لے جا رہے تھے ان کی زبان سے نالہ و فریاد بلند ہونے لگیں۔

سمیرا کا سانس رکا جا رہا تھا اس کا دل چاہا اسے قیامت تک خبر نہ ہو کہ چادر سے ڈھکا وہ وجود کس کا ہے اپنی اس خواہش کے باوجود وہ اٹھی اور چلتی ہوئی اسٹریچر کے پاس آ گئی وہ چند لمحے چادر کا کونا مٹھی میں جکڑ کر کھڑی رہی پھر اس نے جھٹکے سے چادر الٹ دی اور موت کی آغوش میں سوئی ملیحہ کا چہرہ بے نقاب ہو گیا سمیرا اسٹریچر کے پاس گر پڑی۔ وہ آنکھیں پھاڑے بے یقینی سے ملیحہ کو دیکھ رہی تھی جس کا گلابی چہرہ موت کے اثر سے سفید ہو گیا تھا اس کی آنکھوں میں ستارے چمکتے تھے مگر موت کے بوجھ سے بند ہوئی پلکوں تلے اب روشنی کی ہر کرن دب چکی تھی اس کے ہر لمحہ مسکراتے ہونٹ ہمیشہ کے لیے ساکت ہو چکے تھے۔ روح جسم کا ساتھ چھوڑ چکی تھی مگر اس کے ہاتھوں

سے مہندی کی خوشبو اب بھی آ رہی تھی اس نے ملیحہ کے ہاتھ کی پشت کو ذرا سا چھوا تو ملیحہ کی کلائی میں چوڑیاں چھنک گئیں اس دھیمے شور نے سمیرا کے ضبط میں شگاف ڈال دیے روکتے روکتے بھی اس لبوں سے آہیں نکل گئی اور وہ ملیحہ سے لپٹ کر دیوانہ وار رونے لگی۔

نور الہدیٰ نے اسے رشک بھری نظروں سے دیکھا تھا خود ان کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بھی اونچی آواز میں روئیں۔۔۔ اتنی اونچی آواز میں کہ ان کی فلک شگاف چیخیں آسمانوں کے اوپر ملیحہ کے کانوں تک پہنچ جائیں مگر ان کی آنکھیں صحرا بنی ہوئی تھیں لب بھینچتے ہوئے انہوں نے بابا جان کی طرف دیکھا ان کی شخصیت کا رعب و دبدبہ جانے کہاں جا سویا تھا اس وقت تو وہ ایک بے کس غمزدہ باپ تھے جنہیں اکلوتی بیٹی کی موت نے توڑ دیا تھا نور الہدیٰ کو ان پر ترس آنے لگا۔ تھک کر وہ اپنے وجود کی ڈھارس دینے کے لیے اٹھ گئے نور الہدیٰ کا کندھا کیا میسر آیا بابا جان کے رہے سہے ہوش بھی کھو گئے ان کے سینے میں منہ چھپائے وہ رونے لگے۔

"میری ملیحہ مر گئی۔۔۔ میری عمر بھر کی کمائی لٹ گئی۔ جس کا چہرہ دیکھنے کے لیے سات سال ترس کر گزار دیے وہ ایک پل میں مجھے چھوڑ گئی۔۔۔ جسے ہاتھ تھام کر چلنا سکھایا اس نے میرے ہاتھوں میں جان دے دی اور میں اپنی بیٹی کو بچا بھی نہ سکا موت اتنی ارزاں ہو گئی ہے تو کہیں سے مجھے بھی لا دو۔" نور الہدیٰ ٹوٹ رہے تھے مگر ان کا ضبط نہ ٹوٹا۔

سمیرا نے دھندلی آنکھوں سے نور الہدیٰ کو دیکھا جو برداشت کی آخری حدوں کو آزما رہے تھے پھر بابا جان کو دیکھنے لگی جن کی برداشت کی آخری حد بھی ختم ہو چکی تھی اس کا دل بھر آیا۔

"کون کہے گا قیامت آنی باقی ہے۔" پھر اچانک ہی وجدان کا خیال آیا تو کانپ اٹھی۔

"ہاں مگر ایک حشر ابھی اور اٹھے گا پھر قیامت تک قیامت مستقل ہو جائے گی۔"

☼ ☼ ☼

بیڈ کی پائنتی سے کمر ٹکا کر بیٹھا وجدان ایک ایک کر کے ملیحہ کی تصویریں دیکھتا جا رہا تھا۔۔۔ اس کا ہر انداز بے خبر تھا اور ہر ادا دلفریب۔۔۔ ایک تصویر کو دیکھ کر وجدان کا دل رکنے لگا۔ شانے پر پلو صحیح کرتے ہوئے ملیحہ کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں وجدان کی آنکھوں میں چبھن بڑھ گئی۔۔۔ انہی نرم سلاخوں نے تو اسی اسیر کیا تھا نارسائی کے احساس میں الجھ کر اس کے ہاتھوں سے ملیحہ کی تصویریں ایک ایک کر کے کارپٹ پر بکھر گئیں۔ وجدان کی نظر خالی ہاتھ کی ہتھیلی پر پڑی تو وہ غور سے ان خون آلود لکیروں کو دیکھنے لگا جنہوں نے اس کی قسمت بدل دی تھی۔

"اگر ہاتھ تھامنے کی یہ سزا ہے تو آپ کو پالینا واقعی مشکل ہوتا۔" پھیلا ہوا ہاتھ سمیٹتے ہوئے اس نے سامنے دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی پینٹنگ کو دیکھا۔

"عشق اول و آخر دردہی درد ہے۔" عشق آتش کو دیکھتے ہوئے ملیحہ کے الفاظ یاد آئے تو اس نے بے ساختہ رگ و پے میں سرایت کرتے درد کو محسوس کیا۔ طلب کسک بن گئی تھی اور وجدان کے اندر ڈیرے ڈال کر بیٹھی ملیحہ کو پانے کی آرزو اسے کھو کر ختم ہونے کے بجائے پہلے سے سوا ہو گئی تھی۔

"کیا یہ عشق کی ابتدا ہے۔" اس نے حیرت سے سوچا۔

"مگر میں تو انہیں ہمیشہ کے لیے کھو آیا ہوں پھر یہ سودا کیونکر میرے دل میں سمائے گا۔"

"عشق حاصل کا نہیں لاحاصل کا جنون ہے۔" وہ اسے عشق کی نشانیاں بتا رہی تھی۔ وجدان کے اندر لاحاصل کا جنون ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

"عشق کا جنم جدائی کی کوکھ سے ہوتا ہے۔۔۔ جدائی درد دیتی ہے۔" اب وجدان کے دل میں اس درد کے سوا اور کیا تھا۔

"جب یہ درد لہو بن کر جسم میں بہتا ہے تو پھر کوئی امید باقی نہیں رہتی۔" آج وجدان کے لیے امید ختم ہو چکی تھی۔

"عشق وہ آگ ہے جو جلائے تو راکھ نہیں کرتا فنا کر دیتا ہے۔" لیکن جستجو باقی تھی اور لاحاصل کی جستجو نے وجدان کے اندر الاؤ دہکا دیا تھا جس کے شعلوں میں گھر کر وہ ہر احساس کھوتا جا رہا تھا۔

"ہاں مجھے عشق ہے۔" اس نے اعتراف کیا تو ملیحہ کا اعتراف کرنا یاد آگیا۔

"مجھے وجدان سے عشق ہے۔ عشق کی آگ میں جلنا آسان نہیں۔" ملیحہ کے اعتراف نے اس کے درد کو بڑھا دیا تو اپنی تکلیف کو بھول کر ملیحہ کی تکلیف اس کی زبان کا گلہ بن گئی۔

"یا اللہ عشق کی بھٹی میں سلگنے کے لیے کیا میرا وجود کافی نہیں تھا جو تو نے انہیں بھی اس آگ میں اتار دیا۔"

"جس انسان کو عشق ہو جائے تو چوٹ دوسرے کو لگتی ہے پر درد سے اپنا جسم کراہ اٹھتا ہے دوسرے کی چوٹ کا درد سہنا آسان نہیں یہی وجہ ہے کہ یہ جستجو ہر کوئی نہیں کر پاتا یہ الاؤ اسی لیے ہر بھٹی میں دہکایا نہیں جاتا کہ جس کا سینہ عشق کی بھٹی بن جائے اس کی آنکھوں میں کسی دوسرے کے دل جلنے کا دھواں چبھتا ہے کسی دوسرے کے جلنے کا احساس کر کے اپنی جلن بھولنا بہت مشکل ہے۔۔۔ اور جو بھول جائے وہ عمر بھر جلتا ہے پر آگ نہیں بجھتی۔

☼ ☼ ☼

آفاق جس وقت وجدان کے گھر پہنچا وہاں ناشتا شروع کیا جا رہا تھا مزمل اسے ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے بجائے ڈائننگ روم میں ہی لے آیا۔

"بیٹھو آفاق ناشتا کر لو۔" عائشہ مصطفیٰ نے اسے دیکھ کر خالی چیئر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ آفاق نے تو شاید دھیان بھی نہ دیا تھا کہ انہوں نے اس سے کیا کہا ہے۔

"آنٹی وجدان کہاں ہے۔"

"اوپر اپنے کمرے میں۔ میں اسے ہی ناشتے کے لیے بلانے جا رہی تھی۔" پھر غور سے آفاق کی اتری ہوئی شکل کو دیکھ کر بولیں۔

"تم پریشان لگ رہے ہو سب خیریت تو ہے۔" آفاق چھپا نہیں پایا تو سر نفی میں ہلاتا ہوا آہستگی سے بولا۔

"کل رات کو میری کزن کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔ آج ظہر کے وقت اس کا جنازہ ہے۔"

"انا للہ وانا الیہ راجعون۔" انہوں نے تاسف سے زیر لب پڑھا۔

"جنازے میں شرکت کے لیے میں وجدان کو اپنے ساتھ لینے آیا ہوں آپ ناشتا تیار رکھیے میں اسے لے کر آتا ہوں۔"

وجدان کے کمرے کا دروازہ پوری طرح سے بند نہیں تھا اس میں جھری سے بنی ہوئی تھی جس میں سے روشنی چھن کر باہر تک آرہی تھی۔ آفاق نے ہاتھ رکھ کر پورا دروازہ کھول دیا۔ وہ سر بیڈ کی پائنتی سے ٹکائے کارپٹ پر بیٹھا چھت کو گھور رہا تھا ملیحہ کی تصویریں اس کے گرد بکھری پڑی تھیں آفاق جانتا تھا وجدان کو ملیحہ کے مرنے کی خبر سنانا دنیا کا سب سے کٹھن کام ہو سکتا ہے مگر پھر بھی وہ حوصلہ کرتا یہاں تک چلا آیا تھا مگر وجدان کی حالت کو دیکھ کر اس کی ہمت جواب دے گئی۔

"وجدان۔" بڑی دقتوں سے اس نے وجدان کا نام لے کر اسے مخاطب کیا تھا جو ابھی تک اس کی موجودگی سے بے نیاز تھا۔ وجدان نے نظروں کا زاویہ بدل کر آفاق کو دیکھا پھر سیدھا ہوتے ہوئے بے اختیار پوچھنے لگا۔

"ملیحہ کیسی ہیں؟" آفاق کے لب بھینچ گئے۔۔۔ وہ سمجھ نہیں پایا کہ اس سوال کا کیا جواب دے پھر اسے یہی بہتر لگا کہ اس کے سوال کو نظر انداز کر دے۔

"اٹھ کر تیار ہو جاؤ وجدان تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔"

"کہاں؟" اگر کہیں وجدان نے اپنے سوال کے نظر انداز ہونے کو محسوس بھی کیا تھا تو جتایا نہیں۔

"تم چلو تو یہ بھی پتا چل جائے گا۔"

"مجھے ساتھ لے جانا ضروری ہے۔" آفاق سمجھ رہا تھا کہ وہ کمرے سے باہر نہیں جانا چاہتا اسی لیے ٹال مٹول کر رہا ہے مگر اس کی خود کی حالت ایسی تھی کہ وجدان کا خیال کیے بغیر جھنجلا گیا۔

"ضروری نہ ہوتا تو تمہیں لینے نہیں آتا اور پلیز اب مزید کوئی سوال مت کرنا۔ میں بہت پریشان ہوں۔" پھر وجدان نے کوئی سوال نہیں کیا اور اسی طرح چلنے کو تیار ہو گیا۔

آفاق ڈرائیو کرتے ہوئے خود میں اتنی ہمت جمع کرتا رہا جس سے وہ وجدان کو خبر کر سکے۔۔۔ مگر اسے وہ الفاظ ہی نہیں مل پائے جن میں وہ اسے ملیحہ کے مرنے کی خبر سناتا وجدان نے بھی کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ گردن جھکائے اپنے ہاتھوں کو دیکھتا چپ بیٹھا رہا۔ گاڑی رک چکی تھی۔ وجدان نے کار کا رکنا محسوس کر کے باہر دیکھا تو چونک گیا پھر اپنے اندازے کی تصدیق کے لیے اس نے بڑے سے لوہے کے سیاہ گیٹ کے بائیں طرف بیلوں سے ڈھکی اس سلور کلر کی جگمگاتی پلیٹ کو دیکھا جس پر سیاہ روشنائی سے "قصر فاروقی" کندہ تھا۔

"تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟" اس نے حیرت سے آفاق کو دیکھا مگر وہ کوئی جواب دیے بغیر دروازہ کھول کر اتر گیا۔ وجدان کو سمجھنے میں دقت نہیں ہوئی کہ آفاق کچھ بولنے سے گریز کرنے کے لیے اس طرح بی ہیو کر رہا ہے۔ آفاق کے اتر جانے کے بعد بھی وہ کار میں بیٹھا رہا تو آفاق آگے سے گھوم کر اس کی سائیڈ پر آگیا اور اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔ وجدان نے دیکھا وہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا پھر آنکھوں میں الجھن لیے وہ اتر گیا تو آفاق نے دروازہ بند کیا اور۔

اسے اپنے ساتھ آنے کا کہتے ہوئے گیٹ سے اندر پتھریلی روش پر آگے بڑھ گیا۔ وجدان نے اس کی تقلید میں قصر فاروقی کے اندر قدم رکھا تو اسے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔

ایک ہی رات میں قصر فاروقی کا نقشہ بدل گیا تھا۔

رات قصر فاروقی کے در و دیوار سے رنگ و بو کا سیلاب امڈ رہا تھا لیکن دن کے اجالے میں وہاں ویرانی ڈیرہ ڈالے ہوئے تھی۔ رات جن کی خوش گپیوں اور قہقہوں کے بیچ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی اب وہی لوگ سایوں کی طرح بے آواز گردش کرتے اتنی احتیاط سے چل رہے تھے کہ آہٹ بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ بارونق چہرے بے رونق ہو چکے تھے کھنکتی ہوئی آوازیں سرگوشیوں میں ڈھل گئی تھیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے قصر فاروقی کے اندرونی حصے سے نسوانی سسکیوں کی آواز ابھر جاتی اور لان میں بیٹھے کئی مرد چہرہ چھپا کر اپنی آنکھوں کے گوشوں سے نمی سمیٹنے لگتے تھوڑا آگے جا کر وجدان کی نظر اس گوشے پر پڑی جہاں ٹیبلوں کو ڈھیر کی صورت جمع کر کے ان پر کرسیاں الٹ کر رکھی ہوئی تھیں اور ان کے آگے ہی لان کی گھاس پر دری ڈال کر قالین بچھے تھے جن پر چاندنی بچھائے بیٹھے لوگ ہاتھوں میں سپارے لیے قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے۔ انہی لوگوں کے درمیان وجدان نے بابا جان کو بیٹھے دیکھا تھا۔

رات کو وجدان نے جب انہیں دیکھا تھا تو وہ سر اٹھائے تمکنت انداز میں بڑی شان سے نورالہدیٰ کو لیے اسٹیج کی طرف جا رہے تھے ان کے قدموں کی دھمک محسوس کی جانے والی تھی۔ جب وہ خاص انداز میں گردن کو اٹھا کر بے تاثر نظر سے کسی کو دیکھتے تو بے چارہ بلاوجہ ہی مرعوب ہو جاتا مگر اب تو ان کی گردن اس قدر جھکی ہوئی تھی کہ ٹھوڑی سینے کو پہنچی ہوئی تھی۔ کمر میں خم ڈال کر بیٹھے ان کے دونوں شانے آگے کو ڈھلک گئے تھے ہمیشہ بے تاثر رہنے والی ان کی آنکھوں میں بے بسی انتہا کو پہنچ رہی تھی۔ وہ رو نہیں رہے تھے پھر بھی وجدان نے اندازہ لگایا کہ اب تک کی عمر میں بچا کر رکھے سارے آنسو وہ کل رات کو بہا چکے ہیں۔

"آخر ایسی کیا واردات ہوئی ہے۔" اس نے حیرت سے سوچا اور اگلے پل ہی اس کی حیرت [illegible]

نورالہدیٰ' بابا جان کے پاس آئے اور گھٹنا ٹکا کر بیٹھتے ہوئے سرگوشی میں ان سے کچھ کہنے لگے۔ وہ ابھی بھی رات والے کپڑوں میں تھے مگر اب ان کے سوٹ کی حالت خراب ہو چکی تھی۔ اس ابتری کے باوجود ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا پھر بھی وجدان نے ان کے وجود سے لپٹے کسی دکھ کو محسوس کر لیا تھا اور اس احساس کے ساتھ ہی اس نے حیرت سے سوچا۔

"کل ہی تو ہادی بھائی کو من چاہی ہستی کا ساتھ ملا ہے۔۔۔ کم از کم آج تو انہیں اس حال میں نہیں ہونا چاہیے۔" تبھی چلتے چلتے وجدان کو ٹھوکر لگی تھی اور وہ لڑکھڑا کر گھٹنوں کے بل گر پڑا مگر فوراً" ہی ایک ہاتھ زمین پر رکھ کر سنبھلتے ہوئے اس نے اٹھنا چاہا۔۔۔ پر اچانک ہی اس کا جسم جیسے پتھر کا ہو گیا تھا۔ سنبھل کر اٹھتے ہوئے اس نے سامنے دیکھا تو اس کی نظر چارپائی پر سفید کفن میں لپٹی ملیحہ کے بے جان چہرے پر پڑی تھی۔۔۔ وہ پتھر کیسے نہ ہوتا اس نے زور لگا کر سینے میں اٹکے سانس کو اندر کھینچنا چاہا تو اس پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ کھانستے کھانستے اپنے بازو پر کسی کا ہاتھ محسوس کر کے اس نے گردن موڑ کے دیکھا تو آفاق اس کے پاس تھا۔ آفاق آہستگی سے کہنے لگا۔

"کل تمہارے جانے کے بعد اچانک ہی ملیحہ کی حالت بگڑ گئی تھی اور وہ بے ہوش ہو گئی۔۔۔ ہم اسے فوراً" ہی اسپتال لے کر گئے مگر اس نے راستے میں ہی دم توڑ دیا۔" وہ اب کھانس نہیں رہا تھا بلکہ یوں آفاق کو دیکھ رہا تھا جیسے اس کی زبان سے نکلے لفظ اس کے لیے نامانوس ہوں۔ آفاق نے اس کا چہرہ دیکھا پھر اپنا بازو اس کے کندھوں پر پھیلا کر دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر بہت واضح الفاظ میں بولا۔

"ملیحہ مر چکی ہے وجدان۔۔۔" اور اسی دن' اسی پل وجدان بھی مر گیا۔

"بھائی صاحب جنازے کا وقت ہو رہا ہے اب میت اٹھانے کی اجازت دے دیجیے۔" بس ایک منیر حسین ہی تھے جو جانے کیسے خود کو سنبھالے ہوئے تھے باقی [illegible] کی حالت بھی بابا جان سے مختلف نہیں

تھی بابا جان کا ضبط چور چور ہو گیا۔

"میری بیٹی کو مجھ سے جدا نہ کرو منیر حسین۔"

"بیٹی تو کب کی جدا ہو گئی صاحب اب تو بس خاک کا پتلا بچا ہے جسے خاک میں لوٹانا ہے۔" انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

عورتیں لاؤنج کے کارپٹ پر چاندنیاں بچھائے سپارے پڑھ رہی تھیں۔ آفاق نے صوفے کے پاس رک کر آہستہ سے سمیرا کو آواز دی۔

"تم سب آ کر آخری بار ملیحہ کا چہرہ دیکھ لو پھر تھوڑی دیر میں اسے مسجد لے جائیں گے۔" اس کی آنکھیں چھلکنے کو بے تاب ہوئیں مگر وہ پلکیں جھپک کر آنسوؤں کا راستہ روکتی سرہلا کر واپس پلٹ گئی۔

جنازے کو تو اٹھنا ہی تھا مگر وہ اٹھ رہا ہے یہ سن کر کہرام مچ گیا تھا۔ ملیحہ کو زندگی میں تو سکون نہ ملا لیکن مر کر اس کے چہرے پر سکون ہی سکون تھا۔

وجدان نے سر اٹھا کر نورالہدیٰ کو دیکھا جو اچانک ہی بہت بے چین سے ہو گئے تھے۔ اگر وہ اتنے بدقسمت نہ ہوتے تو آج کا دن ان کی زندگی کا سب سے خوب صورت دن ہوتا مگر۔۔۔

"میں نے ایک دعا بھی کی تھی کہ میری خوشی کی خاطر اپنا دکھ سہنے کا حوصلہ رکھنے والے کو بھی دکھ نہ ملے۔۔۔ میں اس کا ساتھ چھوڑنے کا حوصلہ کہاں سے لاؤں جو مجھے ساتھ چھوڑ کر جانے کی اجازت دے رہا ہے۔" وہ الفاظ جو ایک پل کے لیے وجدان کی سماعتوں کا پیچھا نہ چھوڑتے اس کے ذہن میں گونج گئے تو بے اختیار وہ ملیحہ سے گلہ کرنے لگا۔

"آپ تو اپنی ہی دعا کا بھرم نہیں رکھ پائیں۔۔۔ ہادی بھائی کا ساتھ کیا نبھاتیں۔" اس نے ابھی تک اپنے دل میں جھانک کر بھی نہیں دیکھا تھا کہ وہاں کتنی تباہی پھیلی ہے اور آیا کچھ بچا بھی ہے کہ نہیں وہ بس نورالہدیٰ کو سوچ رہا تھا کیونکہ ملیحہ نے نورالہدیٰ کے آگے کچھ نہیں سوچا تھا۔

"آپ کی یہ ادا بہت ظالم ہے ملیحہ۔۔۔" اس نے کفن کی چادر سے جھانکتے ملیحہ کے چہرے کو دیکھا۔

"کل مجھے جدائی کا حکم سنایا تھا اور آج ہادی بھائی سے جدا ہو گئیں۔۔۔ آپ کو نہ مجھ پر ترس آیا اور نہ ہادی بھائی پر۔" وجدان کی آنکھیں نم ہو گئیں تو ملیحہ کا چہرہ اس کی نظروں میں دھندلا گیا اور اس خیال سے کہ آج آخری بار اس کی نظریں ملیحہ کو چھو رہی ہیں اب یہ نظارہ آنکھوں کو پھر نظر نہیں آئے گا۔

"کاش وہ کہیں سے آجائے۔۔۔ ایک بار سہی۔۔۔ آخری بار سہی میں اسے جی بھر کے دیکھ تو لوں اب ایک عمر اس کے بغیر گزارنی ہے کوئی تو سہارا ہو۔۔۔" ملیحہ کو جی بھر کے دیکھنے کی خواہش پر اس کے وجدان سے کہے آخری الفاظ وجدان کو یاد آ کر بے چین کر گئے۔

"کیا وہ بھی اس وقت اسی طرح تڑپی ہوں گی جیسے آج میں تڑپ رہا ہوں۔"

"آج کوئی جا کر اس سے پوچھے اپنی پوری زندگی میں سے ایک پل مجھے نہیں دے گا۔۔۔ ایک پل۔۔۔ صرف ایک پل مجھے دے دے۔۔۔ ایک بار مجھ سے ملنے آجائے۔۔۔ بس ایک بار۔"

"میں اپنی پوری زندگی آپ کو دے دوں گا ملیحہ اپنی ہر سانس آپ کے نام لکھ دوں گا۔۔۔ بس ایک بار لوٹ آئیں۔۔۔ بس ایک بار۔" اس کے دل میں ہر طرف فریادیں مچل اٹھیں۔

"اٹھو اظہر کیا بچی کو کندھا نہیں دو گے۔" ملک ناصر نے یہ کیا کہہ دیا تھا بابا جان تو دیوانوں کی طرح اپنا سر پیٹنے لگے۔

"میں مر جاؤں گی بابا جان۔" کتنے مان سے اس نے اپنے باپ سے جان بخشی کی درخواست کی تھی۔

"مر جاؤ گی تو تمہیں کندھوں پر اٹھا کر اپنے ہاتھوں سے دفناؤں گا۔" اپنی بیٹی کے لیے کہے گئے الفاظ کتنے سفاک تھے بابا جان کو اب احساس ہوا تھا۔

"رہنے دیں ملک انکل' پھوپھا جان سے نہیں ہو گا۔" آفاق نے ان سے کہا۔

وجدان اٹھ کر ملیحہ کے سرہانے بائیں جانب آکھڑا ہوا۔

نورالہدیٰ کا ذہن کام نہیں کر رہا تھا ورنہ وہ وجدان کو پہچان جاتے لیکن وہ حیران ہوئے تھے کہ جلتی آنکھوں اور دہکتے چہرے والا یہ شخص کون ہے جسے ملیحہ کی موت پر اتنا دکھ ہوا ہے کہ صبح سے بیٹھا پاگلوں کی طرح ملیحہ کو دیکھے جا رہا ہے اور اب اپنے حلیے سے دیوانہ نظر آتا وہ شخص حق دار کی طرح ملیحہ کو کاندھا دینے آ گیا تھا۔ یہ حیران ہونے کا وقت نہیں تھا سو انہوں نے اپنی حیرت کو جھٹک دیا پھر چاروں ایک ساتھ جھکے اور ملیحہ کا جنازہ اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ کلمے کی صدائیں بلند ہو گئیں۔

آج وہ قصر فاروقی سے رخصت ہو رہی تھی..... ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ بیس سالوں پر محیط اس کی زندگی کی داستان اچانک ہی ایک موڑ پر آکر ختم ہو گئی تھی ..... اسے کہتے ہیں زندگی..... اور یہ ہوتی ہے موت..... ایک بے وفا..... دوسری بے رحم اور کیا بے بسی ہے کہ فرار دونوں سے ہی نہیں..... زندگی سفاک لگے تو موت کے آنچل میں چھپ جاؤ..... لیکن اگر مر کر بھی سکون نہ ملے تو..... کاش کوئی تیسرا دروازہ بھی ہوتا۔

قبر تیار ہو چکی تھی۔ ملیحہ کا جنازہ قبر کے پاس اتار دیا گیا۔ آفاق نے وجدان کو اشارہ کیا تو وجدان کو ملیحہ کا منہ موڑنا یاد آ گیا اور وہ جبڑے بھینچ کر نفی میں سر ہلاتا پیچھے نکل گیا۔ آفاق ایک نظر اسے دیکھ کر جنازے کے پاس آ گیا پھر کمر کے گرد بندھے کپڑے سے پکڑ کر نورالہدیٰ اور صمد کے ساتھ مل کر احتیاط سے ملیحہ کے جسم کو قبر کے اندر کھڑے جنید اور منیر حسن کے ہاتھوں میں پکڑا دیا پھر وہ اور نورالہدیٰ بھی قبر میں اتر آئے۔

"تم سفید رنگ مت پہنا کرو..... اس رنگ میں تم اتنی پیاری لگتی ہو کہ ڈر لگتا ہے تمہیں نظر نہ لگ جائے۔" کفن کی سفید چادر اس کے چہرے پر سے ہٹاتے ہوئے نورالہدیٰ کے ہاتھ کانپ گئے۔ انہوں نے غور سے اس کی طرف دیکھا لیکن آج انہیں ملیحہ سفید رنگ میں اچھی نہیں لگی۔ انہیں بے ساختہ وہ رات یاد آ گئی جب ان کا انتظار کرتے وہ تھک کر سو گئی تھی۔ سوتے ہوئے اس کے چہرے پر کتنی معصومیت تھی اور وہ نرم سا تاثر جو سوتے جاگتے ہر حال میں اس کے ساتھ رہتا تھا۔ موت کے کئی گھنٹے گزر جانے کے بعد اب بھی وہ نرمی وہ حلاوت اور وہ معصومیت اس کے چہرے پر تھی۔ نورالہدیٰ کو لگ رہا تھا جیسے وہ آج بھی تھک کر سو گئی ہو..... مگر آج یہ تھکن زندگی کی تھی۔

"میں تمہارے سحر سے آزاد نہیں ہونا چاہتا۔" انہوں نے نرمی سے ملیحہ کی پلکوں کو چھوا۔

"میری زندگی سے تو جا رہی ہو بس اتنا احسان کرنا کہ میرے دل سے کبھی نہ جانا اپنی یاد کا ایک چراغ جلا کر میرے دل کے طاق پر رکھ دینا میں اسی روشنی میں جینے کی وجہ ڈھونڈ لوں گا۔" ان کے دل کو کچھ ہوا تھا اور وہ تیزی سے پلٹ کر قبر سے باہر نکل آئے۔ گورکن بیلچوں کی مدد سے مٹی قبر میں بھر رہے تھے اور وجدان دفن ہوتا جا رہا تھا پھر کچھ ہی دیر لگی اور ملیحہ کا قیامت تک کے لیے سورج سے پردہ ہو گیا۔ اس کی ادھوری محبتیں، نامکمل آرزوئیں اور ٹوٹے خواب اس کے جسم کے ساتھ ہی منوں مٹی تلے دفن ہو گئے۔

اپنے جذبوں کی صلیب آپ اٹھائی ہم نے
زندگی سن تو سہی کیسے بتائی ہم نے
مڑ کے دیکھا تو راہ زیست کو تنہا پایا
تب یہ معلوم ہوا عمر گنوائی ہم نے

☼ ☼ ☼

نورالہدیٰ قبرستان سے نکلے تو گھر نہیں آئے بلکہ وہیں سے ملک انکل کو بابا جان کا خیال رکھنے کو کہہ کر سکون کی تلاش میں جانے کن راستوں پر نکل کھڑے ہوئے مگر سکون کبھی ڈھونڈنے سے ملا ہے۔ انہیں گھر جانے کے خیال سے وحشت ہو رہی تھی مگر کب تک گھر نہ جاتے..... گھر کی چوکھٹ پر قدم رکھتے ہی انہوں نے لاشعوری طور پر سامنے لاؤنج میں رکھے صوفے کی طرف دیکھا..... ان کی نظر کو عادت ہو گئی تھی کہ وہ جیسے ہی انٹرنس کا دروازہ کھول کر اندر قدم رکھتے ان کی نظر سامنے کو اٹھ جاتی اور ملیحہ جو روز لاؤنج کے صوفے پر

ھی ان کی واپسی کا انتظار کر رہی ہوتی۔ ہر روز کیے
انے والا استقبال اس انداز میں ہوتا تھا جیسے وہ ہفتوں
بعد گھر لوٹے ہوں۔

وہ ایک ہاتھ لاک پر رکھے ابھی تک دروازے میں
کھڑے تھے جیسے منتظر ہوں کہ ملیحہ کسی کونے سے نکل
کر اچانک ان کے سامنے آجائے گی۔

"تم کیوں مر گئیں ملیحہ۔" یہ سوال اس وقت سے
انہیں بے چین کیے ہوئے تھا۔ لیکن جواب نہیں ملا۔
لاؤنج میں رکھے اس صوفے سے نظر بچا کر سیڑھیاں
چڑھتے اپنے کمرے تک آئے ..... دروازے کے
ہینڈل پر ہاتھ رکھا مگر اسے گھما نہ سکے..... وہ جانتے تھے
جیسے ہی وہ ہینڈل گھما کر دروازہ کھولیں گے دروازہ کے
اوپر رکھی ٹوکری میں ملیحہ کے استقبال کی منتظر گلاب کی
پنکھڑیوں پتیاں ان پر برسنے لگیں گی اور کارپٹ پر بچھے
پھول جو ملیحہ کے پیروں کو چھونے کی آس میں تھک کر
اب مرجھا گئے تھے ان کے بھاری بوٹوں کے تلے چر مرا
جائیں گے۔ وہ بھلا کیسے اس شور کو سن پائیں گے.....
اور وہ شام جو اگر آجاتی تو بڑی حسین تھی۔

اس کے حسن کو دو آتشہ بنانے کی خاطر اپنے وجود
کی قربانی دینے والی کینڈلز جن کا موم کل ملیحہ کو وصل
کے لیے سجائی گئی سیج میں نہ پا کر دکھ سے پگھلتا قطرہ قطرہ
یوں ٹپکا تھا جیسے کسی آنکھ سے آنسو اور پھر شب وصل
میں اجالے بھرنے کے لیے جلائی گئیں موم بتیاں
شب فرقت کے اندھیروں میں بجھ گئی تھیں 'اب
کون ان کے پگھلے ہوئی وجود کو دیکھتا۔ سیج کو اپنی
جھرمٹ میں لیے چھت سے لٹکتی تازہ گلاب کی لڑیاں
جو اب اپنی تازگی کھو چکی تھیں..... نور الہدیٰ کیسے ان
کے کملائے چہرے دیکھتے۔ یہ سب اہتمام ملیحہ کے لیے
تھا اور جب اسی نے یہاں پاؤں نہیں دھرا تو نور الہدیٰ
کیسے یہاں قدم رکھ پاتے۔ دھیرے دھیرے ان کا ہاتھ
ہینڈل پر سے سرک گیا۔ وہ الٹے قدموں لاؤنج میں
آئے تو بابا جان کے بند دروازے کے آگے رک گئے۔
وہ جانتے تھے اس بند دروازے کے دوسری طرف کیا
قیامت ٹوٹ رہی ہوگی مگر ایک قیامت ان پر بھی گزر
رہی تھی۔

کل سے وہ بابا جان کا حوصلہ بڑھا رہے تھے انہیں
سمیٹ رہے تھے مگر اب انہیں اپنا حوصلہ بڑھانا تھا.....
خود کو سمیٹنا تھا تاکہ بابا جان کا دکھ بٹا سکیں وہ سر جھکائے
اس دروازے کے سامنے سے گزر کر ڈرائنگ روم سے
ہوتے ہال میں آگئے جس کی دیواروں پر ملیحہ کی
پینٹنگز آویزاں تھیں۔ ان کا رخ سیڑھیوں کی جانب
تھا۔ ملیحہ کے کمرے کا دروازہ بھڑا ہوا تھا جسے نور الہدیٰ
نے دونوں ہاتھوں سے پٹ تھام کر کھول دیا۔ کمرے کی
فضا ساکت تھی۔ نور الہدیٰ نے آنکھیں بند کیں اور
گہرا سانس لے کر ملیحہ کی خوشبو کو محسوس کرنا چاہا جو
کمرے میں ہر جانب بکھری تھی پھر آنکھیں کھول کر
کمرے میں ادھر ادھر دیکھنے لگے 'یہی تو وہ گوشہ تھا
جہاں ملیحہ نے اپنی مختصر سی زندگی کا زیادہ تر وقت گزارا
تھا کچھ لوگ ہوتے ہیں جو انسانوں پر ہی نہیں چیزوں پر
بھی اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ ملیحہ ان ہی لوگوں میں
سے تھی جن کی چھاپ بہت گہری ہوتی ہے اور شاید
یہی وجہ تھی کہ نور الہدیٰ کو کمرے میں داخل ہوتے
ہی یوں محسوس ہوا جیسے ملیحہ کہیں آس پاس ہی ہے اور
اس احساس سے ان کے اعصاب پرسکون ہونے لگے
تھے جیسے جلتے الاؤ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے پڑ گئے
ہوں۔

نور الہدیٰ نے آگے بڑھ کر بالکونی کا دروازہ کھول
دیا۔ ایک سرد ہوا کا جھونکا نور الہدیٰ سے ٹکراتا ہوا
نکل گیا۔ انہوں نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا جہاں
چودھویں کا چاند جگمگا رہا تھا۔ وہ جانتے تھے ملیحہ چاندنی
راتوں کی دیوانی تھی خاص طور پر چودھویں کے چاند
سے اسے عشق تھا چودھویں کے چاند کی خوب چٹکتی
چاندنی میں وہ کمرے میں بند ہونے کے بجائے جھولے
میں آکر لیٹ جاتی اور چاند کو محویت سے دیکھتے دیکھتے سو
جایا کرتی تھی۔

"آج اسے نہ پا کر چاند نے کیا سوچا ہوگا۔" جھولے
کے پاس کھڑے وہ سوچ رہے تھے۔

"کتنی دور چلی گئی ہو ملیحہ..... چاند سے بھی دور

....." خالی جھولے کو دیکھ کر وہ یاسیت میں ڈوب گئے۔

"میں نے کب قربتوں کی خواہش کی تھی..... لیکن
کبھی یہ بھی تو نہیں چاہا تھا کہ تم دوریوں کے عذاب
بخش دو۔ اب یہ نظر تمہیں کہاں ڈھونڈے۔" وہ
مڑے اور واپس کمرے میں آگئے۔

اپنا دھیان بٹانے کے لیے وہ ملیحہ کے اسٹوڈیو میں آ
گئے۔ دیوار کے سہارے رکھے ایک کینوس کو اٹھا کر وہ
قریب سے دیکھنے لگے۔ بالکونی سے آتے تیز ہوا کے
جھونکے نے ایزل پر لگے کینوس کو ڈھانپے باریک
نیٹ کو اڑایا تھا۔

نور الہدیٰ بے ساختہ متوجہ ہوگئے اور نیٹ کا کور
ہٹا کر کینوس کو دیکھنے لگے جس پر بنا ادھورا پورٹریٹ
ابتدائی مراحل میں ہی نامکمل چھوڑ دیا گیا تھا۔ اپنی
انگلیوں سے کینوس کو چھوتے ہوئے وہ عجیب سے
احساس میں گھر گئے۔

"ملیحہ کی آخری تخلیق..... لیکن ادھوری..... شاید
زندگی نے اس تصویر کو مکمل کرنے کی مہلت نہیں دی
..... اور صرف یہ تصویر ہی کیوں وہ تو سب کچھ ادھورا
ہی چھوڑ گئی۔ اتنے اچانک رخت سفر باندھا کہ یقین ہی
نہیں آتا۔" وہ پورٹریٹ کو دیکھتے ہوئے سوچ رہے تھے
کہ اچانک کسی چیز نے انہیں چونکایا تھا۔ وہ غور سے
اس پورٹریٹ کو دیکھنے لگے۔ انہیں احساس ہوا کہ یہ
چہرہ تصوراتی نہیں ہے بلکہ اس کے نقوش مانوس لگ
رہے تھے مگر اتنے مبہم تھے کہ نور الہدیٰ پہچان نہیں
پائے لیکن انہیں یقین تھا کہ وہ اس چہرے کو دیکھ چکے
ہیں..... کہاں انہیں کوشش کے باوجود یاد نہیں آیا تو وہ
اس احساس کو جھٹک کے وہاں سے ہٹ گئے اور چلتے
ہوئے ملیحہ کے بیڈ پر آکر بیٹھ گئے پھر یوں ہی ٹانگ
لٹکائے وہ پیچھے کو لیٹ گئے۔

نور الہدیٰ نے حساب لگایا..... بے یقینی کی اس
کیفیت کو جھیلتے ہوئے چوبیس گھنٹے گزر گئے تھے جبکہ
ہر پل انہیں لگ رہا تھا کہ بس اگلے ہی پل جان جسم
سے نکل جائے گی۔

"تمہاری محبت دیکھ لی نور الہدیٰ۔" خود پر طنز
کیا۔

"کہتے تھے ملیحہ کے بغیر ایک پل بھی نہ رہ پاؤں گا اور
اب دیکھو..... چوبیس گھنٹے گزر چکے ہیں اور سانس اب
بھی باقی ہے۔ مگر صرف سانس ہی تو باقی ہے۔" ان کے
دل نے شکستہ انداز میں کہا تھا۔ انہوں نے سن کر پلکیں
موند لیں۔ ان کے اعصاب تو پہلے ہی ڈھیلے پڑ چکے تھے
پلکیں بند کیں تو جلتی ہوئی آنکھوں کو قرار آگیا۔ انہوں
نے ہاتھ بڑھا کر تکیہ اٹھایا۔ تکیے کے نیچے ایک ڈائری
رکھی تھی۔ نور الہدیٰ حیران ہوتے اٹھ بیٹھے اور ہاتھ
بڑھا کر ڈائری اٹھالی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں۔)

☼ ☼

نازیہ کنول نازی

مجھے کنارے کی کب تمنا
تجھے ہے دریا کے پار جانا
بپھرے دریا کی سرخ موجیں بتا رہی ہیں
خراج مانگے گا پھر سے دریا
جو میری مانو تو ایسا کرلو مجھے شریکِ سفر بنالو
خراج مانگے جو تم سے دریا
مجھے بھنور میں اتار جانا
تیرا ضروری ہے پار جانا......

وہ ابھی ابھی صبح کی سیر سے واپس لوٹا تھا! فضا میں

مکمل ناول

خنکی پچھلے دنوں کی نسبت زیادہ تھی۔ عبیرہ نے کشادہ برآمدے کے جھروکوں سے اسے دیکھا۔ پھر فوراً "دبے پاؤں اس کے پیچھے آتے ہوئے اس نے اپنے سرد ہاتھ اس کی آنکھوں پر رکھ دیے۔

"بوجھو تو جانیں....." ذرا سا آگے کو جھکتے ہوئے وہ شرارت سے مسکرائی تھی۔ سوید آذر نے جواباً" اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیے۔

"بیہ....." تازہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر بھی تھی۔ عبیرہ احساس تفاخر سے مسکرادی۔

"کب آئیں؟" اگلے ہی پل وہ اس کے ہاتھ چھوڑ کر ذرا سا جھکتے ہوئے اپنے پاؤں کو بوٹوں کی قید سے آزاد کر رہا تھا۔ عبیرہ کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے مقابل بیٹھ گئی۔

"رات عشاء کی نماز کے بعد آئی تھی مگر یہاں آکر پتا چلا کہ جناب اپنے آفس کی طرف سے شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں اور یہ کہ رات دیر سے گھر واپس لوٹیں گے۔ تب مجبوراً" انتظار سے تھک کر سونا پڑا۔"

"اوہ۔ اگر مجھے خبر ہوتی کہ محترمہ بنا اطلاع کے میرے گھر تشریف فرما ہیں تو یقیناً" جلدی آجاتا' یا رات میں ہی نیند سے اٹھا لیتا۔ مگر..... چلو خیر اب تو اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا ہوں میں۔ اب کیا ارادے ہیں تمہارے۔"

دونوں جرابیں ہاتھوں میں لیے اب وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عبیرہ کو بے ساختہ نگاہ چرانی پڑی۔

"سوید....."

"جی جان سوید....." وہ اس کے چہرے پر واضح اضطراب کی کہانی پڑھ رہا تھا۔

عبیرہ کی آنکھیں پل میں آنسوؤں سے بھر آئیں۔

"کیا تم نہیں جانتے کہ اس وقت تمہارے گھر میں کیا چل رہا ہے؟؟"

"جانتا ہوں مگر یہ نئی بات نہیں ہے میرے لیے' بچپن سے اب تک یہی ماحول دیکھتے بڑا ہوا ہوں۔ تم ٹینشن مت لو۔"

"نہیں جانتے..... تم اس طوفان سے باخبر نہیں ہو جو کسی بھی وقت آسکتا ہے۔ میں جانتی ہوں روحیل

انکل کو' وہ ضد کے بہت پکے ہیں' میں کچھ بھی غلط نہیں چاہتی۔ مجھ جیسی سو عبیرہ' میں میرے چاند پر قربان۔"

اس بار وہ رو پڑی تھی۔ سوید آزر نے لب بھینچ کر رخ پھیر لیا۔

"تم بھول رہی ہو عبیرہ کہ میں بھی انہی کا بیٹا ہوں۔ اگر وہ ضدی ہیں تو میری ضدی فطرت کا اندازہ بھی تمہیں بخوبی ہونا چاہیے۔"

"مجھے اندازہ ہے..... مگر میں کسی بھی طور سے تمہارا نقصان نہیں چاہتی سوید! میں تمہیں اذیت میں نہیں دیکھ سکتی..... تم نہیں جانتے یہ لوگ تمہارے ساتھ کیا کر سکتے ہیں۔ میں مزید خالہ امی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی سوید! مجھ سے یہ اذیت برداشت نہیں ہو رہی۔" اس کے آنسو پھر شدت سے بہنے لگے تھے۔

"ہوں..... ساری عمر کی اذیت سمیٹنے کا کہہ کر یہ تو مت کہو عبیرہ کہ تم مجھے اذیت میں نہیں دیکھ سکتیں اور جہاں تک امی کی بات ہے تو وہ بھی نہیں چاہتیں کہ ان کا اکلوتا' ذہین و فطین بیٹا ایک پاگل لڑکی سے شادی کر کے جیتا جی مر جائے..... کوئی ماں ایسا نہیں چاہ سکتی ..... وہ صرف مجبور ہیں اور میں اپنی زندگی ان کی مجبوری پر قربان نہیں کر سکتا۔" سوید کا لہجہ اٹل تھا عبیرہ اپنے آنسو پی کر رہ گئی۔

"تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے سوید! یہ لوگ تم سے تمہارا سب کچھ چھین لیں گے۔ نکال دیں گے تمہیں اس گھر سے اور تم جانتے ہو' اگر ایسا ہوا تو خالہ امی ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکیں گی۔ پھر کیا کرو گے تم؟ کہاں سے لاؤ گے اپنی ماں..... زندگی میں لڑکیاں بہت مل جاتی ہیں چاند..... مائیں نہیں ملتیں۔"

بھرائے لہجے میں کہا عبیرہ کا یہ جملہ سوید کے دل پر گھونسے کی طرح لگا تھا۔

"مجھے جذباتی بلیک میل مت کرو عبیرہ! پہلے ہی بہت ڈسٹرب ہوں میں اور تو شکستہ مت کرو یہاں یہ سب لوگ کم تھے کہ تم بھی....." دکھ سے اس کا گلا رندھ گیا تھا۔ عبیرہ کا سر پھر جھک گیا۔

"شکستہ یا ہی تو نہیں کرنا چاہتی میں تمہیں..... اسی لیے تو دیکھو خود اپنا دل لہولہان کر کے تمہیں کسی اور کی رفاقت کے لیے مجبور کرنے چلی آئی۔ تم کیا سمجھتے ہو سوید! کیا مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا.....؟ میں جو اتنی بچی ہوں تمہارے معاملے میں کہ ہوا کا تمہیں چھونا بھی برداشت نہیں ہوتا مجھ سے کیسے کس دل سے تمہیں کسی اور کا ہونے کو کہہ رہی ہوں کیا تم نہیں سمجھ سکتے؟ تم صرف میری محبت نہیں ہو سوید ..... میری دھڑکن' میرا ایمان' میرا سکون' میری کل کائنات ہو تم..... بہت جذباتی ہوں تمہاری محبت کے معاملے میں میں۔

مگر میں خالہ امی سے بھی بہت پیار کرتی ہوں سوید ..... میری وجہ سے ان کی جان چلی جائے' مجھے مر کر بھی یہ بات گوارہ نہیں ہو سکتی وہ میری خالہ نہیں ماں ہیں سوید ایک حقیقی ماں بن کر ہی پالا ہے انہوں نے مجھے ان کے آنسوؤں پر میں اپنی محبت تو کیا سارا جہان وار دوں پھر بھی کم ہے اور پھر انہوں نے ہی مجھے بتایا ہے' وہ لڑکی قطعی اپنے ہوش و حواس میں نہیں رہتی' سمجھو ٹوٹل پاگل ہے۔ تمہارے تو قریب بھی نہیں پھٹکے گی..... یہ شادی صرف دکھاوا ہو گا سوید..... اور کچھ نہیں۔"

وہ شاید قسم کھا کر آئی تھی کہ اسے قائل کر کے رہے گی۔ سوید اندر سے مسمار ہوتا تلخی سے مسکرا دیا۔

"تو تم یہ طے کر کے آئی ہو کہ مجھے ہرا کر رہو گی ....."

"نہیں..... تمہیں ہارا ہوا ہی تو نہیں دیکھنا چاہتی میں..... اسی لیے تو شیئر کر رہی ہوں۔"

"ٹھیک ہے مگر ایک شرط پر ہتھیار پھینکوں گا میں۔" اس بار گہری سانس بوجھل فضا کے سپرد کرتے ہوئے اس نے عبیرہ کا دل دھڑکا دیا تھا۔

"کیسی شرط۔"

"بہت انہونی نہیں ہے..... میری زندگی کسی اور کے ساتھ شروع ہونے سے پہلے تم مجھ سے نکاح کرو گی..... میری پہلی بیوی تم بنو گی اگر منظور ہے تو ٹھیک ہے میں بابا کی بات مان لیتا ہوں اگر نہیں تو پھر ہونے دو جو ہوتا ہے میں کسی کی کوئی بات نہیں مان رہا۔" وہ ضدی تھا مگر عبیرہ کی محبت میں مخلص تھا۔ تبھی اس کی آنکھیں پھر ڈبڈبا گئیں۔

"ٹھیک ہے..... مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔"

"تو ٹھیک ہے پھر جا کر کہہ دو ان لوگوں سے اندر کہ میں قربانی کے لیے تیار ہوں' انہیں جو اوزار تیز کرنے ہیں کر لیں۔"

اس بار سرعت سے اپنی بات مکمل کرتا وہ پھر وہاں ٹھہرا نہیں تھا۔

عبیرہ سختی سے آنکھیں میچ کر مزید بہہ آنے والے آنسوؤں کو پیتی پھر کتنی ہی دیر وہاں بیٹھی روتی رہی زندگی کبھی ایسے کسی امتحان سے دوچار کرے گی اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

"موی..... آزر بھیا آئے ہیں' کیا نہیں ملو گی؟"

وہ لان میں بیٹھی' جھولے سے ایک ایک پھول اٹھا کر اسے پتی پتی کر رہی تھی' جب مریم عباس اس کے قریب چلی آئی اس کا سر بہت آہستگی سے نفی میں ہلا تھا۔

"نہیں۔"

"کیوں؟؟ کہاں تو ایک ایک پل ان کی آواز سننے کو پاگل ہوتی رہتی تھیں اور کہاں اب وہ واپس لوٹ آئے ہیں تو ملنا ہی گوارہ نہیں' خیر تو ہے۔"

مریم کو اس کے نہیں نے حیران کیا تھا' وہ بے زار بے زار سی اس کے قریب سے اٹھ گئی۔

"وہ بہت بدل گیا ہے مریم..... اب اس میں وہ پانچ سال پہلے والی کوئی بات نہیں رہی۔"

"تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"میں نے اسے دیکھا ہے مریم..... اسے قرۃ العین کے سوا دنیا میں دوسری کوئی چیز دکھائی ہی نہیں دیتی' پانچ سال میں یہاں..... اس کے لیے پل پل تڑپی ہوں' مگر وہ گھمنڈی' بے حس شخص..... اس نے ایک بار بھی تم سے یا کسی اور سے میرا نہیں پوچھا۔ اسے اپنی زندگی میں میرے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا مریم۔"

وہ آزردہ تھی۔ مریم دھیمے سے مسکرا دی۔

"پاگل ہو تم اور کچھ نہیں' ایک طرف جنونی محبت کا دعوا اور دوسری طرف ایسی شدید بدگمانی..... ہائے کیا بنے گا میرے اکلوتے بھائی کا۔" اس کے مصنوعی آہ بھرنے پر وہ چڑی تھی۔

"محبت تو میں کرتی ہوں نا یار..... وہ تھوڑی محبت کرتا ہے مجھ سے۔"

"وہ بھی کرنے لگیں گے۔ کوشش جاری رکھو..... قطرہ قطرہ پانی سے سنا ہے پتھر میں بھی شگاف پڑ جاتا ہے۔"

"تمہارا بھائی پتھر سے بھی بڑھ کر ہے اچھا....."

"ہا ہا ہا..... میں تو تمہارے لیے صرف دعا ہی کر سکتی ہوں آگے تمہارا نصیب۔" مریم ہنسی تھی' موی تپ کر ہاتھ میں پکڑے پھول کی پتیاں اس پر غصے سے اچھالتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئی جبکہ اوپر اپنے کمرے کے ٹیرس پر کھڑا آزر عباس اس کی اس حرکت

پر نرمی سے مسکرا دیا۔

☼ ☼ ☼

عبیرہ لان سے اٹھ کر اپنے کمرے میں واپس آئی تو اس کے سارے جسم میں درد کی لہریں سرایت کر رہی تھیں۔ آنکھیں یوں جل رہی تھیں گویا کچھ ہی دیر میں ان سے لہو ٹپکے گا۔

ڈھیلے ڈھالے انداز میں خود کو صوفے پر گرا کر اس نے آنکھیں میچ لی تھیں۔ اسے یاد آنے لگا تھا کہ جب وہ صرف چھ سال کی تھی تو اس کے محبوب بابا کی رحلت ہو گئی تھی، جس کے بعد اس کی ماں فضیلہ بی اسے ساتھ لے کر اپنے آبائی گاؤں اپنی بڑی بہن کے پاس چلی آئی تھیں۔ سوید ان کی اسی بڑی بہن راحیلہ بی کا اکلوتا بیٹا تھا جس میں ان کی جان تھی۔

سوید کے بابا راحیل جعفری، اس کی ماں راحیلہ بی اور خالہ فضیلہ بی کے فرسٹ کزن تھے۔ شروع سے ہی راحیل جعفری کی ماں، راحیلہ بی اور فضیلہ بی کی ماں پر حاوی رہی تھی کیونکہ وہ اس خاندان کی پہلی بہو تھی اور بے حد ہوشیار تھی جبکہ راحیلہ بی کی ماں سیدھی سادی، حساس دل و دماغ کی مالک عام سی خاتون تھی۔ باطنی چالاکی کے ساتھ ساتھ وہ حسن و صورت میں بھی اپنی دیورانی پر بھاری تھی، یہی وجہ تھی کہ حویلی میں برسوں تک راحیل جعفری کی ماں کا راج ہی رہا سونے پر سہاگہ قدرت اولاد کے معاملے میں بھی ان پر مہربان رہی، وہ لگاتار چار بیٹوں کی ماں بنی تھیں جبکہ راحیلہ بی کی ماں نے پہلے دو بیٹیوں راحیلہ بی اور فضیلہ بی کو جننے کے بعد ایک بیٹے کو جنم دیا، جو عین جوانی کے عالم میں، زمینوں اور جائیداد کے مسئلے پر اپنے باپ کے ساتھ، راحیل جعفری کے بڑے بھائی سہیل جعفری کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

راحیلہ بی ان دنوں ــ پورے خاندان سے ٹکر لے کر شہر میں پڑھ رہی تھیں۔ اکلوتے بھائی اور باپ کی اندوہناک موت کی خبر ان پر بجلی بن کر گری تھی۔ وہ اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر فی الفور گاؤں واپس آئی تھیں جہاں ان کے گھر جیسے کہرام بپا تھا۔

سارا گاؤں قاتل کو جانتا تھا مگر...... ان کے شر سے خوف زدہ ہو کر کسی نے بھی زبان نہ کھولی اور راحیلہ بی بے بسی غم و غصہ پی کر رہ گئیں۔

اپنے تایا زاد سہیل جعفری کے ساتھ ساتھ انہیں ان کے بقیہ تینوں بھائیوں سے بھی شدید نفرت تھی اور یہ نفرت اس وقت مزید دوچند ہو گئی جب ان کی ماں ایک صبح چپ چاپ اپنے سسرالیوں کے مظالم کے دکھ جھیلنے سے لگائے دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ ابھی یہ درد بھی تازہ تھا کہ اس کی نفرت اور خود سری کو ضد بناتے ہوئے راحیل جعفری نے ان سے شادی کا شوشا چھوڑ دیا۔ راحیلہ بی اس شادی کے لیے کسی طور تیار نہ تھیں مگر وہ پنجرے میں قید پنچھی کی مانند محض پھڑپھڑا کر رہ گئیں۔ ان کی نفرت کو اپنی ضد بناتے ہوئے راحیل جعفری نے ان سے شادی تو کر لی مگر انہیں بیوی کی حیثیت سے بھی تسلیم نہ کیا وہ عورت جو تائی کے روپ میں انہیں زہر لگتی تھی اب ساس بن کر مزید قہر ڈھانے لگیں۔ چند دنوں میں ذہنی اور جسمانی طور پر انہیں کچھ یوں تاراج کیا گیا کہ وہ جو شعلہ جوالہ تھیں بجھ کر رہ گئیں۔ دورے پڑنے لگے اور جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا، فضیلہ بی جو راحیل جعفری سے چھوٹے عقیل جعفری کی جنوں خیز محبت سے ہار گئی تھیں، یہاں اس مقام پر آکر ان سے شادی سے انکاری ہو گئیں کہ اپنی بڑی بہن کو مزید دکھ سے ہمکنار کرنا انہیں کسی طور گوارا نہیں تھا۔

حویلی میں واحد عقیل جعفری تھا جو روایتی جاگیردار ثابت نہیں ہوا تھا، بلکہ فضیلہ بی کی غیر متوقع بے وفائی کے بعد وہ گاؤں تو کیا ملک چھوڑ کر ہی چلا گیا۔ کتنے عہد، کتنے پلان، دونوں کی زندگی کے بیچ ادھورے رہ گئے تھے نفرتوں کے سلسلوں کو محبت کی بارش سے دھونے کا ان کا عظم بس عظم ہی رہ گیا۔ اور فضیلہ بی اسی گاؤں میں نمبردار کے بیٹے کی دلہن بن گئیں۔

سوید ان دنوں محض چار سال کا تھا اور سارا سارا دن عقیل جعفری کو یاد کر کے ”چاچو...... چاچو“ کہتا

روتا رہتا تھا، جو شفقت اسے باپ سے ملی تھی وہ چچا نے دی۔ مگر زیادہ عرصہ یہ شفقت بھی اس کا نصیب نہ رہ سکی اور وہ پھر سے محرومیوں کی گود میں آگرا۔

جن دنوں فضیلہ بی کی گود میں عبیرہ آئی انہیں حویلی سے عقیل جعفری کے بیرون ملک نکاح کی خبر ملی، اور وہ کسی حد تک مطمئن ہو گئیں، چار سالہ تھے سوید کے ذہن سے عقیل کا تصور بھی نکل گیا۔ البتہ وہ عبیرہ کو پا کر بہت مسرور تھا، اس کا بس نہ چلتا تھا کہ عبیرہ سارے دن اس کی بانہوں میں کھیلنے کے بعد، رات کو بھی اسی کے پاس سوئے۔

اس کی یہ خواہش پوری ہوئی تھی مگر پورے چھ سال بعد...... جب فضیلہ بی پر شوہر کی ناگہانی اچانک موت نے فالج کا اٹیک کر دیا اور وہ زندہ لاش بن کر محض بستر کی ہو رہیں۔ ایسے میں راحیلہ بی نے ہی تمام تر مشکلات اور اذیتوں کا سامنا کرتے ہوئے نا صرف ان کی دیکھ بھال کی، بلکہ عبیرہ کو بھی سنبھالا، وہ بستر پر ایک طرف بیٹے کو ساتھ لے کر سوتیں تو دوسری طرف عبیرہ کو......

دن، ہفتوں، مہینوں اور سالوں کا روپ دھارتے وقت کا حصہ بنتے چلے گئے اور سوید، عبیرہ کے ساتھ بچپن کی دہلیز سے نکل کر جوانی کی شاہراہ پر آکھڑا ہوا، دونوں کو خبر بھی نہ ہو سکی اور محبت ان دونوں کے بیچ جیسے پنجے گاڑ کر بیٹھ گئی۔

کتنی یادیں تھیں جو اس محبت سے وابستہ تھیں، کتنے ایسے واقعات اور باتیں تھیں جو ان کی چاہت کی گواہ بنی تھیں۔ وہ اس کے مزاج کے ہر موسم کی آشنا تھی اور سوید...... اسے تو زندگی کا ہر رنگ نظر ہی اس کی خوب صورت آنکھوں میں آتا تھا۔

بہت سے پیمان تھے جو بن کہے دونوں کے بیچ بندھ گئے تھے اور بہت سی ذمہ داریاں تھیں جو دونوں نے خود بہ خود اپنے ذمے لی تھیں۔

عبیرہ رہ رہ کر اس وقت کو کوس رہی تھی جب تین روز قبل شام میں وہ ہوسٹل سے گھر آئی تھی۔ شہر میں ان کا مکان تعمیر پا چکا تھا اور آدھے سے زیادہ سامان بھی

نئے گھر میں شفٹ کیا جا چکا تھا جب اچانک راحیل جعفری نے نیا شوشا چھوڑ دیا۔ ان کے فرمان کے مطابق ان کے لاڈلے بھائی عقیل جعفری اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی کے لیے راحیل جعفری اور ان کے اکلوتے بیٹے سوید سے درخواست گزار تھے۔ یہ خبر کسی طرح ہضم ہو ہی جاتی کہ سوید کو یہ پتا چل گیا کہ عقیل جعفری، ان کے امیر کبیر لاڈلے چچا اپنی جس اکلوتی بیٹی کی شادی اس کے ساتھ کرنا چاہ رہے ہیں، وہ پاگل ہے اور کوئی بھی شخص اسے اپنانے کو تیار نہیں۔

راحیل جعفری نے بھائی کی محبت اور بڑے بھائی سہیل جعفری کے دباؤ میں، بنا کسی سے بات کیے نا صرف یہ رشتہ طے کر دیا بلکہ شادی کی تاریخ بھی دے دی، عبیرہ یہ خبر سن کر ہی ہوسٹل سے گھر آئی تھی۔ جہاں اس وقت سوید کا پورا خاندان اسے گھیرے ہوئے بیٹھا تھا۔

وسیع حویلی کے کشادہ ہال کمرے میں، جس وقت اس نے دہلیز پر قدم دھرے، سوید کے بابا راحیل جعفری کی کڑک آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

"مت بھولو برخوردار کہ میں تمہارا باپ ہوں۔ پڑھا لکھا کر، پالنے پوسنے اور ضرورت سے زیادہ لاڈ پیار و آزادی کا یہ مطلب نہیں کہ آج تم باپ پر اپنی مرضی کے فیصلے مسلط کرو، مت بھولو کہ جتنے تم مجھے عزیز ہو، اتنی ہی دل آویز بھی عزیز ہے، وہ صرف عقیل کی نہیں، میری بھی بیٹی ہے اگر کسی وجہ سے بیمار ہے تو اس میں اس پاگل کا کیا قصور۔۔۔ مشکل اور مصیبت میں اپنے ہی اپنوں کے کام آتے ہیں۔ بھری دنیا میں کوئی اور اس کا سہارا بنے نہ بنے تمہیں ضرور اس کا سہارا بننا ہے۔۔۔ بصورت دیگر تم یہ گھر اور اپنے والدین کو چھوڑ کر جا سکتے ہو، میں یہ سمجھ لوں گا کہ عقیل اور سہیل بھائی کی طرح میرا بھی کوئی بیٹا تھا ہی نہیں۔"

"دھڑاک۔۔۔" عبیرہ کو لگا جیسے اس وقت ساتوں آسمان اس کے سر پر آ گرے ہیں، معاملہ اتنی شدید نوعیت کا ہوگا اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔

سوید وہاں سب کے بیچ تنہا اپنے لیے لڑ رہا تھا۔ راحیلہ بی اس کے قریب یوں سر جھکائے کھڑی تھیں جیسے کسی گھناؤنے جرم کی مجرم ہوں، جبکہ سامنے کے صوفے پر راحیل جعفری، عقیل جعفری اور اس کی ماڈرن سی نفیس بیگم براجمان تھے، دائیں طرف دھرے پلنگ پر سہیل جعفری اور اس کی بیوی بیٹھی تھی۔ سوید اپنے باپ کی بات پر تپ کر اٹھا تھا۔

"ہونہہ۔۔۔ آپ سے امید بھی یہی رکھی جا سکتی ہے۔ کبھی باپ بن کر بیٹے کو پالا ہوتا تو آج یوں اتنی آسانی سے یہ بات نہیں کہہ سکتے تھے آپ کیا سوچ کر حق جتا رہے ہیں مجھ پر۔۔۔ میں آپ کی نوازشوں کا محتاج نہیں ہوں۔۔۔ میرے اور میری ماں کے حصے میں صدا قہر آیا ہے آپ کا۔۔۔ آپ کی نوازشیں تو سدا اپنے بھائیوں اور ان کی بیویوں پر رہی ہیں، پھر اب یہ خوش فہمی کیوں لاحق ہو گئی آپ کو کہ میں آپ کی خواہش کا احترام کروں۔۔۔ سوری والد محترم یہ دنیا کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر چلتی ہے، میری ماں بے شک آپ کی جیتی ہوئی جنگ ہوں گی، مگر میں آپ کا منتوح علاقہ نہیں ہوں، نہ میں نے اپنی زندگی سنوارنے کے لیے کبھی آپ کی عنایتوں کی آس رکھی ہے، میں آج جس مقام پر ہوں اپنی ماں کی دعاؤں اور محبتوں کے بعد اپنے بل بوتے پر ہوں۔ اس میں آپ کا کوئی کمال نہیں ہے لہٰذا اس غلط فہمی کو دل سے نکال دیجیے کہ میں یہاں سے نکل کر جی نہیں سکوں گا۔ میں جیوں گا اور جی کر دکھاؤں گا۔ آپ رکھیے اپنی دھن دولت اپنے پاس سنبھال کر۔" وہ بھی انہی کا بیٹا تھا۔ راحیل جعفری اس کی اس قدر جرأت پر دنگ رہ گئے تھے۔

"چٹاخ۔" کی زوردار آواز پر جہاں راحیلہ بی تڑپ کر اٹھی تھیں وہیں عبیرہ کا ہاتھ بھی بے ساختہ اپنے دل پر پڑا تھا۔

"گستاخ، بدزبان تمہاری ہمت کیسے ہوئی ہمارے سامنے زبان چلانے کی؟ کس نے ڈالیں تمہارے ذہن میں ایسی باغیانہ باتیں اور سوچ ہمارے خون سے جنم لے کر آج ہم کو ہی آنکھیں دکھا رہے ہو یہی سکھایا ہے تمہاری ماں اور تعلیم نے تمہیں۔۔۔؟" راحیل

جعفری صاحب کے منہ سے کف بہہ رہا تھا۔ ایسے میں عقیل جعفری فوراً اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"بس کریں بھائی۔۔۔ اگر وہ راضی نہیں ہے تو زور زبردستی مت کریں۔ ایسے معاملے زور زبردستی سے زیادہ دیر نہیں چلتے دل آویز کی قسمت میں اگر کوئی خوشی لکھی ہی نہیں تو بھلا میں اور آپ کیا کر سکتے ہیں؟" ان کے انداز میں شکستگی تھی۔ سوید جعفری نے تنفر سے سر جھٹک دیا۔

"نہیں عقیل۔۔۔ میں نے تمہیں زبان دی ہے اب اس سے پھرنا میرے لیے موت کے مترادف ہے، دیکھتا ہوں یہ کیسے نہیں کرتا دل آویز بیٹی سے شادی۔" راحیل صاحب کی بھائی سے محبت اور واضح چیلنج پر سوید پاؤں پٹختے ہوئے وہاں سے واک آؤٹ کر گیا تھا جبکہ عبیرہ کو لگا جیسے اس کا وجود پتھر کا ہو گیا ہو۔۔۔ اس وقت اسے مزید۔۔۔ کچھ دکھائی دے رہا تھا نہ سنائی دے رہا تھا عجب قیامت پڑی تھی دل پر کہ وہ سسکی بھی نہ نکال سکی اسی رات سوید بنا کسی کو بتائے گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا اور اسی رات راحیلہ بھی ہارٹ اٹیک کا شکار ہو کر، بمشکل منتوں اور دعاؤں سے زندگی کی طرف واپس لوٹی تھیں۔

سوید اس متوقع حادثے پر فوراً گھر تو واپس لوٹ آیا تھا مگر اس نے ہتھیار نہیں پھینکے تھے۔ راحیل جعفری صاحب سے مکمل خفا وہ پورا ایک ہفتہ سب سے لڑا تھا، مگر۔۔۔ بالآخر عبیرہ نے اسے ہار ماننے پر مجبور کر ہی ڈالا تھا۔ اس رات وہ روئی تھی اور اتنا روئی تھی کہ صبح اس کا پورا وجود تیز بخار میں جل رہا تھا۔ اپنی ماں اور خالہ کی محبت میں مجبور ہو کر اس نے اپنا پیار قربان کرنے کا حوصلہ کر لیا تھا مگر اب جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔ اسے جیسے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

سخت گرمی کی چلچلاتی دھوپ میں جس وقت اسے سوید کی بائیک کا ہارن سنائی دیا، وہ بے کل سی لب کاٹ کر رہ گئی۔ ساری رات آنکھوں میں کاٹنے کے بعد بھی اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

سوید ہارن پہ ہارن دے رہا تھا۔ وہ بہت مجبور ہو کر اس کی طرف بڑھی تھی۔

"بیٹھو۔۔۔" کالج گیٹ سے نکل کر جونہی وہ اس کی طرف بڑھی اس نے فوراً حکم صادر کر دیا۔ عبیرہ نے دیکھا اس وقت وہ سخت تناؤ کا شکار دکھائی دے رہا تھا۔ تبھی وہ منمنائی تھی۔

"سوید۔۔۔ آئی ایم سوری میں ایسا نہیں کر سکتی، یہ صحیح نہیں ہے۔"

"تو ٹھیک ہے، پھر میں بھی کسی صورت وہ نہیں کر رہا جو صحیح ہے۔" وہ لب بھینچے کہہ رہا تھا۔ عبیرہ کو تاؤ آ گیا۔

"تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔"

"چپ چاپ بیٹھ جاؤ عبیرہ۔۔۔ سڑک پر تماشا مت بناؤ پلیز۔۔۔"

"سوید تم۔۔۔"

"دیکھتی ہو کہ زبردستی پکڑ کر بٹھاؤں۔" اب کے وہ غصے ہوا تھا۔ عبیرہ بے بسی سے ایک نظر اسے دیکھتی چپ چاپ بیٹھ گئی۔

اگلے تیس منٹ میں وہ اپنے کسی جاننے والے وکیل کے پاس بیٹھا اسے سارا احوال سنا رہا تھا۔ عبیرہ اس دوران خاموش بیٹھی، اپنی شور مچاتی دھڑکنوں کو سنبھالنے اور سمجھنے کی کوشش کرتی رہی تھی! کچھ ہی دیر میں وہ سوید کے ساتھ کورٹ میں کھڑی تھی اور اگلے چند لمحوں میں کچھ ضروری کاغذات پر چند دستخط گھسیٹ دینے کے بعد وہ عبیرہ شیرازی سے عبیرہ سوید ہو گئی، ٹانگوں کے ساتھ ساتھ اس وقت اس کی انگلیاں بھی کانپ رہی تھیں۔ مگر سوید کی محبت اور گرم ہاتھوں کی حرارت نے اسے حوصلہ دیا تھا۔ وہ خوش تھا بے حد خوش۔۔۔ ساتھ ہی اس کے دوست بھی خوش تھے۔

کورٹ سے رخصتی کے بعد جب وہ اسے اپنے ایک دوست کے گھر لے کر آیا تو اس کا چہرہ سچی خوشی سے تمتما رہا تھا۔ والٹ میں موجود سارے پیسے اس نے

کورٹ اور دوستوں میں مٹھائی کے لیے بانٹ دیے تھے۔ عبیرہ بس اسے دیکھتی رہ گئی۔

"تھینکس۔۔۔ تھینکس میری جان کہ تم نے مجھے محبت کی اس پر کٹھن راہ پر بے آسرا' تنہا بھٹکنے کے لیے نہیں چھوڑا۔ میں بہت خوش ہوں عبیرہ' اتنا کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتیں اور ہاں آج سے میرا وعدہ ہے تم سے۔۔۔ بیوی ہونے کا حق میں صرف اور صرف تمہیں دوں گا' اس پاگل سے شادی کاغذی کارروائی کے سوا اور کچھ نہیں ہوگی' جیسے ہی حالات ہمارے حق میں ہوئے میں وہ کاغذی بندھن توڑ دوں گا' میرے بچے اگر دنیا میں آئیں گے تو صرف تمہارے بطن سے۔ سمجھیں۔"

جگر جگر چمکتی روشن سیاہ آنکھوں میں اس کے لیے محبت ہی محبت تھی' عبیرہ نے پرسکون ہو کر اپنا سر اس کے کندھے پر ٹکا دیا۔ سوید کی نرم گداز انگلیاں جانے کتنے دیر تک اس کے ریشمی بالوں کو سہلاتے ہوئے اس پر عجیب سا سحر طاری کرتی رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

آزر یزدار عباس حال ہی میں اپنی تعلیم مکمل کر کے پاکستان اپنے گھر واپس لوٹا تھا۔ عمر میں وہ موی اور مریم سے پورے پانچ سال بڑا تھا۔ اس سے دو سال بڑا یاسر یزدار عباس تھا جس نے لندن میں ہی اپنے والد کی رحلت کے بعد ان کے کاروبار کو سنبھال لیا تھا۔ موی ان کی اکلوتی خالہ زاد کزن تھی جس کے نازک سراپے اور بے جا لاڈ پیار کے باعث انہی کی مما آسیہ بیگم نے اس کا نام پیار سے موی رکھ دیا تھا۔

آزر کو یاد تھا جب وہ لوگ چھوٹے تھے تو دن بھر معمولی معمولی سی باتوں پر کتنا لڑتے تھے۔ وہ غصے ہو کر اگر اس کے بال کھینچتا تھا تو موی غضب ناک ہو کر اپنے دانت اس کے بازو میں گاڑ دیا کرتی' کبھی کبھی وہ اتنی شدت سے بازو کاٹتی تھی کہ وہاں زخم بن جاتا تھا۔ اب بھی اس کے بائیں بازو پر موی کے دانتوں کے نشان زخم کی صورت رقم تھے' تاہم وقت کے ساتھ ساتھ اب ان زخموں پر کھرنڈ آ گیا تھا۔

موی اور مریم نے میٹرک تک اسی کی درس گاہ میں تعلیمی مدارج طے کیے تھے یہی وجہ تھی کہ جھگڑوں کے باوجود وہ اسکول میں ان دونوں کا خاص خیال رکھتا تھا۔ میٹرک کے بعد موی کے والدین نے اچانک پاکستان واپسی کا فیصلہ کیا تو وہ بے قرار ہو گئی۔ مریم اور آزر کے بغیر کہیں رہنے کا خیال ہی اس کے لیے سوہان روح تھا یہی وجہ تھی کہ اس نے وہیں رہ کر مزید پڑھنے کی ضد کر لی' آزر کو اس کی اس ضد کا پتا چلا تو وہ بے حد حیران ہوا' کہاں تو ان کی لڑائیاں ہی ختم نہیں ہوتی تھیں اور کہاں اب وہ موم کی گڑیا اس کے لیے رو رو کر بے حال ہو رہی تھی۔

اپنی اسی حیرانی کو دور کرنے کے لیے وہ اس کے کمرے میں اس کی ضد کی وجہ پوچھنے کے لیے آیا تھا' جب وہ مسل مسل کر آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولی۔

"آزر۔۔۔ تمہارے بغیر پاکستان میں میرا دل نہیں لگے گا۔"

"واہ۔۔۔ کہہ تو ایسے رہی ہو جیسے پتا نہیں کتنی گہری دوستی ہو ہماری' جنگلی بلی تم تو کل کو شادی کے لیے بھی یونہی اڑ جاؤ گی کہ مجھے تو آزر سے ہی شادی کروانی ہے' کسی اور کے ساتھ میرا دل نہیں لگے گا۔"

"ہاں تو اور کیا شادی بھی تم سے ہی کرنی ہے مجھے اور کسی سے نہیں۔"

"جی نہیں محترمہ۔۔۔۔ معاف کرو مجھے میں باز آیا ساری عمر کے لیے یہ مصیبت مول لینے سے۔"

"کیا میں مصیبت ہوں؟"

موی کو اس کے صاف جواب پر سخت صدمہ ہوا تھا وہ شگفتگی سے مسکرا دیا۔

"اور نہیں تو کیا۔۔۔ پوری چڑیل ہو' جنگلی بلی۔"

"تم خود ہو گے جنگلی بلے اچھا خبردار جو دوبارہ مجھ سے بات کی تو۔۔۔ میں جا رہی ہوں پاکستان اپنے ددھیال والوں کے پاس تم رہنا یہاں اپنی ہنسی ہنسی کے ساتھ خوش و خرم۔" اس کی توقع کے عین مطابق وہ چڑی تھی اور آزر بے ساختہ ہنس دیا تھا۔ پھر اس کے بعد وہ اس کے لاکھ روکنے اور منانے کے باوجود اپنے والدین کے ساتھ پاکستان چلی آئی تھی' جبکہ آزر عباس اس کی اس ضد پر کڑھتا رہ گیا تھا۔

موی کے بغیر لندن جیسے خوب صورت ایڈوانس شہر میں اس کے پانچ سال بہت اداس گزرے تھے' ایک طرح سے اسے موی کو چڑانے' رلانے اور پھر منانے کی عادت پڑ گئی تھی' اسے اشتعال دلا کر پھر اس کا جارحانہ روپ دیکھنا بہت لطف دیتا تھا اسے' مگر اپنی غصے کی وجہ سے اس نے کبھی اس پر یہ بات کھلنے نہیں دی تھی۔ وہ پاکستان سے آتی اس کی میلز کا جواب بھی نہیں دیتا تھا۔ قرۃ العین جو برو کن فیملی کی ٹوٹی پھوٹی سی سمجھدار لڑکی تھی اور پوری کلاس میں اس کی واحد عزیز دوست تھی' اکثر اسے موی کے حوالے سے چھیڑتی اور وہ کبھی ہنس کر کبھی ڈانٹ کر اسے ٹال دیتا۔

اس کی فیملی' موی لوگوں کے لندن سے کوچ کے ایک سال بعد ہی پاکستان شفٹ ہو گئی تھی مگر وہ پاکستان نہیں گیا تھا' اپنی تعلیم مکمل کرنے تک وہ یاسر عباس کے ساتھ لندن میں ہی رہا تھا اور یہی وہ بات تھی جس نے موی کو سب سے زیادہ ہرٹ کیا تھا۔

پورے پانچ سال بعد پاکستان واپسی پر عینی بھی اس کے ہمراہ تھی۔ وہ پاکستان میں اس کے ساتھ مل کر بزنس اسٹارٹ کرنا چاہتی تھی اور آزر کے لیے یہ خوشی کی بات تھی' تاہم اپنی واپسی پر شوق دیدے سے بے حال موی کو جو نکھر کر اور بھی پیاری ہو گئی تھی۔ اس نے جان بوجھ کر نظر انداز کیا تھا۔ ویسے بھی اس کی سوچ میں بہت میچورٹی آ گئی تھی' وہ اس سے پچھلے پانچ سال کی جدائی کا بدلہ اپنے ہی انداز میں لینے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔

☆ ☆ ☆

راحیلہ بی بی اور فضیلہ بی بی کو سوید آزر کے کارنامے کی خبر ہو چکی تھی اور وہ دونوں اس پر بے حد مسرور تھیں۔ تاہم فضیلہ بی بی کے دل کو کچھ وسوسے ضرور گھیرے ہوئے تھے۔ سوید' عبیرہ کے ساتھ گھر واپس لوٹا تو وہ کتنی ہی دیر اس کا منہ چومتے ہوئے زار و قطار روتی رہی تھیں۔ وہ بد نصیب تھیں اپنا پیار نہیں پا سکی تھیں' تاہم ان کی بیٹی کے آنکھوں کے خواب ضرور تعبیر پا گئے تھے۔

دوسری جانب راحیلہ بی بی اپنی دلی تمنا کی تکمیل کے لیے اپنے بیٹے کی جرات اور جائز حکمت عملی پر از حد مطمئن و مشکور تھیں ان کا دل اپنے سوہنے رب کا شکر ادا کرتا نہ تھک رہا تھا۔ حویلی میں دل آویز جعفری سے سوید کی نکاح کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ تاہم اب انہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا وہ مسرور تھیں کہ ان کے دل نے جس لڑکی کو بہو کے روپ میں دیکھنے کی خواہش کی تھی بالآخر پہلے وہی لڑکی ان کی اکلوتی بہو کے منصب پر فائز ہوئی تھی۔

اس روز دل آویز جعفری کے ساتھ سوید کے نکاح کی تقریب تھی۔ دل آویز کی خراب طبیعت کے پیش نظر شادی کی دیگر رسومات سے پرہیز کرتے ہوئے صرف نکاح کی تقریب ہی شایان شان طریقے سے ارینج کرنے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ عبیرہ کو اس روز ہلکا ہلکا بخار تھا سوید شہر میں تمام انتظامات کی دیکھ بھال کے بعد گاؤں واپس آیا تو راحیلہ بی بی سے مل کر سیدھا اس کی طرف چلا آیا۔ جو اس وقت مغرب کی نماز کی ادائیگی کے بعد جائے نماز پر بیٹھی چپ چاپ آنسو بہاتے ہوئے دعا مانگ رہی تھی۔

سوید ایک سرسری نگاہ اس کے بھیگے چہرے پر ڈالنے کے بعد کسی لاابالی بچے کی مانند اس کی گود میں سر رکھ کر زمین پر ہی لیٹ گیا۔ عبیرہ نے چونک کر فوراً سے پیشتر دعا سمیٹتے ہوئے آنسو پونچھے تھے جب سوید نے محبت سے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"لو مجھے ہی مانگ رہی تھیں نا اللہ سے' میں آ گیا۔"

"مہربانی' اٹھو یہاں سے۔"

"کیوں۔۔۔ کیوں اٹھوں۔۔۔ میری خالہ جانی کا گھر ہے اور محبوب بیوی کی گود ہے' تمہیں کیا اعتراض ہے؟"

"پاگل ہو تم اور کچھ نہیں۔" عبیرہ نے بے ساختہ نگاہ چراتے ہوئے اپنے آنسو اس سے چھپانا چاہے تھے جب وہ بولا۔

"رو کیوں رہی ہو عبیرہ.....؟ میں تو وہی کر رہا ہوں جو تم نے مجھ سے چاہا ہے' ورنہ ایک پاگل لڑکی سے شادی میں بھلا میرا کیا انٹرسٹ ہو سکتا ہے خود سوچو میرے تو سارے جذبے صرف تم سے وابستہ ہیں..... اس لیے آج رات تقریب میں تم میرے ساتھ رہو گی سمجھیں؟"

"ہوں۔" نم آنکھوں سے سرہلاتے ہوئے وہ اسے بے حد پیاری لگی۔

"چلو شاباش اب یہ آنسو پونچھو نہیں تو میں ہونٹوں سے چنوں گا تو پھر تم شکایت کرو گی۔" وہ پھر شرارت پر آمادہ تھا۔ عبیرہ نے ہلکا سا مکا بنا کر اس کے چوڑے سینے پر رسید کر دیا۔

"زیادہ رومینس بگھارنے کی ضرورت نہیں ہے' اچھا۔"

"ضرورت ہے یار' میری ممابہت بے تابی سے اپنی گود میں میرے بچے کھلانے کی خواہشمند ہیں۔" وہ کب باز آنے والا تھا عبیرہ اسے گھور کر رہ گئی۔

"تو..... میں نے ابھی ایسا کچھ نہیں کرنا۔"

"تو کی بچی آرام سے رہو..... ضروری نہیں کہ ہر بار میں تمہاری مانتا رہوں گا' کبھی دل کے کہے پر بھی چلنے دیا کرو اچھا۔"

"اچھا جی اچھا..... تمہیں تو اللہ سمجھے۔" وہ اب پزل ہو رہی تھی۔ سوید جان بوجھ کر اگلے تین چار گھنٹوں تک اسے یونہی زچ کرتا رہا۔

☼ ☼ ☼

دل آویز جعفری سے سوید کی نکاح کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔

وہ شہریارات کے ساتھ روانہ ہونے سے پہلے پھر عبیرہ کی طرف اسے اور فضیلی کو لینے آیا تھا۔ جب اسے سادہ سے کپڑوں میں ہلکا پھلکا تیار دیکھ کر' بے خود سا اس کے قریب چلا آیا۔

"بیہ....." وہ جو سنگھار میز کے سامنے کھڑی بال سنوار رہی تھی اس کی پکار پر پلٹی۔

"ہوں۔"

"بیہ..... میں کسی دل آویز جعفری سے شادی نہیں کر رہا۔"

"کیوں.....؟" اس کی قربت پر دھڑکتے دل کو بمشکل سنبھالتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔ مگر پھر سوید کی آنکھوں میں دیکھ کر فوراً" نگاہ جھکا گئی۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا..... اور کچھ نہیں۔"

"صحیح کہہ رہی ہو قسم سے..... آج تو ٹھیک ٹھاک خراب ہو رہا ہے اک شعر سنو۔

جس طرح میرا خواب ہے اس طرح تیرے ساتھ
اک شام گزر جائے تو اک شام بہت ہے

اپنے گرم سانسوں سے عبیرہ کے چہرے کو چھوتے ہوئے اس نے سرگوشی کی تھی۔ جب وہ بولی۔

"عقل کو ہاتھ مارو سوید..... وہاں سب لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"تو کرنے دو نا یار..... تمہیں کیا مسئلہ ہے' اچھے بھلے موڈ کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیتی ہو بالکل اچھی بیوی نہیں ہو تم۔" اپنی ٹھوڑی مزے سے اس کے کندھے پر ٹکاتے ہوئے اس نے دہائی دی تھی۔ جب وہ مسکرا دی۔

"چلو دوسری تو اچھی مل رہی ہے نا..... اس سے پیار کروا لینا۔" اس نے مذاق کیا تھا مگر سوید برا مان کر تپ اٹھا۔

"شٹ اپ۔" تپ کر کہتے ہوئے وہ فوراً" کمرے سے نکل کر باہر گاڑی کی طرف بڑھ گیا تھا جبکہ عبیرہ ہنستے ہوئے فضیلی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

میرج ہال میں جس وقت وہ اپنے خاندان والوں کے درمیان گھرا خود کو عقد ثانی کے لیے تیار کر رہا تھا' عبیرہ کی آنکھ کے آنسو اسے تڑپا گئے' ڈھیروں مہمانوں کے بیچ وہ اسٹیج کے قریب بیٹھی جیسے اپنا ضبط

آزمانے کی کوشش کر رہی تھی۔

سوید سے رہا نہ گیا تو اٹھ کر اس کے قریب چلا آیا۔

"بیہ..... تم رو رہی ہو؟"

"نہیں تو۔"

"جھوٹ مت بولو دیکھو اگر تم راضی نہیں ہو تو میں ابھی....." وہ مضطرب تھا۔ عبیرہ آنسو چھپاتی زبردستی مسکرا دی۔

"پاگل مت بنو..... میں ٹھیک ہوں جاؤ سب ادھر ہی دیکھ رہے ہیں۔" اپنے ہاتھ اس کی گرفت سے نکالتے ہوئے اس نے بمشکل سوید کو پیچھے دھکیلا تھا' جس پر راحیل جعفری صاحب جو اپنے کسی دوست سے باتوں میں مگن تھے پہلو بدل کر رہ گئے تھے اندر کمرے میں دل آویز جعفری نامال ہوش و حواس سے بے گانہ پڑی تھی اور مسز عقیل کے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے

"آنٹی..... میرا خیال ہے ہمیں موی کو ابھی مزید کچھ وقت دینا چاہیے تھا۔"

"نہیں بیٹے..... ڈاکٹرز کے مطابق اس کی فوری شادی بے حد ضروری ہے۔"

"مگر....."

"اللہ سب بہتر کرے گا مریم..... تم کسی طرح اس کا ذہن اس طرف سے ہٹاؤ پلیز۔"

"ٹھیک ہے میں کوشش کرتی ہوں۔"

تھکن اور ان دیکھے درد کی آمیزش نے اس کا لہجہ بھاری بنا دیا تھا۔ مسز عقیل قدرے مطمئن سی کمرے سے نکل گئیں۔ سوید نے الجھے دل و دماغ کے ساتھ نکاح نامے پر سائن کیے تھے اور پھر جبراً" مسکرا کر سب سے نکاح کی مبارک باد وصول کی' اس دوران اس نے نہ تو دلہن کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا' نہ اس معاملے میں اس کی کوئی دل چسپی سامنے آسکی' نکاح کے بعد کھانے کا دور چلا تو وہ عبیرہ کو لے کر میرج ہال سے نکل آیا چپکے سے۔

"بس اب تو خوش ہو نا عبیرہ..... میں نے بانٹ دیا خود کو دو حصوں میں۔"

"نہیں کاغذ کے اس جبری تعلق کو میں کوئی اہمیت نہیں دیتی تم میرے ہو اور زندگی کی آخری سانس تک صرف میرے ہی رہو گے۔"

سوید کا بازو' اپنے بازوؤں کی گرفت میں لیے اس نے آہستہ سے اپنے ہونٹ اس کی ٹھوڑی سے ٹچ کیے تھے۔ سوید جیسے بے جان سا گاڑی میں آبیٹھا۔

"یہ یقین ہمیشہ قائم رکھنا عبیرہ! کیونکہ جس دن تمہارے اور میرے بیچ ذرا سی بھی غلط فہمی آئی' اسی دن میں مر جاؤں گا۔"

"پاگل ہو گئے ہو.....؟" تڑپ کر کہتے ہوئے عبیرہ نے اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا تھا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں عبیرہ..... میری سانسیں تم سے جڑی ہیں تم میرے وجود' میرے سارے جذبوں کی مالک ہو۔ بہت پیار کرتا ہوں میں تم سے۔ یہ زندگی اگر خوب صورت ہے تو صرف تمہارے دم سے..... مما کے بعد تم دوسری عورت ہو' جو مجھے اپنی جان سے بڑھ کر پیاری ہے۔" وہ جذباتی ہو رہا تھا۔ عبیرہ نے محبت پاش نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"تم بھی میرا ایمان ہو سوید..... زندگی کی آخری سانس تک میری وفا تمہاری ہمسفر رہے گی۔" سوید کی آنکھوں کی نمی اسے بھی رلا گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

تکیہ بانہوں میں دبائے' بیڈ پر آڑھا ترچھا لیٹا وہ گہری نیند میں غرق تھا' جب موی دبے پاؤں اس کے کمرے میں چلی آئی' نیچے آسیہ بیگم اور مریم ناشتے کی تیاری کر رہی تھیں اس نے تفصیلی نگاہوں سے آزر کا جائزہ لیا' وہ پہلے سے قدرے کمزور ہو گیا تھا۔

کتنے افسوس کی بات تھی کہ وہ لندن سے اس کے لیے کوئی تحفہ نہیں لایا تھا۔ وہ دکھ کی انتہا پر تھی۔ اس وقت اسے کچھ اور نہ سوجھا تو فریج سے ٹھنڈے پانی کی

بوتل نکال کر پوری کی پوری اس پر انڈیل دی۔ وہ جو گہری نیند میں تھا اس اچانک افتاد پر بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔
"تم....؟" نگاہ اس کے مسکراتے چہرے پر پڑتے ہی اس کی آنکھیں پوری کی پوری کھل گئی تھیں۔
"جی جناب.... السلام علیکم اینڈ صبح بخیر۔" دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے اس نے اسے چڑایا تھا۔
جب وہ گہری سانس بھر کر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔
"کسی کو گہری نیند سے جگانے کا یہ کون سا طریقہ ہے۔"
"بہت زبردست طریقہ ہے۔ تمہیں کیا پتا پاکستان میں یہ طریقہ کتنا کامیاب ہے؟" مزے سے کہتے ہوئے وہ اس کی اسٹڈی ٹیبل پر ٹک گئی تھی۔ آزر اسے دیکھ کر رہ گیا۔
"تم انتہائی بدتمیز.... اور بے وقوف لڑکی ہو۔"
"اور تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟" وہ کہاں اس کے رعب میں آنے والی تھی۔ آزر بستر چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔
"اپنے گھر میں سکون نہیں ہے تمہیں.... جو ہر لمحہ ادھر دوڑی رہتی ہو۔"
"تمہیں کیا تکلیف ہے۔ میری خالہ کا گھر ہے جب دل چاہے آؤں جاؤں تمہیں کیا؟"
"بہت بولنا آگیا ہے اچھی تمیز سیکھی ہے یہاں آکر۔" اسے برا لگا تھا۔ موی اسے منہ چڑا کر رہ گئی۔
اگلے تین چار روز وہ عینی کے ساتھ کام میں بے حد مصروف رہا تھا۔ موی کا بس نہ چلتا تھا کہ عینی کو شوٹ کر ڈالتی، جو لندن کے بعد پاکستان میں بھی اس کے گلے کا ہار بن کر رہ گئی تھی۔ اس وقت بھی وہ اس کے ساتھ گھر کے لان میں بیٹھا کسی ضروری امور پر ڈسکس کر رہا تھا، جب وہ مریم کے ساتھ اسلامک اکیڈمی سے واپسی پر اس طرف چلی آئی۔
"مریم.... تم مانو نہ مانو، تمہارا یہ بھائی ضرور اسی عینی چڑیل سے شادی کرے گا۔" وہ جلی تھی۔ مریم مسکرا دی۔
"ایسی کوئی بات نہیں ہے یار، وہ صرف بھائی کی اچھی دوست ہے اور بس۔"
"ہاں.... تم تو یہی کہو گی.... آخر ہو نا بھائی کی چمچی۔"
"ہاہاہا، پاگل ہو تم اور کچھ نہیں۔" مریم ہنسی تھی۔ وہ تیز تیز چلتی لان کراس کر گئی آزر کی پرشوق نگاہوں نے دور تک اس کا پیچھا کیا۔
تقریباً پندرہ منٹ کے بعد وہ لان سے اٹھ کر اندر آیا تو وہ آسیہ بیگم کے پاس بیٹھی مزے سے نان کھا رہی تھی۔ وہ پرشوق نگاہوں سے اسے دیکھتا وہیں بیٹھ گیا۔
"تم پھر آگئیں.... آخر تمہیں ہے نا سکون اپنے گھر میں۔" وہ اسے تنگ کرنے سے باز آنے والا نہیں تھا۔ موی کلس کر رہ گئی۔
"اپنے شوق سے نہیں آئی.... تمہاری بہن زبردستی کھینچ کر لائی ہے۔"
"اچھا.... یقیناً سارے گھر کی صفائی کرنی ہوگی یا پھر کپڑے وغیرہ دھونے ہوں گے۔ کل سے کام والی بھی تو نہیں آرہی نا چاچی پہلے میرا کمرہ صاف کرو بہت خراب ہو رہا ہے۔"
"منہ دھو رکھو.... اور خود کرو یہ سارے کام، فضول لوگوں سے گپ شپ میں جو قیمتی وقت برباد کرتے ہو اسے بھی مفید بھی بنا لیا کرو۔" غصے میں ناک چڑھا کر بولتی وہ اسے بے حد اچھی لگی تھی۔ آسیہ بیگم مسکرا کر اٹھتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گئیں۔
"مریم.... میں ذرا مارکیٹ تک جا رہا ہوں عینی کے ساتھ.... واپسی پر امی کا شربت بنا کر رکھنا۔" فوراً سنجیدہ ہو کر وہ مریم سے مخاطب ہوا تھا۔ موی کی جلن مزید بڑھ گئی۔
"اللہ کرے تم اسے چھوڑنے جاؤ اور تمہارا ایکسیڈنٹ ہو جائے.... جس میں وہ اسٹوپڈ لڑکی مر جائے۔"
"موی.... پاگل ہو گئی ہو؟"
اس کے دبے دبے غصے کی بددعا پر مریم نے دہل کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ جب وہ ضبط کرتے ہوئے

بولی۔
"ابھی تو نہیں ہوئی، مگر تم دیکھ لینا.... تمہارا یہ بھائی ایک دن ضرور مجھے پاگل کر کے چھوڑے گا۔" آزر کمرے سے نکل چکا تھا۔ مریم محض افسوس سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

"مریم.... کیا آزر واقعی عینی سے محبت کرتا ہے؟" اس روز اکیڈمی جاتے ہوئے موی نے مریم سے پوچھا تھا۔ جب وہ بولی۔
"نہیں.... میرا نہیں خیال کہ ایسا کچھ ہے۔"
"کیوں.... تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہو؟" وہ بے چین تھی، مریم اسے دیکھ کر رہ گئی۔
"عینی بھائی سے بات کر رہی تھی کہہ رہی تھی وہ تم سے بہت پیار کرتی ہے آزر، خیال کیا کرو اس کا.... اس سے مجھے پتا لگا کہ بھائی کی زندگی میں وہ نہیں ہے۔"
"گڈ.... میں ایویں خار کھاتی ہوں چاچی سے ایسے پھر وہ کون ہے جس کی وہ سفارش کر رہی تھی یہ تو مجھے پتا ہے کہ وہ میری سفارش کسی صورت نہیں کر سکتی، کیونکہ میرا اس سے اب تک بہت غلط ہی ہو رہا ہے۔"
"یہ تو اب وہی جانے.... مگر یہ ہے کہ بھائی کسی نہ کسی سے محبت کرتے ضرور ہیں۔"
"کیسے.... میرا مطلب ہے تمہیں کیسے پتا؟"
"ابھی پرسوں پتا چلا ہے، جب میں انہیں شام کے بعد چائے دینے گئی، بھائی کے ہاتھ میں کسی لڑکی کی تصویر تھی اور وہ اکیلے میں اس سے باتیں کر رہے تھے، میں گئی تو جلدی سے تصویر ڈائری میں چھپا کر رکھ دی.... جہاں تک میرا خیال ہے وہ کوئی لندن کی لڑکی ہی ہے، کیونکہ بھائی کے سیل پر آنے والی زیادہ تر کالز لندن کی ہی ہوتی ہیں۔"
"ہائے نہیں مریم.... میرے ہوتے اگر کسی نے میرے حق پر ڈاکہ ڈالا تو میں اس کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دوں گی۔" وہ جذباتی ہوئی تھی، مریم نے نظر پھیر لی۔
"بس رہنے دو.... دلوں کی سلطنت غنڈا گردی سے نہیں جیتی جاتی اس معاملے میں صرف عاجزی چلتی ہے۔"
"تمہارے بھائی کا دل عاجزی سے قابو میں آنے والا نہیں ہے اچھا۔" وہ چڑی تھی۔ مریم خفا ہو گئی۔
"ایک تو تم فتوے بڑی جلدی جاری کر دیتی ہو، ذرا جو کسی کی بات سمجھ میں آجائے تمہارے۔"
"مجھے نہیں سمجھنی ایسی کوئی بات جس سے اسے مزید اکڑنے کا موقع ملے ایک تو پہلے ہی اس کی گردن میں خم نہیں ہے اوپر سے تم مجھ سے منتیں کروا رہی ہو، نا بابا مجھے تمہاری یہ نادر رائے منظور نہیں۔" وہ ہٹلر سوچ کی مالک تھی۔ مریم منہ پھیر کر اپنی جماعت کی طرف بڑھ گئی۔
آزر کا آئی ڈی کارڈ اور اے ٹی ایم کارڈ اکٹھے گم ہو گیا تھا، سارا گھر چھان مارا مگر کہیں سے وصول یابی نہ ہو سکی.... تبھی اس نے مریم سے پوچھ تاچھ کی تھی مگر وہ صاف مکر گئی، یہ کہہ کر کہ بھائی میں تو آپ کے کمرے میں جاتی ہی نہیں ہوں۔
"پھر.... جن اٹھا کر لے گئے یا انہیں پاؤں لگ گئے۔"
اس کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔ مریم کو یاد آگیا کہ صبح اس کے آفس جانے کے بعد موی وہاں آئی تھی۔ تبھی وہ بول اٹھی تھی۔
"بھائی.... صبح موی یہاں آئی تھی شاید اس نے ادھر ادھر رکھ دیے ہوں۔" موی کی شرارتیں بہت بڑھ گئی تھیں۔ آزر آج اسے رعایت دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔
"او کے.... فوری بلا کر لاؤ اسے۔" موی بلیک میکسی میں سک سک سی تیار کہیں جانے کو پر تول رہی تھی جب آزر کے بلاوے پر بنا کسی ہچکچاہٹ کے اس کے حضور پیش ہو گئی۔
"کہاں جا رہی ہو؟" اسے بنے سنورے دیکھ کر وہ

اپنا مسئلہ فوری بھول ہی گیا۔ مریم کا دل من ہی من میں بے تحاشا ہنسنے کو چاہ رہا تھا مگر وہ ضبط کیے رہی۔

"ایک فرینڈ کی برتھ ڈے پارٹی ہے' وہیں جا رہی ہوں' کیا یہی پوچھنے کے لیے بلایا ہے؟؟"

"جی نہیں..... میرا آئی ڈی کارڈ اور اے ٹی ایم کارڈ کہاں ہے؟؟"

"مجھے کیا پتا..... مجھے تو نہیں پکڑائے تھے۔"

"موی میں اس وقت ٹینشن میں ہوں' مجھے تنگ مت کرو۔" وہ شدید غصے میں تھا۔ موی ٹھٹک کر رہ گئی۔

"جو سچ ہے میں وہی کہہ رہی ہوں۔"

"اوکے..... پھر آؤ میرے ساتھ۔" لپک کر آگے بڑھتے ہوئے اس نے موی کا بازو تھاما اور اسے زبردستی اپنے ساتھ گھسیٹتا اوپر کی بالائی منزل پر لے آیا۔ موی اس وقت اس کا موڈ سمجھنے سے قطعی قاصر تھی۔ وہ ٹیرس کے قریب آیا اور اس سے پہلے کہ موی اس کا ارادہ جانتی' اس نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر ٹیرس سے نیچے لٹکا دیا۔ وہ چیخی تھی اور اس کا دل لمحے میں خشک پتے کی مانند کانپ کر رہ گیا تھا۔

"اب بولو مجھے تنگ کرنے سے باز آؤ گی یا نہیں۔"

"آزر..... "وہ خوف سے چیخ رہی تھی' مگر وہ بے نیاز تھا۔

"میرے کارڈ واپس کرتی ہو یا پھینک دوں نیچے.....؟"

"آزر....." موی کا لہجہ خوف اور دکھ سے پھٹ رہا تھا۔ وہ جیسے آزر کی کوئی بات نہیں سن پا رہی تھی' مریم بھاگتے ہوئے اوپر آئی تھی اور پھر سامنے کا منظر دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو گئی' موم کے سانچے میں ڈھلی اس کی وہ پیاری سی کزن' آزر عباس کے دو مضبوط بازوؤں کے سہارے فضا میں لٹکی ہوئی تھی۔

"بھائی..... یہ کیا کر رہے ہیں؟" وہ پریشان سی اس کے قریب آئی تھی جب وہ بولا۔

"تم چپ رہو مریم..... اسے اس کی شیطانیوں کی سزا ملنی چاہیے۔" موی کا رنگ اب سفید پڑ رہا تھا' آزر کو نا چاہتے ہوئے بھی اسے واپس کھینچنا پڑا۔

"بولو..... باز آؤ گی اپنی حرکتوں سے کہ نہیں؟؟"

وہ ذرا سا نرم پڑا تھا۔ موی سے اپنی سانسیں درست کرنا دشوار ہو گیا۔

"موی..... تم ٹھیک ہو؟" مریم پریشانی سے آگے بڑھی تھی مگر موی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ اب رو رہی تھی۔ آزر عباس کی ٹینشن مزید بڑھ گئی۔

"تو تم اپنی فضول حرکتوں سے باز نہیں آؤ گی؟"

"شٹ اپ..... مجھے نہیں پتا تھا کہ میں تمہارے لیے اتنی سستی ہوں..... خبردار جو کبھی دوبارہ مجھے چھونے کی کوشش کی تو۔"

اس کی بھیگی آنکھوں میں جیسے آگ دہک رہی تھی۔ آزر کچھ دیر اسے سنجیدگی سے دیکھتا واپس پلٹ گیا تھا۔ جبکہ مریم اب اس کی دہکتی ہوئی آگ کو سرد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

ٹی وی لاؤنج میں ٹیلی ویژن فل آواز کے ساتھ چل رہا تھا۔ جبکہ وہ اس کے سامنے بیٹھی جیسے وہاں ہوتے ہوئے بھی وہاں نہیں تھی۔

وہ چھوٹی سی تھی جب اس کی ماں زبردستی اس کے پاپا سے ڈائیورس لے کر علیحدہ ہو گئی' قرۃ العین کے لیے وہ وقت زندگی کا سب سے کٹھن وقت تھا مگر پھر اس سے بھی برا وقت تب آیا جب اس کے پاپا نے بھی دوسری شادی کر لی' وہ جیسے اپنے ہی گھر میں ایک فالتو شے کی حیثیت اختیار کر گئی تھی' ایسے میں آزر کی فیملی اور دوستی نے اسے بہت سہارا دیا تھا' وہ جو مایوسیوں اور غموں کے حصار میں قید ہو چلی تھی' آزر کے ساتھ نے اسے دوبارہ زندگی کی طرف واپس کھینچ لیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ جیسے اس کی فیملی کا حصہ بنتی چلی گئی تھی اسے اس تنہائی اور وحشت کا احساس ہی نہ رہا' جو کچھ روز پہلے اسے دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔ وہ پھر سے جینے لگی تھی۔

اس روز بھی آزر اپنے سارے کام التوا میں ڈال کر' اس کی سالگرہ دھوم دھام سے منانے کے لیے گھر کا کونا کونا سجا رہا تھا۔ موی ہر بات سے بے خبر اس روز اکیلی ہی اکیڈمی گئی تھی۔ جبکہ مریم نے گھر میں کام کا بہانہ بنا کر چھٹی کر لی۔ وہ اکیڈمی سے واپس آئی تو آزر' مریم کے ساتھ مل کر ہال کمرے کی سجاوٹ کر رہا تھا۔ وہ ذرا سی حیران ہوئی تھی۔ کہاں تو اس کی اتنی مصروفیت کہ سر کھجانے کو ٹائم نہیں' اور کہاں اب مکمل فرصت سے بچوں کی طرح دیواروں پر رنگا رنگ ربن لگا کر وہاں غبارے باندھ رہا تھا۔ اسے یاد آیا' وہ لندن میں صرف اس کی سالگرہ کے روز ایسا اہتمام کیا کرتا تھا۔ مہمانوں کو مدعو کرنے کے ساتھ ساتھ گھر کو سجانا اور سنوارنے سے لے کر مزے مزے کے پکوان تیار کرنے میں بھی وہ ہمیشہ سب سے آگے رہا کرتا تھا۔ موی چاہ کر بھی ان دنوں کو بھلا نہیں پا رہی تھی جب وہ صرف اور صرف اس کا تھا۔ وہ آگے بڑھی تھی اور مریم کے قریب آ کھڑی ہوئی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے..... کوئی آ رہا ہے کیا؟"

"ارے تمہیں یاد نہیں..... آج عینی کی سالگرہ ہے اور آزر بھیا اسے سرپرائز دینا چاہ رہے ہیں۔"

مریم کیک سجانے میں مصروف تھی وہ دیکھ ہی نہیں سکی کہ اس کے الفاظ نے موی کے چہرے پر کیا اثر ڈالا ہے۔ آزر اب میز سے کود کر اس کے مقابل آ کھڑا ہوا تھا۔

"تم نے عینی کے لیے کوئی گفٹ وغیرہ خرید ا ہے کہ نہیں؟"

کتنی فکر تھی اسے عینی کی خوشی اور پذیرائی کی..... موی کے اندر جیسے دھواں سا بھر گیا۔

"نہیں۔"

"کیوں..... اپنے لیے تو بڑی کانشس رہتی ہو' کبھی دوسروں کی خوشی کا خیال بھی کر لیا کرو۔"

"دوسروں کی خوشی کا خیال رکھنے کے لیے تم کافی ہو آزر عباس۔" اسی کے انداز میں تپ کر جواب دیتے ہوئے وہ پھر وہاں ٹھہری نہیں تھی جبکہ آزر عباس اس کی بھیگی پلکوں کا تصور کر کے مسکرا دیا تھا۔

"یہ ٹھیک نہیں ہے بھائی' آپ کو پتا بھی ہے کہ وہ آپ سے کتنا پیار کرتی ہے' پھر بھی آپ اسے دکھ دینے سے باز نہیں آتے کیوں؟"

"مزا آتا ہے ڈیئر سسٹر..... تمہیں کیا پتا وہ سڑ سڑ کرتی کتنی اچھی لگتی ہے۔" وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔ مریم اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"موی صحیح کہتی ہے۔ آپ واقعی بہت بے حس ہیں۔"

کیک کی سجاوٹ کا کام ادھورا چھوڑ کر وہ بھی وہاں سے واک آؤٹ کر گئی تھی تاہم آزر' موی کی متوقع ناراضی کا سوچتے ہوئے دیر تک لطف اٹھاتا رہا۔

☼ ☼ ☼

اس روز بہت بارش ہوئی تھی۔

رات بھر وقفے وقفے سے بارش کا سلسلہ جاری رہا تھا۔ ولی آویزہ ہاسپٹل سے گھر شفٹ ہو چکی تھی لہٰذا عقیل جعفری اب اس کی رخصتی کا سوچ رہے تھے' اسی مقصد کے لیے راحیل جعفری کی شہر آمد پر ایک عرصے کے بعد وہ ان کے گھر فیملی کے ساتھ آئے تھے۔

برستی بارش میں بھیگے در و دیوار حسرت سی تکتی ان کی آنکھوں میں عجیب سی خاموشی تھی۔

جوانی میں وہ عورت کیا تھی اور اب..... وقت سے پہلے بڑھاپے نے اس خوب صورت سراپے والی عورت کا کیا حشر کر دیا تھا کہ سناٹوں کی چیخیں ان کی آنکھوں سے باہر آتی تھیں۔ وہ ہال کمرے میں لیٹی بارش کو دیکھ رہی تھیں جب ان کے قدم اس کمرے کی دہلیز پر پڑے تھے اور پھر..... جیسے وجود پتھر کا ہو گیا تھا۔

بارشوں کے موسم میں
تم کو یاد کرنے کی عادتیں پرانی ہیں
اب کی بار سوچا ہے
عادتیں بدل ڈالیں
پھر خیال آیا کہ

عادتیں بدلنے سے بارشیں نہیں رکتیں!

"عقیل..." فضیلہ بی کی نگاہ ان پر پڑی تھی اور لب جیسے پھڑپھڑا کر رہ گئے تھے۔

اس نے چھو کر مجھے پتھر سے پھر انسان کیا
مدتوں بعد میری آنکھ میں آنسو آئے

وہ ست روی سے قدم اٹھاتے ان کی طرف آئے تھے۔

"کیسی ہو فضیلہ...؟"

"پتا نہیں... بس ایک بے نام اداسی سی ہے جو کسی لمحہ چین نہیں چھوڑتی... ایک خلش ہے عقیل! جو کسی پل سکون سے جینے نہیں دیتی تم، تم اعلا ظرف ہو معاف کر دو مجھے پلیز۔" ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔ عقیل جعفری نے بے ساختہ رخ پھیر لیا۔

"کس بات کی معافی پگلی... اپنے قانون ہوتے ہیں محبت کے اور سزا میں بھی... میں تو اب وہ سزا پوری بھی کر چکا۔" ان کی آواز بھاری ہوئی تھی۔ فضیلہ بی کی آنکھوں سے کئی قطرے ایک ساتھ پھسل کر چہرے کو بھگو گئے۔

"گھر والے کہاں ہیں؟" "فوراً" سے پیشتر سنبھالا تھا انہوں نے خود کو جب وہ بولیں۔

"کہیں باہر گئے ہیں' سوید اور عبیرہ بیٹی اوپر ہیں۔"

"ٹھیک ہے' پھر میں چلتا ہوں' راحیل بھائی آئیں تو میرا بتا دینا اور کہنا کہ سوید اور دل آویز کی باقاعدہ شادی کی تیاری کرلے۔"

"عقیل..."

"ہوں۔" فضیلہ بی کے پکارنے پر وہ جیسے چونکتے ہوئے ان کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

"عقیل... سوید میری بیٹی کی محبت ہے میری عبیرہ بہت چاہتی ہے اسے..." وہ بے قراری بولی تھیں اور عقیل جعفری جیسے پھر سے شاکڈ رہ گئے تھے۔

"یا کہہ رہی ہو فضیلہ؟"

"وہی جو سچ ہے۔" "انہیں جیسے بہت جلدی تھی" عقیل جعفری کتنی ہی دیر تک حیران حیران سی پشیمان نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتے رہ گئے تھے۔ یا ہر بارش پھر زور پکڑ گئی تھی! اگلی صبح عبیرہ اپنی ماں کو "صبح بخیر" کہنے کے لیے ان کے کمرے میں آئی تو گرم بستر میں فضیلہ بی کا صرف جسم پڑا تھا روح نہیں تھی۔

وہ روئی تھی' بلک بلک کر روئی تھی مگر... اس کے آنسو بھلا اس کی ماں کو کہاں واپس لا سکتے تھے۔ رات کے کسی پہر فالج کے دوسرے شدید اٹیک نے ان کے جسم کے بائیں طرف والے حصے کو مفلوج کر دیا تھا۔

راحیلہ یوں سن ہو کر رہ گئی تھیں جیسے ان کا دنیا میں کچھ باقی بچا ہی نہ ہو' جبکہ سوید... اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی زندگی کی ان دو عزیز ہستیوں کا غم کیسے بانٹے؟

چار ماہ اسی غم نے چاٹ لیے... سوید کے ساتھ دل آویز کی رخصتی پھر التوا میں پڑ گئی' وہ قطعی کسی نئی ذمہ داری کو قبول کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا جبکہ عبیرہ سے اس کا تعلق بھی' عبیرہ کی پریگننسی کے باعث منظر عام پر آ چکا تھا۔ حالات مختلف ہوتے تو شاید راحیل جعفری صاحب شور مچاتے مگر... عجیب سی سوگواری کے اس ماحول میں' عبیرہ پر انگلی اٹھنے سے قبل ہی اس نے انہیں سب کچھ صاف صاف بتا کر' کچھ کہنے کے لائق نہیں چھوڑا تھا۔

ادھر عقیل جعفری نے فضیلہ بی کی موت کی خبر بڑے حوصلے سے سنی تھی' مگر یہ حوصلہ اندر ہی اندر انہیں کھانے لگا تھا' اسی لیے' فضیلہ بی کی وفات کے ٹھیک چار ماہ بعد... سوید کے لاکھ پاؤں پٹخنے کے باوجود دل آویز کی رخصتی طے کر دی گئی۔

رات بھر جاگنے اور ٹینشن کا شکار رہنے کے سبب اس کے سر میں شدید درد تھا اور پورا جسم جیسے ہلکے ہلکے بخار کی لپیٹ میں آیا ہوا تھا۔ پورا دن عبیرہ کے ناز اٹھانے کے بعد شام ڈھلے' وہ ضد کر کے بے حد سادگی کے ساتھ' راحیل جعفری کی ہمراہی میں عقیل منزل کی طرف آیا تھا' جس کے شاندار درودیوار سے چھلکتی عجیب سی وحشت نے اس کا بڑھ کر بیباک استقبال کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

قرۃ العین عرف مینی کی سالگرہ اس کی شرکت کے بغیر بھی بہت شاندار رہی تھی۔

تقریب ابھی شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ مریم اسے شرکت کے لیے بلانے چلی آئی۔ مگر وہ جو اندر سے لہولہان ہو رہی تھی اسے مریم کا یہ بلاوا جلتی پر تیل کا کام لگا تبھی اسے بے رخی سے انکار کر کے کمرہ بند کر کے بیٹھ گئی۔ جانے کیوں اس وقت اس کا دل شدت سے رونے کو چاہ رہا تھا۔ اگر مینی وہ لڑکی نہیں تھی جسے آزر چاہتا تھا تو پھر وہ اس پر اتنا مہربان کیوں ہو رہا تھا۔ کیوں اتنی اہمیت دے رہا تھا اسے... سوچ سوچ کر اس کا سر درد سے پھٹنے لگا تھا۔

اسے ہر لمحہ انتظار رہا کہ وہ اسے بلانے آئے گا مگر... اس کا انتظار انتظار ہی رہا اور تقریب ختم بھی ہو گئی۔ اسے پتا ہی نہ چل سکا کہ وہ کتنی دیر سر گھٹنوں میں دیے روتی رہی تھی۔ مسز عقیل تقریب کے اختتام کے بعد اٹھ کر آنے لگیں تو آزر بھی ان کے ساتھ ہی چلا آیا۔

"آنٹی... موی نے کھانا نہیں کھایا' پلیز اسے کھانا کھلا دیجیے گا۔"

"لیکن... وہ تو اب تک سو چکی ہوگی۔"

"آج وہ اتنی جلدی نہیں سو سکتی۔ خیر میں دیکھتا ہوں۔"

کچھ سوچ کر کہتے ہوئے وہ سرعت سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔ موی کا کمرہ اس کی توقع کے برخلاف لاکڈ نہیں تھا' وہ جانتا تھا کہ اسے موی کو کیسے کھانا کھلانا ہے۔ مگر... اس وقت اس کی جان پر بن گئی جب اس نے کمرے کے وسط میں موی کو اپنا پیٹ پکڑے درد سے تڑپتے ہوئے دیکھا۔ بجلی کی سرعت سے وہ اس کی طرف لپکا تھا۔

"موی۔"

"آزر... آزر مجھے بچاؤ' میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔" اس کا چہرہ اس وقت عجیب ہو رہا تھا۔ آزر کو لگا جیسے اس کی ٹانگوں سے جان نکل گئی ہو۔

"او مائی گاڈ... کیا کیا ہے تم نے اپنے ساتھ کیا کھایا ہے؟" موقع کی نزاکت کا احساس کیے بغیر وہ دھاڑا تھا۔ مگر موی بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ اسے کوئی جواب نہ دے سکی۔ تب وہ اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں اٹھا کر نیچے کی طرف بھاگا تھا' مسز عقیل ابھی کچن میں موی کے لیے کھانا نکال رہی تھیں' ان کی نظر آزر پر پڑی تو ہاتھ سے کھانے کی ٹرے چھوٹ کر گر پڑی۔

"آزر... کیا ہوا میری بچی کو۔"

"پتا نہیں آنٹی... شاید اس نے کچھ کھا لیا ہے۔ پلیز جلدی میرے ساتھ آئیں۔" گاڑی باہر کھڑی تھی وہ سرعت سے موی کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹا کر بیٹھے میں اودھم مچاتے دل کے ساتھ' مسز عقیل کے گاڑی میں بیٹھتے ہی' بنا کسی کو اطلاع دیے گاڑی بھگا لے گیا' مسز عقیل کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے بار بار موی کا منہ چومتے ہوئے وہ رو رہی تھیں' جبکہ آزر کا دل اسے کچھ ہو جانے کے تصور سے ہی پھٹ رہا تھا' اس کا بس نہ چلتا تھا کہ گاڑی کسی درخت سے ٹکرا کر اپنا وجود ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا۔

زندگی میں پہلی بار اس نے ٹریفک سگنل کے قوانین کو توڑا تھا۔ گاڑی کو سڑک پر دوڑانے کی بجائے ہوا میں اڑاتے ہوئے وہ ہاسپٹل پہنچا تھا اور وہاں ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹرز کو غیر حاضر پا کر دیگر عملے پر برس پڑا تھا۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ سب کو گریبان سے پکڑ کر زبردستی ایمرجنسی روم میں دھکیل دیتا۔ یہ کیسا امتحان

تھا محبت کا کہ جسے جلا کر 'ستا کر وہ لطف سمیٹتا تھا 'اب وہی زندگی اور موت کی کشمکش میں تھی تو جیسے وہ دیوانہ ہو کر رہ گیا تھا۔ صحیح معنوں میں اسے ابھی احساس ہوا تھا کہ وہ اس کے لیے کتنی قیمتی تھی؟

جانے یہ ایک ماں کی دعاؤں کا اثر تھا کہ محبوب کی بروقت کوششوں کا جو وہ موت کو شکست دے کر زندگی کی طرف واپس پلٹ آئی تھی' ڈاکٹرز کے مطابق اس نے جو بے مار ادویات پھانکی تھیں 'جس سے اس کا معدہ چھلنی ہونے کا خدشہ تھا۔ اس کا زندہ بچ جانا ایک طرح سے معجزہ ہی خیال کیا جا رہا تھا۔ جب تک وہ ایمرجنسی وارڈ میں رہی 'آزر کو اپنی جان سولی پر لٹکی محسوس ہوتی رہی 'اس دوران اس نے نہ تو کسی کا فون سنا' نہ ایک پل کے لیے بھی ہاسپٹل سے باہر گیا۔ جس وقت ڈاکٹرز نے اسے موی کی زندگی خطرے سے باہر ہونے کی نوید سنائی' وہ پلکیں موندے 'سر دیوار سے لگائے بن بیٹھا تھا۔ اس کی زندگی کی نوید سننے کے بعد اسے زندگی اپنے اندر دوڑتی محسوس ہوئی تھی۔

ڈاکٹرز کے مطابق موی بے ہوشی میں مسلسل اپنی ماں اور باپ کے ساتھ آزر کو پکارتی رہی تھی۔ اس کے کمرے میں شفٹ ہونے کے بعد آزر نے گھر فون کر کے اپنی ماما اور دیگر افراد کو اطلاع دی تھی۔ آسیہ بیگم کے ساتھ جس وقت مریم اور عینی نے کمرے میں قدم رکھا۔ وہ بے ہوش پڑی موی کا ہاتھ تھامے 'بیڈ پر اس کے سرہانے بیٹھا تھا۔ عینی کے اندر بے چینی سی پھیل گئی۔

مریم اور آسیہ بیگم 'موی کو چومتے ہوئے رو رہی تھیں 'جبکہ اس نے آزر کے قریب جا کر اپنا ہاتھ اس کے مضبوط کندھے پر رکھا تھا۔

"اب کیسی طبیعت ہے موی کی؟"

"خطرے سے باہر ہے۔" آزر کے لہجے سے لگ رہا تھا جیسے اسے بولنا دشوار لگ رہا ہو۔ وہ وہیں کھڑی رہی۔

"ٹینشن مت لو آزر۔۔۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ انکل کو فون کیا ہے؟"

"نہیں۔۔۔ اس وقت انہیں پریشان کرنا مناسب نہیں۔" عقیل صاحب ملک سے باہر تھے اس لیے آزر نے انہیں اطلاع نہیں دی' ویسے بھی موی اب ہوش میں آ رہی تھی' آزر خاموشی سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ عینی بھی اس کے پیچھے ہی باہر آ گئی تھی۔

"کچھ پتا چلا کہ موی نے ایسا کیوں کیا؟"

"پتا کس سے چلنا ہے 'میں جانتا ہوں کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔" آزر کی آنکھیں اس لمحے جیسے جل رہی تھیں۔ عینی اس کے پہلو میں ٹک گئی۔

"میں کئی دنوں سے یہ بات محسوس کر رہی تھی آزر ۔۔۔ کہ وہ ٹینس ہے 'شاید وہ تم سے بہت جنوں خیز قسم کی محبت کرتی ہے۔"

"وہ بہت پاگل ہے عینی 'میں بچپن سے جانتا ہوں اسے 'مگر پاگل پن میں وہ کوئی ایسا احمقانہ قدم بھی اٹھا سکتی ہے 'میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔" وہ پریشان تھا۔ عینی دیر تک اس کے پہلو میں بیٹھی اسے تسلیاں دیتی رہی تھی!

٭ ٭ ٭

"سوید بھائی!" ہلکی پھلکی کڑھائی کے سادہ سے پنک سوٹ میں تیار 'بڑی سی سیاہ چادر میں لپٹی دل آویز جعفری رخصتی کے لیے تیار تھی جب وہ کسی کی پکار پر ٹھٹک کر رک گیا۔

"جی۔۔۔" فوراً" پلٹ کر پیچھے دیکھتے ہوئے اس کی نگاہ بہت دل کش چہرے والی ایک خوب صورت سی لڑکی سے ٹکرائی تھی۔

"مم۔۔۔ میرا نام مریم ہے 'مریم عباس۔۔۔ دل آویز کی بہن اور بہت اچھی دوست ہوں۔۔۔ آپ سے کچھ کہنا تھا۔"

"جی فرمایئے۔" بے گانگی لیے اس کے لہجے میں عجیب سا روکھا پن تھا۔ مریم عباس سے اپنا مدعا بیان کرنا مشکل ہو گیا۔

"وہ۔۔۔ میں آپ کو بتانا چاہتی تھی کہ۔۔۔ دل آویز

پاگل نہیں ہے۔۔۔ وہ صرف ایک صدمے کے حصار میں ہے ڈاکٹرز کے مطابق 'ماحول کا بدلاؤ اور ڈھیر ساری محبتیں اسے اس صدمے کے حصار سے نکال سکتی ہیں۔"

"تو۔" سوید کو ذرا برابر اس قصے سے دلچسپی نہیں تھی۔

"تو۔۔۔ تو آپ اس کا بہت خیال رکھیے گا 'اسے بہت سارا پیار دیجیے گا 'انکل نے اگر 'اس کے لیے آپ کا انتخاب کیا ہے تو یقیناً" بہت سوچ سمجھ کر کیا ہو گا' وہ گوہر نایاب ہے 'صدف ہے 'اسے کبھی دکھ مت دیجیے گا پلیز۔" سامنے کھڑی خوب صورت لڑکی کی بھیگی پلکیں دیکھ کر وہ کہتے کہتے رہ گیا تھا۔

"ایسا ہی گوہر تھا تو گھر میں رکھتے 'میری زندگی کیوں عذاب کر رہے ہو۔" مگر نہ کہہ سکا۔

"ٹھیک ہے اور کچھ؟"

"نہیں۔" آنسو پینے کی ناکام کوشش کرتی وہ لڑکی نفی میں سر ہلا کر فوراً" واپس پلٹی تھی اور تقریباً" بھاگتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کسی کمرے میں گم ہو گئی تھی۔ سوید سر جھٹک کر 'بنا کسی سے ملے کمرے سے نکل آیا۔

تھکن سے بے حال جس وقت وہ گھر واپس لوٹا' عبیرہ اس کے انتظار میں جلے پیر کی بلی کی مانند ادھر سے ادھر چکر لگا رہی تھی دل آویز کو گاڑی سے راحیل جعفری صاحب باہر نکال کر گھر کے اندر لائے تھے' وہ یوں سرد اور گم سم تھی جیسے برف سے نکال کر لائی گئی ہو۔

راحیلہ بی ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈال کر اپنے کمرے میں قید ہو گئی تھیں ایسے میں راحیل جعفری صاحب کو مجبوراً" سوید کو آواز دینی پڑی 'جو اندر کمرے میں عبیرہ کے پاس بیٹھا 'اسے ڈھیروں وعدے اور تسلیاں تھما رہا تھا۔

"جی بابا۔" راحیل جعفری کی کڑک پکار پر وہ فوراً" نیچے آیا تھا۔

"دل آویز کو کمرے تک تو لے جاؤ" یا یہ فرض بھی مجھے سرانجام دینا پڑے گا۔"

کوئی اور موقع ہوتا تو شاید وہ جواب میں کچھ کہتا 'مگر اس وقت تھکن سے بے حال وہ کچھ بھی کہنے سننے کی پوزیشن میں نہیں تھا لہٰذا خاموشی سے دل آویز کا ہاتھ تھام کر اسے اوپر اس کے لیے مخصوص کیے گئے کمرے میں لے آیا۔

"بیٹھ جاؤ آرام سے اگر بھوک لگے تو بتا دینا 'کھانا لا دوں گا۔" اسے بیڈ پر بٹھا کر وہ پلٹ رہا تھا جب دل آویز جعفری سکڑ کر خود کو سمیٹتی 'دونوں پاؤں بیڈ کے اوپر رکھ کر بیٹھ گئی وہ یوں خوف زدہ تھی جیسے جنگل سے پکڑ کر شیر کے چوراہے پر لا کر کھڑی کر دی گئی ہو۔ سوید سر جھٹک کر رہ اس کا دیدار کیے کمرے سے نکل آیا تھا!

٭ ٭ ٭

رات عبیرہ کے اطمینان سے سو جانے کے بعد 'وہ بے دلی سے اٹھ کر دل آویز جعفری کے کمرے کی طرف آیا تھا۔ دروازہ آہستہ سے دھکیل کر جس وقت وہ کمرے میں داخل ہوا ٹھٹک کر رک گیا۔ دل آویز جعفری 'کمرے میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی' عجیب دل چسپی سے آئینے کو دیکھ رہی تھی' خوبصورت نگاہوں میں عجیب سا خالی پن تھا 'کسی بھی قسم کے داغ سے پاک 'موم سے ڈھلا 'سرخ و سپید چہرہ' اپنے تیکھے نقوش کی تمام تر دل کشی کے ساتھ اسے مبہوت کر گیا تھا' چاکلیٹ کلر سنہری بال' شانوں پہ بکھرے 'اسے دیومالائی حسن کی نگری کا باسی ثابت کر رہے تھے۔ وہ اتنی نازک اور خوب صورت تھی کہ سوید کو بے ساختہ اس کا پیکر مٹی کی بجائے 'موم اور کانچ میں ڈھلا محسوس ہوا تھا۔

وہ اس کی چچا زاد کزن تھی مگر عجیب اتفاق تھا کہ بچپن میں ایک دو بار سلام دعا کے علاوہ وہ اس سے کبھی نہیں ملا تھا۔ شاید یہ ددھیالی رشتہ داروں سے نفرت تھی یا کچھ اور کہ وہ کبھی اپنے دیگر کزنز سے بھی نہیں مل سکا تھا۔

سوید کو لگا اگر وہ اس کے نزدیک جائے گا تو یقیناً"

کانچ کا وہ مجسمہ ٹوٹ کر بکھر جائے گا۔ لہٰذا گم سم سا وہ بلینز پر کھڑا وہ اسے تکتا رہا تھا۔ جو کافی دیر آئینے کے سامنے کھڑی رہنے کے بعد اب اس کی سینگھار پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیر کر نجانے کیا چیک کر رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر پڑی ' ادھ کھلی لپ اسٹک اٹھائی تھی ' اور اسے ہونٹوں کے ساتھ ساتھ پورے چہرے پر مل لیا تھا۔

تھی!

"دل آویز!" قطعی بے خودی کے عالم میں سوید نے اسے پکارا تھا اور وہ چونک کر پلٹی تھی۔

"آزر..." نگاہیں سوید کے پر تھکن چہرے پر جمائے اس کے لبوں سے بے ساختہ نکلا تھا سوید پھر بھونچکا سا رہ گیا۔

دل آویز جعفری اب اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"کون ہو تم...؟" اس کی آنکھوں میں خوف اور غصہ تھا۔ وہ بے مقصد اس کی طرف بڑھ آیا۔

"وہی... جس کے ساتھ نصیب پھوٹے ہیں تمہارے۔"

"جاؤ... چلے جاؤ یہاں سے۔" ایک لمحے میں رنگ بدلا تھا اس نے سوید کو کچھ سمجھنے کا موقع ہی نہ مل سکا اور دل آویز جعفری نے دیکھتے ہی دیکھتے بیڈ سے تکیہ اٹھا کر اسے دے مارا۔

"چلے جاؤ... میں جان لے لوں گی تمہاری جاؤ چلے جاؤ یہاں سے۔" بری طرح چلاتے ہوئے اس سے پہلے کہ وہ دوسرا تکیہ بھی اٹھا کر اسے دے مارتی۔ سوید نے پھرتی سے لپک کر اسے قابو کر لیا۔ اس کا بھاری ہاتھ اس کے منہ پر جم کر اس کی آواز کا گلا گھونٹ چکا تھا۔ وہ اس کی مضبوط گرفت میں مچھلی کی طرح پھسل تڑپ رہی تھی۔

"میں جانتا ہوں تم پاگل ہو مگر میں تم سے بڑا پاگل ہوں ' دماغ گھوم گیا تو سارا ماضی بھلا دوں گا ' سمجھیں تم۔"

مریم عباس کی آخری لمحوں میں کی گئی درخواست وہ قطعی بھلا چکا تھا۔

دل آویز جعفری کی حالت اس لمحے غیر ہونا شروع ہو گئی تھی... اس کا جسم اب سرد پڑ رہا تھا ہاتھ پاؤں مڑنے لگے تھے سوید کے ہاتھوں میں ہی اس کا خوشبوؤں سے مہکتا وجود ہوش و حواس سے بے گانہ ہو چکا تھا۔

سوید اس نئی افتاد کے لیے قطعی تیار نہیں تھا ' تبھی اسے بیڈ پر سلا کر نیچے آیا اور پھر راحیلہ بی کی منت کر کے انہیں اوپر دل آویز کے پاس لے آیا۔ اگلے پندرہ منٹ کے بعد وہ عبیرہ کے پہلو میں لیٹا سونے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

دل آویز کو محفوظ ہاتھوں میں سونپنے کے بعد ' عقیل جعفری اپنی بیگم کے ساتھ دوبارہ بیرونی ملک واپسی کی تیاری کر رہے تھے۔ فضیلہ بی کی رحلت کے بعد انہیں اس ماحول میں اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا ' انہی کی خواہش پر ' راحیل جعفری صاحب نے دل آویز کو ان سے ملوانے کے لیے سوید کے ساتھ "عقیل منزل" بھیجا تھا۔

عبیرہ کا حال دیکھنے والا تھا ' وہ اس کے ساتھ جانا چاہتی تھی مگر سوید نے منع کر دیا ' کیونکہ وہ اس کے معاملے میں ذرا سی لاپروائی کا متحمل ہونا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ گاڑی میں بیٹھا تھا جب راحیل جعفری صاحب ' دائیں بازو کے حلقے میں دل آویز کو لیے گاڑی کے قریب چلے آئے پھر خود اپنے ہاتھوں سے گاڑی کا دروازہ کھول کر اسے سوید کے برابر فرنٹ سیٹ پر بٹھایا تھا اور یہ سب اوپر سوید کے کمرے کے ٹیرس پر کھڑی عبیرہ باخوبی دیکھ رہی تھی۔

دل آویز کے ہوش ربا حسن کے باوجود سوید آزر کی اس لاتعلقی نے اسے قدرے اطمینان بخشا تھا۔ راحیل جعفری سوید کو دل آویز کا خاص خیال رکھنے کی

تلقین کرتے واپس پلٹے تھے کہ ابھی تھوڑی دیر میں انہیں بھی گاؤں کے لیے روانہ ہونا تھا۔

سوید ' دل آویز کی ہمراہی میں ابھی چند فرلانگ کا فاصلہ ہی طے کر پایا تھا کہ وہ جو پتھر کی مورت بنی گم سم سی کھڑکی کے اس پار باہر کے نظاروں میں کھوئی تھی ' اچانک بول اٹھی۔

"رکو... رک جاؤ پلیز... رک جاؤ۔"

سوید کا پاؤں اس کی صدا پر "فوراً" سے پیشتر بریک پر جا پڑا تھا۔ گاڑی رکتے ہی اس نے تھوڑی سی تگ و دو کے بعد اپنی سائیڈ کا دروازہ کھولا اور سرپٹ سڑک پر بھاگ کھڑی ہوئی۔

"آزر... آزر رک جاؤ میری بات سنو آزر پلیز۔" بھاگنے کے ساتھ ساتھ وہ اب چلا بھی رہی تھی۔ سوید ہکا بکا سا اسے دیکھتا رہ گیا۔ سڑک پر لوگ اب رک رک کر اس کی عزت کا تماشا دیکھ رہے تھے تاہم اس سے پہلے کہ وہ لپک کر اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے اسے قابو کرتا وہ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ' دیوانہ وار ' کسی گاڑی کے پیچھے بھاگتے ہوئے ایک موٹر سائیکل کی زد میں آ گئی۔

حادثہ اس قدر اچانک تھا کہ سوید کو کچھ کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ وہ تو موٹر سائیکل والے کی اسپیڈ آہستہ تھی جس کی وجہ سے بچت ہو گئی ورنہ پتنگے کی طرح جس طرح سے وہ ٹکرائی تھی اسے خاصی شدید قسم کی چوٹیں بھی لگ سکتی تھیں ' جو جان لیوا ثابت ہوتیں۔

سوید "فوراً" سے پیشتر گاڑی سے نکل کر اس کی طرف بڑھا تھا ' جو سڑک پر اوندھے منہ پڑی تھی ' یقیناً اس کے چہرے اور پیشانی پر زخم آئے تھے۔ وہ سرسری سا اس کا جائزہ لینے کے بعد ' اس کا نازک سا وجود بانہوں میں سمیٹ کر اسے سسرال لے جانے کی بجائے سیدھا ہاسپٹل لے آیا تھا ' تھوڑی دیر میں عقیل جعفری اور ان کی مسز کے ساتھ مریم عباس بھی اس کی اطلاع پر وہاں موجود تھی۔

ڈاکٹرز کے اچھی طرح اطمینان دلانے کے بعد مسٹر اور مسز عقیل کو ' دل آویز کے پاس چھوڑ کر وہ مریم عباس کے ساتھ اس کے کمرے سے باہر آیا تھا۔

"مس مریم... اگر آپ محسوس نہ کریں تو میں آپ سے کچھ جاننا چاہتا ہوں۔"

"کیا جاننا چاہتے ہیں؟" اس کے چہرے پر اب بھی یاسیت پھیلی تھی۔ وہ اس کے ساتھ چلتے چلتے رک گیا۔

"آزر کون ہے؟" مریم اس سے جس سوال کی توقع نہیں کر رہی تھی وہی پوچھ لیا تھا اس نے۔ وہ چپ چاپ سی چند لمحوں تک خود سے الجھتی رہی پھر بولی۔

"بھائی تھا میرا... کچھ عرصہ پہلے ایک حادثے میں ڈیتھ ہو گئی ان کی۔"

"او... ویری سیڈ کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ دل آویز کا اس سے کیا رشتہ تھا؟"

"بچپن کا دوست تھا اس کا اور فیانسی بھی۔"

"بس... میرا مطلب ہے دوست اور فیانسی تھا تو لازمی طور پر دل اس سے محبت بھی کرتی ہو گی۔"

"پتا نہیں... میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے ' میں بس صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ اس کا بہت خیال رکھتے تھے بہت پیار تھا انہیں دل آویز سے۔"

"ہوں... کیا یہی وہ صدمہ ہے ' جس کا ذکر آپ اس دن کر رہی تھیں؟"

"جی ہاں۔" اب کے مریم نے اپنے آنسو چھپانے کے لیے ذرا سا رخ پھیر لیا تھا۔

"دل آویز کسی طور اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ آزر بھائی اب اس دنیا میں نہیں رہے ' اسی لیے وہ جو بھی ان سے ملتا جلتا انسان دیکھتی ہے۔ اس کے پیچھے بھاگتی ہے اسے آزر بھیا سمجھ کر اس سے باتیں کرتی ہے اگر کبھی کوئی اسے ہرٹ کرے تب زیادہ یاد آتے ہیں وہ اسے اسی لیے میں نے آپ سے گزارش کی تھی کہ آپ اس کا بھرپور خیال رکھیے گا۔"

"آپ شاید مجھے کرائے کا انسان سمجھتی ہیں مس مریم... تم اپنی کوئی زندگی کوئی پسند و ناپسند نہیں

مریم عباس کی روداد سننے کے بعد اس نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا! وہ گم صم سے انداز میں سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

"میری کزن ہے عبیرہ بچپن سے دونوں ساتھ پلے بڑھے ہیں۔ میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں مس مریم..... اور وہ بھی بہت خیال رکھتی ہے میرا..... آپ کو شاید یہ جان کر شاک لگے کہ میں آل ریڈی اس کا شوہر ہوں..... ایسا شوہر جس کی تقسیم کے لیے وہ دلی طور پر کسی طور راضی نہیں تھی۔"

اس کا رخ مریم عباس کی طرف نہیں تھا ورنہ وہ اس کے چہرے پر بکھرنے والی۔ تندری کو ضرور دیکھ لیتا، تاہم اس کے سفید دودھیا ہاتھوں کی گرفت کوریڈور میں دھرے لکڑی کے بینچ پر مضبوط ہوئی تھی۔

"آذر بھیا کی رحلت کے بعد میرے لیے یہ دوسری بڑے دکھ کی خبر ہے۔" اس کی بھیگی آواز پر وہ اس کی طرف پلٹا تھا۔ مگر مریم عباس بنا اس کی طرف دیکھے پیچھے پلٹتے ہوئے تیز تیز چلتی کوریڈور سے نکل گئی تھی۔ وہ دیر تلک بجتے سیل سے بے نیاز اس کے تیزی سے اٹھتے ہوئے قدموں کو دیکھتا رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

دل آویز جعفری کی حالت قدرے سنبھل گئی تھی سوید نا چاہتے ہوئے بھی اس کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ ایک عرصے کے بعد بہت سا وقت اس نے عقیل جعفری کے ساتھ بتایا تھا۔ جو ماضی کے دھندلکوں میں کھوئے، بہت دیر تک اسے اس کی بچپن کی بہت سی باتوں کے ساتھ ساتھ خود سے اس کی انسیت کے قصے بھی سناتے رہے تھے۔ سوید کو پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ نفرت کے چکر میں ددھیالی رشتہ داروں سے قطع تعلق کوئی ایسا بھی احسن اقدام نہیں تھا۔

عقیل صاحب اور ان کی بیگم کے ساتھ مریم عباس بھی لندن واپس اپنے والدین کے پاس جا رہی تھی سوید کی نگاہیں بار بار اس کی گود میں سر رکھے لیٹی دل آویز جعفری کی سمت اٹھ رہی تھیں۔ جو جانے کس احساس کے تحت یک ٹک ٹکٹکی باندھے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

مسز عقیل کھانا لگوا رہی تھیں جبکہ عقیل صاحب اب اس سے کہہ رہے تھے۔

"مجھے تمہارے جذبات و احساسات کا پورا خیال ہے سوید میں کسی طور تمہاری طرف سے عبیرہ بٹی کے حقوق میں زیادتی کا خواہشمند نہیں کیونکہ وہ بھی مجھے اتنی ہی عزیز ہے جتنی کہ موی۔"

"موی.....؟" سوید کے لیے یہ نام قطعی غیر شناسا تھا تبھی وہ چونکے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ عقیل جعفری صاحب اب اسے وضاحت دے رہے تھے۔

"ہوں موی، دل آویز کا نک نیم ہے، جب یہ چھوٹی سی تھی تو بالکل موم کی گڑیا دکھائی دیتی تھی اسی لیے اس کی آنٹی نے پیار سے اس کا نام موی رکھ دیا تھا۔ گھر میں اور گھر سے باہر اپنی فرینڈز کے لیے دل آویز صرف موی ہی ہے۔" بڑے پیار سے بتاتے ہوئے ایک آسودہ سی مسکراہٹ نے ان کے لبوں کا احاطہ کر رکھا تھا۔ سوید کی نگاہ ایک مرتبہ پھر موی کے شفاف چہرے کو چھو کر پلٹ آئی۔ عین اسی لمحے اس کے سیل پر عبیرہ کی کال آئی تو وہ عقیل صاحب سے معذرت کر کے سائیڈ پر چلا آیا۔

"ہیلو....."

"ہاں سوید..... کہاں ہو، میں کب سے کھانا بنا کر تمہارا ویٹ کر رہی ہوں..... آئے کیوں نہیں ابھی تک؟" اس کے ہیلو کہتے ہی وہ شروع ہو گئی تھی۔ سوید کو مجبوراً "جھوٹ کا سہارا لینا پڑا۔

"دل آویز کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے بیو..... میں ابھی نہیں آسکوں گا۔"

"کیوں..... تم اس کے ڈاکٹر ہو یا اس کے پاپا ابھی سے کوچ کر گئے ہیں پاکستان سے؟" اسے اس کی معذرت چبھی تھی سوید دھیرے سے مسکرا دیا۔

"ڈاکٹر نہ سہی اس کا شوہر تو ہوں۔"

"جی نہیں..... تم صرف اور صرف میرے ہو اچھا..... اس کے ساتھ محض کاغذی تعلق ہے تمہارا، یاد رکھنا سوید! اگر تم نے اسے پیار کرنے یا چھونے کی کوشش کی تو میں اپنی جان دے دوں گی۔" وہ جذباتی تھی اور اس وقت بھی اس نے جذباتیت کا مظاہرہ ہی کیا تھا۔ وہ پھر مسکرا دیا۔

"بے وقوف ہو تم اور کچھ نہیں..... ایک پاگل لڑکی سے بھی خدشات لاحق ہیں تمہیں؟"

"لڑکی پاگل ہے تو کیا ہوا..... لڑکا تو پاگل نہیں ہے نا، ویسے بھی تم مردوں ——— کی رال ٹپکتے دیر نہیں لگتی۔"

"اچھا..... مگر آپ بھول رہی ہیں محترمہ کہ اس مرد کو اس شادی کے لیے مجبور کرنے والی بھی آپ ہی تھیں۔"

"ہاں تو شادی کے لیے مجبور کیا تھا نا..... رومینس بگھارنے کے لیے تو نہیں۔" وہ پھر جلی تھی۔ سوید اس بار ہنس پڑا۔

"شادی ہو گئی تو اب شریعت کی رو سے رومینس بھی ضروری ہے ورنہ اللہ کا گنہگار ہوں گا۔"

"او کے..... کر لو رومینس..... جب فارغ ہو جاؤ تو آکر میری قبر پر فاتحہ بھی پڑھ جانا۔" اس بار سلگ کر کہتے ہوئے اس نے لائن ڈس کنکٹ کر دی تھی۔ سوید ہنس پڑا ——— دل آویز اب بھی اسے دل چسپ نگاہوں سے ہنستے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

"کتنی پیاری لڑکی ہو تم..... ذرا جیلس نہیں ہو تم اپنی سوتن سے..... خیر ہو بھی کیسے سکتی ہو، میں کون سا تمہارا آذر عباس ہوں۔" پلٹ کر عقیل صاحب کی طرف بڑھتے ہوئے اس کی نگاہ پھر دل آویز کی نگاہ سے ٹکرائی تھی اور اس نے دل ہی دل میں جیسے اس سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔

عبیرہ سے بات ہونے کے بعد اس کی کوشش فوراً "گھر واپسی کی تھی مگر..... عقیل صاحب نے اسے کھانا کھائے بغیر اٹھنے ہی نہیں دیا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ اٹھنے لگا تو مریم نے دل آویز کو بھی ساتھ تیار کر دیا۔

"موی بھی آپ کے ساتھ جائے گی سوید بھائی۔"

اب اس کی طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔" وہ ٹھٹکا تھا، ایک نظر عقیل صاحب اور مسز عقیل پر بھی ڈالی تھی، مگر ان کی نگاہیں بھی مریم کے الفاظ کی ترجمانی کر رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے اثبات میں سر ہلا کر باہر کی طرف بڑھ گیا۔

مریم نے اسے شانوں سے تھامے تھامے سوید کے برابر گاڑی میں فرنٹ سیٹ پر لا بٹھایا تھا۔ وہ تمام راستے خاموش سی یوں بیٹھی رہی تھی جیسے گاڑی میں بالکل اکیلی ہو، جس وقت وہ گھر پہنچے خاصی دیر ہو چکی تھی۔ عبیرہ بے چین سی ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی بظاہر نیوز دیکھ رہی تھی مگر اصل میں اسے سوید کی واپسی کا انتظار تھا، اب جو گاڑی کے ہارن پر وہ الرٹ ہو کر بیٹھی تھی۔ سوید کے ساتھ دل آویز کو دیکھ کر اس کا دل جیسے جل کر راکھ ہو گیا۔ سوید کے مطابق اگر اس کی طبیعت بہت خراب تھی تو پھر وہ اپنے پاؤں پر چل کر اس کے ساتھ گھر کیسے آگئی تھی، ہزار وسوسے تھے جو اس کے صرف ایک جھوٹ کی آڑ میں اس کے دماغ میں گھس آئے تھے۔

اس کا شدت سے دل چاہا تھا کہ وہ سوید کو دو چار تھپڑ رسید کر کے پھر خوب روئے۔ سوید اسے لاؤنج میں بیٹھے دیکھ کر فوراً "اس کی طرف لپکا تھا۔

"بیو ایم سوری میں۔"

"جسٹ شٹ اپ سوید! جھوٹ کی بھی حد ہوتی ہے کوئی۔" اس کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔ سوید کی مشکل بڑھ گئی۔

"میری بات تو سنو یار۔"

"مجھے کچھ نہیں سننا نہیں..... جاؤ عیش کرو اپنی نئی نویلی بیگم کے ساتھ۔" غصے سے کہتے ہی وہ سیڑھیوں کی طرف لپکی تھی۔ سوید نے بھاگ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔

"اتنی جلدی بدگمان ہو گئیں عبیرہ.....؟"

"بازو چھوڑو میرا۔" وہ اس کی طرف دیکھنے کی روادار بھی نہیں تھی۔ سوید دکھ کی شدت سے اسے دیکھتا، زبردستی اس کا ہاتھ تھام کر اسے اوپر اپنے بیڈ روم

میں لے آیا تھا۔
"ہے اتنا حوصلہ تم میں کہ مجھے کسی دوسری عورت کے ساتھ عیش کرتے دیکھ سکو۔" اس کی آنکھوں میں سرخی تھی۔ عبیرہ چپ چاپ رو پڑی۔
"نہیں ہے نا' اسی لیے کہتا ہوں بیبا! میرے ضبط کا امتحان مت لیا کرو ہزار بار کہہ چکا ہوں میرا جسم' میری روح' میری ہر سوچ صرف تمہارے لیے ہے' تمہارا پیار اتنا کافی ہے میرے لیے کہ کسی اور کے لیے کچھ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں۔" اس بار نرمی سے کہتے ہوئے اس نے عبیرہ کو اپنے حصار میں لیا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر خفا خفا سی اس کے سینے سے لگی روتی رہی تھی۔ سوید تو بھول ہی گیا کہ وہ نیچے لاؤنج میں 'دل آویز عرف موی نامی ایک حادثاتی پاگل لڑکی کو اکیلا ہی چھوڑ آیا ہے' جو سکڑی سمٹی سی لاؤنج میں دھرے ٹی وی پر نگاہ پڑتے ہی سسک اٹھی تھی۔
"آزر......" بے خودی میں اس کے لب بار بار اسی نام کا ورد کر رہے تھے جبکہ باہر شب جیسے اس پر ہنستے ہوئے آہستہ آہستہ آگے سرکتی جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"اب کیسی طبیعت ہے موی؟" آسیہ بیگم' موی کے پاس بیٹھی اس سے باتیں کر رہی تھیں۔ جب عینی نے مریم کے ساتھ وہاں انٹری دیتے ہوئے پوچھا۔ موی کی نگاہیں اٹھی تھیں اور اس کے ساتھ آزر کو نہ پا کر دوبارہ پلٹ گئی تھیں۔
"ٹھیک ہوں۔" گھر کے سب افراد کے ساتھ ساتھ وہ عینی سے بھی عجیب سی جھجک اور شرمندگی محسوس کر رہی تھی' جانے اس کی بزدلی کے بارے میں وہ بھی کیا سوچتی ہو گی۔ مریم بیڈ پر اس کے پہلو میں آ بیٹھی تھی۔
"تم بہت بری ہو موی قسم سے۔" منہ اس کے کان میں گھسیڑتے ہوئے اس نے گلہ کیا تھا۔ موی کے لبوں پر ایک افسردہ سی مسکان بکھر گئی۔
"ہوں...... صحیح کہتی ہو مریم۔" وہ جانے کس سوچ کے حصار میں تھی۔ عین اسی لمحے آزر نے کمرے میں قدم رکھا تھا' پرشکن کپڑوں اور نیند کی کمی سے سرخ تھکی تھکی سی آنکھوں کے ساتھ اس کا حال موی پر خوب واضح ہو رہا تھا' مگر وہ زیادہ دیر اس پر نگاہ جما کر نہ رکھ سکی تھی۔
"آزر بیٹے' تھوڑی دیر گھر جا کر آرام کر لو پچھلے تین روز سے بے آرام ہو۔" مسز عقیل اس پر نگاہ پڑتے ہی بولی تھیں۔ مگر وہ سرسری سی نگاہ موی پر ڈالتے ہوئے اس کے بیڈ کے کنارے پر ٹک گیا۔
"میں ٹھیک ہوں آنٹی...... البتہ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ پلیز آپ لوگ گھر جائیے صرف آج کی رات ہے۔ کل اللہ نے چاہا تو موی ہمارے گھر ہو گی۔" ہلکی ہلکی بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ رف حلیے میں بھی وہ بے حد پیارا لگ رہا تھا۔ موی نے اپنی آنکھیں سختی سے میچ لیں۔
"میرا خیال ہے۔ میں موی کے پاس رک جاتی ہوں' آپ لوگ جائیں۔" عینی بروقت بولی تھی مگر آزر نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔
"نہیں...... میں نے کہا نا' میں یہاں ہوں تم گاڑی ڈرائیو کر سکتی ہو' پلیز مما اور آنٹی وغیرہ کو گھر لے جاؤ انہیں مجھ سے زیادہ آرام کی ضرورت ہے۔" وہ ضدی تھا۔ عینی' موی کے سامنے اپنا بھرم کھونے کے ڈر سے نا چاہتے ہوئے بھی تیار ہو گئی۔ باہر شام گہری ہو رہی تھی' آزر سب کو رخصت کرنے کے بعد کمرے میں واپس آیا تو موی ڈبل تکیے پر سر رکھے لیٹی پلکیں موند چکی تھی' وہ چپ چاپ سا اس کے پاس بیٹھ گیا۔
"تمہیں پتا ہے موی' آج تمہارا برتھ ڈے ہے؟"
اچانک وہ بولا تو موی کی آنکھیں پٹ سے کھل گئیں۔
"کبھی کبھی مجھے تم پر اتنا شدید غصہ آتا ہے کہ تمہارا حشر نشر کرنے کو جی چاہتا ہے' مگر...... اگلے ہی پل میں خود کو قطعی بے بس محسوس کرتا ہوں' سمجھ میں نہیں آتا' تمہارا کیا کروں؟"
"ایم سوری آزر! ایم رئیلی ویری سوری۔" وہ اس کے سامنے پھر رو پڑی تھی۔ آزر تڑپ اٹھا۔
"کس بات کی سوری؟" اپنے ہاتھوں سے اس کے

آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے پوچھا تھا جب وہ بولی۔
"میں بہت خود غرض ہوں...... بچپن سے اب تک میں نے صرف اپنے لیے سوچا ہے' اپنی خوشی' اپنے غم کے لیے...... میں جو سانس بھی تمہارے لیے لیتی ہوں تمہارے لیے تو کبھی کچھ سوچ ہی نہیں سکی...... بہت تنگ دل ہوں میں آزر! پلیز مجھے معاف کر دو۔" وہ اب بھی اپنی سوچ کے حصار میں تھی۔ آزر کے لب ہلکے سے مسکرا دیے۔
"شکر ہے تمہیں اس بات کا احساس تو ہوا کہ تم کتنی بری ہو۔" موی کا نرم و نازک سا ہاتھ اس کی گرفت میں تھا۔ وہ سر جھکا کر بے وجہ مسکرا دی۔
"ہوں...... مگر تم بہت اچھے ہو' کبھی تو ہر مشکل میں سب سے پہلی صدا میں تمہیں دیتی ہوں۔"
"وہ تو میں ہوں...... خیر آئندہ اگر تم نے ایسی کوئی فضول حرکت کرنے کی کوشش کی تو یاد رکھنا موی' میں سچ مچ تمہارا حشر نشر کر کے رکھ دوں گا۔" دھیمے سے مسکراتے ہوئے وہ بولا' سنجیدہ ہوا تھا۔ موی نم آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔
"میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی آزر' ایک پل بھی نہیں۔" اس کی آنکھیں آزر کے چہرے پر جمی چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں مگر ہونٹوں پر چپ کا بھاری قفل پڑا تھا۔
تھوڑی دیر بعد یونہی آزر کو دیکھتے' اس سے باتیں کرتے' اس کی آنکھ لگ گئی تھی مگر...... وہ اس رات بھی نہیں سویا تھا۔ موی کا کمبل ٹھیک کر کے' دیر تک اس کے سرہانے بیٹھا وہ اس کے دل کش موی چہرے کو دیکھتے ہوئے بنا اپنی تھکن کی پروا کیے' جاگتی آنکھوں سے جانے کیسے کیسے خواب دیکھتا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"موی...... درد تو نہیں ہو رہا؟" آزر کا اس کے کمرے میں یونہی چکر تھا۔ موی کا دل اس کی اس درجہ توجہ پر خوشی سے بھر گیا۔
"نہیں۔" نگاہ اس کے چہرے پر جمائے جمائے اس نے نفی میں سر ہلایا تھا جب وہ بولا۔
"تو پھر کچھ کھا کیوں نہیں رہی ہو؟"
"میری مرضی۔" وہ اسے تنگ کرنے کے موڈ میں تھی۔ آزر مسکرا دیا۔
"نہیں باز آؤ گی نا تنگ کرنے سے؟"
"اوں ہوں۔" نفی میں گردن ہلاتے ہوئے اس نے آزر کی مسکراہٹ گہری کی تھی۔
"بہت پٹائی کروں گا...... سوچ لو۔"
"سوچ لیا۔"
"چلو پھر ٹھیک ہے' میرا ارادہ آج تمہیں کچھ دکھانے کا تھا مگر...... تم تنگ کرنے سے باز نہیں آؤ گی تو پھر...... میں بھی کچھ نہیں دکھانے والا۔" اب وہ اسے بلیک میل کر رہا تھا۔ موی اسے دیکھتی رہ گئی۔
"میرا کچھ بھی کھانا تمہارے لیے اتنا ضروری تو نہیں آزر۔" وہ کہے بغیر نہیں رہ سکی تھی جواب میں آزر نے ایک ہلکی سی چپت اس کے سر پر رسید کر دی۔
"قطعی پاگل ہو اور کچھ نہیں چلو شاباش یہ سوپ پیو' پھر میں تمہیں آؤٹنگ پر لے کر چلتا ہوں۔"
"کیا عینی بھی ساتھ جائے گی؟"
"نہیں...... ابھی صرف ہم دونوں جا رہے ہیں اور بس۔" کتنا مہربان ہو رہا تھا وہ اس پر موی کے لیے سوسائیڈ کرنے کی یہ کوشش' جس کی وجہ اس نے کسی کو بھی نہیں بتائی تھی بہت سود مند رہی تھی۔
تقریباً" ایک گھنٹے کے بعد آزر اسے خود اپنے ہاتھوں سے سوپ پلا کر باہر گاڑی تک لے آیا تھا۔
مسز عقیل اور آسیہ بیگم کے ساتھ ساتھ مریم اور عینی بھی اس وقت لان میں بیٹھے' موی کے نصیب پر رشک کر رہے تھے۔ آسیہ بیگم کا ارادہ جلد از جلد دونوں بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہو جانے کا تھا اور اس سلسلے میں موی کے بعد اپنے بڑے بیٹے کے لیے ان کی نظر عینی پر تھی' جس کے دل میں صرف اور صرف آزر کے لیے پیار تھا' یاسر عباس کے لیے نہیں۔ تاہم گھر میں کوئی بھی اس بات سے آگاہ نہیں

تھا۔ موی کو ایک مدت کے بعد زندگی بے حد پیاری لگ رہی تھی۔

"آزر۔۔۔ ایک سوال پوچھوں سچ سچ جواب دو گے؟"

"پوچھو۔۔۔" تمام مصروفیات بھلائے وہ صرف اس کا ہو کر رہ گیا تھا۔

"کیا اب بھی تم کسی سے پیار نہیں کرتے؟"

"کرتا ہوں۔" آزر اس کی الجھن سمجھ رہا تھا، تبھی مسکرا دیا۔

"کس سے؟"

"یہ تمہیں کیوں بتاؤں۔۔۔ کچھ تو سیکرٹ بھی رہنے دو۔"

"کیوں۔۔۔ کیا اب میں تمہاری دوست نہیں رہی۔"

"دوست ہو اسی لیے تو بتا نہیں رہا۔ تمہارا کوئی پتا چلتا ہے کب کیا کر دو ویسے بہت جلد اس راز سے پردہ اٹھنے والا ہے کیونکہ میں نے مما سے کہہ دیا ہے جلدی سے میری شادی کر دیں نہیں تو پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" اس کی مسکراہٹ موی کی اداسی میں اضافہ کر رہی تھی، وہ پھر کتنی ہی دیر تک اس سے کوئی سوال نہ کر سکی آزر نے گاڑی ایک زیر تعمیر عمارت کے سامنے روکی تو اس کا انہماک ٹوٹا۔

"آؤ موی۔۔۔ تمہیں وہ تاج محل دکھاؤں جو میں نے اپنی ممتاز بیگم کے لیے تعمیر کروایا ہے۔" وہ اتنا خوش اور پرجوش تھا کہ موی اس کے ہاتھ میں دبے اپنے ہاتھ کے دباؤ سے اس کی شدت محسوس کر سکتی تھی۔

"یہ دیکھو، یہ لان ہے یہاں میں دنیا بھر سے نایاب قسم کے پودے اور پھول لا کر لگاؤں گا اور پھر میں اور میری ممتاز بڑھاپے میں اپنے بچوں سے روٹھ کر یہیں ایک دوسرے کا غم بٹانے کے لیے پہروں بیٹھے رہیں گے اور یہ دیکھو یہ اطالوی طرز کا کچن ہے جب میں آفس سے تھک کر آیا کروں گا تو میری ممتاز یہیں مصروف ملا کریں گی مجھے اور یہ، یہ ہمارا بیڈ روم ہے میں اس کی دیواروں پر اتنا دیدہ زیب پینٹ کرواؤں گا کہ میرے گھر سے جانے کے بعد بھی میری ممتاز کا دل اس کمرے سے نکلنے کو نہیں چاہے گا۔"

اپنی ہی خوشی اور جوش میں وہ اسے اپنے ساتھ ساتھ کھینچتا۔ اپنا سب سے چھپ کر خفیہ خریدا ہوا گھر دکھا رہا تھا۔ اس لمحے موی کو وہ وہی لندن والا آزر عباس لگ رہا تھا۔ جس نے اپنی ایسی ہی حرکات سے اس کے دل میں اپنے پیار کی شمع روشن کی تھی۔

"اور یہ دیکھو۔۔۔ یہاں ہمارے بیڈ روم کے ٹیرس سے شام ڈھلنے اور پھر سورج نکلنے کا منظر اتنا دل فریب لگتا ہے کہ جب بھی میری ممتاز کا مجھ سے کسی بات پر جھگڑا ہوا کرے گا وہ مجھے روتی بسورتی، تمہاری طرح گلے شکوے کرتے یہیں بیٹھی ملا کرے گی۔۔۔ یہ تاج محل اسی کی ملکیت ہو گا موی۔"

جگمگاتی سیاہ نگاہوں میں ڈھیروں خواب سجائے وہ اسی کھڑکی کے پٹ سے ٹیک لگائے کھڑا دونوں بازو سینے پر باندھے، خواب ناک لہجے میں کہہ رہا تھا۔ موی نم پلکوں سے یک ٹک اسے دیکھتی رہی۔

"تم بہت بری ہو موی۔ قسم سے نہ تم کوئی فضول حرکت کرتیں نہ میں تمہیں ابھی یہاں لاتا، یہ تاج محل "اپنی مکمل تکمیل" تک میرے گھر والوں کے لیے ایک سرپرائز ہے۔" فوراً اپنے خوابوں کے سحر سے نکلتے ہوئے اس نے پھر موی کو سرزنش کی، وہ سر جھکائے چپ کھڑی رہی۔

"چلو آؤ۔۔۔ مارکیٹ چلیں تمہارا برتھ ڈے گفٹ ڈیو ہے مجھ پر۔" انتہائی مصروف انداز میں دوسرے ہی پل اس کا ہاتھ تھام کر پھرتی سے وہ بالائی منزل سے نیچے اتر آیا۔ موی کا دل ان لمحوں کے لیے امر ہو جانے کی دعا کر رہا تھا۔

"یہ رنگ دیکھو اچھی ہے نا، میری ممتاز کے ہاتھ میں بہت پیاری لگے گی۔" مارکیٹ پہنچ کر سب سے پہلے وہ جیولرز شاپ میں گھسا تھا۔ موی نے رنگ فوراً انگلی سے اتار دی۔

"چلو ڈریس دیکھتے ہیں۔۔۔ ہو سکتا ہے نیکسٹ

ویک میں مما میری شادی کا فنکشن رکھ دیں۔۔۔ تو اچھے کپڑے تو ہونے چاہئیں نا تمہارے پاس۔" اپنے ہی انداز میں کہتا، بنا اس کے احساسات کی پروا کیے وہ اب اسے ساتھ لیے، بوتیک میں گھس رہا تھا۔ موی جیسے بے اختیار سی اس کے ساتھ کھنچتی جا رہی تھی۔

"یہ بلیک ڈریس دیکھو، پیارا ہے نا۔"

"جی نہیں۔۔۔ تمہاری شادی پر بلیک ڈریس نہیں پہننا مجھے۔" پہلی بار اس نے لب کھولے تھے۔ آزر کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھتا زیر لب مسکرا دیا۔

"اور کیسا ڈریس پہننا ہے میری شادی پر؟"

"جیسا تمہاری بیوی پہنے گی بالکل ویسا ہی۔"

"نہیں یار وہ تو دلہن ہو گی تم کوئی دلہن تھوڑی ہو گی۔"

"تو کیا ہوا بس مجھے یہ بلیک ڈریس نہیں پہننا۔"

"تم یہی بلیک ڈریس پہنو گی بس میری پسند ہے۔" وہ ضدی ہو رہا تھا۔ موی بھی ضد میں آ گئی۔

"میں یہ بلیک ڈریس نہیں پہنوں گی۔ اتنا ہی پسند ہے تو اپنی محبوبہ کو گفٹ کر دو۔"

"اوکے یہ بھی ٹھیک ہے چلو پھر تم یہ بلو سوٹ پہنو گی یہ بھی بہت اچھا لگا ہے مجھے۔" ڈارک بلو سوٹ جس پر خالص نگینوں کا ہلکا پھلکا کام ہوا تھا، اٹھاتے ہوئے اس نے کہا تو موی چڑ گئی۔

"مجھ پر فرض نہیں ہے کہ تمہاری پسند کا ڈریس ہی پہنوں۔ اب میری اپنی بھی کوئی پسند ہے۔"

"گولی مارو اپنی پسند کو۔۔۔ بس تم یہ بلو سوٹ پہنو گی۔۔۔ چلو اب چوڑیاں دلاؤں تمہیں۔"

"مجھے نہیں لینی چوڑیاں۔۔۔ بس اب گھر چلو۔"

"اوں ہوں۔۔۔ تمہارے ہاتھوں میں چوڑیاں بہت اچھی لگتی ہیں وہ تو شکر کرو ابھی عینی ساتھ نہیں آئی، ورنہ اس نے تو ساری جیب خالی کروا دینی تھی میری تکمیل اس کے حوالے سے بھی ایک زبردست سرپرائز دوں گا تمہیں۔" وہ ایک لمحے کے لیے بھی اس کا ہاتھ نہیں چھوڑ رہا تھا، موی کے اندر کی ساری خوشی ماند پڑ گئی۔

"چلو اب مزے کی آئس کریم کھلاتا ہوں تمہیں زیادہ ہیوی کھانا تو کھا نہیں سکو گی تم۔" رنگا رنگ چوڑیوں کے کئی پیکٹ اپنی پسند سے خریدنے کے بعد وہ اس سے کہہ رہا تھا۔ موی لاتعلق سی چپ چاپ اثبات میں سر ہلا گئی۔

"آج بڑے فیاض اور مہربان ہو رہے ہو، خیر ہے نا؟"

"ہوں تمہیں کیا لگتا ہے خیر نہیں ہے۔" وہ ہنسا تھا۔ موی خاموش رہی۔

"میرا دل چاہتا ہے موی۔۔۔ بس آج تم میرے ساتھ رہو بہت دیر تک۔"

"کیوں کیا آج کے بعد تم پر پابندی لگ جائے گی؟"

"کیا پتا۔" شانے اچکاتے ہوئے اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور مسرور سا فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"ایک نظم سنو گی؟" وہ خاموش سی کھڑکی کے باہر دیکھ رہی تھی جب آزر گاڑی کو مین روڈ پر لاتے ہوئے بولا۔

"ہوں۔۔۔ نہیں بھی سنوں گی تو تم کون سا سنائے بغیر رہ جاؤ گے۔" وہ اس کے الفاظ پر مبہم سا مسکرایا تھا۔

"خاصی سمجھ دار ہو گئی ہو۔" موی نے اسے ایک نظر دیکھا اور پھر نگاہ پھیر لی۔

پاگل لڑکی تم سے مل کر یوں لگتا ہے
جیسے خواب کی رانی تو ہے
میری پریم کہانی تو ہے
تیری اٹھتی گرتی پلکیں
نین کٹیلے ہونٹ رسیلے
مل جل کر بے کل کرتے ہیں
دوش زمانے کو کیا دینا
مجھ کو خود سے ڈر لگتا ہے
صحرا جیسا گھر لگتا ہے
ریت کی بوچھاڑیں ہیں قاتل
سچ پوچھو تو مجھ کو اب بھی

مرجانے کی آس نہیں ہے
بارش مجھ کو راس نہیں ہے!

اس کا لہجہ گمبھیر ہو رہا تھا۔ موی چاہتے ہوئے بھی چپ نہ رہ سکی۔

"ویری گڈ.... نظم تو اچھی ہے مگر اس نظم کا پس منظر کیا ہے؟"

"وہ کل بتاؤں گا' جب عینی کو لندن کے لیے ایئرپورٹ چھوڑنے آئیں گے۔" بے خیالی میں وہ اسے بتا گیا تھا۔ موی چونک اٹھی۔

"عینی لندن جا رہی ہے؟"

"ہوں۔" آزر نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"کیوں....؟"

"اپنے پاپا کو مس کر رہی ہے.... ویسے بھی وہ لندن جائے گی تو مما اسے وہاں سے رخصت کروا کر ہو بنا کر گھر لائیں گی نا۔"

مکمل توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز رکھے وہ بتا رہا تھا۔ موی کے اندر جیسے دھڑکتا' مچلتا دل ساکت ہو کر رہ گیا۔ اس کے ہونٹ جیسے مزید کچھ بولنے سے ہی قاصر ہو گئے۔ سن ہوتے اعصاب کے ساتھ وہ آزر کے ہلکی ہلکی بڑھی ہوئی شیو والے خوب صورت چہرے کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ عین اسی لمحے اس کا سیل بجا تھا۔ کال قرۃ العین کی تھی۔

"ہیلو آزر۔"

"ہاں بولو عینی۔" ایک ہاتھ سے کار ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے دوسرے ہاتھ سے سیل کان سے لگایا تھا۔ موی کا دکھ اور بے زاری مزید بڑھ گئی۔

"او یار اب تو کافی آگے نکل آئے ہیں خیر یو ڈونٹ وری' میں لاتا ہوں۔" کال ڈراپ کرتے ہوئے اس نے کہا۔ پھر ایک نظر موی کو دیکھتے ہوئے گاڑی ریورس کرلی۔

"سوری موی.... وہ عینی نے پرسوں سے مجھے کچھ ٹیبلیٹس کے لیے کہا ہوا ہے ہارٹ پین ہوتا ہے اسے مگر میں تمہاری وجہ سے اتنا پریشان تھا کہ روز ہی یاد نہیں رہتا بے چاری کیا سوچتی ہوگی۔" کتنی فکر تھی

اسے عینی کی' موی بنا اس کے الفاظ پر غور کیے اپنی خود ساختہ آگ میں جلتی رہی' گاڑی ایک مرتبہ پھر پر ہجوم راستوں پر دوڑ رہی تھی۔ وہ لاتعلق سی بنی بیٹھی رہی۔

"تم یہیں رکو.... میں بس دو منٹ میں دوا لے کر واپس آتا ہوں۔" گاڑی ایک شاندار کلینک کے سامنے روکتے ہوئے اس نے بائیں ہاتھ سے آہستہ سے موی کا گال چھوا تھا۔

"آزر۔" وہ ابھی گاڑی سے نکلا تھا کہ اس نے پکار لیا۔

"ہوں۔" وہ پلٹا تھا' جب وہ اچانک ڈوبتے دل کی کیفیت سمجھے بغیر بولی۔

"جلدی آنا۔"

"اوکے.... پاگل ہو تم اور کچھ نہیں۔" ذرا سا مسکراتے ہوئے اس نے سر جھٹکا تھا۔ موی کی آنکھوں میں آپ ہی آپ نمی اتر آئی۔

"میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی آزر.... ایک پل بھی نہیں۔" خوب زور سے پلکیں میچتے ہوئے اس نے سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا تھا اور ابھی وہ کچھ ہی لمحہ تھا جب اس کے کانوں نے ایک زوردار دھماکے کی آواز سنی تھی اسے لگا جیسے اس کی کار بلاسٹ ہو گئی ہو' وہ چیخی تھی اور ہر طرف پھیلتے دھوئیں میں اس نے آخری آواز آزر کو دی تھی.... پھر اس کے بعد اس کا ذہن مکمل اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔

پورے تین روز کے بعد وہ ہوش میں آئی تو اس کا وجود ہاسپٹل کے شفاف بستر پر بے سدھ پڑا تھا۔ اسے پہلی بار آنکھیں کھولنے میں شدید دشواری پیش آئی تھی۔ سارا جسم شدید درد کے حصار میں تھا۔ آنکھ کھلتے ہی سب سے پہلے اس کی آنکھ کے سامنے جو چہرہ آیا تھا وہ اس کی ماں کا تھا' جو حال سے بے حال دکھائی دے رہی تھیں۔

"مما.... آزر۔" اس کے لبوں نے جنبش کی تھی۔ مسز عقیل پھپک کر رو پڑیں۔

"آزر...." اس بار اس نے زیادہ تڑپ کر شدت سے اسے پکارا تھا۔ تبھی عینی بول اٹھی۔

"آزر نہیں رہا موی.... ہی از ڈیڈ۔"

"ہی از ڈیڈ۔" یہ الفاظ موی کے ذہن پر کسی ہتھوڑے کی طرح لگے تھے۔ اس کے ذہن پر دباؤ بڑھا تھا اور آنکھیں جیسے پھر سے بند ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

اس روز کے بعد اسے صحیح معنوں میں ہوش میں آنا نصیب ہوا ہی نہیں جب بھی ہوش میں آتی چیخنے چلانے لگتی یا پھر سہم کر گھنٹوں دیواروں کو گھورتی رہتی' آزر کی شبیہ اسے ہر شے میں دکھائی دیتی تھی۔ اس کا ذرا سا مسکرا کر سر جھٹکنا اس کے ذہن سے نکلتا ہی نہیں تھا۔ وہ سارے دن پلکیں موندے لیٹی اس کے لبوں سے ادا ہونے والی نظم "بارش مجھ کو راس نہیں ہے" ذہن میں دہراتی رہتی تھی! عینی لندن واپس جا چکی تھی' آسیہ بیگم کو بھی یاسر وہیں لے گیا تھا' کچھ ماہ کے لیے مسز عقیل' اور عقیل صاحب بھی موی اور مریم کے ساتھ لندن میں ہی رہے تھے مگر پھر موی کی طبیعت زیادہ خراب ہونے پر ڈاکٹرز نے جب اس کے لیے فوری شادی کا ایک آپشن رکھا تو وہ فوری پاکستان چلے آئے موی کو سمجھانے کے لیے مریم بھی ان کے ساتھ ہی پاکستان چلی آئی تھی

پاک سرزمین کی پاک فضا میں اس روز ہاسپٹل کے قریب ہونے والا وہ خودکش حملہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی' اس حملے میں ضائع ہونے والی ساری قیمتی جانیں عام لوگوں کی تھیں۔ کسی وزیر' کسی مشیر کا کوئی بیٹا نہیں مرا تھا لہٰذا حکومتی سطح پر صرف چند مزاحمتی جملوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوا تھا مگر.... لوگوں کے جان و مال کے محافظ ان گدھوں کی حکمرانی میں بے قصور لقمہ اجل بننے والے ان سینکڑوں افراد سے وابستہ جانے کتنے خاندانوں سے زندگی جیسے روٹھ گئی تھی۔

اقتدار کے نشے میں چور.... صرف اپنی عیاشیوں اور آسائشوں کے لیے' بے بس مظلوم لوگوں کی جانوں پر سیاست کرنے والوں کے لیے.... آزر عباس کی ناگہانی موت کوئی معنی نہیں رکھتی تھی مگر.... موی کو ساری فضا اس شہزادے کی حادثاتی موت پر سسکیاں

لیتی سنائی دیتی تھی۔

رات دھیرے دھیرے اپنا پچھلا سفر طے کر رہی تھی۔ موی ہال کمرے سے نکل کر سست روی سے بے خودی سی چلتی باہر آ گئی۔ دور آسمان پر سب سے زیادہ روشن دکھائی دینے والا ستارہ' آہستہ آہستہ سرکتا اب جیسے عین اس کے سر پر پہنچ گیا تھا۔ شدید ٹھنڈ کے باوجود اسے اپنے جسم سے ٹکراتے سرد ہوا کے شریر جھونکوں سے کوئی فرق پڑتا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

مسلسل کئی گھنٹے کھڑے رہنے سے اس کے پاؤں سوج رہے تھے مگر.... اسے بھلا اس کا احساس ہی کہاں تھا۔ نم نم سی بھیگی آنکھوں میں پھیلے سرخی کے ڈورے اسے وحشت ناک بنا رہے تھے' سر تھا کہ جیسے درد کی شدت سے پھٹ رہا تھا مگر وہ بے حس سی کھڑی آسمان کو دیکھ رہی تھی۔

اس کی سماعتوں میں اب بھی بارود پھٹتا تھا' اب بھی دھماکے کی زوردار آواز اسے ہوش و حواس سے بے گانہ کر کے رکھ دیتی تھی مگر.... ایک ہجر کا درد تھا جو جان لیوا ہو رہا تھا۔ آزر کی موت کے بعد اسے یہ پتا چلا تھا کہ اس کی متاثرہ خود تھی۔ دل آویز جعفری۔

وہ تصویر جس سے وہ فرصت کے لمحات میں باتیں کیا کرتا تھا' اسی کی تصویر تھی' اس کی موت کے بعد

اس کے سارے راز افشا ہوگئے تھے، آزر کے اس کے لیے خریدے ہوئے گفٹ "امانتاً" اس کی الماری میں ان چھوئے پڑے تھے، اس کی ادھوری ڈائری، جس میں اس کے ہزاروں خواب لفظوں کی صورت دفن تھے۔ آخری وقت میں جو شاپنگ اس نے اس کے لیے کی تھی..... وہ ساری چیزیں بھی گاڑی میں جوں کی توں پڑی رہ گئی تھیں بس ایک رنگ تھی، جو اس کی پاکٹ میں ہونے کے باعث اسی کے ساتھ ختم ہوگئی تھی۔

"دل آویز....." سوید کی آنکھ کھلی تھی۔

وہ پانی پینے کے لیے نیچے کچن میں آیا تھا جب دل آویز کو کمرے میں نہ پا کر ہال کمرے سے باہر نکل آیا مگر..... وہ اس کی پکار پر نہیں پلٹی تھی تبھی وہ اس کے قریب آیا تھا۔

"دل آویز۔" اس بار نرمی سے پکارتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ اس کے شانوں پر دھرے تھے، تبھی وہ حیران حیران سی پلٹی تھی۔

"اتنی رات گئے یہاں کیا کر رہی ہو..... کسے ڈھونڈ رہی ہو وہاں آسمان پر.....؟"

"وہ، وہ وہاں ایک ستارہ نہیں ہے مم میں روز اسے اپنے کمرے کی کھڑکی سے جگمگاتے ہوئے دیکھتی تھی، مم مگر اب وہ وہاں نہیں ہے۔" وہ پریشان دکھائی دے رہی تھی، سوید کی نگاہیں بھی آسمان پر جم گئیں۔

"سردی بڑھ رہی ہے دل آویز..... اندر چلو۔" کچھ ہی لمحوں میں تھک کر وہ اسے کہہ رہا تھا۔ موی خالی خالی سی نگاہوں کے ساتھ واپس پلٹ آئی۔

اس رات صبح فجر کی نماز کے قریب کہیں اس کی آنکھ لگی تھی اور پہلی بار اس نے آزر کے ساتھ سوید کو دیکھا تھا، دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ندی کنارے بیٹھے کچھ کھا رہے ہوتے ہیں سوید آزر سے گلے مل کر رخصت ہوتا ہے تو وہ موی کا ہاتھ تھام کر اسے سوید کے ہاتھ میں دے دیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ اس کا خیال رکھے، سوید، موی کو ساتھ لے کر رخصت ہوتا ہے تو اس کی گاڑی، ایک درخت سے ٹکرا جاتی ہے۔ سوید آزر کا لہولہان چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے اور وہ چیختی ہے، عین اسی لمحے اس کی آنکھ کھل گئی۔

سوید اس وقت اسی کے کمرے میں موجود کوئی چیز تلاش کر رہا تھا۔ جب وہ فلک شگاف چیخ کے ساتھ بیدار ہوئی۔ وہ پلٹ کر فوراً اس کی طرف لپکا تھا۔

"دل آویز..... آر یو او کے.....؟" عبیرہ نیچے کچن میں اس کے لیے ناشتا تیار کر رہی تھی۔ موی کی چیخ پر وہ بھی اوپر چلی آئی۔ دل آویز اب سہمی سہمی سی نگاہوں سے سوید کو دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہوا تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

عبیرہ کو سوید کی موی کے پاس موجودگی تپا گئی تھی۔ وہ خاموشی سے پلٹ گیا۔

"کچھ نہیں میرا کمرا ہے ایک ضرور فائل لینے آیا تھا۔"

"او کے چلو نیچے ناشتا تیار ہے۔" کہنے کے ساتھ ہی اس نے اپنا بازو سوید کے بازو کے گرد لپیٹ دیا تو موی مچل کر بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"نہیں..... تت تم کہیں نہیں جاؤ گے۔" اس کا ذہن اب بھی خواب والے حادثے کے حصار میں تھا۔ عبیرہ حیران حیران سی سلگ اٹھی۔

"یہ کیا بکواس ہے..... تم تو کہتے تھے یہ پاگل ہے۔ پھر یہ الفت یہ استحقاق میری آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہو نا تم۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے عبیرہ..... میں تو ابھی کمرے میں آیا ہوں، یہ شاید خواب میں ڈر گئی ہے اسی لیے ایسا کہہ رہی ہے۔" نرمی سے کہتے ہوئے اس نے عبیرہ کو اپنے حصار میں لیا تھا۔ جب موی بول اٹھی۔

"آزر..... تت تم اس کے نہیں ہو مجھے سب پتا چل گیا ہے۔ تت تم صرف میرے ہو، تت تم کہیں نہیں جاؤ گے وہاں آگ ہے تم وہاں نہیں جاؤ گے۔"

اس کی گردن اور پیشانی پسینے سے تر تھی۔ سوید شرمندہ اور حیران سا اسے دیکھتا رہ گیا جو اس کا دوسرا بازو تھام رہی تھی۔ عبیرہ کا دماغ گھوم گیا۔

"سن لیا..... کیا کہہ رہی ہے یہ پاگل اب بھی کچھ

کہنے کے لیے ہے تمہارے پاس۔" وہ چلائی تھی۔ موی اس کے احساسات سے قطعی بے نیاز سوید کے بازو سے لگ گئی۔

"رہو اسی کے ہو کر..... مجھے بٹی ہوئی محبت نہیں چاہیے۔" کینہ توز نگاہوں سے دونوں کو دیکھتے ہوئے وہ تیزی سے کہتی کمرے سے نکل گئی تھی، سوید نے بے زاری سے اپنا بازو موی کی گرفت سے چھڑا کر اسے قریبی بیڈ پر دھکیل دیا۔

"پاگل ہو..... پاگل ہی رہو مجھے پاگل مت کرو پلیز کتنی بار کہوں کہ میں تمہارا آزر عباس نہیں ہوں۔" تنفر سے کہہ کر وہ فوری کمرے سے باہر نکل گیا تھا موی کی آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ چھلکا اور بائیں گال پر لڑھکتا ہوا ہونٹوں میں جذب ہوگیا۔

☆ ☆ ☆

عقیل صاحب اپنی وائف اور مریم کے ساتھ لندن روانہ ہوگئے تھے۔

روانگی سے تین روز قبل ہی دل آویز عقیل منزل چلی آئی تھی جہاں مریم زیادہ وقت اسے اپنے ساتھ رکھتے ہوئے اس سے آزر کی باتیں کرتی رہی تھی، اسی روز وہ موی کو آزر کے خوابوں کے نگر اس کے زیر تعمیر تاج محل میں لائی تھی جس کے بارے میں صرف مریم ہی جانتی تھی، اسی نے موی کو آزر کے کمرے میں اس کے لیے رکھی چیزیں اور وہ تصویر بھی دکھائی دی، جس سے موی کی بدگمانیاں آزر کے لیے بڑھی تھیں۔

تاج محل میں ایک مرتبہ پھر موی کی حالت شدید بگڑ گئی تھی، تبھی مریم کو مجبوراً سوید کو کال کر کے اسے وہاں بلوانا پڑا۔ وہ ایک ضروری میٹنگ میں مصروف تھا، مریم کی کال پر پہلی فرصت میں وہاں پہنچا اور پھر دونوں مل کر اسے ہاسپٹل لائے، سوید نے اپنا سیل آف کر دیا تھا۔ جس سے عبیرہ کی الجھن بڑھی تھی، وہ دن میں جب تک اسے پچاس فون نہیں کر لیتی تھی اسے سکون نہیں ملتا تھا۔ آج کل تو ویسے بھی وہ تخلیق کے عمل سے گزر رہی تھی لہٰذا سوید خود ہی سارا دن اس سے رابطے میں رہتا اور اسے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ تاہم اس روز موی کی حالت ہی اتنی بگڑ گئی تھی کہ اسے مجبوراً عبیرہ کی خفگی سے بچنے کے لیے اپنا سیل آف کرنا پڑا۔ دن کے بعد شام بھی ڈھل گئی تھی۔ عبیرہ کی طبیعت بگڑنا شروع ہوگئی، ادھر مریم جو اپنا سامان بھی پیک کر چکی تھی۔ تاج محل کی ادھوری تعمیر کے بارے میں سوید کو سب کچھ بتاتے ہوئے بولی۔

"یہ گھر موی کی زندگی میں بہت اہمیت رکھتا ہے سوید بھائی، اسی لیے اس کی طبیعت اتنی خراب ہوئی، آپ دعا کیجیے اسے سکون کی زندگی تو نصیب نہیں ہوئی، سکون کی موت ہی نصیب ہو جائے۔" وہ از حد آزردہ تھی۔ سوید گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

رات خاصی تاخیر سے وہ گھر واپس لوٹا تو چوکیدار سے حالات کا پتا چلا۔ عبیرہ کی طبیعت بگڑ گئی تھی اور راحیلہ بی اس سے رابطے کی تمام تر کوشش کے بعد ناکام ہو کر، اکیلی ہی اسے ہاسپٹل لے گئی تھیں۔ سوید کے پاؤں تلے سے زمین نکلی تھی، تھکن سے چور اس نے چوکیدار سے ہاسپٹل کا پوچھا اور فوراً گاڑی نکال لی۔ عبیرہ ابھی لیبر روم سے باہر تھی، ڈاکٹرز کے مطابق اس کی ڈیلیوری بغیر میجر آپریشن کے ممکن نہیں تھی۔ وہ رو رہی تھی جب سوید آزر اس کے پاس پہنچا۔

"بیبی، بیبی ایم سوری میں ایک مسئلے میں پھنس گیا تھا، سیل کے سگنل بھی کام نہ کر رہے تھے تم ٹھیک ہو نا۔"

"ابھی تو ٹھیک ہے مگر ڈاکٹرز نے ڈیلیوری کے لیے میجر آپریشن کا کہا ہے۔" راحیلہ بی کے لہجے میں ہلکی سی خفگی تھی۔ وہ بھی پریشان ہو گیا۔

"لیکن..... اس سے پہلے تو ڈاکٹرز سب ٹھیک ہے کہ رپورٹ دیتے رہے ہیں۔"

"ڈاکٹرز کا کیا ہے..... جب چاہیں سیاستدانوں کی طرح اپنا بیان بدل لیں تمہارے پاپا شہر سے باہر ہیں، میں اکیلی عورت کیا کیا کروں۔"

"ایم سوری مما..... میں واقعی ایک مسئلے میں

پھنس گیا تھا۔ ورنہ آپ تو جانتی ہیں، میری بیہ میں میری جان ہے۔"

عبیرہ کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے اس نے پھر اسے اپنی محبت کا یقین دلایا تھا۔ تبھی ڈاکٹرز نے آپریشن کا اعلان کر دیا۔

"بیہ.... پلیز کوئی ٹینشن مت لینا.... اللہ ہے نا ہمارے ساتھ وہ سب بہتر کرے گا جب تک میں زندہ ہوں، میری بیہ کو معمولی سی تکلیف بھی نہیں چھو سکتی میں، میں یہیں ہوں، بس جلدی سے جاؤ اور ہمارا بے بی لے آؤ۔" لیبر روم سے باہر وہ اسے حوصلہ تھما رہا تھا اس پر اپنا بے تحاشا پیار لٹا رہا تھا، اسی پل عبیرہ نے لب کھولے تھے۔

"سوید ایم سوری میں نے تمہیں بہت تنگ کیا ہے تمہیں پوجنے کی حد تک چاہنے کے باوجود بڑے امتحان لیے ہیں تم سے آج امتحان دینے کی باری میری ہے تم.... مجھے معاف کر دینا میں نے، میں نے تمہیں دل آویز سے دور رکھا اپنے اللہ کی گنہگار ہوئی.... اپنے چھوٹے ظرف سے مجبور اس کے احکامات کی نافرمانی کی.... وہ، وہ ہر چیز پر قادر ہے آزر.... وہ نوازنا بھی جانتا ہے اور لینا بھی.... اگر، اگر میں واپس نہ آسکی تو، تو پلیز ....."

"چپ کر جاؤ بیہ.... نہیں تو میرا دل پھٹ جائے گا میں نے کہا نا تمہیں کچھ نہیں ہو گا، تم میری زندگی ہو بیہ میرے لیے جیو گی ـــــ" اس پر جھکا اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں کی مضبوط گرفت میں لیے وہ اسے پیار کر رہا تھا۔

عبیرہ پر سکون سی لبوں پر پھیکی سی مسکان سجائے لیبر روم میں چلی گئی سوید آزر اس لمحے دل آویز جعفری کا درد بہ خوبی سمجھ سکتا تھا مگر اسے اس پر غصہ آ رہا تھا۔ نہ اس کی حالت بگڑتی نہ وہ اتنی دیر تک اپنی عبیرہ سے دور رہتا۔ اس کے لب مسلسل درود پاک کا ورد کر رہے تھے۔

اس نے ڈاکٹر سے کہہ دیا تھا کہ وہ انہیں منہ مانگی رقم ادا کرے گا، مگر اس کی بیوی کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ تقریباً" تین گھنٹے کے بعد آپریشن روم کا دروازہ کھلا تھا اور اسے صحت مند بیٹے کی ولادت کے ساتھ ساتھ بیوی کی زندگی کی نوید ملی تھی۔ اللہ رب العزت کے حضور مانگی گئی اس کی دعائیں رد نہیں ہوئی تھیں۔ وہ خوش تھا اتنا خوش کہ ہاسپٹل کے پورے عملے کو اس نے پیسوں سے خوش کر دیا تھا۔

عبیرہ کمرے میں شفٹ ہونے کے بعد ہوش میں آئی تو اس کی خوشی کا بھی کوئی ٹھکانہ نہیں تھا گو جسم ابھی درد کے حصار میں تھا مگر وہ اپنے بچے کو فوری فیڈ کروانے کی خواہشمند تھی۔ راحیلہ بی کے پاؤں مارے خوشی کے زمین پر نہ ٹکتے تھے، جانے کیوں اس موقع پر ان کی آنکھیں پھر سے فضیلہ بی کو یاد کر کے آبدیدہ ہو گئی تھیں۔

"سوید اللہ رب العزت نے ہم پر بڑا کرم کیا ہے میرے بیٹے کا وارث دنیا میں آ گیا بس اب یہاں سے فارغ ہو کر تم پہلا کام اس لڑکی کو طلاق دینے کا کرو گے، جو نا چاہتے ہوئے بھی ہماری پر سکون زندگی میں گھس آئی ہے۔" راحیلہ بی کا اشارہ دل آویز کی طرف تھا۔ سوید کی نگاہ عبیرہ کی نگاہ سے ملی اور پھر فوراً" جھک گئی۔

"ٹھیک ہے امی، میرے بیٹے کو دیکھیں ایک ایک نقش میرا چرایا ہے اس نے۔"

"ہوں اس میں تو کوئی شک نہیں بہو کو گھر کب تک لے جا سکیں گے۔"

"آج ہی لے چلتے ہیں.... میں اپنی بیہ کو مزید یہاں اس بستر پر نہیں دیکھ سکتا۔" پر شوق نگاہوں سے اسے دیکھتا ہوا وہ اٹھا اور ڈاکٹرز سے بات کرنے کے لیے کمرے سے باہر نکل گیا۔ تبھی راحیلہ بی عبیرہ کے قریب آئی تھیں۔

"عبیرہ سب ٹھیک ہے نا بیٹی۔"

"ہوں بس درد بہت ہو رہا ہے اور ٹانگیں بھی سن سی محسوس ہو رہی ہیں۔"

"کمزوری ہے نا چلو میں دبا دیتی ہوں۔"

"نہیں۔" وہ کچھ پریشان سی تھی۔ آپریشن کے بعد سے بلیڈنگ ایک منٹ کے لیے بھی نہیں رکی تھی

اور یہ بات اس نے سوید کو بتائی تھی۔

"میں ڈاکٹرز سے بات کرتا ہوں تم ٹینشن مت لو۔" اپنائیت سے اس کا ہاتھ تھپتھپا کر وہ پھر روم سے باہر نکل گیا تھا۔ ڈاکٹر فرزین نے اس کی شکایت پر عبیرہ کا چیک اپ کیا تو ٹھٹک گئی۔

"سوری مسٹر سوید.... ہمیں آپ کی وائف کا دوبارہ آپریشن کرنا پڑے گا، میرا خیال ہے ڈاکٹر ناہید دیانت داری سے اپنا فرض انجام نہیں دے سکیں فوری چار بوتل خون کے انتظام کیجیے پلیز۔" ڈاکٹر فرزین اس کے ایک قریبی دوست کی بھابھی تھیں، تبھی انہوں نے وہ بات بتا دی تھی جو عموماً "انسانیت کے یہ مسیحا" اپنی غلطیاں اور گناہ چھپانے کے لیے اپنی بے احتیاطی کا شکار ہونے والے مریضوں کو کبھی بتانے کا رسک مول نہیں لیتے، سوید کے چہرے کی ہوائیاں ایک مرتبہ پھر اڑی تھیں۔

آپریشن کے دوران ڈاکٹر ناہید نے ذرا سی لاپروائی کے باعث غلط آنت کاٹ کر، عبیرہ کی زندگی کو خطرے سے دوچار کر دیا تھا، جس کا احساس تیسرے روز ہوا تھا جب عبیرہ کے آدھے جسم کا خون بہہ گیا تھا۔ راحیلہ بی، دل آویز جعفری کو سوید کی زندگی سے بے دخل کرنا چاہتی تھیں، مگر کاتب تقدیر نے اس سے قبل ہی کہانی اپنی رضا سے ترتیب دے ڈالی تھی۔ سوید خون کا انتظام کر رہا تھا اور ادھر.... دوبارہ آپریشن کے دوران عبیرہ زندگی کی بازی ہار گئی۔

ملک میں روزانہ ڈاکٹرز کی لاپروائی کے باعث پیش آتے حادثات میں وہ بھی ایک معمولی سا حادثہ تھا جس سے کہیں کسی ملکی نظام میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا مگر.... اس ایک حادثے نے کسی ایک شخص سے اس کے زندہ رہنے کا مقصد ہی چھین لیا تھا.... نہ کہیں کوئی آسمان پھٹا نہ صدائے احتجاج بلند ہوئی اور سوید کی بیہ اپنے سارے ارمان دل میں لیے اسے اپنی محبت کی نشانی دے کر ہمیشہ کے لیے ابدی نیند سو گئی۔ سوید کتنے ہی دنوں تک چوبیس گھنٹے کمرے میں بند پڑا روتا رہا تھا، ڈاکٹر ناہید کے خلاف اس نے ایف آئی آر کٹوا کر اسے

عبرت ناک سزا بھی دلوائی تھی مگر اس کے باوجود وہ دل جو چھٹ چکا تھا دوبارہ کسی طور نہ سل سکا۔ راحیلہ بی اس اچانک حادثے سے الگ بستری ہو کر رہ گئی تھیں۔

ایسے میں دل آویز جعفری نے سوید آزر کے بیٹے کو سنبھالا تھا۔ زمانے کے سرد و گرم سے بے نیاز، وہ نیم پاگل سی لڑکی، اس ننھے کومل سے پھول کو روتے دیکھ کر تڑپ اٹھی تھی، سوید اس روز درد سے پھٹتے سر سے مجبور ہو کر کمرے سے باہر نکلا تو اپنے بیٹے کو اس کم گو سی لڑکی کی آغوش میں سکون سے سوتے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ دل آویز نے ہلکی سی آہٹ پر سر اٹھا کر دیکھا، وہ سرخ آنکھوں اور بھیگے ہوئے چہرے کے ساتھ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"آزر۔" اس کے لب ہلے تھے، سوید آزر کے اندر کوئی سسک اٹھا۔

"ہاں میں آزر ہی ہوں وہ آزر جو مر چکا ہے۔" دل آویز اس کے قریب آئی تھی اور پھر بہت اپنائیت سے اس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تھا۔

"آؤ میں سلا دوں۔" اس نے آفر کی تھی۔

سوید جو بے سکونی سے تنگ آ چکا تھا اس کی آفر پر آنسو پیتے ہوئے پلکیں موند گیا۔ عبیرہ کے بعد اس رات پہلی بار وہ بہت پر سکون ہو کر سویا تھا، دل آویز کی آغوش کے لمس نے اسے ایک عجیب سے سرور سے متعارف کروایا تھا۔ جبکہ وہ چپ چاپ بے آواز دل ہی دل میں روتی رہی

☆ ☆ ☆

سوید آزر کی آنکھ گہری نیند سے کھلی تھی۔

اس کا دو سالہ بیٹا، اس کے سینے سے لگا مزے کی نیند سو رہا تھا۔ مگر دل آویز اپنی جگہ پر نہیں تھی، وہ اٹھا تھا اور بستر چھوڑ کر بیڈ روم سے ملحقہ ٹیرس کی جانب چلا آیا تھا، جہاں اس کی توقع کے عین مطابق سادہ سے کپڑوں میں ملبوس دل آویز جعفری خاموش کھڑی، ذرا سا سر اٹھائے اوپر آسمان کو دیکھ رہی تھی۔ وہ گہری سانس بھرتا آگے بڑھا اور چپکے سے اس کے پہلو میں جا کھڑا ہوا۔

"دل آویز۔" بھرپور محبت کے ساتھ بہت قریب سے پکارا تھا اس نے وہ اس کی پکار پر چونک کر پلٹی۔

"اب بھی اس ستارے کو رات میں اٹھ اٹھ کر تلاش کرتی ہو پاگل۔"

"نن' نہیں۔" وہ ذرا سی نروس ہوئی تھی۔ پھر سر جھکاتے ہوئے نم لہجے میں بولی۔

"وہ ستارہ جسے دیکھنے کی میں عادی تھی' وہ تو کب کا ٹوٹ چکا۔" پلک جھپکنے کے ساتھ ہی اس کی آنکھ سے ایک آنسو ٹوٹ کر گرا تھا۔ سوید آزر نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے حصار میں لے لیا۔

"پھر یوں گہری نیند سے اٹھ کر یہاں کسے تلاش کر رہی ہو؟" اس کا لہجہ گمبھیر ہوا تھا۔ دل آویز اس کے مضبوط بازو پر سر ٹکا کر سکون سے پلکیں موند گئی۔

"ایک نئے ستارے کو آزر...... جس کی روشنی کے لیے اس ٹوٹے ہوئے ستارے نے قربانی دی تھی۔" اس کے لہجے کی نمی سوید آزر کا دل جکڑ گئی تھی۔ اس نے ذرا سی گردن گھما کر ایک نظر سامنے لگے وال کلاک پر ڈالی' جہاں رات کے بارہ بجنے میں کچھ ہی سیکنڈ باقی تھے۔

"دل آویز۔" اس بار اس کی پکار میں زیادہ محبت تھی۔ وہ آہستہ سے اس کے بازو سے سر اٹھا گئی۔

"ہوں۔"

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔" وہ چونکی تھی اور حیرانی سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

"آپ کو کیسے یاد رہا کہ آج......"

"یاد رہتا نہیں اچھی لڑکی...... یاد رکھنا پڑتا ہے۔"

"اچھا تو پھر پچھلے سال یاد کیوں نہیں رکھا؟" اس نے گلہ کیا تھا۔ وہ گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

"پچھلے سال میں آزر کب تھا دل' پچھلے سال تو میں سوید تھا عبیرہ کا سوید۔"

"ہوں آپ مرد لوگ بڑے بے وفا ہوتے ہیں فقط چند دنوں میں اس لڑکی کو بھی بھول جاتے ہیں جو آپ کی خوشی کے لیے اپنی جان پر کھیل جاتی ہے۔" اس کا مقصد سوید کو ہرٹ کرنا نہیں تھا مگر...... وہ ہرٹ ہو گیا تھا۔

"صحیح کہتی ہو تم میں خود بھی سوچتا ہوں تو خود سے شرمندگی ہوتی ہے کہ میں اس کے بعد زندہ کیوں رہا مر کیوں نہیں گیا اس کے ساتھ مگر کیا کروں کوئی خودکش حملہ' کوئی بم دھماکہ کوئی کار ایکسیڈنٹ مجھے نگلتا ہی نہیں۔" وہ اندر سے اب بھی زخمی تھا۔ دل آویز تڑپ کر رہ گئی۔

"ایم سوری آزر میرا کہنے کا وہ مطلب نہیں تھا پچھلے دو سال میں جیسے ہم ایک دوسرے کے قریب آئے ہیں' جیسے ہم نے تقدیر کے لکھے پر صبر کرتے ہوئے ایک دوسرے کو سمجھا ہے وہ میں ہی جانتی ہوں' بہت ناز اٹھائے ہیں پچھلے دو سال میں' میں نے آپ کے اپنا آزر سمجھ کر بہت خیال رکھا ہے آپ کا اور آپ نے' بیٹا مجھ پر اور میری بیوقوفی پر ترس کھاتے ذرا ذرا سی بات پر برہم ہو کر' بے قصور' بے حساب تھپڑ مارے ہیں دو سال لگ گئے مجھے اس حقیقت کا یقین کرنے میں کہ میں جسے اپنا آزر عباس سمجھ رہی ہوں وہ آزر عباس نہیں ہے وہ صرف سوید آزر ہے عبیرہ کا سوید آزر مجھے محبوب کے ساتھ ساتھ شوہر کا ساتھ بھی بنا ہوا ہی ملا اور اب جبکہ ہمیں ایک ہی دکھ میں جیتے ہوئے اڑھائی سال ہو گئے ہیں میں یہ جان گئی ہوں ہمارے لیے اپنے ماضی کو یکسر فراموش کر دینا ممکن نہیں لیکن اگر اسی ڈھب سے جینا نصیب ٹھہرا تو کیوں نا رب کی رضا میں راضی ہو کر میں آپ کے لیے آپ کی عبیرہ بن جاؤں اور آپ' آپ میرے لیے میرے آزر۔" وہ سنجیدہ تھی آزر نے سر بیڈ کی پٹی سے ٹکا دیا۔

"سو جاؤ دل آویز مجھے نیند آ رہی ہے۔"

"مگر مجھے نیند نہیں آ رہی...... پچھلے کئی سالوں سے۔" اس کی آواز پھر بھرائی تھی۔ سوید آزر خاموش لیٹا رہا۔

عبیرہ کی رحلت کے بعد اس لڑکی نے جیسے اس کی بکھری ذات کو سمیٹا تھا' وہ واقعی اس کا معترف تھا' اس نے نا صرف سوید کی نفرت سہی تھی' بلکہ اس کے اور عبیرہ کے بیٹے کے لیے اپنا غم بھی بھول گئی تھی۔

وقت کے ساتھ ساتھ اس کا پاگل پن بھی جاتا رہا تھا، آزر عباس کی ذات سے اس کی دیوانگی میں بھی کمی آتی گئی تھی، ہر دکھ ہر حقیقت سے بے نیاز ہو کر اس نے اپنی زندگی کا محور صرف ننھے سعد کو بنا لیا تھا۔ جو اس ماں کا بیٹا تھا۔ جسے اس لڑکی سے نفرت تھی مگر پھر بھی وہ اپنی ذات کو پس پشت ڈالے، سگی ماں کی طرح اسے پال رہی تھی، لبوں پر خاموشی کا قفل لگائے، بنا کسی ——— واہ واہ کی تمنا کیے اس نے ———
راحیلہ بی جیسی پتھر عورت کا دل بھی جیت لیا تھا۔

پورے دو سال بعد سوید آزر کو اپنی زندگی میں اس کی اہمیت کا احساس ہوا تھا۔ عبیرہ نے ہاسپٹل میں آپریشن سے پہلے جو چند باتیں اس سے کی تھیں۔ وہ باتیں اب اس کے اندر نئے احساسات کو جنم دے رہی تھیں۔ دل آویز جعفری نے اس سے پچھلے دو سال کے کسی لمحے کا حساب نہیں لیا تھا مگر...... اب وہ خود کو تعلق نبھانے کی بجائے تعلق کو مضبوط بنانے کے لیے تیار کرتے ہوئے اپنا احتساب کر رہا تھا تو دل آویز نامی اس لڑکی کے بہت سے قرض اس پر واجب ہو رہے تھے۔

وہ بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ جبکہ وہ بیڈ کے ایک کونے پر تکی بہت اداسی سے پلکیں موند گئی تھی!

☼ ☼ ☼

اگر یہ جان جاؤ تم کوئی کیسے اجڑتا ہے
کوئی کیسے بکھرتا ہے
تو میرے پاس آنا تم میری بنجر ہوئی آنکھوں میں
جلتے خواب کو تکنا ان کا مرثیہ سننا
اگر ایسا نہیں ممکن تو میری زندگی کی ڈائری کو کھول
کر پڑھنا
کہ اس کے ہر ورق پر آنسوؤں سے بات لکھی ہے
جو تم سے کہہ نہیں پائی وہی ہر بات لکھی ہے
تمہاری چاہتوں کے نام اپنی ذات لکھی ہے
اگر یہ ڈائری پڑھ کر بھی تم انجان رہتے ہو
تو اس کا ہے یہی مطلب
میری سب التجائیں بس ہواؤں میں معلق ہیں
ابھی کچھ وقت باقی ہے بدل جاؤ پگھل جاؤ
کہیں ایسا نہ ہو یہ وقت ہاتھوں سے نکل جائے
ہماری آرزو میں اپنا رستہ ہی بدل جائیں

وہ کمرے میں نہیں تھی مگر اس کی ڈائری ضرور سوید کے ہاتھوں میں تھی، جس نے بے دار ہوتے ہی اسے اپنے کاموں میں الجھا کر رکھ دیا تھا۔ موی کی ڈائری میں تحریر یہ تازہ نظم بار بار پڑھنے کے بعد مبہم سا مسکراتے ہوئے وہ آئینے کے سامنے آیا اور اپنی تیاری کو فائنل ٹچ دینے لگا۔

"آپ کہیں جا رہے ہیں؟" موی ناشتا لے کر کمرے میں آئی تو پوچھ بیٹھی۔

"ہوں بہت ضروری کام ہے تم ایسا کرو میری واپسی تک شام میں اچھی طرح تیار ہو جانا، آج تمہاری سالگرہ کی خوشی میں بہت زبردست سرپرائز دینے والا ہوں میں تمہیں۔"

"ولیکن یہ ناشتا۔"

"یہ تم کر لو کی اور جو شام میں بتاؤں گا۔" بات ختم کر کے گال پر ہلکی سی چٹکی لیتے ہوئے وہ اپنے بیٹے کو جھک کر پیار کر کے کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ موی گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر ابھی اپنے بیٹے کو تیار کر رہی تھی کہ جب وہ واپس چلا آیا۔

"تم ابھی تیار نہیں ہوئیں؟"

"نہیں وہ میں۔"

"بس کوئی وضاحت نہیں۔" وہ روٹھ کر اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھا تھا جب وہ پریشان سی پیچھے لپکی۔

"سوید میری بات سنیں میں اصل میں آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی، آپ سے ڈریس پسند کروانا تھا۔" اپنی پریشانی اور روانی میں وہ جان ہی نہ سکی کہ اس نے کیا کہا ہے۔ سوید خوشگوار حیرت سے پیچھے پلٹا۔

"کیا کہا پھر سے کہنا ذرا پلیز۔"

"میں تیار ہو کر آتی ہوں۔" گھبرا کر کہتی وہ فوراً کمرے سے بھاگ گئی تھی۔

ہلکے پھلکے کام والے کپڑوں میں ہلکی پھلکی تیار ہو کر،

جس وقت سوید کی ہدایت پر وہ باہر گاڑی کی طرف آئی۔ سوید سیل فون پر کسی سے باتوں میں مصروف تھا۔ دل آویز کے گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے فون آف کر دیا۔

"کس کا فون تھا؟"

"میری ایک دوست کا بہت پسند کرتی ہے مجھے سوچا چلو آج تم سے بھی ملوا ہی دوں۔" اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ دل آویز کے لبوں کو چپ لگ گئی۔

"آؤ۔" تقریباً بیس منٹ بعد گاڑی ایک جھٹکے سے رکی تو سوید کی آواز پر اس نے سر اٹھایا۔ مگر یہ کیا گاڑی سے قدم باہر رکھتے ہی اس کا جسم جیسے پتھر ہو گیا تھا۔

"یہ، یہ آزر عباس......"

"ہوں یہ اسی کا تاج محل ہے وہ تاج محل جس سے اس کے ہزاروں خواب جڑے تھے مگر بے رحم موت نے اسے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ وہ اس خوابوں کے نگر کو تکمیل تک پہنچا سکتا...... مجھے مریم نے اس کے بارے میں بتایا تھا، انہی سے یہ بھی پتا چلا کہ یہ محل میری موی کے نام ہے، اسی لیے صرف اور صرف تمہاری خوشی کی خاطر میں نے اس ادھوری عمارت کو آزر کی امنگوں اور خوابوں کے عین مطابق مکمل کروا لیا ہے اور اب...... میری موی گڑیا اسی محل میں رہے گی کیوں ہے نا شاندار گفٹ اور سرپرائز۔" وہ مسرور تھا۔ موی وہیں کھڑے کھڑے رو پڑی۔

"ارے یہ کیا کر رہی ہو ابھی کوئی پاس سے گزرے گا تو سمجھے گا میں اتنی خوب صورت لڑکی کو ڈنیپ کر لایا ہوں اندر چلو پھر جو دل چاہے کر لینا۔" وہ لپک کر پاس آیا تھا جبکہ اس کی بانہوں میں مقید اس کا بیٹا بھی ہمک کر موی کی طرف آنا چاہ رہا تھا۔ وہ سوید سے بچے کو لے کر چپ چاپ اندر بڑھ آئی، تبھی وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولا تھا۔

"کل ماں اور بابا بھی شہر آ رہے ہیں اور آج رات میں کسی بھی وقت عقیل انکل، آنٹی اور مریم کی آمد بھی متوقع ہے سب یہیں آئیں گے تم سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے۔"

"مجھ سے دو، دو ہاتھ...... کیوں؟" وہ بولی نہیں تھی مگر اس نے الجھن آمیز نگاہوں سے سوید کو دیکھا ضرور تھا، وہ اس کے ساتھ چلتے چلتے رک کر مسکرا دیا۔

"پچھلے دو سالوں میں میری سالگرہ پر تم نے مجھے سوائے ایک پیالی چائے کے اور کچھ بھی نہیں دیا ہے، ایک کیوٹ سی پیاری سی بیٹی بھی نہیں دی تو دو دو ہاتھ کرنا تو فرض ہوا نا ان پر۔" وہ اب پرشوق نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ موی کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔

"چلو یہیں کیک کاٹتے ہیں پھر میں تم سے اپنی پسند کی ٹریٹ لوں گا اس کے بعد پھر اپنے ہاتھوں سے وہ نیکلس پہناؤں گا، جو سعد کی پیدائش پر بڑی چاہ سے کسی اور کے لیے خریدا تھا اور پھر مہمانوں کو لینے ایئرپورٹ جائیں گے پھر اس کے بعد۔" موی کا ہاتھ تھامے چہرہ اس کے چہرے کے قریب کیے وہ اسے اپنی پلاننگ بتا رہا تھا اور وہ کانپ رہی تھی، سر اٹھا کر سوید کی نگاہوں میں دیکھنا اس کے لیے دشوار ہو گیا تھا۔

"سوید تم...... میں۔" ذرا سی ہمت کرتے ہوئے اس کے لبوں نے ہلکی سی جنبش کرنے کی کوشش کی تھی۔ جب سوید نے اپنا ہاتھ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔

"اب نہیں موی...... کوئی ایکسکیوز کوئی بہانہ نہیں۔" وہ اپنا کنٹرول کھو رہا تھا۔ موی گھبرا کر، سرسری سی ایک نگاہ اس پر ڈالتی، سر جھکا گئی کہ اب واقعی فرار کی ساری راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ وہ تاج محل جہاں آزر عباس کے خواب دفن تھے، اسی تاج محل میں ایک نئی زندگی، اپنے نئے خوابوں کے ساتھ اس کی منتظر تھی اور اسے اس بار خوابوں کی انگلی تھام کر ان کے پیچھے چلنا تھا۔

☼ ☼

آصفہ عنبرین قاضی

مکمل ناول

وادی کشمیر میں نرم اور چمکیلی صبح رات کی تاریکی پر حاوی ہو چکی تھی، پرندوں کی مدھ بھری آوازیں سورج کی راج دھانی میں موسیقیت جگا رہی تھیں۔ مظفر آباد کے دامن میں واقع پرانی طرز کی حویلی کے مکین بھی اپنے اپنے کاموں میں جت گئے تھے۔

رحیم داد حویلی کی عقبی دیوار کے ساتھ سر نیہوڑائے آڑو کے پودے کا تھانولا صاف کر کے مرجھائے ہوئے اور گلے سڑے پتے ایک جگہ ڈھیر کر رہا تھا۔ دوسری جانب سجاول عرف جو مہمان خانے کے بھاری بھرکم آبنوسی دروازے کو تارپین کا تیل لگا کر چمکانے میں مصروف تھا۔ مشقت کے باعث سردی کے باوجود اس کی کنپٹیوں پر پسینے کے ننھے قطرے نمودار ہو رہے تھے۔ مگر وہ ان سے بے نیاز تندہی سے کام میں مگن تھا۔ اسی اثنا میں حویلی کے بیرونی گیٹ پر میر صاحب کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ چوکیدار نے آگے بڑھ کر دو پٹ آہنی گیٹ کھول دیا، جیسے ہی گاڑی سست رفتاری سے اندر داخل ہوئی رحیم داد چیتے کی سی پھرتی سے گاڑی کی طرف لپکا۔ ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود بھی وہ ہر کام نہایت چابکدستی اور سرعت سے انجام دینے کی کوشش کرتا اور بدلے میں میر بایزید خان کا ایک تعریفی جملہ اس کا سیروں خون بڑھا دیتا۔ اس کی دلی تقویت کا باعث بنتا اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ذرا سی بھول چوک سے میر صاحب کا پارہ بڑھ جاتا تو وہ اپنے غیض سے اس کا خون جلانے میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑتے، جملہ ملازمین تو موقع کی نزاکت بھانپتے ہی کان لپیٹ کر ادھر ادھر ہو جاتے، سارا نزلہ گرتا تو بے چارے رحیم داد پر، ایسے میں میر صاحب کے ابروؤں کی خفیف سی جنبش بھی اسے لرزہ براندام کرنے کے لیے کافی ہوتی۔

اب بھی وہ میکانکی انداز میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گاڑی کی طرف بڑھا اور جیسے ہی سرمئی لینڈ کروزر سرخ اینٹوں سے بنی راہداری پر رکی وہ مستعدی سے گاڑی کا اگلا دروازہ کھول کر مؤدبانہ انداز میں ایک طرف ایستادہ ہو گیا۔ اندر سے سفید شلوار کرتے میں ملبوس کندھوں پر خاکستر رنگ کی کشمیری چادر پھیلائے میر صاحب پورے کروفر سے برآمد ہوئے باوردی ڈرائیور گاڑی کو بائیں طرف بنے پورچ میں لے گیا۔

"ولید آگیا پنڈی سے؟" انہوں نے ہاتھ میں پکڑی ساگوان کی چھڑی نہایت اہتمام سے زمین پر ٹیکتے ہوئے سوال کیا۔

"نہیں جی ان کا فون آیا تھا کہ چند دن اور لگ جائیں گے۔" رحیم داد ان کے عقب میں چلتے ہوئے بولا۔

"نہایت سست واقع ہوا ہے اسے تو کام ختم کر کے آجانا چاہیے تھا۔" ان کی پیشانی پر برہمی کے آثار نمایاں ہو گئے۔ رحیم داد نے کوئی جواب نہ دیا کہ

خاموشی میں ہی عافیت تھی۔ جیسے ہی بجو کی نظران پر پڑی اس نے تاریچن میں چپڑے ہاتھ ماتھے تک لے جاتے ہوئے دور سے ہی باآواز بلند سلام کیا۔ میر صاحب نے سر کو ہلکے انداز میں جنبش دی اور مرکزی ہال کا بھاری منقش دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ رحیم داد دوبارہ پودوں کی طرف آیا جن کی قطع برید کا کام ابھی باقی تھا۔ اگرچہ وہ حویلی کے خاص اور پرانے ملازموں میں سے تھا' مگر اسے کبھی کبھی کسی ملازم کی عدم دستیابی پر مالی' خانساماں' منشی اور ایلچی کے فرائض بھی سرانجام دینے پڑتے اور وہ کوئی عار محسوس کیے بغیر پوری جانفشانی سے ہر کام تکمیل تک پہنچاتا اور یہ ہی خصوصیت اسے تمام ملازموں سے ممتاز بناتی۔

حویلی کی بالائی منزل کی بالکونی میں کھڑی رتبہ سکندر پوری وادی کا دلچسپی سے جائزہ لے رہی تھی۔ وہ میر صاحب کی لاڈلی بھانجی کراچی سے چھٹیاں گزارنے یہاں آئی تھی' وہ چند سال پہلے اپنی امی' ابو اور بھائی اشعر کے ساتھ آئی تھی۔ مگر اتنے برس گزر جانے کے باوجود بھی اسے حویلی کی روایات اور رکھ رکھاؤ میں کوئی خاص تبدیلی نظر نہ آئی' اس برس جیسے ہی وہ فائنل ایئر کے پیپرز دے کر فارغ ہوئی وہ ضد کر کے کشمیر چلی آئی' اس نے ٹھنڈی ہوا کو اپنے اندر تک محسوس کیا' سامنے گہرے نیلگوں اور جامنی پہاڑوں کے دامن میں چمکتا سورج بادلوں کے باعث نارنجی گولے کی مانند نظر آرہا تھا' مشرقی راستے پر بنی پگڈنڈی پر چند عورتیں لکڑی کی بنی بڑی بڑی ٹوکریوں میں آڑو اور لیچی بھر کر نیچے وادی کی جانب آرہی تھیں' پگڈنڈی کے اطراف میں پھولوں کے کنج تھے۔ گلاب کی ادھ کھلی کلیاں' سفید موتیا اور گل لالہ کے پھول جنگلی گھاس میں گھرے ہوئے تھے۔

پتھریلی سڑک کے کنارے لگے دیودار اور چیڑ کے درختوں میں چھپ کر بیٹھا پپیہا اپنی کوکو سے وادی کے سکوت میں ارتعاش پیدا کر رہا تھا وہ خود کو جیتی جنت میں پاکر بہت خوش تھی' ایسے قدرتی مناظر تو اس کی کمزوری تھے' اس نے سر جھکا کر نیچے لان کی طرف دیکھا' رحیم داد بجو سے محو گفتگو تھا۔

"رحیم داد!" ہال سے میر صاحب کی پاٹ دار آواز گونجی تو رحیم داد بجو کو چھوڑ کر اندر کی طرف دوڑ پڑا۔ رتبہ مسکرا اٹھی۔

"یہ رحیم بابا اتنے ڈرتے کیوں ہیں ماموں جان سے؟" وہ بالکونی چھوڑ کر علیزہ کے پاس چلی آئی جو اس کے چھوٹے ماموں میر سعید کی اکلوتی بیٹی اور اس کی ہم عمر تھی۔

"تایا جان کے غصے سے تو سب کی جان جاتی ہے' مگر یہ رحیم بابا تو کچھ زیادہ ہی سہمے رہتے ہیں۔" علیزہ تپائی پر بلوری رکابی رکھتے ہوئے بولی' جس میں وہ انار کے دانے لائی تھی۔

"سب اسی طرح ڈرتے ہیں ماموں جان سے۔" وہ ہنستے ہوئے انار کے چند دانے منہ میں رکھتے ہوئے بولی۔

"جی نہیں ایک ہستی ایسی بھی پائی جاتی ہے' اس حویلی میں جس کو تایا جان کے غصے کی مطلق پروا نہیں ہوتی۔" علیزہ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے گویا ہوئی۔

"کون؟" وہ متجسس ہوئی۔

"معید خان۔" علیزہ' میر صاحب کے بڑے صاحبزادے کا نام لیتے ہوئے بولی۔

"کیوں وہ بھی تو اسی حویلی میں رہتا ہے۔" رتبہ کو حیرانی ہوئی۔

"یہاں رہتا ضرور ہے' مگر کرتا اپنی مرضی ہے' تایا جان سے زیادہ تو غصہ اس کی ناک پہ دھرا رہتا ہے۔" علیزہ نے کراؤن سے ٹیک لگا کر پاؤں پسارتے ہوئے کہا۔

"اچھا جہاں تک مجھے یاد ہے معید تو بہت سلجھا ہوا تھا۔ میں نے بچپن میں بھی اسے ہنستے مسکراتے ہی دیکھا تھا۔ یہ اس کا مزاج کب سے بدل گیا۔" رتبہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔

"پتا نہیں ماموں تو خود سمجھ نہیں آرہی کہ وہ اتنا بدمزاج کیوں ہو گیا ہے پچھلے تین چار سالوں سے تائی

جان جب تک زندہ تھیں وہ بہت رکھ رکھاؤ سے کام لیتا تھا' ان کی وفات کے بعد تو منہ زور گھوڑے کی مانند ہو گیا ہے جو ذرا سی باگیں کھینچنے پر مالک کو بھی پشت سے گرا دیتا ہے۔"

"ماموں جان سمجھاتے نہیں اس کو؟" رتبہ نے سوال کیا۔

"وہ سنتا ہی کب ہے الٹا چڑ جاتا ہے' اب تو انہوں نے اس کے معاملات میں بولنا ہی چھوڑ دیا ہے' ایک آدھ دفعہ ولید نے بھی بات کی' وہ اس کے بھی سر ہو گیا۔" علیزہ نے ولید کا حوالہ دیا جو معید سے تین سال چھوٹا تھا' مگر اپنی دھیمی طبیعت اور خوش اخلاقی کی وجہ سے باپ اور خاندان کی نظروں میں خاص مقام رکھتا تھا۔

"یہ ہوتا کہاں ہے' میں نے تو دو دن سے دیکھا ہی نہیں' جس دن آئی تھی اس روز سرسری سی ملاقات ہوئی تھی۔" رتبہ معید کی بابت پوچھنے لگی۔

"کبھی زمینوں پر تو کبھی شکار کھیلنے نکل جاتا ہے' تم تو خیر مہمان ہو' ہمیں بھی وہ بھی کبھی نظر آتا ہے' وہ بھی کھانے کی میز پر۔"

"رتبہ بی بی آپ کو میر صاحب بلا رہے ہیں۔" حویلی کی ملازمہ نفیس بی بی نے کمرے کے اندر جھانک کر اطلاع دی۔

"ابھی آئی۔" وہ ٹشو سے ہاتھ صاف کر کے اٹھ کھڑی ہوئی تو وہ سر ہلا کر باہر چلی گئی۔

"تھوڑی سی نشست اب ماموں جان سے بھی ہو جائے' یہاں آئے ہوئے آج تیسرا دن ہے' مگر ان سے تفصیلی گپ شپ ہی نہیں ہوئی۔" وہ دوپٹہ کھول کر شانوں پر پھیلاتے ہوئے بولی۔

"تایا جان تو اسی وقت گھر پہ ہوتے ہیں دوپہر کا کھانا کھا کر پھر چوپال میں جا بیٹھیں گے۔" علیزہ خالی رکابی اٹھا کر دروازے کی جانب بڑھی تو وہ بھی اس کی ہمراہی میں چل پڑی۔

رات کھانے کی میز پر حویلی کے تقریباً" سبھی افراد موجود تھے' سوائے ولید خان کے جو کسی کام سے راولپنڈی گیا ہوا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ رتبہ نے سامنے ٹیبل پر نگاہ دوڑائی جس پر انواع و اقسام کے کھانے سجے تھے' ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ کہاں سے شروع کرے کہ چھوٹی ممانی نے اس کی مشکل حل کر دی۔

"یہ لو تم میں نے اسپیشل تمہارے لیے بنوائی ہے یہ ڈش۔" انہوں نے مچھلی کے سالن والا ڈونگہ رتبہ کے آگے سرکایا۔

"ہوں اس فش کا ذائقہ تو مجھے ابھی تک نہیں بھولا' چند سال پہلے جب میں یہاں آئی تھی تو آپ نے بنا کر کھلائی تھی' کوشش کے باوجود بھی ہمارا کک اس طرح نہیں بنا سکا۔" وہ اپنی پلیٹ میں مچھلی کا سالن اور سلاد رکھتے ہوئے تعریفی انداز میں گویا ہوئی تو چھوٹی ممانی مسکرا دیں' سب خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے' صرف برتنوں اور چمچوں کی ہلکی سی کھٹ پٹ سنائی دے رہی تھی' سب اپنی اپنی پلیٹوں پر جھکے ہوئے تھے' رتبہ کو اس طویل خاموشی سے کوفت ہونے لگی' وہ کھانے کے دوران ہلکی پھلکی گفتگو کرنے کی عادی تھی۔

اسے محسوس ہوا یہاں پر کسی کے پاس بات کرنے کے لیے کوئی موضوع نہیں ہے یا پھر جرات گویائی کی

گئی ہے۔ اس نے ایک نظر اٹھا کر سامنے بیٹھے معید خان کی طرف دیکھا جو کھانے کی میز پر ایسے تاثر کے ساتھ بیٹھا تھا جیسے کسی نے گن پوائنٹ پر لا بٹھایا ہو۔ ماتھے پر ناگواری کی ہلکی سی شکن موجود تھی جو شاید اس کی شخصیت کا حصہ بن چکی تھی۔

پچھلے دو دن میں معید سے اس کا سامنا شام کو پہلی بار ہوا تھا، جب وہ ہال کے اندر داخل ہو رہا تھا تو وہ سامنے ہی کھڑی تھی، رسمی سی دعا سلام کے بعد وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ رتبہ بہت غور سے اسے دیکھ رہی تھی، سرخ و سفید رنگت اور چوڑے جسم کے ساتھ وہ خاصا وجیہہ لگ رہا تھا۔ اگر اس خوب صورت چہرے پر شکنوں کا جال نہ ہوتا تو بلاشبہ وہ ایک بے مثال انسان تھا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ ولید اور معید کے مزاجوں میں اتنا فرق کیوں ہے؟ ولید خان ایک سلجھا ہوا اور خوش مزاج انسان جبکہ معید اس سے یکسر مختلف بقول علیزہ یوں لگتا ہے معید کے اندر کسی وحشی کی روح سمائی ہوئی ہے جو موقع ملتے پر پوری طرح ظاہر ہو جاتی ہے۔ وہ ان ہی سوچوں میں غلطاں تھی کہ معید نے پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا وہ یقیناً اس کی محویت نوٹ کر چکا تھا۔

"ماموں جان ولید کب تک آئے گا؟" اس نے اپنی خجالت چھپانے کے لیے جلدی سے سوال کر ڈالا، معید دوبارہ اپنی پلیٹ پر جھک گیا۔

"اسے آج آ تو جانا چاہیے، ہو سکتا ہے کوئی اور کام پڑ گیا ہو۔" میر بازید نے نیپکن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے جواب دیا وہ سر ہلا کر دوبارہ اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔

اتنے میں ٹیبل پر رکھا معید کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے کچھ دیر کانوں سے لگائے رکھا۔ رتبہ نے بس اس کی ہوں ہاں ہی سنی، وہ موبائل بند کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" میر صاحب نے اسے اچانک اٹھتے دیکھ کر سوال داغا۔

"ایک ضروری کام ہے۔" وہ کرسی کی پشت پر رکھی کشمیری چادر اٹھا کر کندھے پر ڈالتے ہوئے بولا۔

"میں جانتا ہوں کون سے ضروری کام ہیں تمہیں، یہ وقت ہے باہر جانے کا؟" غصے سے میر صاحب کی رگیں تن گئیں۔

"میں اپنے کام کے متعلق آپ سے بہتر جانتا ہوں۔" وہ اتنا کہہ کر رکا نہیں بلکہ آتشی دیوار پر ٹنگی رائفل اٹھا کر باہر لے گیا۔

میر صاحب خاموشی سے لب کاٹ کر رہ گئے۔ اس کے بعد کھانے کی میز پر بڑی دیر تک معید خان کی بدتمیزیوں اور نالائقیوں کا تذکرہ ہوتا رہا، جسے رتبہ خاموشی سے سنتی رہی۔

"رحیم بابا۔" میر بازید نے عقب میں کھڑے رحیم بخش کو بلایا۔

"جی۔" وہ ہاتھ باندھ کر آگے آیا۔

"چوکیدار سے کہو گیٹ مت لاک کرے، پتا نہیں رات کے کس پہر اس خبیث کی واپسی ہو۔" وہ لاکھ غصے میں تھے، مگر معید کی واپسی کے بارے میں بھی فکر مند تھے۔

"جی بہتر۔" رحیم بابا سر ہلا کر باہر چلے گئے۔

رات نے دھیرے دھیرے اپنا سفر شروع کر دیا تھا۔ اردگرد کی وادی مکمل طور پر تاریکی کی لپیٹ میں تھی۔ چاند کی ساتویں تاریخ تھی، جس کی وجہ سے ہلکی دودھیا روشنی ماند پڑتی جا رہی تھی۔ جھینگروں اور مینڈکوں کے ٹرانے کی آوازیں سکوت میں مخل ہو رہی تھیں۔ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا، ایک دل موہ لینے والی موسیقی کی تان سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دالان کی طرف کھلنے والی کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھا، دالان کے بائیں جانب بنے سرونٹ کوارٹر کے باہر سیڑھیوں پر بیٹھا سجو بہت محویت سے رباب بجا رہا تھا، رباب کی تاروں سے نکلنے والی تانیں رات کے پرسکون ماحول کو بہت مسحور کن بنا رہی تھیں، پتا نہیں کیسی نغمگی تھی اس دھن میں کہ رتبہ کا دل چاہا کہ وہ پاس جا کر رباب سنے اس نے پردہ گرا کر ایک نظر پاس سوئی ہوئی علیزہ پر ڈالی اور شال لپیٹ کر آہستگی سے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی، حویلی میں ویرانی کا راج تھا، چوکیدار گیٹ کے قریب رکھی کرسی پر اونگھ رہا تھا۔

اگرچہ ابھی اتنی سردی نہیں تھی مگر رات کی وجہ سے فضا میں خنکی موجود تھی، وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی سرونٹ کوارٹر کی جانب بڑھی جہاں سجو آنکھیں موندے رباب بجانے میں مصروف تھا، وہ خاموشی سے سیڑھیوں کے ساتھ رکھی چارپائی پر ٹک گئی۔

وہ رتبہ کی آمد سے یکسر بے نیاز گود میں رکھے رباب پر جھکا تانیں چھیڑنے میں مصروف تھا، یہ موسیقی رتبہ کو اپنی زندگی کا بہترین تجربہ لگ رہی تھی، کتنا سوز و گداز تھا ان تانوں میں وہ محویت سے سجو کو دیکھ رہی تھی۔ اسی اثنا میں اسے اپنے عقب میں ہلکا سا کھٹکا محسوس ہوا اس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تو ٹھٹک کر رہ گئی۔ معید خان اس کے بالکل پیچھے کھڑا تھا، اسے موقع کی نزاکت کا اب احساس ہوا تھا۔ رات کے اس پہر وہ اپنے کمرے سے اٹھ کر یہاں چلی آئی تھی یہ سوچے سمجھے بغیر کہ کوئی بھی اس کو دیکھ سکتا ہے۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو اس وقت؟" وہ اپنی چوگوشیا ٹوپی کو کانوں سے ہٹاتے ہوئے کڑے تیوروں سے مخاطب تھا، اسے پتا ہی نہیں چلا کب گیٹ کھلا اور معید کی واپسی ہوئی۔

"وہ... وہ میں رباب سننے آئی تھی۔" متوقع صورت حال کا سوچ کر اس کا حلق خشک ہونے لگا، پتا نہیں معید کیا سمجھے گا۔

"ہمارے گھر کی عورتیں یوں آدھی رات کو حویلی سے باہر نہیں نکلتیں۔" وہ ایک لفظ چبا کر بولا۔

"معید پلیز میں نے حویلی سے باہر قدم نہیں نکالا، غلط مت سمجھنا۔" وہ اٹھ کر ہمت مجتمع کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔

"رات گئے ایک غیر مرد کے پاس بیٹھ کر موسیقی سننا حویلی سے باہر نکلنے سے بھی زیادہ گھناؤنی حرکت ہے۔" وہ غرا کر بولا اور پھر خونخوار نظروں سے سجو کی طرف دیکھا۔ سجو کے لیے یہ تمام صورت حال غیر متوقع تھی، وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ رباب کی دھن رتبہ سکندر کو حویلی کے ایوانوں سے کھینچ کر اس کے سامنے بٹھا دے گی، معید خان کو سامنے دیکھ کر خوف...

سے اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔
"نمک حرام، بے غیرت۔" وہ جارحانہ انداز میں تجو کی طرف بڑھا۔
"چھوٹے خان میرا کوئی قصور نہیں، مجھے معاف کردیں۔" وہ ملتجیانہ انداز میں دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔
"تجھے تو میں زندہ گاڑ دوں گا، امیر خسرو کے جانشین۔" وہ اسے گریبان سے پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے دھاڑا اور گدی سے پکڑ کر چٹاخ اس کے گالوں پر تھپڑ رسید کیا۔
"معید اس معصوم کو کیوں مار رہے ہو، میں تو خود آئی تھی یہاں۔" وہ تقریباً چیختے ہوئے بولی، مگر وہ سنی ان سنی کرکے تجو کو زمین پر گرا کر جانوروں کی طرح ہاتھوں اور ٹھڈوں کی مدد سے مار رہا تھا۔ وہ دونوں ہتھیلیاں منہ پر رکھے خوف سے پیچھے ہٹ گئی۔ تجو درد کی شدت سے کراہ رہا تھا، جیسے ہی معید کی نظر گھاس پر رکھے رباب پر پڑی وہ تجو کو چھوڑ کر اس کی طرف لپکا۔
"میں دیکھتا ہوں یہ پھر کیسے بجتا ہے اس حویلی میں۔" اس نے بڑبڑاتے ہوئے رباب کو ہاتھ میں اٹھا کر زمین پر دے پٹخا اور پوری قوت سے اوپر دایاں پاؤں مارا، بھاری بوٹوں کی طاقت سے کرچ کی آواز کے ساتھ رباب کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہوگیا۔ تجو زمین پر اوندھا پڑا تھا، اسی اثنا میں چوکیدار بھی وہاں آپہنچا۔
"اسے لے جاؤ۔" اس نے ڈپٹ کر چوکیدار سے کہا۔
"جی اچھا!" وہ کراہتے تجو کو کندھوں پر اٹھا کر سرونٹ کوارٹر کی طرف چل دیا۔ رتبہ آنکھوں میں خوف اور تاسف لیے معید کو دیکھ رہی تھی، وہ دوبارہ اس کی طرف پلٹا۔
"ایک بات یاد رکھنا رتبہ بی بی۔" وہ ہانپتے ہوئے رتبہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا، وہ سہم کر تھوڑا پیچھے سرک گئی۔
"اس حویلی میں کسی بھی ایسے رواج کی بنیاد مت ڈالنا جو ہماری عورتوں کو باغی بنادے، یہ موسیقی کے شوق کراچی میں ہی پورے کرنا۔" وہ چادر جھاڑ کر کندھے پر رکھتے ہوئے نخوت سے بولا تو وہ جیسے خرد کی دنیا میں لوٹ آئی۔
"حویلی کی کوئی لڑکی اگر موسیقی سن لے تو وہ گناہ گار اور باغی ہوجاتی ہے، ایسا کوئی قانون اس حویلی کے مردوں پر لاگو نہیں ہوتا، جو رات گئے باہر رہ کر من مانیاں کرتے پھرتے ہیں؟" اس نے بالواسطہ معید کی ذات کو نشانہ بنایا اور وہ یہ کڑوا سچ سن کر تلخی سے مسکرا دیا، کچھ دیر اس کے پیروں کو دیکھتا رہا، پھر دھیرے سے گویا ہوا۔
"کوئی مرد ایسی غلطی کرے تو وہ اس کی نادانی ہوتی ہے اور ایسی غلطی اگر عورت کرے تو وہ اس کا جرم ہوتا ہے اور غلطی تو قابل معافی ہوتی ہے، مگر جرم قابل سزا۔" وہ ایک ایک پر زور دیتے ہوئے بولا۔
"تم کون ہوتے ہو مجھے جرم و سزا کے بارے میں خبردار کرنے والے۔" وہ درشتی سے بولی، اسے معید کا یوں رعب جھاڑنا بہت برا لگا تھا۔
"میں کون ہوں اس بحث میں پڑنے کی بجائے تم اپنی حرکت پر غور کرنا، میں حویلی کی روایات کو سمجھانے کے لیے پہلا سبق دے رہا ہوں اور پہلا سبق ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے، فکر نہ کرو یہ بات کسی کو پتا نہیں چلے گی کہ رتبہ بی بی آدھی رات کو موسیقی کا شوق پورا کرنے کے لیے سرونٹ کوارٹر تک چلی آئی تھی، مگر آئندہ محتاط رہنا۔" وہ اتنا کہہ کر تیز تیز قدم اٹھاتا اندر کی طرف بڑھ گیا، وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے کچھ دیر گھاس کو دیکھتی رہی، پھر سست روی سے اپنے کمرے میں چلی گئی، اس نے کھڑکی کے شیشے سے سرونٹ کوارٹر کو دیکھا، کمرے کا دروازہ بند تھا، مگر لالٹین کی روشنی روشن دان سے باہر آرہی تھی، وہ تاسف سے سر ہلا کر بیڈ پر لیٹ گئی۔
"کاش میں ہی باہر نہ جاتی، کم از کم وہ معصوم انسان تو مار پیٹ سے بچ جاتا۔" وہ بیڈ پر لیٹتے ہوئے سوچ رہی تھی، وہ خود کو تجو پر ہونے والے تشدد کا ذمہ دار سمجھ رہی

تھی۔
اگلے دن اس واقعے کا کوئی ذکر نہ ہوا۔ تجو بخار کا بہانہ کرکے اندر نہ آیا اور معید سے حسب توقع اس کا سامنا ہی نہ ہوا، وہ دل ہی دل میں شکر ادا کررہی تھی کہ یہ بات باہر نہیں نکلی، ورنہ وہ کس کس کو وضاحتیں پیش کرتی جو بھی تھا یوں رات گئے سرونٹ کوارٹر میں جانا سب کے لیے یقیناً "اچنبھے کی بات ہوتی اور بات کا بتنگڑ بنتے دیر نہیں لگتی۔

✧ ✧ ✧

چڑیوں کی چہچہاہٹ نے ماحول کو عجیب سی موسیقیت عطا کر رکھی تھی، رتبہ نے سامنے والی کھڑکی سے باہر دیکھا، سہ پہر ڈھل کر سایوں کو لمبا کررہی تھی، اس نے ہاتھ میں پکڑا میگزین سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور اٹھ کر کھڑکی کے قریب چلی آئی اور دونوں پٹ پوری طرح کھول دیے، سامنے جامنی رنگ کے پہاڑ بہت خوب صورت منظر پیش کررہے تھے، سفید کونجوں کی ڈار پہاڑوں سے اڑ کر جھیل کی جانب محو پرواز تھی، حویلی کی دیوار کے ساتھ لگے شاہ بلوط اور شیشم کے درخت ٹھنڈی ہواؤں میں رقصاں تھے، اس نے گہری سانس کھینچ کر تازہ ہوا کو اندر بھرنے کی سعی کی، باہر کا خوب صورت موسم غضب ڈھا رہا تھا اور وہ ایسے موسم کی دیوانی تھی۔
اسے کشمیر آئے ہوئے آج آٹھواں دن تھا، مگر ابھی تک اسے وادی کی سیر کا موقع میسر نہیں آیا تھا، ماموں جان اپنے کاموں میں مصروف تھے اور ولید ابھی تک راولپنڈی سے نہیں لوٹا تھا اور معید کے ساتھ باہر جانے کی بات کرکے وہ کوئی اور بدمزگی پیدا کرنے کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اسے لڑکیوں کا وادی میں کھلے عام گھومنا پھرنا پسند نہیں تھا۔ مگر وہ تو آئی ہی وادی کی سیر کے لیے تھی، اس نے ایک نظر دوبارہ تاحد نگاہ پھیلے پہاڑوں کی طرف دیکھا، روئی کے گالوں کی مانند سفید بادل مشرق کی جانب سے نمودار ہورہے تھے، شریر ہوا کی اٹکھیلیوں میں تیزی آگئی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اس کے گلابی رخساروں سے ٹکرایا تو اس نے کھڑکی کے پٹ آہستگی سے بند کردیے۔
اسے اچانک کوئی خیال سوجھا تو بال سمیٹ کر سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نیچے والی منزل پر چلی آئی، تجو ڈرائنگ روم کے دبیز قالین پر پاؤں پسارے صوفے کے ساتھ سر ٹکائے اونگھ رہا تھا، رتبہ کو بالائی منزل کی سیڑھیاں اترتے دیکھا تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔
"سلام بی بی جی۔" وہ حسب عادت ماتھے تک ہاتھ لے جاتے ہوئے مؤدب انداز میں گویا ہوا۔
"وعلیکم السلام! علیزہ بی بی کدھر ہیں۔" اس نے ویران سے ڈرائنگ روم پر نظر دوڑائی اس کا خیال تھا وہ یقیناً "یہاں بیٹھ کر ٹی وی دیکھ رہی ہوگی مگر اس کا اندازہ غلط نکلا تھا۔
"جی وہ تو ابھی اٹھ کر کچن میں گئی ہیں، بلا لاؤں؟"
"بیٹھو میں دیکھ لیتی ہوں۔" وہ اسے بیٹھنے کا اشارہ کرکے کچن کی طرف چلی آئی اور تجو دوبارہ نیچے بیٹھ کر اونگھنے کی تیاریوں میں لگ گیا۔ علیزہ باورچی خانے میں کھڑے ہو کر فیض بی بی کو رات کے کھانے کا مینیو بتا رہی تھی اور وہ اس کی ہدایات پر ایک روبوٹ کی مانند سر ہلا رہی تھی۔
"اور دیکھو پالک میں قیمہ مت ڈالنا تایا جان پسند نہیں کرتے، وہ الگ سے بھون لینا۔" وہ فریج کھول کر جائزہ لیتے ہوئے بولی۔
"ٹھیک ہے جی۔" فیض بی بی نے اثبات میں سر ہلایا اور پالک کے پتے توڑنے لگی۔
"علیزہ بات سنو۔" رتبہ کچن کے دروازے پر ہاتھ رکھ کر آہستگی سے بولی تو وہ فریج کا دروازہ بند کرکے اس کی طرف پلٹی۔
"سناؤ۔" وہ اس کے روبرو آن کھڑی۔
"یار موسم دیکھا ہے تم نے کتنا زبردست ہو رہا ہے۔" وہ کچن کی مشرق کی طرف کھلنے والی کھڑکی کی طرف اشارہ کرکے بولی۔
"یہاں تو تقریباً" ہر وقت یہ ہی موسم اسی طرح رہتا

ہے۔" رتبہ کی خبر اس کے لیے زیادہ معلومات افزا ثابت نہ ہوئی۔

"کیا خیال ہے جھیل پر چلیں آؤٹنگ کے لیے۔" وہ دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے مچل کر بولی۔

"اس وقت گھر میں کوئی بھی نہیں ہے' ہم بھلا کیسے جاسکتے ہیں۔" علیزہ نے اسے مایوس کن جواب دیا۔

"یہ کیا بات ہوئی' نور محمد ہے نا وہ گاڑی ڈرائیو کرلے گا' ہم اس کے ساتھ ہو آئیں گے۔" رتبہ نے کندھے اچکا کر فوراً "حل پیش کردیا۔

"بات گاڑی چلانے کی نہیں ہے یار۔" علیزہ کچن سے نکل کر ڈرائنگ روم میں جاتے ہوئے بولی' وہ بھی اس کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں چلی آئی' جہاں مجتبیٰ قالین پر لیٹ کر گہری نیند کے مزے لے رہا تھا۔

"یہاں ڈرائیور کے ساتھ عورتوں کا باہر نکلنا برا سمجھا جاتا ہے' ساتھ گھر کا مرد ہو تو اور بات ہوتی ہے اور اس وقت تو کوئی مرد بھی گھر پہ نہیں ہے۔" وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے رتبہ کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

"اففوہ ہم نے کون سا زیادہ دور جانا ہے' یہ سامنے ہی تو جھیل ہے' شام ہونے سے پہلے واپس آجائیں گے' ممانی جان سے پوچھ لو۔" رتبہ مصر تھی۔

"امی تو خیر کچھ نہیں کہیں گی' مگر رسک لینے والی بات ہے' سوچ لو دیر بھی ہوسکتی ہے۔" علیزہ نے اسے ہراساں کرنا چاہا۔

"کہا نا تھوڑی دیر میں واپس آجائیں گے رسک لے کون رہا ہے۔" رتبہ نے قدرے چڑ کر کہا' اسی اثنا میں رحیم داد اندر داخل ہوا تھا۔

"رحیم بابا بات سنیں۔" رتبہ نے دور سے ہی اسے پکارا تھا۔

"جی بیٹا۔" وہ اوپر جانے کا ارادہ ملتوی کرکے رتبہ کی طرف چلا آیا۔

"بابا' ماموں جان کہاں ہیں؟" رتبہ نے استفسار کیا۔

"بڑے میر صاحب تو نیچے وادی میں احسان اللہ کی چوپال میں بیٹھے ہیں۔"

"اور چھوٹے ماموں۔" اس نے علیزے کے ابو کی بابت دریافت کیا۔

"وہ تو اس وقت بڑے اصطبل کا جائزہ لینے گئے ہیں' شندور میلے کے لیے نئے گھوڑے آرہے ہیں' ادھر ہی مصروف ہیں۔" رحیم داد کے پاس گھر کے تمام افراد کی مصروفیات کا حساب کتاب موجود تھا۔

"اچھا۔" وہ پرسوچ انداز میں قالین پر بنے ڈیزائن کی طرف دیکھنے لگی۔

"اصل میں ہم نور محمد کے ساتھ ذرا جھیل کی سیر کے لیے جانا چاہتے ہیں تو آپ چلیں نا ہمارے ساتھ تاکہ ہمیں تسلی رہے۔" وہ رحیم داد چونکہ گھر کا پرانا اور قابل بھروسہ ملازم تھا' اس لیے رتبہ کو وہ اس وقت ساتھ لے جانے کے لیے بہت موزوں نظر آیا۔

"وہ بیٹا جی اس وقت تو مجھے زمینوں کے کاغذات لے کر بڑے میر صاحب کے پاس جانا ہے' وہ چوپال میں انتظار کررہے ہیں' ذرا سی بھی تاخیر ہوگئی تو وہ ناراض ہوں گے۔" رحیم داد نے دبے لفظوں میں صاف انکار کردیا تھا۔

"ٹھیک ہے آپ جائیں۔" وہ گہری سانس لے کر صوفے پر ڈھے سی گئی' مایوسی چہرے سے صاف مترشح تھی۔ رحیم داد چادر کی بغل مارے اوپری منزل کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔

علیزہ مسکرا کر اسے دیکھ رہی تھی اور وہ لب بھینچ کر سامنے دیوار پر لگی جانوروں کی خشک کھالوں کو اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہاں باہر نکلنے کے لیے کتنے مشکل مراحل سے گزرنا پڑتا ہے' کراچی کا تو جب موسم ذرا اچھا ہوتا تھا وہ اشعر یا مما کے ساتھ ساحل سمندر پر چلی جاتی تھی' مگر یہاں معاملہ اس کے برعکس تھا۔ وہ اسی کوفت میں مبتلا بیٹھی تھی کہ مرکزی دروازے سے میر سعید اندر داخل ہوئے تھے' چہرے سے تھکاوٹ کے آثار بڑے واضح نظر آرہے تھے۔

"السلام علیکم' ماموں جان۔" وہ خوشی سے اپنی جگہ

سے اٹھ کھڑی ہوئی' انہوں نے شفقت سے سلام کا جواب دیا اور ٹوپی بڑے میز پر رکھ کر صوفے پر بیٹھ گئے۔ چند رسمی جملوں کے بعد رتبہ اپنے اصل مدعا پر آگئی۔

"ماموں جان پلیز میں تو بور ہوگئی ہوں آپ ہمارے ساتھ یا پھر نور محمد کے ساتھ جانے کی اجازت دے دیں۔" وہ ملتجانہ تھی' تھوڑی سی حیل و حجت کے بعد وہ مان گئے تھے۔

"ٹھیک تم دونوں چلی جاؤ نور محمد کے ساتھ' میں تو اس وقت بہت زیادہ تھکا ہوا ہوں مجتبیٰ کو بھی ساتھ بھیج دیتا ہوں اور شام سے پہلے واپس آجانا' راستے میں جنگلی جانوروں کا خطرہ بھی ہوتا ہے۔" انہوں نے ہدایات جاری کرتے ہوئے اجازت دی تو رتبہ خوشی سے اچھل پڑی' نور محمد باہر پائپ لگا کر گاڑی دھو رہا تھا' جب میر سعید نے اسے ان دونوں کو جھیل دکھانے کا حکم دیا۔

"اور سنو ادھر مغربی پگڈنڈی سے جانے کی بجائے سامنے سے نکل جانا' ادھر سڑک نسبتاً کم پتھریلی ہے۔" وہ آخری ہدایت دیتے ہوئے واپس حویلی میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں نور محمد کے پاس حویلی کے گیٹ پر کھڑی تھیں' وہ گاڑی کا تیل پانی چیک کرنے کے بعد ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر بیٹھ گیا۔

"بیٹھیں۔" نور محمد نے گاڑی کا شیشہ نیچے کرکے ان دونوں کو کہا۔ رتبہ نے جونہی پچھلے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اس کی نظر گیٹ سے اندر داخل ہونے والے معید خان پر پڑی' وہ ان دونوں کو گاڑی کے پاس کھڑا دیکھ کر چونکا تھا' کندھے پر لٹکتی بندوق سے اندازہ ہورہا تھا کہ وہ ابھی ابھی شکار سے واپس لوٹا ہے۔

"کدھر جارہی ہو تم دونوں۔" اس نے قریب آکر قدرے نرمی سے دریافت کیا تھا' مگر ماتھے پر نمودار ہونے والی شکنیں اندر کا احوال بتا رہی تھیں۔

"ہم ذرا باہر گھومنے جارہی ہیں' ماموں جان کو بتایا ہے۔" رتبہ نے گرم شال کو اچھی طرح لپیٹتے ہوئے کہا' علیزہ خاموشی سے رتبہ کی آڑ لے کر کھڑی ہوگئی۔

"اس وقت اندھیرا پھیلنے والا ہے اور اوطرکا علاقہ بہت خطرناک ہے' یہ کون سا وقت ہے سیر کرنے کا۔" اس نے کڑے تیوروں سے گاڑی کی طرف دیکھا۔

"ہم زیادہ دور نہیں جائیں گے' بس جھیل دیکھ کر واپس آجائیں گے' مجتبیٰ بھی ساتھ جارہا ہے۔" رتبہ نے حد درجہ ضبط سے کام لیتے ہوئے تاویلیں پیش کیں' اسے معید کا یوں ہر کام میں دخل اندازی کرنا زہر لگ رہا تھا' مگر موقع کی نزاکت بھانپتے ہوئے اس نے لہجے کو کافی حد تک نرم رکھا۔

"اس وقت کوئی نہیں جائے گا' چلو اندر۔" اس نے درشتی سے حکم صادر کیا۔

"ہمیں ماموں جان نے....."

"زیادہ بحث نہیں میں نے کہا نا تم لوگ باہر نہیں جاؤ گی' کم از کم میں یہ برداشت نہیں کرسکتا۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر رتبہ کی بات کو درمیان سے اچک لیا تھا۔

"گاڑی اندر کھڑی کرو نور محمد۔" اس نے رتبہ کے چہرے پر عود آنے والی ناگواری اور حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے گاڑی کے اندر بیٹھے ہوئے نور محمد کو حتمی انداز میں کہا اور کندھے پر لٹکتی چادر کو جھٹکا دے کر راہ داری کی سرخ اینٹوں پر اندر کی طرف چل دیا۔

"آپ گاڑی چلائیں نور بابا' دیکھتی ہوں یہ طرم خان کیا کرتا ہے۔"

رتبہ غصے سے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی اور باہر کھڑی علیزہ کا بھی بازو کھینچ لیا' وہ کسی سہمی ہوئی چڑیا کی طرح رتبہ کے پہلو میں دبک کر بیٹھ گئی معید نے اپنے قدم روک لیے تھے۔

"چلو نور محمد!" رتبہ نے اسے قدرے اونچی آواز میں کہا' نور محمد کشمکش میں مبتلا تھا' جو ابھی تک باہر کھڑا کن انکھیوں سے معید خان کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ رہا تھا' بالآخر نور محمد نے گاڑی اسٹارٹ کردی' جونہی گاڑی کے ٹائر چرچرائے معید خان نے گھوم کر پیچھے دیکھا تھا۔

"رک جاؤ نور محمد!" وہ حلق کے بل دھاڑا تھا۔

"آپ گاڑی چلائیں۔" رتبہ نے سختی سے ہدایت

جاری کی نور محمد کے اسٹیرنگ پر ڈھیلے پڑتے ہاتھ پھر حرکت میں آئے اسی لمحے معید خان نے کندھے پر لٹکتی رائفل اتاری فائر کی زوردار آواز سب کے کانوں سے ٹکرائی تھی گاڑی کا پچھلا ٹائر رائفل سے نکلنے والی گولی سے برسٹ ہوچکا تھا گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی غم و غصے سے رتبہ کی سانس بند ہونے لگی تھی۔

توہین اور دکھ کے احساس سے رتبہ کی آنکھیں بھیگنے لگیں نور محمد پتھر کا بت بنا حیرت سے گنگ ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان تھا جو کچھ ہوا تھا اس کی تو اسے ذرہ بھر بھی توقع نہ تھی معید اپنی ازلی بدتہذیبی اور غیض کا مظاہرہ کرکے اندر حویلی میں غائب ہوچکا تھا۔ رتبہ شکست خوردہ قدموں سے گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی ڈری سہمی علیزہ نے اس کی پیروی کی شام دھیرے دھیرے گہری ہورہی تھی کمرے میں رتبہ کی دبی دبی سسکیاں ابھر رہی تھیں۔

"پلیز رتبہ چپ ہوجاؤ اس کی طبیعت کا تمہیں علم تو ہے اس لیے تو منع کررہی تھی مجھے پتا تھا وہ آگیا تو ضرور کوئی نہ کوئی ہنگامہ کھڑا ہوجائے گا۔" وہ گھٹنوں پر سر رکھے روتی ہوئی رتبہ کو رسان سے سمجھا رہی تھی۔

"علیزہ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی وہ اس حد تک جاسکتا ہے اس قدر انسلٹ کی ہے اس نے میری!" وہ گھٹنوں سے پیشانی اٹھا کر گلوگیر لہجے میں بولی۔

"اس کی حدیں تو کوئی بھی متعین نہیں کرسکا اس کے رویے پر خوامخواہ دل جلانے کا فائدہ۔!" علیزہ اس کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"خوامخواہ؟" اس نے چونک کر علیزہ کو دیکھا آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھری ہوئی تھیں۔

"تم نے اپنی آنکھوں سے سارا تماشا دیکھا ہے کتنی بے عزتی کی ہے اس نے ہماری اور تم کہہ رہی ہو میں خوامخواہ اپنا دل جلا رہی ہوں کم از کم مجھ سے تو اس کی بدتمیزی اور بدتہذیبی برداشت نہیں ہوسکتی سمجھتا کیا ہے وہ اپنے آپ کو اجڈ گنوار انسان۔" وہ غصے سے بھری بیٹھی تھی علیزہ گہری سانس لے کر اسے تکنے لگی وہ بھی اپنی جگہ حق بجانب تھی معید کا رویہ کس قدر نازیبا تھا رتبہ کی پلکوں پر آنسو موتیوں کی طرح جھلملا رہے تھے اس نے ذرا سی پلکوں کی شاخوں کو حرکت دی تو وہ گلابی رخساروں کو تر کرگئے۔

"ارے اب رونا بند کرو پلیز میں بھی تو یہی کہہ رہی ہوں کہ اب اس کے رویے پر افسوس کرنے کا فائدہ جب اسے اچھائی یا برائی میں فرق کا پتا ہی نہیں ہے۔" وہ انگلی کی پور سے اس کے گالوں پر آئی نمی کو صاف کرتے ہوئے بولی۔

"مجھے بس اب کراچی جانا ہے یہاں اب مزید نہیں رک سکتی۔" وہ آنکھیں رگڑتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں بولی۔

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی پھپھو کیا سوچیں گی؟"

"کچھ بھی ہو مجھ سے اب یہ مزید برداشت نہیں ہوگا اور نہ ہی میں ایسی فضول روک ٹوک کی عادی ہوں۔" وہ حتمی انداز میں گویا ہوئی۔

"اس طرح تو وہ سمجھے گا کہ تم بہت کمزور نکلی ہو یوں بزدلوں کی طرح کراچی بھاگ جانا کہاں کی دانشمندی ہے۔" علیزہ اسے قائل کرنے کی ہر ممکن کوشش کررہی تھی۔

"اگر میں یہاں مزید رکی تو وہ کوئی تماشا بھی کھڑا کرسکتا ہے پتا نہیں اس کو مجھ سے اتنی چڑ کیوں ہے اور میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے حویلی میں کوئی بدمزگی پیدا ہو۔"

"اسے صرف تم سے پرخاش نہیں ہے ہر وہ بندہ جو اس کی سوچ اور مرضی کے خلاف چلے وہ اس سے خار کھاتا ہے اور اس سے یقیناً یہ برداشت نہیں ہوا ہوگا کہ ہم اس کی مرضی کے برخلاف باہر جاتے۔"

رتبہ کوئی جواب دیے بغیر خاموشی سے اپنے پاؤں کی طرف دیکھنے لگی وہ علیزہ کے دلائل سے متفق نہیں ہوسکی تھی۔

"اچھا بابا ٹھیک ہے اگر تم جانا ہی چاہتی ہو تو چلی جانا مگر ولید کے آنے کا تو انتظار کرلو تمہیں کراچی لے کون جائے گا!" علیزہ نے اس کی طویل خاموشی سے تنگ آکر ہتھیار ڈال دیے۔

"پتا نہیں وہ کب آئے میں اشعر کو فون کردوں گی۔" اس نے قالین پر پاؤں پسارتے ہوئے قدرے نرمی سے کہا۔

"بس آج کل میں آنے والا ہے فی الحال تم یہ جانے کی رٹ چھوڑو۔" علیزہ نے دونوں ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا اسی اثنا میں کمرے کا دروازہ کسی نے دھیرے سے کھولا تھا ان دونوں نے میر بازید خان کو اندر داخل ہوتے دیکھا رتبہ نے جلدی سے بیڈ پر رکھا اپنا دوپٹہ اٹھایا اور مناسب طریقے سے شانوں پر پھیلا لیا۔ وہ دونوں ان کی اچانک آمد پر حیران کھڑی تھیں۔

"کیسی ہو بیٹا؟" وہ رتبہ کو دیکھتے ہوئے شفقت سے بولے وہ ساگوان کی چھڑی قالین پر ٹکا کر دونوں ہاتھوں کا وزن اس پر ڈال کر کھڑے تھے۔

"ٹھیک ہوں ماموں جان! آپ بیٹھیے نا!" اس نے جلدی سے دائیں طرف دھری کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"مجھے ذرا جلدی ہے کچھ مہمان بیٹھے ہیں نیچے مجھے تھوڑی دیر پہلے نور محمد نے آج شام کے واقعے کے بارے میں بتایا ہے معید نے جو کچھ بھی کیا ہے میں نے اس سے بھی باز پرس کی ہے بلکہ اسے ڈانٹا بھی ہے۔" رتبہ کو ان کی آمد کا مقصد سمجھ آگیا تھا وہ مہر بہ لب ان کی بات سن رہی تھی میر صاحب تھم تھم کر بول رہے تھے۔

"لیکن اس میں کچھ غلطی تم دونوں کی بھی ہے وادی کی سیر کرنا کوئی معیوب بات نہیں مگر زیادہ بہتر یہ تھا کہ تم دونوں ولید کی واپسی کا انتظار کرلیتیں، معید غصے کا ذرا تیز ہے اسے یوں سرِشام عورتوں کا باہر نکلنا پسند نہیں' ہاں مگر اس کے روکنے کا طریقہ بھی ٹھیک نہیں تھا۔" وہ یوں سر جھکائے اپنے ماموں کے سامنے کھڑی تھی جیسے ساری غلطی اسی کی ہو مگر وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ وہ معید کی حرکت کا دفاع کررہے تھے یا اس کی بدتمیزی کو حق بجانب سمجھ رہے تھے۔

"مگر ماموں جان ہم وہاں اکیلی تھوڑی جارہی تھیں نور محمد اور بجو بھی ہمارے ساتھ تھے۔" اس نے اپنی دانست میں ٹھوس دلیل پیش کی مگر وہ بھی میر صاحب کے لیے نہایت بودی ثابت ہوئی۔

"وہ اس گھر کے ملازم ضرور ہیں بیٹا مگر ہمارے گھر کی عورتوں کے محرم نہیں' اس علاقے میں ہمارے کئی دشمن بھی ہیں جو ایسی باتوں کو اچھال دیتے ہیں یہاں ہر قدم پھونک کر رکھنا پڑتا ہے ہمیں اور اس حویلی کی عورتوں کے بارے میں تو ہمیں خاص طور پر محتاط رہنا پڑتا ہے تاکہ تاک میں بیٹھا کوئی دشمن ہماری لاپروائی سے فائدہ نہ اٹھالے تم سمجھ رہی ہو نا میری بات!" وہ پیار سے رتبہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تم فکر نہ کرو ولید آگیا تو تمہیں سارے علاقے کی سیر کروائے گا پھر معید سمیت کسی کو بھی اعتراض کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔" وہ ہنوز چھڑی پر ہلکا سا دباؤ ڈالے رتبہ کے سامنے ایستادہ تھے۔

"اور میں نے معید سے کہا ہے کہ وہ اپنی حرکت پر تم سے معافی مانگے بس آپ اپنا موڈ ٹھیک کرلو۔" وہ اس کے گال تھپتھپا کر واپس مڑے اور کمرے سے باہر نکل گئے اور وہ طنزاً مسکرا دی۔

"معید خان اور معافی۔ ماموں جان بھی کتنے سادہ ہیں۔" وہ بال سمیٹتی ہوئی دوبارہ قالین پر بیٹھ گئی۔

"معافی مانگنا اخلاقیات کے زمرے میں آتا ہے اور معید تو اخلاقیات کی ابجد تک سے واقف نہیں۔" وہ لب کاٹ کر سوچنے لگی۔

☼ ☼ ☼

رحیم داد باغیچے میں رکھی کرسیوں کو کپڑے کی مدد سے صاف کرنے میں مصروف تھا وہ گرم پانی سے غسل کے بعد ہاتھ میں میگزین لیے وہاں چلی آئی۔ سورج کی نرم و نازک کرنیں سرسبز لان کو بوسہ دے چکی تھیں صبح کی سبک خرام ہوا آس پاس ایستادہ ببول اور شیشم کے پتوں میں سرسراہٹ پیدا کررہی تھی اگرچہ گھر کے باقی مکین ابھی پوری طرح بیدار نہیں ہوئے تھے مگر

رتبہ کی آنکھ حسب عادت فجر کے وقت ہی کھل گئی تھی اور کسلمندی سے بستر پر پڑے رہنے کی بجائے اس نے ہوا خوری کو ترجیح دی اور ذرا سی روشنی پھیلنے کے بعد باغیچے کی طرف آنکلی۔

"بیٹا چائے لے آؤں تمہارے لیے؟" رحیم داد نے کرسیوں کے درمیان رکھی تپائی پر کپڑا رگڑتے ہوئے رتبہ سے پوچھا۔

"نہیں بابا! رہنے دیں مجھے عادت نہیں ہے صبح سویرے چائے پینے کی۔" اس نے میگزین کی ورق گردانی کرتے ہوئے سہولت سے منع کردیا وہ دوبارہ صفائی میں مصروف ہوگیا۔

"رحیم بابا رات کو کون آیا تھا میں نے گاڑی کی آواز سنی تھی۔" اسے اچانک خیال آیا تو پوچھنے لگی رات کا پتا نہیں کون سا پہر تھا کہ گاڑی کے تیز ہارن سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی پھر گیٹ کھلنے کی آواز بھی اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی دوسری منزل پر موجود اس کے کمرے کی کھڑکی لان اور گیٹ کی طرف کھلی تھی جس کی وجہ سے گیٹ پر ہونے والا ہلکا سا کھٹکا بھی کمرے میں سنائی دیتا۔

"رات کو تو ولید خان واپس آئے تھے!" رحیم داد نے سر پر رکھی چترالی ٹوپی کو درست کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا.... ولید آگیا!" اسے حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی بھی ہوئی۔

"انہوں نے آتے ہی آپ کا پوچھا تھا مگر آپ اس وقت سو رہی تھیں پھر وہ بڑے میر صاحب سے مل کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔" رحیم داد ایک طرف کھڑا ہو کر اسے تفصیل بتانے لگا۔

"ٹھیک ہے آپ جائیں۔" وہ دوبارہ میگزین کی طرف جھکتے ہوئے بولی تو وہ سر کو جنبش دے کر وہاں سے چلا گیا میگزین پڑھتے اسے ہلکا سا کھٹکا محسوس ہوا اس نے نظروں کے سامنے سے میگزین ہٹایا تو سامنے والی کرسی پر ولید کا مسکراتا چہرہ موجود تھا۔

"ارے تم کب آئے۔" اس نے حیرت سے میگزین تپائی پر رکھتے ہوئے ولید کی طرف دیکھا۔

"رات کو دو بجے!" وہ دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے بولا۔

"وہ تو مجھے پتا ہے یہاں کب سے بیٹھے ہو؟" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"کمال ہے آپ مطالعے میں اس قدر محو تھیں کہ آپ کو میری موجودگی کا علم ہی نہیں ہوا میں تو پچھلے آدھے گھنٹے سے یہاں بیٹھا ہوں!"

"اور مجھے یہاں آئے ہوئے ابھی صرف دس منٹ ہوئے ہیں!" رتبہ نے برجستگی سے کہا اور وہ جو دو منٹ کو فراخدلی سے آدھے گھنٹے پر محیط کر گیا تھا کھسیانا سا ہو کر ہنس پڑا۔

"اچھا ہو سکتا ہے میری گھڑی کی سوئیاں آگے ہوں یہ بتائیں کراچی میں سب کیسے تھے اور اشعر کی پڑھائی کیسی جارہی ہے یہاں کب تک رکیں گی۔" اس نے سوالوں کی بوچھاڑ سی کردی تھی۔

"کچھ دن رکوں گی ابھی تو۔" اس نے بقیہ سوالوں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف مؤخر الذکر سوال کا جواب دیا۔

"تم نے کافی دن لگا دیے راولپنڈی میں ہم دونوں کب سے تمہارا انتظار کررہی تھیں۔"

"خیریت! میرا انتظار کیوں ہو رہا تھا۔" وہ کرسی کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے آرام سے گویا ہوا۔

"بھئی سننے میں آیا ہے کہ اس حویلی میں میر ولید خان وہ واحد شخص ہے جس کی معیت میں ہم اس خوب صورت وادی کی سیر کا لطف اٹھا سکتی ہیں بصورت دیگر ہمیں حویلی کی کھڑکیوں اور بالکونیوں سے ہی باہر کا نظارہ کرکے اپنے شوق سیاحت کی تسکین کرنا ہوگی۔" رتبہ نے قدرے طنزیہ انداز میں اپنا موقف بیان کیا تو ولید مسکرادیا۔

"وہ مظلوم خواتین یقیناً" آپ اور علیزہ ہوں گی!"

"ظاہر ہے ہم دونوں کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے اب ممانی جان تو اس عمر میں سیر کی اتنی شوقین نہیں رہی ہوں گی ان کی تو عمر گزری اسی دشت کی سیاحی میں۔" وہ شرارت سے بولی تو ولید نے فوراً" ہامی

بھرلی۔

"ٹھیک ہے بھئی آپ کو بھی لے چلیں گے آج کسی وقت فی الحال تو ناشتا تیار ہے اندر۔" وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا تو وہ بھی اس کے ساتھ اندر کی طرف چل دی۔

☼ ☼ ☼

سفید روئی کی مانند بادلوں کے گالے آسمان پر تیر رہے تھے وادی میں بہت دلکش اور رومان پرور دوپہر اتری تھی وہ دونوں ولید کی ہمراہی میں سیر کا لطف اٹھا رہی تھیں۔ شفاف جھیل میں اردگرد کھڑی فلک بوس پہاڑیوں کا عکس ایسے نظر آرہا تھا جیسے کسی ماہر مصور نے پانی کے کینوس پر کوئی اچھوتا شاہکار تخلیق کردیا ہو۔ رتبہ نے ایک بڑے پتھر پر بیٹھ کر اپنے دونوں پاؤں جھیل کے ٹھنڈے پانی میں ڈبو دیے۔

"ارے یہ کیا کررہی ہیں آپ ٹھنڈ لگ جائے گی آپ کو۔" دور بیٹھے ولید کی نظر جونہی رتبہ پر پڑی وہ دور سے چلایا اس نے تھوڑی دیر بعد خود ہی پاؤں باہر کھینچ لیے کیونکہ پانی اب ناقابل برداشت حد تک برفیلا لگ رہا تھا۔

"گھوڑے پر سواری کریں گی؟" ولید پتھروں کو پھلانگتا ان کے پاس چلا آیا۔

"وائے ناٹ!" وہ شلوار کے اڑسے ہوئے پائنچے نیچے کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آؤ علیزہ۔" وہ علیزہ کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولی۔

"نہیں بابا مجھے تو ڈر لگتا ہے ان گھوڑوں سے یہ تایا جان کے ریس کے لیے سدھائے ہوئے گھوڑے ہیں کہیں اٹھا کر نیچے ہی نہ پٹخ دیں۔" وہ ازل کی ڈرپوک تھی۔

"چلو نا یار مزا آئے گا دونوں اکٹھے سواری کریں گے۔" رتبہ بضد تھی مگر علیزہ ٹس سے مس نہ ہوئی مجبوراً" اسے اکیلے ہی بیٹھنا تھا سو ولید کو گھوڑا لانے کے لیے کہا۔

"سجو اصطبل سے ایک گھوڑا یہاں لے آؤ۔!" ولید نے گاڑی کے پاس کھڑے سجو کو مخاطب کیا جو پہاڑیوں کے دامن میں بنے اصطبل کی طرف دوڑ پڑا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک خوب صورت سے سیاہ گھوڑے کی پشت پر زین جمائے ولید کے پاس لے آیا۔

"آپ کو پتا ہے یہ گھوڑا ہر سال شندور میلے میں حصہ لیتا ہے یہ اعلا نسل کا بہترین گھوڑا ہے میرا نہیں خیال یہ میدان سے کبھی شکست کھا کر آیا ہو۔" ولید گھوڑے کے ایال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے رتبہ کو اس کی خصوصیت سے آگاہ کررہا تھا اس نے سرہلانے پر اکتفا کیا کیوں کہ اسے گھوڑوں کی بجائے گھڑسواری سے دلچسپی تھی۔

"بیٹھیں!" ولید نے گھوڑے کی باگیں مضبوطی سے پکڑ کر رتبہ کو دعوت دی وہ نڈر ہو کر آگے بڑھی اور پھرتی سے بایاں پاؤں رکاب میں رکھ کر ایک جست میں اس کی پشت پر سوار ہوگئی۔

"ارے آپ تو کافی تجربہ کار معلوم ہوتی ہیں۔" ولید اس کی پھرتی اور چابک دستی سے بیٹھنے پر حیرت زدہ تھا ورنہ عموماً" لڑکیاں اس معاملے میں کافی ڈرپوک ہوتی ہیں۔

"خیر میں ایسی اناڑی بھی نہیں ہوں میں نے اور اشعر نے بابا کے ساتھ بچپن میں کئی دفعہ ہارس رائیڈنگ کی ہے اتنا تجربہ تو ہے کہ گھوڑے پر بیٹھ سکوں۔" وہ بڑے فخر سے ولید کو بتانے لگی وہ گھوڑی کی باگیں پکڑ کر آہستہ آہستہ آگے چل رہا تھا اسے پتھریلے راستوں سے گزرتے ہوئے بڑا لطف آرہا تھا اس نے سامنے پتھروں پر بیٹھی علیزہ کو ہاتھ ہلایا جواباً" وہ بھی ہوا میں دونوں ہلا کر مسکرائی تھی۔

"ولید باگیں مجھے پکڑا دو!" اس نے ولید کو مخاطب کیا تھا۔

"نہیں۔ نہیں راستہ بہت پتھریلا ہے میں یہ رسک نہیں لے سکتا یہ کسی بھی وقت قابو سے باہر ہو سکتا ہے۔" ولید نے اس کی فرمائش کو یکسر مسترد کردیا تھا۔

"پلیز ولید کچھ نہیں ہوگا بچوں کی طرح

بیٹھنے سے مزا نہیں آرہا ڈونٹ وری مجھے گھڑسواری آتی ہے۔" وہ بچی لہجے میں گویا ہوئی۔

"آپ سمجھ نہیں رہیں یہ ریس کے گھوڑے ہیں ذرا سی ایڑ لگی تو سرپٹ دوڑ پڑتے ہیں بڑے بڑے گھڑ سوار مشکل میں پڑ جاتے ہیں۔" وہ زچ ہو کر بولا تھا اسے رتبہ کی فرمائش ہولائے دیے جا رہی تھی۔

"میں نے کہا نا کچھ نہیں ہوگا فکر نہ کرو بس یہ ذرا سی دیر کے لیے مجھے پکڑا دو پلیز۔" وہ بھی اپنے نام کی ایک تھی مجبوراً" ولید کو ہتھیار ڈالنے پڑے گھوڑے کی باگیں اپنے ہاتھ میں تھام کر اس نے ایک فاتحانہ اور پر جوش مسکراہٹ ولید پر ڈالی جو کندھے اچکا کر ایک طرف ہو گیا تھا۔ مگر فکر اس کے چہرے سے عیاں تھی رتبہ نے آہستگی سے باگیں ڈھیلی کیں اور گھوڑے کو آرام سے آگے بڑھایا راستہ قدرے ہموار تھا گھوڑا معمولی چال سے چل رہا تھا گھوڑے کو اندازہ تھا کہ اس کی سوار اتنی زیرک اور منجھی ہوئی نہیں ہے وہ ست روی سے چلنے لگا ولید دور کھڑا پشت پر ہاتھ باندھے گھوڑے کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا واپس مڑتے ہوئے اچانک رتبہ کو نجانے کیا سوجھا اس نے یونہی گھوڑے کو ذرا سی ایڑی لگائی تو وہ بدک کر ایکدم تیز رفتاری سے میدان میں دوڑنے لگا رتبہ کا دل زور سے دھڑکا تھا ضرور کہیں گڑبڑ ہونے والی تھی گھوڑے کی رفتار نے خطرے کا الارم بجا دیا تھا ولید تیزی سے اپنی جگہ سے دوڑا تھا رتبہ نے لگام دینے کی بہت کوشش کی مگر اڑیل جانور اس کے قابو میں نہیں تھا ولید کے ساتھ ساتھ علیزہ کے بھی اوسان خطا ہو گئے جو کافی دور بیٹھی رتبہ کا ایڈونچر ملاحظہ کر رہی تھی۔

"بجو۔۔۔ نور محمد!" ولید ملازموں کو پکارتے ہوئے گھوڑے کے قریب پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ کوئی بھی اس کے قریب جاتا ایک بڑا پتھر پھلانگتے ہوئے گھوڑے نے پوری قوت سے رتبہ کو پشت سے نیچے گرانے کی کوشش کی تھی وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور زین سے ایک جھٹکا کھا کر پھسلتی ہوئی نیچے آگری وہ بھاگم بھاگ اس کے پاس پہنچا گھوڑا اب بغیر کسی سوار کے پتھریلے میدان میں چکر لگا رہا تھا جسے بجو نے بڑی مشکل سے قابو کر کے پکڑ لیا ولید نے دیکھا رتبہ کے سر کے داہنے حصے سے کافی خون بہہ رہا تھا اور وہ شدید چوٹ اور خوف کی شدت سے اپنے ہوش و حواس کھو چکی تھی اس کے خدشے درست نکلے تھے رتبہ کا بے سدھ وجود اس کے حواس شل کر دینے کے لیے کافی تھا۔

☼ ☼ ☼

"حد ہوتی ہے لاپروائی کی ولید کم از کم میں تمہیں اس قدر غیر ذمہ دار نہیں سمجھتا تھا۔" وہ حسب توقع اپنے باپ کی عدالت میں موجود تھا۔

"میں نے تو رتبہ آپی کو بہت سمجھایا کہ گھڑسواری کا شوق اس پتھریلے علاقے میں خود مت پورا کریں مگر وہی ہوا جس کا مجھے بھی ڈر تھا یہ سب ان کی فرمائش کا نتیجہ ہے ورنہ میں کبھی گھوڑے کی لگام ان کے ہاتھ میں نہ دیتا۔"

وہ میر بازید کے سامنے سر جھکائے پاؤں کے انگوٹھے سے قالین کو دبا رہا تھا ساتھ والے صوفے پر معید خان ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے چھوٹے بھائی کا خجالت بھرا چہرا اور وضاحتیں دیکھ کر دل ہی دل میں حظ اٹھا رہا تھا اسے ایک کمینی سی خوشی محسوس ہونے لگی تھی یہی تو وہ چاہتا تھا کہ عورتوں کو بے جا آزادی دینے کا نتیجہ سب کے سامنے تو آیا۔

"جو بھی ہوا اگر اس کے نتیجے میں اس کی ہڈی وڈی ٹوٹ گئی تو کیا جواب دیں گے ہم اس کے والدین کو۔" وہ غصے سے ہال میں چکر لگا رہے تھے۔

"معافی چاہتا ہوں بابا جان مگر آپ فکر نہ کریں چوٹ اتنی شدید نہیں ہے وہ پھسل کر گری ہے بجو ڈاکٹر کو بلانے گیا ہے ابھی ہوش بھی آجائے گا۔" وہ انہیں تسلی دینے کی سعی کرنے لگا۔

"بابا جان۔۔۔!" معید ایک نظر نادم سے ولید پر ڈال کر ان کی طرف متوجہ ہوا۔

"اس دن آپ نے بلاوجہ مجھ پر غصہ کیا میں اسی وجہ سے انہیں جھیل پر جانے سے روکا تھا کہ کوئی نہ کوئی حادثہ ضرور رونما ہوگا۔ مگر سب نے شاید اسے میری انا کا مسئلہ سمجھ لیا تھا مگر اب کو اندازہ ہو جانا چاہیے کہ انہیں اگر ذرا سی ڈھیل دی جائے تو یہ کس طرح پر پرزے نکال لیتی ہیں اگر رتبہ میری بات مان لیتی تو یہ سب کچھ تو نہ ہوتا۔" وہ صوفے سے اٹھا اور اپنا مافی الضمیر بیان کر کے آہستگی سے چلتا ہوا ہال سے باہر نکل گیا۔ میر بازید خان خاموشی سے اسے جاتا دیکھتے رہے وہ زندگی میں پہلی بار اس طرح لاجواب ہوئے تھے۔

"آئیے ڈاکٹر صاحب۔" بجو ڈاکٹر کو لے کر رتبہ کے کمرے میں آیا جہاں علیزہ اور اس کی امی پہلے سے موجود تھیں ڈاکٹر کو اندر داخل ہوتا دیکھ کر علیزہ بیڈ سے اٹھ کر دوپٹہ درست کر کے ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ ولید بھی ڈاکٹر کے پیچھے آکر کھڑا ہو گیا ڈاکٹر بہت غور سے سر پر آنے والے زخم کا معائنہ کر رہا تھا فوری طبی امداد سے خون رسنا تو بند ہو چکا تھا لیکن پٹی کی ضرورت تھی ڈاکٹر اپنے بیگ سے ضروری سامان نکالنے لگا۔

"ڈاکٹر صاحب مسئلہ زیادہ سیریس تو نہیں ہے یہ پوری طرح ہوش میں کیوں نہیں آرہیں۔" ولید متفکر سا تھا۔

"فکر کی کوئی بات نہیں ہے دراصل چوٹ سے زیادہ خوف کا اثر ہے میں انجکشن لگا رہا ہوں کچھ دیر بعد انہیں خود ہی ہوش آجائے گا باقی سب کچھ ٹھیک ہے۔" وہ رتبہ کا زخم صاف کرتے ہوئے بولا ڈاکٹر کے چلے جانے کے کچھ دیر بعد رتبہ خرد کی دنیا میں لوٹ آئی تھی اسے سب کچھ ایک ڈراونا خواب لگ رہا تھا جیسے ہی اس کی نظر آس پاس کھڑے لوگوں پر پڑی تو شرمندگی سے منہ۔۔۔ دوسری طرف پھیر لیا ولید مسکرا کر آگے بڑھا۔

"آپ ٹھیک تو ہیں نا؟" "ہوں" اس نے فقط ہوں پر اکتفا کیا۔

"مگر اتنا ہی حوصلہ تھا تو اتنی دلیری دکھانے کی کیا ضرورت تھی شکر ہے میں نہیں بیٹھی تمہارے ساتھ!" علیزہ اپنے بچاؤ پر دل ہی دل میں شکر ادا کر رہی تھی۔

"آئی ایم سوری میری بلاوجہ ضد سے اتنی ٹینشن پیدا ہوئی۔" وہ واقعی نادم تھی۔

"شکر کریں آپ بچ گئی ہیں ورنہ مجھے تو لگ رہا تھا آج بابا جان مجھے چھوڑیں گے نہیں۔" وہ بیڈ کے قریب دھری کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"کیا ماموں جان بہت غصے میں ہیں۔" وہ پریشان سی ہو کر ولید کی طرف دیکھنے لگی۔

"ایسے ویسے ذرا ان کا سامنا کرنے کی ہمت تو کریں وہ تو شکر کریں آپ ہوش میں نہیں تھیں ورنہ ان کی ڈانٹ سے تو آپ نے ویسے ہی بے ہوش ہو جانا تھا بہرحال خاطر جمع رکھیے وہ کسی بھی وقت گرج چمک کے ساتھ نازل ہو سکتے ہیں۔" وہ خوامخواہ اسے ڈرا رہا تھا۔

"تم سچ کہہ رہے ہو؟" وہ سہم کر بولی تو علیزہ اور ولید قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

"بس اتنی سی بہادری ہے آپ میں؟" وہ ولید کی شرارت بھانپ کر مسکرانے لگی۔

"ارے کیوں تنگ کر رہے ہو آرام کرنے دو اسے اور چلو باہر نکلو تم دونوں۔" چھوٹی ممانی نے دونوں کو باہر جانے کو کہا تو وہ سعادت مندی سے کمرے سے باہر نکل گیا جبکہ علیزہ اس کے پاس ہی بیٹھی رہی اس نے کمبل اپنے اوپر پھیلا کر آنکھیں موند لیں۔

☼ ☼ ☼

وہ نیم غنودگی میں تھی جب کسی نے دروازے کو ہلکے ہاتھ سے دستک دے کر آہستگی سے کھولا تھا وہ دروازے کی جانب دیکھنے لگی۔ تھوڑی دیر قبل ہی علیزہ اس کے پاس سے اٹھ کر گئی تھی اندر داخل ہونے والے معید خان کو دیکھ کر وہ ایک دم حیران سی ہوئی تھی وہ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں سمجھ گئی کہ معید کے آنے کا مقصد کیا ہے وہ یقیناً" رتبہ سکندر کو اس کی ضد کا نتیجہ بتانے اور شرمندہ کرنے آیا تھا وہ بیڈ

کے کراؤن سے ٹیک لگا کر سیدھی ہو بیٹھی وہ اپنی مخصوص کشمیری چادر کو کندھے پر پھیلائے اس کے بیڈ کے قریب آکر ایستادہ ہو گیا اور وہ اس کے منہ سے نکلنے والے طنزیہ اور کڑوے کسیلے جملے سننے کے لیے خود کو تیار کیے بیٹھی تھی۔

"کیا حال ہے؟" معید خان کی گمبھیر آواز نے کمرے کی خاموشی میں ارتعاش پیدا کیا تھا اور رتبہ کو یہ جملہ اپنی توقعات کے بالکل برعکس لگا تھا۔

"آپ تو بہت بہتر ہوں۔" اس نے سامنے دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا وہ خاموشی سے کھڑا تھا۔

"بیٹھ جاؤ!" تھوڑے سے توقف کے بعد رتبہ نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا تھا مگر اس نے فوراً" انکار میں سر ہلا دیا۔

"میرے پاس وقت نہیں بس تمہارا پتا کرنے آیا تھا۔" وہ اتنا کہہ کر آہستگی سے مڑا اور کمرے سے باہر نکل گیا اور حیرت کے سمندر میں غوطہ زن بند دروازے کو دیکھتی رہ گئی اگرچہ اس نے نہایت رسمی سی تیمارداری کی تھی مگر رتبہ کو یہ بھی غنیمت لگی۔ معید خان جس کو وہ پچھلے دو ہفتوں سے صرف بدتمیزی کا مظاہرہ کرتے ہی دیکھ رہی تھی اور اسے جاہل گنوار اور وحشی جیسے نجانے کتنے القابات سے نواز چکی تھی آج ایک اخلاقی مظاہرہ اس کا نیا روپ لے کر سامنے آیا تھا۔

"ہو سکتا ہے ماموں جان نے اسے بھیجا ہو۔" اس نے دل ہی دل میں قیاس کیا بہرحال جو کچھ بھی تھا اسے معید کا رویہ کافی حد تک مہذبانہ لگا اور یہی تو وہ چاہ رہی تھی۔ اس کی چوٹ کافی حد تک مندمل ہو چکی تھی وہ دو دن تک کمرے میں آرام کرتے کرتے اکتا گئی تھی۔ اس دوران کئی دفعہ اس کی کراچی مما سے بھی بات چیت ہوئی مگر اس نے اس حادثے کا ذکر نہیں کیا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ مما فوراً" پریشان ہو کر اسے واپس بلا لیں گی مگر وہ علیزہ کے اصرار پر مزید کچھ دن رکنا چاہتی تھی۔

دوپہر کو وہ ذرا ٹہلنے کے لیے لان میں نکلی تو جہاں تجو کیاریوں میں لگے پودوں کو پائپ سے پانی دے رہا تھا۔ ہر طرف گل داؤدی اور موتیے کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔

"تجو پائپ مجھے دے دو۔" اس نے آگے بڑھ کر تجو کے ہاتھ سے پانی کا پائپ تھام لیا اور خود پودوں کو سیراب کرنے لگی۔

"بی بی جی مجھے دے دیں میر صاحب ناراض ہوں گے۔" تھوڑی دیر بعد تجو نے اس کے ہاتھ سے پائپ لینا چاہا مگر وہ مگن سے انداز میں پانی دیتی رہی۔

"تم ایسا کرو یہ بیس ہزار اسے دے دو اگر مکان کی حالت زیادہ خراب ہے تو مجھے بتا دینا میں اور بندوبست کر دوں گا۔" اس کی سماعتوں سے معید کی آواز ٹکرائی تھی اس نے مڑ کر دیکھا وہ راہداری پر چلتے ہوئے بابا کو کچھ ہدایات دے رہا تھا۔

"میں دے دوں گا وہ تو بڑا احسان مان رہے ہیں جی آپ کا بہت دعائیں دیتے ہیں۔" رحیم داد نے پیسے واسکٹ کی اندرونی جیب میں رکھتے ہوئے کہا تو وہ گیٹ پار کر کے باہر نکل گیا اس کی نظر پودوں کو پانی دیتی رتبہ پر نہیں پڑی تھی کیونکہ وہ اس کی جانب پشت کیے جھاڑیوں کی آڑ میں کھڑی تھی رحیم بابا نے اسے دیکھا تو وہیں چلا آیا۔

"ارے بیٹا رانی اب کیسی طبیعت ہے؟" وہ شفقت سے بھرے لہجے میں گویا ہوا۔

"بابا اب تو بالکل فٹ ہوں دیکھ نہیں رہے تجو کا ہاتھ بٹا رہی ہوں۔" وہ خوشگوار لہجے میں بولی۔

"ماشاء اللہ۔" رحیم بابا اتنا کہہ کر مڑنے لگا تھا کہ رتبہ نے دوبارہ مخاطب کیا۔

"بابا یہ معید کیا کہہ رہا تھا؟" اس نے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر پوچھا۔

"وہ بیٹا جی ادھر پہاڑوں میں کچھ غریب لوگ بھی بستے ہیں ایک دو لوگوں کے گھر مٹی کا تودہ گرنے سے ڈھے گئے ان کی مدد کے لیے چھوٹے خان پیسے دیتے رہتے ہیں غریب لوگ ہیں خوش ہو جاتے ہیں اللہ زندگی دے ان کو۔" رحیم بابا مشکور انداز میں گویا ہوا۔

"اچھا تو تمہارے چھوٹے خان نیکی کے کاموں میں بھی حصہ لیتے رہتے ہیں!" وہ پانی کا پائپ تجو کے ہاتھ میں دیتے ہوئے حیرت سے بولی۔

"جی بڑا بھلا کرتے ہیں ہم غریبوں کے ساتھ تو یہ جوان کا غصہ ہے نا بس وقتی ہوتا ہے دل کے برے نہیں ہیں معید خان میں نے گود میں کھلایا ہے ان کو ایسے تو ان دنوں میں ہو گئے ورنہ فطرت کے بہت اچھے ہیں جی۔" وہ رتبہ کی معلومات میں نیا اضافہ کر رہا تھا۔

"صرف غریبوں کے ساتھ ہی اچھے ہیں؟" وہ مسکرا کر رحیم بابا کی طرف دیکھنے لگی۔

"میں نے کہا نا وہ خود بڑے اچھے ہیں سب کے ساتھ بس ذرا میر صاحب کی بے جا سختی اور پابندی سے خود سر ہو گئے ہیں باہر تو لوگ بہت تعریفیں کرتے ہیں ان کی سخاوت اور اخلاق کی مگر حویلی میں سب کا خیال ان کے بارے میں اچھا نہیں ہے اس وجہ سے معید خان کچھ اکھڑے سے رہتے ہیں۔" رحیم بابا اس کے ساتھ چلتا ہوا لان میں رکھی کرسیوں کے قریب چلا آیا۔

"مگر اس کا رویہ بھی تو سب کے ساتھ خراب ہے وہ اپنے آپ کو بدل لے تو سب اس پر بے جا تنقید کیوں کریں؟" اس نے کچھ سوچ کر نقطہ اٹھایا رحیم بابا معید خان کی شخصیت کی پرتیں کھول رہا تھا اور اسے یہ سب بہت دلچسپ لگ رہا تھا۔

"اللہ جانتا ہے بی بی وہ کس کا غصہ کس پر نکال رہے ہیں مگر میں تو اتنا جانتا ہوں کہ وہ احساس کمتری کا شکار ہو کر سب سے باغی ہو گئے ہیں میر صاحب ہر بات میں ولید خان کو اس پر ترجیح دیتے آئے ہیں ہو سکتا ہے یہ بات چھوٹے خان کو پسند نہ آئی ہو۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں جی پر آج سے کچھ برس پہلے ان کا رویہ ایسا نہیں تھا۔" رحیم داد گہری سانس لے کر تاسف سے سر ہلانے لگا۔

رتبہ بھی یہ بات جانتی تھی کہ اس کے ماموں بچپن سے ہی ولید کو معید پر ترجیح دیتے تھے۔ اور بلاوجہ روک ٹوک کا نشانہ بھی معید ہی بنتا تھا مگر یہ رویہ اس کو اس قدر شدت پسند بنا دے گا اس کے بارے میں تو کسی نے سوچا بھی نہ تھا۔ اسے یاد ہے کہ بڑی ممانی کی وفات سے پہلے معید اچھا خاصا سلجھا ہوا تھا آج سے پانچ سال پہلے وہ جب یہاں آئی تھی تو معید بالکل ایسا نہ تھا وہ کسی اور سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی رحیم بابا وہاں سے ہٹ کر تجو کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے جو پودوں کو پانی دینے کے بعد غیر ضروری پتوں کی قطع برید میں مصروف تھا۔ رحیم بابا اسے شاید پودوں کی کانٹ چھانٹ کے بارے میں ہدایات دے رہے تھے وہ خاموشی سے کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر انہیں دیکھنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے حویلی کے گیٹ سے اندر داخل ہونے والے ایک اجنبی شخص کی طرف دیکھا اچھے خاصے قد کاٹھ اور ڈیل ڈول کے ساتھ وہ شخص کافی بارعب نظر آ رہا تھا۔ وضع قطع سے وہ شہر کا آدمی لگ رہا تھا دائیں ہاتھ میں لٹکا ہوا سیاہ بریف کیس اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ وہ کچھ خاص کام سے حویلی میں آیا تھا۔

رحیم داد جلدی سے اس کی جانب بڑھا وہ دو چار قدم چل کر راہداری پر ہی کھڑا ہو گیا تھا شاید رہنمائی کا منتظر تھا رحیم داد کچھ لمحے اس کے ساتھ گفتگو کرتا رہا پھر اسے اپنی معیت میں لے کر اندر مرکزی ہال کی طرف بڑھ گیا تھوڑی دیر بعد رحیم داد دوبارہ باہر نکلا تو رتبہ نے نووارد کے متعلق سوال کیا۔

"بیٹا میں تو نہیں جانتا کون تھا یہ مجھے تو کوئی افسر معلوم ہوتا ہے میر صاحب سے ملاقات کا وقت لے رکھا تھا۔" رحیم داد نے مکمل لاعلمی ظاہر کی تو وہ سر جھٹک کر دوبارہ لان میں لگے پودوں کو دیکھنے لگی ایک آدھ گھنٹے بعد اس نے وہ اجنبی شخص میر بازید کے ساتھ باہر جاتے دیکھا ولید بھی ان کے ساتھ تھا مگر گیٹ تک جا کر واپس رتبہ کے پاس چلا آیا اس نے دیکھا ولید کے چہرے پر پریشانی کے واضح آثار تھے وہ چپ چاپ سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے ولید پریشان لگ رہے ہو۔" اس نے

کریدنے والے انداز میں پوچھا۔
"ہوں۔ بات ہی کچھ ایسی ہے۔" وہ نیچے گھاس کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔
"مجھے نہیں بتاؤ گے۔" اس نے سوال کیا۔
"ابھی تھوڑی دیر قبل سرکاری محکمے کی جانب سے ایک افسر آیا تھا وہ یہاں پر جنگلات کا مہتمم ہے اس نے بابا جان سے جنگل سے قیمتی لکڑی چوری ہونے کی شکایت کی ہے!"
"تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے اس کا پتا چلانا ان کے محکمے کی ذمہ داری ہے!" رتبہ نے رسان سے کہا۔
"پریشانی کی بات یہ ہے کہ انہوں نے درختوں کی چوری کا الزام معید بھائی پر عائد کیا ہے ان کا خیال ہے کہ قیمتی لکڑی چوری کرکے باہر اسمگل کی جارہی ہے اور یہ سب کچھ معید بھائی کی سرپرستی میں ہو رہا ہے۔" ولید کے انکشاف پر وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔
"مگر وہ یہ بات بغیر کسی ثبوت کے کیسے کر سکتے ہیں بغیر کسی تحقیق کے معید پر اتنا بڑا الزام لگا رہے ہیں وہ۔" اسے نجانے کیوں یقین نہ آیا کہ معید اس گھناؤنے کاروبار میں ملوث ہو سکتا ہے۔
"یہی بات تو پریشانی کی ہے کہ وہ معید بھائی کو انوالو کیوں کر رہے ہیں اس آفیسر نے کہا ہے کہ وہ چند روز میں ثبوت فراہم کرنے کی کوشش کرے گا اور اگر ایسا ثابت ہو گیا تو کیا عزت رہ جائے گی ہماری یہاں معید بھائی سے تو کسی بھی کام کی توقع کی جا سکتی ہے۔" وہ خفگی سے گویا ہوا۔
"مگر میرا نہیں خیال کہ وہ ایسا کر سکتا ہے ہو سکتا ہے جنگلات والوں کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی معید کی شخصیت کے بعض گوشے سامنے آنے پر وہ اتنے بڑے قومی نقصان میں معید کو حصہ دار سمجھنے میں تامل سے کام لے رہی تھی۔
"لیکن آپ ان کی طرف داری کیوں کر رہی ہیں۔"
ولید نے اچنبھے سے رتبہ کی جانب دیکھا تو وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔
"میں اس کی طرف داری نہیں کر رہی کوئی بھی ہوتا میں یہی کہتی کہ پہلے تحقیق کر لینی چاہیے خوامخواہ دوسرے پر الزام لگا کر اسے نظروں سے گرانے والی بات ہے۔" وہ وضاحت پیش کرنے لگی۔
"بابا جان کہہ رہے ہیں شام کو بھائی سے بات کریں گے پھر ہی یہ معاملہ سمجھ سکتا ہے آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں پہلے چھان پھٹک کر لینی چاہیے اس بارے میں۔" وہ بھی رتبہ کے خیالات سے متفق ہو چکا تھا۔
"آپ کو چھوٹے میر صاحب یاد فرما رہے ہیں۔" بجو نے ولید کے عقب میں کھڑے ہو کر علیزہ کے ابو میر سعید کا پیام دیا تھا۔
"آرہا ہوں۔" وہ فوراً ہی کھڑا ہو گیا اور بجو کے ساتھ اندر چلا گیا تھوڑی دیر بعد رتبہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور کچن میں چلی آئی جہاں فیض بی بی گاجر کا حلوہ بنانے میں مصروف تھی وہ بہت دلچسپی سے اسٹول پر بیٹھ کر سارا عمل دیکھنے لگی۔
رات کو وہ اپنے بستر پر لیٹی تو دوبارہ معید کا خیال آگیا اس کی پراسرار شخصیت رتبہ کو الجھائے دے رہی تھی اب اک نئے ایشو نے اس کے ذہن کو منتشر کر دیا تھا اس کا سامنا معید سے پہلے جتنی بار بھی ہوا اس نے بہت درشت رویہ رکھا اور پھر اس کی تیمارداری کرکے اس کو حیران کر گیا ایک طرف اس کا گھر والوں سے بدلحاظی سے سوا ہوتا رویہ تو دوسری طرف اس کی تعریف میں رطب اللسان گاؤں والے رتبہ کے ذہن کو خلفشار میں مبتلا کر رہے تھے۔
"کیا معید نفسیاتی عارضے کا شکار تو نہیں۔" اس کے دل میں ایک خدشے نے سر اٹھایا اور ذہن اس خیال کی تصدیق کرنے لگا۔ ایسے نفسیاتی لوگوں کا علاج تو توجہ اور محبت مانگتا ہے شاید معید بھی اس کا متقاضی ہو وہ اسی سوچ ڈوبی تھی کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا گھڑی رات کے سوا دو بجا رہی تھی اس نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کیا اور کروٹ لے کر آنکھیں موند

لیں۔

☼ ☼ ☼

حسب معمول وہ صبح سویرے اٹھ بیٹھی ناشتا کرنے کے بعد اس نے علیزہ سے کچھ دیگر گپ شپ لگائی پھر نیچے ڈرائنگ روم میں چلی آئی تھوڑی دیر بعد بجو وہاں سے ناشتے کی خالی ٹرے لے کر گزرا تھا اور وہ جانتی تھی کہ یہ معید کا ناشتا تھا جو کہ اکثر وہ اپنے کمرے میں ہی منگوا لیا کرتا تھا۔
"بجو بات سنو!" اس نے کچن سے باہر نکلتے بجو کو مخاطب کیا۔
"جی بی بی۔" وہ ہمہ تن گوش تھا۔
"معید اپنے کمرے میں ہے یا باہر چلا گیا ہے؟" اس نے سرسری انداز میں پوچھا۔
"ابھی تک تو کمرے میں تھے کچھ دیر بعد زمینوں پر جائیں گے۔" بجو نے اسے آگاہ کیا وہ سر ہلاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی کچھ دیر کھڑے ہو کر سوچتی رہی پھر معید کے کمرے کی طرف چلی آئی وہ ایڈونچر کی شوقین تھی اور آج ایک نیا ایڈونچر کرنے جارہی تھی اس کے کمرے کا دروازہ حسب توقع بند تھا اس نے دستک دینے کو ہاتھ بلند کیا مگر وہ کافی دیر ہوا میں ہی معلق رہا۔
"پتا نہیں وہ کیا سوچے گا۔" دستک دینے سے پہلے اس کے اندر سے آواز آئی تھی مگر پھر حوصلہ مجتمع کرکے اس نے انگلیوں کی مدد سے دروازے کو ہلکا سا بجایا اگلے ہی لمحے دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا تھا اور معید اس کے سامنے کھڑا تھا ایک بار تو اس کا دل ڈر کے مارے زور سے دھڑکا تھا مگر وہ جلد ہی اپنے حواس پر قابو پانے میں کامیاب ہو چکی تھی وہ معید کی آنکھوں حیرانی اور استعجاب کو واضح طور پر دیکھ سکتی تھی رتبہ کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ ذرا سی دیر کو ٹھٹکا ضرور تھا مگر اگلے ہی لمحے خود کو نارمل رکھ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا جیسے اس کے آنے کا مقصد پوچھ رہا ہو۔
"مجھے اندر آنے کو نہیں کہو گے؟" رتبہ نے کچھ لمحے توقف کے بعد دھیرے سے کہا وہ دروازے کے کھلے کواڑوں پر ہاتھ جمائے عین اس کے سامنے کھڑا تھا جیسے اس کا راستہ روک رکھا ہو رتبہ کے سوال پر اس نے ایک ہاتھ کواڑ سے اٹھا لیا جس کے بعد بمشکل اتنی ہی جگہ بن پائی کہ وہ گزر کر کمرے میں آگئی وہ عین کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر ارد گرد رکھی چیزوں کا بغور جائزہ لینے لگی جبکہ معید دونوں ہاتھ پشت پر باندھے کڑی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
آج کتنے عرصے بعد کمرے میں اسے گھر کا کوئی فرد نظر آیا تھا جہاں تک اسے یاد تھا پچھلے کئی ماہ سے صرف بجو ہی اس کمرے کو رونق بخش رہا تھا یا پھر ہفتہ میں ایک آدھ بار فیض بی بی صفائی کی غرض سے ادھر آنکلتی آج رتبہ کو اپنے کمرے میں دیکھ کر وہ الجھن، تذبذب اور حیرت جیسے احساسات کا شکار تھا جبکہ رتبہ کافی حد تک پرسکون لگ رہی تھی اور کمرے میں ٹہل کر ہر چیز کا جائزہ لے رہی تھی اس کی یوں بے نیازی اور مان نہ مان میں تیرا مہمان والی صورت حال دیکھ کر معید خان اندر ہی اندر کڑھ کر رہ گیا مگر وہ ضبط کے گھونٹ بھر کر چپ رہا اور وہ اس کا صبر ہی تو آزما رہی تھی یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنی آمد کا مقصد یکسر فراموش کر چکی ہو۔
"تمہیں مجھ سے کوئی کام ہے یا کمرے کی تلاشی لینے آئی ہو۔" وہی اکھڑا اکھڑا سا لہجہ اور وہ جو سامنے شلف پر سجے آبنوسی رنگ کے پتھر سے بنے گلدان کو دیکھ رہی تھی اس کی آواز پر گلدان واپس اپنی جگہ پر رکھ کر معید کی طرف مڑی۔
"ایم سوری!" وہ خجل سی ہو کر مسکرائی تھی۔
"دراصل تمہارے کمرے میں اتنے نوادرات سجے ہوئے ہیں کہ میں بس انہیں ہی دیکھنے لگ گئی۔" وہ دیوار کے ساتھ رکھی خوب صورت ایزی چیئر پر بے تکلفی سے بیٹھتے ہوئے بولی۔
"میں نے پوچھا تمہیں مجھ سے کوئی کام ہے؟" وہ حد درجہ روکھے اور سپاٹ لہجے میں بولا تو وہ گلا صاف کرکے خود کو بات کرنے کے لیے تیار کرنے لگی۔
"میں تم سے کچھ باتیں کرنے آئی ہوں۔" وہ بالآخر

کہ ابھی اور وہ اسے ایسے حیرانی سے دیکھنے لگا جیسے وہ بھی کمرے میں رکھے گئے نوادرات کا ایک حصہ ہو۔
"تم مجھ سے کیا باتیں کروگی۔" وہ جیسے طنز کر رہا تھا۔
"کیوں میں تم سے بات کیوں نہیں کر سکتی؟"
"یہ تم اچھی طرح جانتی ہو پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو۔" وہ پشت پر ہاتھ باندھے ہنوز اسی پوزیشن میں کھڑا تھا جس میں پچھلے دس منٹ سے رتبہ اسے دیکھ رہی تھی۔
"میں کچھ نہیں جانتی اس لیے تو پوچھنا چاہتی ہوں۔" وہ ہمت کر کے گویا ہوئی۔
"کیا پوچھنا چاہتی ہو؟" وہ جھنجھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔
"یہی کہ تمہارے اندر اتنا غصہ، شدت پسندی اور بغاوت کیوں ہے تم گھر والوں سے اتنا دور کیوں بھاگتے ہو؟" اس کے اندر جانے کیسے اتنی جرات گویائی آ گئی تھی کہ وہ معید کے روبرو کھڑے ہو کر سوال کیے جا رہی تھی۔
"میں تم سے وہ وجہ پوچھنا چاہتی ہوں جس کی بنا پر تم نے اپنے اوپر خود پسندی اور انا کا ایسا خول چڑھا لیا جس سے تمہاری اصل شخصیت کہیں دب کر رہ گئی ہے۔" وہ بہت بے باکی سے اسے آئینہ دکھا رہی تھی مگر وہ خلاف توقع خاموش کھڑا تھا۔
"مجھے بتاؤ گے نہیں ایسا کیوں ہوا؟" وہ سوالیہ انداز میں مہر بہ لب کھڑے معید کو دیکھنے لگی اس نے پشت پر باندھے دونوں ہاتھ ڈھیلے انداز میں نیچے گرائے اور چلتا ہوا کارنس کے قریب کھڑا ہو گیا اور بلاوجہ چیزوں کی ترتیب درست کرنے لگا وہ غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔
"معید میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔" کمرے میں چھائی گہری خاموشی کو توڑتے ہوئے اس نے معید کو پیچھے سے مخاطب کیا معید نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔
"تم وجہ معلوم کر کے کیا کروگی؟" اس نے ہمیشہ کی طرح جواب دینے کی بجائے دلیل مانگی۔
"میں تمہارے مسئلے کا حل تلاش کر لوں گی جو الجھن ہے وہ دور تو ہو۔" وہ معید کو نرم پڑتا دیکھ کر فوراً بولی۔
"تم مجھے نفسیاتی مریض سمجھتی ہو؟" وہ اسے نظروں میں تولتا ہوا سپاٹ لہجے میں بولا تھا۔
"معید تم کیوں ہر بات کو غلط انداز میں لیتے ہو۔" وہ روہانسی ہو گئی۔
"کبھی تو مثبت پہلو دیکھا کرو میں چاہتی ہوں تم از کم میرے ساتھ وہ سب کچھ شیئر کرو جو تمہارے اندر لاوا بن کر اکٹھا ہو رہا ہے۔" وہ چلتے ہوئے اس کے قریب آن رکی۔
"ہمارے درمیان ابھی اتنی بے تکلفی نہیں ہے کہ سب کچھ تم سے شیئر کروں۔" وہی روکھا پھیکا سا انداز جو رتبہ کو مایوس کرنے کے لیے کافی تھا مگر وہ مایوس نہیں ہوئی۔
"چلو بے تکلفی نہ سہی دوستی بھی نہ سہی مگر خون کا رشتہ تو ہے کیا یہ کافی نہیں ہے بھروسے کے لیے؟" وہ ضبط سے کام لیتے ہوئے بولی۔
"خون کا رشتہ ہی تو نہیں ہے رتبہ سکندر صاحبہ۔" وہ عجیب سے انداز میں کہتے ہوئے فرش پر بچھے کارپٹ کو دیکھنے لگا۔
"کیا مطلب؟" وہ اچنبھے سے گویا ہوئی۔
"مطلب یہ کہ اگر تم اس بات پر اڑی گئی ہو کہ سب کچھ جاننا چاہتی ہو تو پہلی حقیقت تو یہ جان لو کہ میں میر بایزید کی اولاد نہیں ہوں اور نہ ہی اس گھر کے کسی بھی فرد سے خون کا رشتہ ہے۔" وہ اتنا بڑا انکشاف کر رہا تھا اور وہ اپنی بے خبری پر سن سی کھڑی تھی۔
"یہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" الفاظ اس کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ تھے۔
"یہ ہوا ہے اور جب سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے میرا اس خاندان سے کوئی تعلق نہیں تو مجھے تمہارے ماموں یعنی میر بایزید خان کی اصلیت بھی معلوم ہو گئی ہے۔ میری تمام محرومیوں کے ذمہ دار ہیں وہ۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

"اگر یہ سچ ہے تو اس کی خبر مجھے کیوں نہیں پچھلے چھبیس سالوں میں میں نے کبھی کسی کے منہ سے یہ نہیں سنا کہ تم بڑے ماموں کی اولاد نہیں ہو۔" وہ حیرانی کے سمندر میں غوطہ زن تھی اور سمجھ رہی تھی کہ معید کسی غلط فہمی کا شکار ہوا ہے۔
"تمہیں کیسے معلوم ہو؟ مجھے خود اتنے سالوں بعد معلوم ہوا۔ میر صاحب کے رویے سے تو بہت پہلے لگتا تھا کہ وہ مجھ میں اور ولید میں فرق رکھتے ہیں بعد میں وجہ بھی معلوم ہو گئی کہ ولید اتنا عزیز کیوں تھا انہیں۔" وہ رخ موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا اس کی آواز میں کچھ غصہ، محرومی اور رائیگانی کے علاوہ بہت کچھ تھا۔
"پھر تمہارے والدین کہاں ہیں اور ماموں جان کے پاس تمہیں کون لے کر آیا؟" رتبہ کے دل میں ہزاروں سوال سر ابھار رہے تھے۔
"میں تمہیں ابھی مزید کچھ نہیں بتا سکتا میرے پاس وقت نہیں ہے اور نہ ہی ضبط تم اگر چاہو تو رحیم بابا سے پوچھ سکتی ہو وہ یقیناً" تم سے جھوٹ نہیں بولیں گے پھر تم خود ہی فیصلہ کرنا کہ کون صحیح ہے اور کون غلط۔" وہ اتنا کہہ کر اس کے پاس سے گزرا اور بیڈ پر رکھی گرم چادر اٹھا کر چشم زدن میں کمرے سے باہر نکل گیا اور وہ انگشت بدنداں کمرے میں اکیلی کھڑی رہ گئی وہ جو معید کی تہہ در تہہ چھپی شخصیت کے پرت کھولنے آئی تھی خود الجھنوں اور غصے کا شکار ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

حویلی کے در و دیوار پر عجیب سی خاموشی چھائی تھی مرکزی ہال میں میر بایزید خان ساگوان کی چھڑی پر دونوں ہاتھ ٹکائے مخصوص انداز میں صوفے پر براجمان تھے ماتھے پر ہلکی سی تیوری واضح نظر آ رہی تھی اور نظریں سامنے دیوار پر ٹنگی تلواروں پر تھیں ولید دوسرے صوفے پر بیٹھ کر خاموشی سے میر صاحب کو دیکھ رہا تھا تھوڑی دیر بعد رحیم داد سیڑھیاں اتر کر نیچے ہال میں آیا اور ہاتھ باندھ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔
"معید خان آ رہے ہیں میں نے آپ کا پیغام پہنچا دیا ہے۔" جونہی میر صاحب نے سوالیہ نظروں سے رحیم داد کی طرف دیکھا اس نے وضاحت پیش کی انہوں نے ہوں کہہ کر دوبارہ خلا میں گھورنا شروع کر دیا تھوڑی دیر بعد معید بالائی منزل سے نیچے آتا دکھائی دیا اور چلتا ہوا عین میر صاحب کے سامنے ایستادہ ہو گیا۔
"آپ نے مجھے بلایا؟" اس نے سنجیدگی سے کہا۔
"بیٹھو مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے!" میر صاحب نے سامنے رکھے صوفے کی جانب اشارہ کیا وہ کندھوں پر رکھی بھاری شال کو سمیٹ کر صوفے پر براجمان ہو گیا۔
"دو دن پہلے محکمہ جنگلات کا ایک افسر آیا تھا میرے پاس وہ کہہ رہا تھا کہ یہاں پر درختوں کی غیر قانونی کٹائی ہو رہی ہے اور اس میں۔"
"میں جانتا ہوں اس نے میرا نام لیا ہوگا اور یقیناً آپ اس کی تردید نہیں کر سکے ہوں گے۔" وہ ان کی بات قطع کرتے ہوئے تلخی سے بولا۔
"میں تم سے پوچھے بغیر کیسے اس کی تردید کر دیتا۔" میر صاحب نے بھنویں اچکائیں۔
"یعنی آپ کو شک تھا کہ میں ایسا جرم کر سکتا ہوں۔" وہ حیران سا انہیں دیکھنے لگا۔
"بات شک کی نہیں ہے اس افسر نے اگر پوری وادی میں صرف تمہارا نام لیا ہے تو کوئی وجہ تو ہوگی میں تو تردید نہیں کر سکا تم ہی بتا دو۔"
"مجھے اس کاروبار سے کوئی واسطہ نہیں ہے نہ ہی میں یہ گری ہوئی حرکت کرنے کے بارے میں سوچ سکتا ہوں میں جو بھی کام کرتا ہوں ڈنکے کی چوٹ پر کرتا ہوں مجھے کسی سے چھپ کر کرنے کی کیا ضرورت۔" وہ پرسکون انداز میں کندھے اچکا کر بولا۔
"لیکن بات تو پھر وہی آ گئی کہ اس نے تمہارا نام کیوں لیا کیا کسی دشمنی کی بنا پر؟" میر صاحب نے تفتیشی انداز اپنایا۔
"میں جانتا ہوں اس نے مجھے ملوث کیوں کیا ہے یہ وہی افسر ہے نا جس نے شمال کی طرف جانے والے پہاڑی نالے کے اوپر لکڑی کا پل بنانے میں ٹھیکیدار

کے ساتھ مل کر لاکھوں کا غبن کیا۔ اس نے ناقص لکڑی مہنگے داموں بیچ کر پیسے اپنی جیب میں ڈال لیے اور اس سال بھی یہ اخروٹ کے درختوں کو دیمک زدہ ظاہر کر کے بیچنا چاہ رہا تھا میں نے نشاندہی کی تو ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گیا اس سے کہیں کہ اگر الزام ثابت کرنا ہے تو ثبوت پیش کرے ورنہ میں اس کی بدعنوانیاں سامنے لا کر پیش کرتا ہوں۔" وہ ماتھے پر تیوریاں ڈال کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"ٹھیک ہے تم جاؤ اگر ایسی بات ہے تو میں خود اس مسئلے سے نبٹ لوں گا اور اس آفیسر کے متعلق بھی چھان بین کرا لوں گا مجھے خوشی ہے کہ تمہارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔" میر صاحب بھی اپنی چھڑی پر دباؤ ڈال اٹھ کھڑے ہوئے۔

"میں جانتا ہوں اب بھی آپ کا ذہن میری طرف سے صاف نہیں ہوا ہو گا بہر حال مزید تسلی کر لیجیے گا مگر ایک بات ضرور یاد رکھیں میں نے آج تک کوئی ایسا کام نہیں کیا جو آپ کا سر جھکا دے۔" وہ اتنا کہہ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہال سے باہر نکل گیا میر صاحب لب بھینچے ولید کی طرف مڑے جو ان کی تقلید میں صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور دونوں ہاتھ پشت پر باندھے خاموشی سے میر یازید کے اگلے حکم کا منتظر تھا۔

"ولید رحیم داد سے کہنا کل اس آفیسر سے رابطہ کر کے اسے میرے پاس بھیجے۔"

"میرے پاس اس کا فون نمبر ہے میں ابھی اس کو آگاہ کر دیتا ہوں۔" ولید نے سعادت مندی سے کہا وہ سر ہلا کر دوبارہ صوفے پر براجمان ہو گئے جبکہ ولید اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☼ ☼ ☼

آتش دان میں دھیمی دھیمی آگ جل رہی تھی۔ رحیم بابا ایک سرکنڈے کی مدد سے چنگاریوں کو الٹتے پلٹتے اور بجھتی آگ کو بھڑکانے کے لیے مزید خشک لکڑیاں رکھ دیتے وہ کب سے صوفے پر آلتی پالتی مارے ایک ہی زاویے پر بیٹھی بغور آگ کو دیکھ رہی تھی حرارت کی وجہ سے کمرے کی خنکی کافی حد تک کم ہو گئی تھی۔

"رحیم بابا بات سنیں!" کچھ سوچنے کے بعد اس نے رحیم داد کو پکارا۔

"جی بیٹا!" وہ آخری لکڑی شعلوں کی نذر کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ادھر بیٹھیں میرے پاس!" اس نے پاؤں صوفے سے نیچے لٹکاتے ہوئے کہا۔

"آپ بات کریں بیٹا میں یہیں ٹھیک ہوں!" وہ اس کے عین سامنے نیچے قالین پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"بابا مجھے آپ سے ایک بات پوچھنی ہے آپ وعدہ کریں مجھے سب کچھ سچ سچ بتائیں گے۔" اس نے قدرے دھیمی آواز میں کہا۔

"پوچھو بیٹا اگر مجھے معلوم ہوئی تو ضرور بتاؤں گا۔" وہ اپنے رعشہ زدہ ہاتھوں سے سر پر رکھی چترالی ٹوپی درست کرتے ہوئے گویا ہوا۔

"معید خان کا قصہ کیا ہے۔" اس نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔

"کون سا قصہ؟" وہ نا سمجھی کے عالم میں بولا۔

"میں نے سنا ہے کہ وہ ماموں جان کا حقیقی بیٹا نہیں ہے بلکہ انہوں نے گود لیا تھا۔" رتبہ کی بات پر رحیم داد کے چہرے کا رنگ فق سا ہو گیا۔

"یہ۔۔۔ یہ آپ سے کس نے کہا؟" وہ ڈرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"آپ اس بات کو چھوڑیں مجھے صرف یہ بتائیں کہ سچ کیا ہے میں جانتی ہوں آپ کئی سالوں سے اس حویلی میں ہیں آپ کو یقیناً علم ہو گا کہ معید یہاں کیسے آیا؟" وہ رحیم داد کے متغیر چہرے کو دیکھ کر سکون سے بولی۔

"ہم۔۔۔ مگر بیٹا آپ یہ مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں میں نہیں بتا سکتا بڑے میر صاحب کو علم ہو گیا تو وہ مجھے حویلی سے نکال دیں گے اس حویلی کا نمک کھایا ہے جی، نمک حرامی نہیں کر سکتا۔" وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

"او ہو رحیم بابا یقین کریں آپ کو کوئی نقصان نہیں ہو گا میں صرف معید میں تبدیلی چاہتی ہوں مجھے آپ کی مدد چاہیے!" وہ رحیم داد کے فق چہرے پر سارے خدشات پڑھ چکی تھی۔

"میرا نام تو نہیں آئے گا۔" وہ خشک حلق کے ساتھ بولا۔

"بالکل بھی نہیں آپ فکر ہی نہ کریں۔" وہ رحیم داد کے کانپتے ٹھنڈے یخ ہاتھوں کو تسلی سے تھپتھپاتے ہوئے گویا ہوئی۔

"بتائیے۔" وہ ہمہ تن گوش تھی وہ رتبہ کی کسی قدر تشفی اور یقین دہانی پر اصل حقیقت بتانے پر آمادہ نظر آنے لگا وہ کچھ دیر خاموشی سے نیچے قالین کو گھورتا رہا جیسے کسی مناسب جملے کی تلاش میں ہو۔

"بڑے میر صاحب کی شادی میرے سامنے ہوئی تھی۔" وہ گہری سانس لے کر گویا ہوا رتبہ پوری طرح متوجہ تھی۔

"ان کی بیوی اللہ انہیں جنت نصیب کرے بڑی نیک خاتون تھیں شادی کو چار سال گزر گئے مگر ان کی گود ہری نہ ہو سکی میر صاحب کو تو کوئی خاص پریشانی نہ تھی مگر بڑی بی بی ہر وقت بجھی بجھی اور پریشان رہتی تھیں اولاد تو عورت کا فخر اور مان ہوتی ہے جی! میر صاحب تو چوپال اور زمینوں میں مصروف رہتے مگر بڑی بی بی حویلی میں بولائی سی پھرتیں وہ جیسے اللہ کی رحمت سے مایوس ہو بیٹھی تھیں۔" رحیم داد ماضی کی گپھا میں داخل ہو کر رتبہ کو من و عن ساری کہانی بتانے لگا۔

"پھر ایسا ہوا کہ اس سال جنوری میں خوب برف باری ہوئی کشمیر کی طرف آنے والے سارے راستے برف باری سے بند ہو چکے تھے ایک شام حویلی میں ایک ضعیف شخص اپنی بیمار بہو کو لے کر آیا جس کا بچہ ہونے والا تھا اس عورت کا خاوند دو دن پہلے پہاڑی سے پھسل کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا وہ بوڑھا سیف اللہ حویلی کے خدمت گاروں میں سے تھا اس نے میر صاحب سے درخواست کی وہ اس کی بہو کو کسی طریقے سے شہر لے جانے کا بندوبست کریں اس کی حالت کافی خراب تھی مگر برف کی وجہ سے راستے بند تھے اس عورت کو بڑی بی بی نے اندر بلایا اور گاؤں کی دائی کو حویلی میں بلا بھیجا وہ عورت ایک بچے کو جنم دینے کے بعد چل بسی بوڑھا سیف اللہ بہت رویا۔ اکلوتے بیٹے کے بعد قدرت نے اس کی بہو کو بھی دنیا سے اٹھا لیا بڑی بی بی کو معصوم بچے پر ترس آ گیا انہوں نے میر یازید خان سے اجازت لے کر بچے کو گود لینے کا فیصلہ کیا۔ سیف اللہ بہت خوش تھا وہ چوپال کی دیکھ بھال کرتا اور اپنے پوتے کو پھلتے پھولتے دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کرتا۔" رحیم بابا روانی سے بول رہا تھا اور رتبہ یک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔

"شادی کے ساتویں سال اللہ نے بڑی بی بی پر اپنا فضل کیا اور ولید خان کی آمد ہوئی۔ میر صاحب کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ معید بھی تین سال کا ہو چکا تھا۔ وہ بھی ولید کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ سیف اللہ کو اس کی امانت لوٹا دی جاتی، مگر بی بی چاہتی تھیں کہ معید کچھ بڑا ہو جائے، مگر میر صاحب اس پر راضی نہ تھے، کچھ بھی ہو معید ان کا خون نہیں تھا۔ وہ جلد از جلد اس کے دادا کے حوالے کرنا چاہتے تھے۔ بی بی آمادہ تو ہو گئیں، مگر اللہ کو کچھ اور منظور تھا۔ ان ہی دنوں جاڑے میں سیف اللہ پر نمو کا حملہ ہوا اور وہ تین دن بیمار رہنے کے بعد وفات پا گیا اب میر صاحب کو نہ چاہتے ہوئے بھی معید کو حویلی میں جگہ دینی پڑی اور بی بی کی خواہش پر سب کو یہی بتایا کہ معید ان کا بڑا بیٹا ہے، سوائے حویلی کے مکینوں کے اور کسی کو یہ بات معلوم نہ تھی۔

بڑی بی بی دونوں لڑکوں سے ایک جیسی محبت کرتی تھیں، معید ذرا شرارتی سا تھا، اس نے اپنی شرارتوں کی وجہ سے کئی بار میر صاحب سے مار کھائی، وہ بچپن سے ہی ان سے دور رہنے لگا تھا۔ مگر آج سے پانچ سال پہلے بڑی بی بی کی وفات ہوئی میر صاحب کا رویہ بھی کافی تبدیل ہو گیا جس کا معید نے کافی اثر لیا۔ اب تو ہر وقت کی ڈانٹ ڈپٹ نے اسے حویلی سے بالکل ہی بے زار کر دیا ہے، جو میر صاحب چاہتے ہیں یہ اس کا الٹ

کرتا ہے اور جو اس کی منشا ہوتی ہے میر صاحب اس کی مخالفت کرتے ہیں "اب تو معید خان بہت عجیب ہو گیا ہے' بیشاید بڑی بی بی کا معید خان نہیں رہا۔" رحیم داد نے تاسف سے سر ہلایا۔ اور وہ جو کب سے سانس روکے بیٹھی تھی رحیم داد کے خاموش ہونے پر ایک دم سیدھی ہو بیٹھی اور گہری سانس لے کر کچھ سوچنے لگی۔

"اگر یہ بات اتنی خفیہ رکھی گئی ہے تو معید کو کیسے پتا چلا کہ وہ ماموں جان کا بیٹا نہیں ہے۔" وہ بالوں میں ہاتھ پھنسا کر نیچے قالین کی طرف دیکھنے لگی' تھوڑی دیر بعد رحیم داد خاموشی سے اٹھ کر آتش دان کے پاس چلا گیا جہاں دہکتے انگارے اب راکھ کے پردے میں چھپ کر بجھنے کو تھے۔

☼ ☼ ☼

چھوٹے لکڑی کی بنی ہوئی ٹوکری میں آلوچے اور خوبانیاں رکھ کر درمیانی میز پر رکھ دیں' جس کے آس پاس کرسیوں پر علیزہ' ولید اور رتبہ خوش گپیوں میں مصروف تھے' سردیوں کی نرم دھوپ سے لان کی گھاس پر لرزتے اوس کے ننھے قطرے چمک رہے تھے۔ رتبہ تازہ اور دھلی ہوئی خوبانی کی طرف ہاتھ بڑھانے ہی والی تھی کہ اس کی گود میں رکھا موبائل بج اٹھا' اس نے نمبر دیکھا تو کراچی سے اس کی ماما کا تھا۔

"ہیلو ماما' کیسی ہیں آپ۔" اس نے خوشی سے کہا۔

"دیکھیں فی الحال تو کوئی مجھے کراچی بھیجنے پر راضی نہیں ہے پھر میں کیسے آسکتی ہوں۔" وہ تکن انکھیوں سے علیزہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"نہیں میرا ابھی دل چاہ رہا ہے کچھ دن اور ٹھہر جاؤں' چلیں میں آپ کو فون کروں گی' آپ اشعر کو بھیج دیجیے گا' فی الحال میں بہت انجوائے کر رہی ہوں یہاں کے موسم کو۔" وہ موبائل کان سے لگائے سامنے درختوں کے عقب میں فلک بوس جامنی پہاڑوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"اوکے میں رات کو بات کروں گی' مس یو ٹو۔" وہ مسکراتے ہوئے فون بند کرتے ہوئے گویا ہوئی۔

"کیا کہہ رہی تھیں پھپھو؟" ولید نے خوبانی منہ میں رکھتے ہوئے سوال کیا۔

"ماما بہت اداس ہو گئی ہیں میرے لیے' کہہ رہی ہیں جلدی واپس آجاؤ میں اشعر کو بھیج رہی ہوں تمہیں لینے کے لیے۔" وہ دوبارہ خوبانی کو ٹوکری سے اٹھا کر ہاتھ میں لیتے ہوئے بولی۔

"اتنی جلدی؟" علیزہ حسب توقع حیران ہوئی۔

"میں نے منع کر دیا ہے یار ابھی میرا بھی جانے کا کوئی پروگرام نہیں ہے' کچھ دن مزید رکوں گی یہاں۔" وہ اطمینان سے بولی۔

"خیریت پہلے تو بڑی جلدی تھی جانے کی' اب خیر سے کیا خیال آیا؟" علیزہ نے یونہی پوچھا تو وہ مسکرا دی اور خوبانی کھانے لگی' اب وہ اسے کیا بتاتی کہ وہ کس مقصد کے لیے اپنے جانے کا ارادہ موخر کر چکی ہے' رحیم بابا نے جو پوری کتھا اس کے گوش گزار کی تھی اس کے بعد معید کی الجھن کو سلجھانے میں اس کی دلچسپی مزید بڑھ گئی تھی اور وہ یہ سب بالائی بالا کرنا چاہ رہی تھی' یہ نئی وجہ تھی کہ ابھی تک کسی کو کانوں کان خبر نہ تھی کہ وہ کس مشن پر کام کر رہی تھی' ولید اور علیزہ سے اس بات کا ذکر کرنا بے سود تھا کہ وہ دونوں اس حقیقت سے لاعلم تھے اور وہ اس راز سے پردہ اٹھا کر حویلی میں مزید ہلچل پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لہٰذا وہ سب کچھ نہایت خاموشی اور رازداری سے کر رہی تھی' اسے یقین تھا کہ وہ بہت جلد معید کا ذہن صاف کرنے میں کامیاب ہو جائے گی اور اس کی غلط فہمیاں دور کر کے نئے سرے سے سب کے ساتھ گھل مل کر رہنے پر مائل کر لے گی۔

"کیا سوچ رہی ہو۔" علیزہ نے گہری سوچ میں گم دیکھ کر ٹہوکا دیا۔

"اں... کچھ نہیں۔" وہ خیالی دنیا سے چونکتے ہوئے واپس حقیقی دنیا میں پلٹ آئی۔

"کچھ تو ہے؟" علیزہ نے کریدا۔

"یار کہا نا کچھ نہیں' تم مجھے باتوں میں الجھا کر یہ

سب ختم کرنے کے چکر میں ہو۔" اس نے پھلوں کی ٹوکری اپنی طرف کھسکاتے ہوئے بات کو بدل دیا' اسی اثنا میں حویلی کا گیٹ کھلا اور معید کی گاڑی اندر آئی' وہ گاڑی سے نکل کر سیدھا ان کے پاس چلا آیا۔

"ولید تم نے بات کی اس افسر سے۔" اس نے آتے ہی سنجیدگی سے ولید سے استفسار کیا۔

"ہاں بھائی میں نے اس کو کہا تھا کہ بابا جان بلا رہے ہیں' مگر وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا' اب بابا جان کل خود اس کے پاس جائیں گے' آپ ٹھیک کہہ رہے تھے' وہ بڑا کرپٹ آدمی ہے۔" ولید کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ بات بابا کو بھی سمجھا دینا' وہ تو مجھے ہی کرپٹ سمجھتے ہیں۔" وہ طنزیہ انداز میں کہتا ہوا واپس مڑا۔

"معید آؤ بیٹھو نا۔" رتبہ نے پیچھے سے پکارا' وہ جاتے ہوئے رکا اور واپس پلٹا۔

"آپ لوگ انجوائے کرو' خوامخواہ میری وجہ سے پریشانی ہوگی۔" وہ عام سے انداز میں کہتا ہوا اندر کی طرف بڑھ گیا۔

"کبھو ہی نہیں سکتا کہ وہ ہمارے پاس بیٹھ کر شرف ملاقات بخشیں' ان کی اپنی ایک الگ دنیا ہے۔" علیزہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی تو وہ خاموشی سے اسے اندر جاتا دیکھتی رہی۔

☼ ☼ ☼

کوئی تو ہوتا
میں جس کی چاہت کا خواب بنتا
میں ہجر کے موسم کی
لمبی راتوں میں
یاد بن کر عذاب بنتا
کوئی تو ہوتا
جو میری خواہش میں
اٹھ کے راتوں کو خوب روتا
دکھوں کی چادر لپیٹ کر
ہجوم دنیا سے دور ہوتا
میں روٹھ جاتا' منا تا مجھ کو
چاہے میرا قصور ہوتا
کوئی تو ہوتا
میں جس کے اتنے قریب ہوتا
نہ پاس کوئی رقیب ہوتا
میں تنہا اس کا حبیب ہوتا
کوئی تو ہوتا!

وہ نیم تاریک کمرے میں خاموشی سے نیم دراز تھا' کمرے میں عجیب سی ویرانی کا راج تھا۔ وہ غور سے کھڑکی کی درز سے اندر آنے والی روشنی کی باریک سی لکیر کو دیکھنے لگا جو کمرے میں قدرے روشنی کا سبب بن رہی تھی' رتبہ نے جب سے اس کا اندر ٹٹولا تھا اسے لگا تنہائی کا احساس اور سوا ہو گیا تھا' کم مائیگی کے زخم ایک بار پھر رسنے لگے تھے۔ وہ کیا تھا' اس حویلی میں وہ کس حیثیت سے رہ رہا تھا' یہ سب سوال خودرو جھاڑیوں کی طرح ایک مرتبہ پھر ذہن کی زمین پر اگ آئے تھے' اسے بڑی بی بی کی وفات کا دکھ تو تھا ہی' مگر تین سال قبل جب اس نے چچی کو کسی سے فون پر گفتگو کرتے سنا اسے بہت شاک لگا تھا' تذکرہ پتا نہیں کس کا تھا۔ مگر اس نے دوران گفتگو جب اپنا نام سنا تو وہ سیڑھیاں چڑھنے کی بجائے وہیں ٹھہر گیا' جہاں علیزہ کی امی اس کی جانب پشت کیے صوفے پر براجمان کسی سے کہہ رہی تھیں۔

"ارے اس میں حرج ہی کیا ہے' میں نے تو پہلے بھی مشورہ دیا تھا حسنین بھائی کو کہ اولاد تو اللہ کے ہاتھ میں ہے' مگر اب تو شادی کو گیارہ سال بیت گئے اور کچھ نہیں تو گھر کی رونق کے لیے کسی سینٹر سے کوئی بچہ ہی گود لے لو' طاہرہ بھابھی کا دل ہی بہل جائے گا' اب وہ لوگ کینیڈا میں ہیں کسی کو خاک پتا چلے گا کہ اپنا بچہ ہے یا گود لیا ہے' اب یہ اپنے معید کو ہی دیکھ لو۔" وہ روانی سے بول رہی تھیں' معید کے بڑھتے قدم رک سے گئے۔

"بھابھی جان نے خدا ترسی کر کے اسے گود لیا تو چند سال بعد ہی قدرت نے گود ہری کر دی' اب سوائے

چیدہ لوگوں کے کسی کو بھی نہیں معلوم کہ وہ بڑے میر صاحب کا بیٹا نہیں ہے۔" اس سے آگے پتا نہیں انہوں نے کیا کہا مگر معید کے کان سائیں سائیں کرنے لگے تھے' اس انکشاف نے اس کے اعصاب شل کردیے تھے' وہ بمشکل سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کمرے میں آیا۔

بڑی بی بی کی وفات کو ابھی چند دن ہی گزرے تھے' وہ اس کے لیے ٹھنڈی چھاؤں اور پیار کا گھنا برگد تھیں' ابھی تو وہ اس صدمے سے باہر ہی نہیں نکل پایا تھا کہ چچی کی باتوں نے اسے ایک اور دھچکا دے ڈالا تھا' اس شام وہ کمرے میں آکر خوب رویا' اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کس ماں کے لیے روئے' وہ جس کی کوکھ سے اس نے جنم لیا مگر وہ اسے گود کی گرمی نہ دے سکی یا وہ جس نے پیدا تو نہیں کیا مگر ممتا کی حرارت ضرور دی' وہ رات اس کے لیے بہت بھاری تھی' میر صاحب تو طبیعتاً "سخت واقع ہوئے تھے" مگر اس رات اسے ان کی تمام زیادتیاں اور سختیاں یاد آنے لگیں' وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنا اور ولید کا موازنہ کرنے لگا' اسے اپنا آپ مظلوم لگنے لگا۔ وہ خود کو دنیا کا بدقسمت انسان تصور کرنے لگا۔

اگلے چند دنوں میں اس نے ہر چیز اور ہر رویے کا ازسرنو جائزہ لیا' میر صاحب کا انداز اگرچہ وہی تھا' مگر معید کو اب ان میں سوتیلے باپ کی جھلک واضح نظر آنے لگی' اسے اپنا چچا میر سعید کی نظروں میں ولید کے لیے زیادہ محبت نظر آنے لگی' اسے لگا علیزہ اور ولید اس کی باتوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے' حالانکہ وہ دونوں اس حقیقت سے واقف نہیں تھے کہ معید لے پالک ہے' مگر یہ حقیقت کھلنے کے بعد معید میں مد جزر کی سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی' پتا نہیں یہ خود ساختہ انتقام تھا یا مظلومیت کا احساس' وہ خاموشی سے حویلی کے ہر مکین سے دور ہونے لگا۔

کبھی کبھی اس کے اندر کا لاوا پھٹ پڑتا تو وہ بغیر کسی وجہ کے کسی نہ کسی سے الجھ پڑتا' آہستہ آہستہ حویلی کے مکینوں نے اس کے کام میں دخل اندازی چھوڑ دی' سوائے میر بازید خان کے وہ کبھی کبھی اس کو اپنی من مانی کرنے پر ٹوک دیتے' وہ منہ سے تو کچھ نہ کہتا مگر چہرے پر ناگواری کے تاثرات کسی سے پوشیدہ نہ رہتے' پھر ایک دن یہ ناگواری بھی نفرت میں بدل گئی' جب ایک روز چوپال میں میر صاحب نے معید کو کسی بات پر سخت سست کہا تو وہ حسب عادت بحث کرنے لگا' تھوڑی دیر بعد میر سعید نے اسے اشارے سے باہر جانے کو کہا تاکہ معاملہ ٹھنڈا ہوجائے' وہ ہاتھ میں پکڑا پانی کا کٹورہ درمیانی میز پر پٹخ کر باہر نکل گیا' میر بازید خان شدید طیش میں اسے دیکھ رہے تھے۔

"بے نام کمین کی اولاد' ایسا تو کرے گا' اسے کیا پتا رکھ رکھاؤ کیا ہوتا ہے۔" تھوڑی دیر بعد جب وہ میز پر رکھی گاڑی کی چابیاں اٹھانے دوبارہ چوپال کی طرف آیا جو وہ جلدی میں اٹھانا بھول گیا تھا تو میر صاحب کی زبان سے ادا ہونے والا فقرہ اس کی سماعتوں سے ٹکرایا تھا' اسے یہ جملہ نیزے کی انی کی طرح لگا تھا' وہ چابیاں اٹھائے بغیر واپس پلٹ گیا۔

پہلا خیال اس کے دل میں یہی آیا کہ وہ یہاں سے چلا جائے' مگر کہاں؟ رحیم داد کے بقول اس کے خاندان کے تینوں افراد اس دنیا میں نہیں تھے' پھر وہ کس برتے پر یہ حویلی چھوڑ کر جائے' پھر اس نے حویلی میں ہی رہنے کا ارادہ باندھ لیا اور اس ارادے کے پیچھے انتقامی اور منفی جذبات تھے' وہ کسی پر ظاہر کیے بغیر کہ اسے حقیقت معلوم ہوچکی ہے بڑے تنتنے کے ساتھ حویلی میں رہنے لگا تھا۔ مگر اس تنتنے میں دکھ بھی تھا اور بے بسی بھی' اسے اپنے اندر کا نرم دل اور معصوم معید خان مارنے میں کئی دن لگے' اب وہ ایک جذبات سے عاری اور برف کی مانند ٹھنڈا انسان تھا۔ لچک کیا ہوتی ہے وہ بھول گیا تھا' اور اب جبکہ وہ مکمل طور پر بدل چکا تھا رتبہ سکندر اسے کریدنے اور بدلنے چلی تھی' وہ شاید نہیں جانتی کہ یہ ناممکن ہے۔

وہ کافی دیر سے کسی گیان میں گم تھا' شام کا نارنجی سورج ڈوبنے کو تھا اور کھڑکی کی درز سے آنے والی روشنی کی مہین سی لکیر اب معدوم ہوگئی تھی جس

سے کمرے کی تاریکی میں اضافہ ہوگیا تھا' وہ ان ہی سوچوں میں غلطاں و پیچاں تھا کہ دروازے پر کسی نے ہلکی سی دستک دی۔

"دروازہ کھلا ہے آجاؤ۔" اس نے بیڈ سے اٹھتے ہوئے قدرے بے زاری سے کہا' اس وقت عموماً "بجو شام کی چائے لے کر آتا تھا' مگر دروازہ کھول کر اندر آنے والا چہرہ بجو کا نہیں تھا۔

"اف کتنا اندھیرا ہے کمرے میں۔" اس نے اندر آتے ہی ٹک ٹک کی آواز کے ساتھ کمرے کی تمام لائٹوں کے بٹن دبا دیے' معید کی آنکھیں ایک دم چندھیا سی گئیں' وہ ماتھے پر آنے والی ناگواری کی شکن کو رتبہ سے چھپا نہ سکا۔

"سو رہے تھے کیا' یہ کوئی وقت ہے سونے کا؟" وہ بے تکلفی سے کہتی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"میں نے کب کہا سو رہا تھا۔" وہ بھنویں سکیڑ کر عدم دلچسپی سے گویا ہوا۔

"کمرے کا ماحول تو بڑا خواب ناک بنایا ہوا تھا' تم ایسے میں کتاب پڑھنے سے تو رہے۔" وہ ٹانگ پر دوسری ٹانگ چڑھا کر آرام سے بولی۔

"جب کرنے کو کچھ نہ ہو تو بندہ چھپ کر کمرے میں بند تو ہو سکتا ہے نا۔" وہ ذرا سا تلخ ہوا۔

"مگر بندہ اپنے آپ کو یونہی گوشہ نشین کرلے تو پھر کرنے کو باقی کیا رہ جاتا ہے۔" وہ افسوس سے اسے دیکھنے لگی۔

"تم پھر لیکچر جھاڑنے آئی ہو' مگر میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا۔" وہ بیڈ سے ٹانگیں نیچے لٹکا کر سلیپر پہننے لگا' جیسے فوراً "یہاں سے بھاگنے کا ارادہ ہو۔

"لیکن جب تم نے خود ہی موضوع چھیڑ دیا ہے تو بات کرنے میں کیا حرج ہے؟" وہ بلا جھجک اب معید سے جرح کرنے لگی تھی۔

"اس پر بات کرنا لاحاصل ہے۔" وہ بیڈ سے اٹھتے ہوئے لاپروائی سے بولا۔

"بیٹھ جاؤ معید' میں تمہاری کچھ غلط فہمیاں دور کرنا چاہتی ہوں' بات کرنے سے کافی الجھنیں کم ہوسکتی ہیں۔" وہ ملتجی لہجے میں معید کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"کون سی غلط فہمیاں؟" وہ چونک کر رتبہ کی طرف دیکھنے لگا' وہ واقعی بے خبر تھا یا جان بوجھ کر انجان بن رہا تھا' رتبہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

"وہی جو تمہارے اور ماموں جان کے درمیان پیدا ہوگئی ہیں' تم شاید جان بوجھ کر میری بات کو ٹال رہے ہو۔" وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مجھے کسی قسم کی غلط فہمی نہیں ہے' میری تو خوش فہمیاں دور ہوئی ہیں اپنی حیثیت کا پتا چلا ہے مجھے۔" اس کے لہجے کی کڑواہٹ دوبارہ لوٹ آئی تھی۔

"تم سمجھتے ہو ماموں جان کا قصور یہ ہے کہ انہوں نے تمہیں پال پوس کر اپنے بیٹے کی حیثیت دی ہے' معید مجھے تمہاری سمجھ نہیں آرہی اس ساری صورت حال میں مجھے تو کوئی ایسا گمبھیر اور پیچیدہ مسئلہ نظر نہیں آیا جسے تم بنیاد بنا کر اپنا اور گھر والوں کا خون جلاتے رہو۔" اب کی بار وہ زچ ہو کر بولی۔

"پال پوس کر حویلی میں جگہ دینا ان کی مجبوری تھی' اگر بڑی بی بی ضد نہ کرتیں تو وہ مجھے کب کا کسی یتیم خانے میں داخل کرا چکے ہوتے۔" وہ کاٹ دار مگر دھیمے لہجے میں بولا۔

"مگر وہ تمہیں یتیم خانے داخل کروا بھی دیتے تو کوئی انوکھی بات نہیں تھی' تم ماموں جان کی اولاد نہیں تھے اور نہ ہی تمہیں گود لیتے وقت یہ معاہدہ طے تھا کہ تم ہمیشہ یہاں رہوگے' یہ تو ان کی مہربانی ہے کہ انہوں نے نہ صرف تمہیں دنیا کے سامنے اپنا وارث اور بیٹا بتایا بلکہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی کہ تم لے پالک ہو' آخر تم یہ بات کیوں نہیں سمجھتے۔" اس کی بات پر ذرا سی دیر کو معید کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا تھا اور ماتھے پر شکنوں کا جال سا نمودار ہوگیا جو اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ اسے رتبہ کا انداز ناگوار گزرا ہے۔

"جب تمہیں سرسری سی حقیقت معلوم ہے تو پھر کیوں ان کی وکالت کررہی ہو' اور مجھے غلط ثابت کرنے پر تلی ہو۔" وہ رتبہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ضبط سے بولا۔

"مجھے رحیم بابا نے ساری بات بتائی ہے' اگر اس کے علاوہ بھی کوئی بات ہے تو مجھے بتاؤ' ورنہ بظاہر مجھے کوئی ایسی وجہ نظر نہیں آرہی جس کو بنیاد بنا کر تم یوں سب سے الگ تھلگ ایک دنیا بسالو۔"

"تمہیں اپنے ماموں جان کا رویہ بھی نظر نہیں آرہا؟ کتنی تذلیل کرتے ہیں وہ میری' سب کے سامنے کتنی سبکی محسوس ہوتی ہے مجھے۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ رتبہ گہری سانس لے کر نفی میں سرہلانے لگی۔

"یہ صرف تمہاری سوچ ہے' ورنہ وہ کتنی بار ولید کو ڈانٹ دیتے ہیں' ان کے غصے سے تو سب کی جان جاتی ہے' فرق صرف اتنا ہے کہ ولید خاموش رہتا ہے اور تم ماموں جان سے بحث کرتے ہو' جس سے معاملہ بگڑ جاتا ہے' میرا نہیں خیال کہ وہ تم سے بلاوجہ غصہ ہوتے ہیں۔" وہ دلیل دیتے ہوئے بولی۔

"یہ تمہارا خیال ہے۔" وہ استہزائیہ انداز میں کہتے ہوئے کھڑکی سے پار دیکھنے لگا۔

"انہیں میری ہربات اور خواہش پر اعتراض ہوتا ہے' مجھے نہیں یاد پچھلے چند سالوں میں انہوں نے مجھے شفقت یا محبت سے بلایا ہو۔" وہ زہرخند لہجے میں بولا۔

"دودن پہلے بھی مجھے یاد فرمایا گیا تو صرف یہ اگلوانے کے لیے کہ میں ناجائز دھندوں میں ملوث ہوں' مجھے اخلاقی طور پر اس قدر گرا ہوا سمجھتے ہیں وہ اور تم کہتی ہو یہ صرف میرا وہم ہے۔" وہ بھڑک ہی تو گیا تھا۔ رتبہ خاموشی سے ایک ٹک اسے دیکھے جارہی تھی' وہ اسے بولنے کا موقع فراہم کررہی تھی' تاکہ وہ اپنے دل کی ساری بھڑاس نکال سکے' تھوڑی دیر بعد وہ اضطراری انداز میں بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کمرے میں ٹہلنے لگا' رتبہ اس کی کیفیت سمجھ سکتی تھی' وہ شدید دباؤ میں تھا اور وہ اسے اس ذہنی کشمکش اور دباؤ سے ہی تو نکالنا چاہتی تھی' وہ اس کے اندر چھپے ہوئے نرم خو اور سلجھے ہوئے انسان کو ایک بار پھر باہر لانا چاہتی تھی' نہ جانے کیوں اسے ایک دم معید خان سے ہمدردی محسوس ہونے لگی تھی' وہ اس کی الجھن کو سلجھانا چاہتی تھی اور وہ اس کی ذات میں دلچسپی کو سوائے ہمدردی کے جذبے کے کوئی دوسرا نام نہیں دے پارہی تھی۔

"ایک بات بتاؤ معید۔" کچھ دیر بعد وہ خاموشی کو توڑتے ہوئے گویا ہوئی' وہ رک کر اسے دیکھنے لگا' جیسے اس کے اگلے سوال کا منتظر ہو۔

"کیا تمہارے اندر یہ منفی جذبات اس وقت پیدا ہوئے جب تمہیں پتا چلا کہ تمہارا اس حویلی والوں سے کوئی رشتہ نہیں ہے' میرا مطلب ہے کیا ماموں جان کی سخت طبیعت کا تمہیں اس سے پہلے ادراک نہیں تھا؟" وہ اسے جان بوجھ کر اس طرف لے آئی تاکہ وہ اپنا احتساب خوب کرسکے۔

"ظاہر ہے جب سب کچھ پتا چلا تب ہی تو ان کے رویے پر غور کیا' ورنہ میں پتا نہیں کب تک ان کی زیادتیاں یونہی سہتا رہتا۔" وہ خائف سا ہو کر بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"بعض دفعہ بے خبری بھی کتنی اچھی ہوتی ہے معید' اگر تمہیں یہ سب پتا نہ چلتا تو کتنا اچھا ہوتا' تمہارے دل میں کبھی کسی کو پرکھنے کا خیال ہی نہ آتا۔" وہ غیرمحسوس طریقے سے اسے آئینہ دکھارہی تھی۔

"پہلے تم ماموں جان کی ڈانٹ ولید کی طرح ایک باپ کی ڈانٹ سمجھ کر برداشت کرتے رہے' پھر تم کو لگا کہ یہ سب زیادتی تھی تمہارے ساتھ اور ماموں تمہیں ظالم سوتیلے باپ کی طرح نظر آنے لگے۔" وہ طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے معید کے قریب آن کھڑی ہوئی۔

"کسی کا رویہ نہیں بلکہ تمہارا سوچنے کا انداز بدلا ہے' ورنہ اس حویلی میں سب کچھ ویسا ہے جیسا آج سے چند سال پہلے تھا' تم نا صرف اپنی جان جلارہے ہو بلکہ اپنے رویے سے سب کو پریشان کررہے ہو' پلیز اپنے آپ کو ان منفی خیالات سے آزاد کرو' جب تم نے اپنے قدم پیچھے ہٹا لیے ہیں تو دوسرے کیوں تمہارے پاس آئیں گے' یقین کرو معید تم اگر ایک قدم بڑھاؤ گے تو یہ سب تمہاری طرف لپک کر آئیں گے' میں چاہتی ہوں کہ تم۔"

"بس یا اور بھی کچھ رہتا ہے مجھے نیند آرہی ہے۔" وہ ماتھے پر تیوریاں لیے بے زاری سے اٹھ کھڑا ہوا' جس کا مطلب تھا رتبہ اب جاسکتی ہے' وہ بے یقینی سے معید کی طرف دیکھنے لگی' وہ اسے اتنا بے لچک اور سنگدل نہیں سمجھتی تھی' مگر اس وقت وہ لگا تھا۔

"ٹھیک ہے تم آرام کرو۔" وہ گہری سانس لیتے ہوئے مایوسی سے بولی۔

"میں بہت امید اور خلوص نیت سے آئی تھی تمہارے پاس' تمہیں ان خودساختہ سوچوں اور غلط فہمیوں سے نکالنا چاہتی تھی جنہوں نے تمہیں سب سے الگ کردیا ہے' مگر یہ میری خام خیالی تھی کہ تم میرا بھرم رکھو گے' مجھے۔" وہ ایک لمحے کو رکی پھر معید کی آنکھوں میں دیکھا۔

"مجھے تسلیم کرلینا چاہیے کہ میں چاہنے کے باوجود بھی تمہارے اندر تبدیلی لانے میں ناکام رہی ہوں' کاش تم کسی پر اعتبار کرسکتے۔" وہ اپنا جملہ مکمل کرکے دروازہ کھول کر بوجھل قدموں سے باہر نکل گئی۔ وہ خاموشی سے لب بھینچے بند دروازے کو دیکھنے لگا' اسے اچانک احساس جرم نے آن گھیرا تھا' کہیں کچھ غلط ضرور ہوا تھا' اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کہاں۔

وہ کافی دیر بیڈ پر لیٹا رتبہ کی باتوں پر غور کرتا رہا' کچھ دیر بعد اٹھ کر بے چینی سے بیٹھ گیا' رتبہ کے سوالات اس کے آس پاس گونجنے لگے تھے۔ خود احتسابی کا کڑا عمل شروع ہوچکا تھا' رتبہ نے اسے آئینے کے سامنے لاکھڑا کیا تھا جہاں عکس تو بہت واضح تھے مگر نقش بہت معدوم اور وہ یہ نقش ہی تو سنوارنے لگی تھی' جسے معید نے مایوس لوٹا دیا تھا' وہ کراؤن سے سر ٹکا کر سوچوں کے بھنور میں اترنے لگا تھا اور سوچیں سمندر سے زیادہ عمیق تھیں۔

☼ ☼ ☼

دوسرے دن شکار سے واپسی پر وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا۔ باہر شام کا ملگجا سا اندھیرا چھانے لگا تھا۔ ہلکی سی دھند کی وجہ سے ایسا لگ رہا تھا جیسے پوری وادی پر سفید دھوئیں کا غلاف اوڑھا دیا گیا ہو' دھند اور خنکی نے سرشام ہی سارے ماحول کو اپنے زیرنگیں کرلیا تھا۔ اس کے کمرے کی ہر چیز حسب معمول بہت ترتیب' قرینے اور نفاست سے اپنی جگہ موجود تھی' لگتا تھا آج فیض بی بی نے کافی وقت دیا تھا کمرے کو چمکانے میں' اس نے اپنے شانوں سے گرم چادر اتار کر کرسی پر رکھتے ہوئے کمرے کا ناقدانہ جائزہ لیا۔ اور جوتے اتار کر بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

آج وہ خلاف معمول حویلی میں جلدی لوٹ آیا تھا' ورنہ عموماً وہ رات گئے گھر لوٹنے کا عادی ہوگیا تھا' وہ یک ٹک سامنے دیوار کو تکے جارہا تھا' آج اس کا دل بہت بوجھل ہورہا تھا' نہ جانے کیوں اسے انجانی سی تھکن اور دل گرفتی نے گھیر لیا۔ دل خوامخواہ رونے کو چاہ رہا تھا' اسے محسوس ہورہا تھا کہ اپنے آپ سے اور دوسروں سے لڑتے لڑتے وہ نڈھال سا ہوگیا تھا' پچھلے کئی سالوں میں اسے نہیں یاد پڑتا کہ وہ کتنی بار دل کھول کر ہنسا تھا بلکہ مسکرائے ہوئے بھی عرصہ بیت گیا تھا' اس نے گہری سانس لے کر آنکھیں موندلیں۔

"تم تھک گئے معید خان؟" اس کے اندر سے کسی نے سرگوشی کی۔

"ہاں میں تھک گیا ہوں' اپنے آپ سے اور اس حویلی کے مکینوں سے بھاگتے بھاگتے تھک گیا ہوں۔" اس نے دل ہی دل میں اعتراف کیا' وہ اعتراف جو وہ کرنا نہیں چاہتا تھا' مگر کرنا پڑا اور اس اعتراف کا محرک اور سبب کون تھا' وہ اچھی طرح جانتا تھا' اگر وہ یوں اسے سمجھانے کے لیے آگے نہ بڑھتی تو وہ نہ جانے کب تک احساس کمتری اور بے وقعتی کی آگ میں جلتا رہتا' اس کی باتیں کڑوی تھیں' مگر سچ تھیں' وہ آنکھیں موندے اعتراف کررہا تھا۔

"معید خان اس نے کتنی آسانی سے تمہیں قائل کرلیا' ایک رات میں بدل گئے تم۔" اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

"ایسا کیسے ہو گیا؟ وہ ذرا سی دیر میں تمہیں قائل بھی کر گئی اور زیر بھی۔" اس کے اندر کوئی بولا تھا اور یہ یقیناً "مخالف قوت" تھی۔

جس کو انا کا نام دیا جاتا ہے یہ ہمیشہ یونہی آڑے آجاتی ہے، جب کوئی ساری رنجشیں پس پشت ڈال کر آگے بڑھنا چاہتا ہے اب بھی وہ قوت سر پیچ رہی تھی۔

"کہاں گئے تمہارے دعوے، تم ایک چھٹانک بھر کی لڑکی سے ہار مان گئے۔" کوئی ہنسا تھا۔

"پھر کیا کروں میں؟" وہ بالوں میں انگلیاں پھنسا کر دوزانو بیٹھ گیا۔

"وہ کہتی ہے محبت میری منتظر ہے، میں نے اپنے دل کے دروازے بند کر رکھے ہیں، وہ ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔" وہ سر جھکائے بیٹھا تھا، رتبہ سکندر اسے زندگی کے معنی سمجھا گئی تھی، جس کو اس نے کب سے اپنی لغت سے نکال رکھا تھا، رتبہ ٹھیک تو کہتی ہے، اگر میر صاحب مجھے یتیم خانے بھی داخل کروا دیتے تو کیا ہو جاتا، میں ذرا سی بات پر ان کے اتنے احسانات کیسے فراموش کر سکتا ہوں، وہ بیڈ سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

وہ خاموشی سے دھند اور تاریکی میں لپٹی وادی کو دیکھنے لگا، خود احتسابی کا عمل بھی کتنا کڑا تھا، رتبہ نے اسے خود احتسابی کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ اس نے اس خود ساختہ جنگ میں خود کو کتنا تنہا کر لیا تھا۔ اسے یاد ہے پچھلے چند سالوں میں ایسی کئی راتیں گزری تھیں جب وہ تنہائی اور بے بسی سے دلگرفتہ ہو جاتا، مگر ایسا کوئی فرد نہ ملتا جس سے باتیں کر کے وہ دل کا بوجھ ہلکا کر لیتا اور اب جبکہ رتبہ اسے کریدنے آئی تو اس نے اپنا آپ سارا کھول کر رکھ دیا، بلکہ اس کے دکھائے ہوئے راستے پر بھی چل پڑا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی تھی، جس سودے میں محبت ہی محبت ہاتھ لگے وہ سودا اتنا برا بھی نہیں، وہ کھڑکی کے پٹ بند کر کے دوبارہ اپنے بیڈ پر چلا آیا اور کمبل منہ پر اوڑھ کر سونے کی کوشش کرنے لگا، مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی جسے اس نے کئی جتن کر کے منانا تھا۔

☼ ☼ ☼

معیذ سے بات کرنے کے بعد اگلے روز ہی اس نے کراچی فون کر کے اشعر سے کہا تھا کہ وہ اسے لینے آجائے، وہ واپس کراچی جانا چاہتی ہے، علیزہ کو پتا چلا تو وہ حیران رہ گئی۔

"مگر تم نے تو ابھی ٹھہرنا تھا۔" وہ بیڈ پر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ایک ماہ ہو گیا ہے، یہاں آئے ہوئے اگلے ویک اشعر کے ایگزامز ہونے والے ہیں اور میں پیپرز میں اسے ڈسٹرب نہیں کر سکتی، بہتر ہے ابھی چلی جاؤں۔" وہ اچانک جانے کی اصل وجہ علیزہ کو نہیں بتا سکتی تھی۔

"مجھے سمجھ نہیں آتی تمہاری منطق کی، بھئی اگر اس کے ایگزامز ہیں تو ولید چھوڑ آتا تمہیں کراچی، فون کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" وہ تلملا کر بولی تو رتبہ ہنس پڑی۔

"اگلے سال پھر آؤں گی، رہنے کے لیے فی الحال تو جانے دو۔" وہ اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"کھانا لگ گیا ہے، سب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" فیض بی بی نے دروازے سے سر اندر کر کے اطلاع دی تو وہ دونوں اٹھ کھڑی ہوئیں، کھانے کی ٹیبل پر آج کافی دنوں بعد معیذ بھی موجود تھا، وہ عین اس کے سامنے براجمان ہوئی۔

"ولید بتا رہا تھا کہ تم کراچی واپس جا رہی ہو؟" کھانے کے دوران میر بازید نے رتبہ کی طرف دیکھتے ہوئے۔

"جی ماموں جان، مما تو کب سے فون کر رہی تھیں کہ اب واپس آجاؤں، میں نے ان سے کہا ہے کہ اشعر کو بھیجیں وہ شاید پرسوں تک آجائے۔" اس نے پانی کا گلاس بھرتے ہوئے کہا تو معیذ کے حرکت کرتے ہاتھ ایک لمحے کو رک سے گئے، اس نے چونک کر رتبہ کی طرف دیکھا، مگر وہ بے نیازی سے پانی پینے میں مصروف تھی۔

"اشعر تو رکے گا نا یہاں چند روز؟" چھوٹی ممانی نے استفسار کیا۔

"آئی ڈونٹ نو میرا خیال ہے وہ ایک، دو روز سے زیادہ نہ رکے، شاید اس کے بی ایس سی کے ایگزامز ہونے والے ہیں۔" وہ نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولی۔

"آپ ولید اور علیزہ کو بھی بھیجیں نا کبھی کراچی، بہت مزا آئے گا۔" وہ معیذ کو جان بوجھ کر نظر انداز کرتے ہوئے اطمینان سے علیزہ کی امی سے مخاطب ہوئی۔

"ہاں کیوں نہیں چکر لگائیں گے ہم سب بلکہ میں تو ہر سال کہتی ہوں، پھر کسی نہ کسی وجہ سے پروگرام رہ جاتا ہے۔" چھوٹی ممانی نے کہا تو اس نے کن انکھیوں سے معیذ کی طرف دیکھا، وہ لب بھینچے خاموشی سے خالی پلیٹ میں دھرا چمچہ دیکھ رہا تھا، اس نے رتبہ کی بے نیازی کو یقیناً "محسوس" کیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ کرسی پیچھے سرکا کر اٹھ کھڑا ہوا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا بالائی منزل کی سیڑھیاں چڑھنے لگا، رتبہ نا سمجھنے والے انداز میں اس کی خالی کرسی کو دیکھنے لگی۔

"ایک تو مجھے اس لڑکے کی سمجھ نہیں آتی، کھانا کھا کر ایسے اٹھ گیا ہے جیسے یہاں کسی سے کوئی تعلق ہی نہ ہو، سرائے سمجھ رکھا ہے گھر کو۔" میر بازید اس کے رویے سے سخت نالاں نظر آرہے تھے، لیکن حسب معمول ٹیبل پر صرف پلیٹوں سے چمچہ ٹکرانے کی آوازیں آتی رہیں، کوئی بھی معیذ کی حمایت یا مخالفت میں نہیں بولا، مگر رتبہ نے گلا صاف کر کے کچھ کہنے کی ہمت پکڑ ہی لی۔

"ماموں جان میرا خیال ہے اسے کوئی نفسیاتی پرابلم ہے۔" اس نے میر بازید کی طرف دیکھے بغیر سامنے رکھے ٹشو بکس کو دیکھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

"کیا مطلب، کیسا پرابلم؟" میر صاحب نا سمجھی کے عالم میں رتبہ کو دیکھنے لگے۔

"میں نے اندازہ لگایا ہے وہ کچھ زیادہ حساس واقع ہوا ہے، ذرا ذرا سی بات کا نوٹس لیتا ہے۔" میر صاحب اب بھی بھنویں سیکڑ کر نا سمجھنے والے انداز میں رتبہ کو تک رہے تھے اور وہ اپنے نپے تلے الفاظ سے بات کی وضاحت نہیں کر پا رہی تھی۔

"کھل کے کہو کیا بات ہے۔" وہ کچھ سوچ کر بولے۔

"ماموں جان مجھے لگتا ہے وہ خوش نہیں ہے کسی بات سے، اس کو دکھ ضرور پہنچا ہے۔" اسے لگا جیسے وہ معیذ کی وکیل اور وہ مدعی ہو۔

"کیوں خوش نہیں ہے، کس چیز کی کمی ہے اسے، گاڑی ہے اس کے پاس ہزاروں روپے کا جیب خرچ ملتا ہے، اسے کوئی ذمہ داری نہیں ڈالی میں نے اس کے کاندھے پر کئی ملازم اس کے ایک اشارے کے منتظر ہیں، پھر بھی وہ خوش نہیں ہے؟" میر صاحب نے اپنے

سامنے رکھی خالی پلیٹ کو پرے دھکیلتے ہوئے برہمی سے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے ماموں جان، مگر میرے خیال میں ان مادی آسائشوں کے علاوہ وہ شاید زیادہ توجہ اور پیار کی ڈیمانڈ کرتا ہے بڑی ممانی کی وفات کو اس نے دل پر لے لیا تھا، وہ سمجھتا ہے کہ ان کے جانے کے بعد آپ کا رویہ بدل گیا ہے اس کے ساتھ۔" اس نے براہ راست میر صاحب کی ذات کو موضوع بحث بنایا، سب نے چونک کر رتبہ کی طرف دیکھا مگر وہ یونہی ٹیبل کی سطح کو دیکھتے ہوئے اپنا نقطہ نظر بیان کیے جارہی تھی۔

"ماموں اگر اسے محبت سے ڈیل کیا جائے تو وہ سمجھ جائے گا کہ وہ کہاں پر غلط ہے۔"

"تمہیں یہ سب کس نے کہا؟" میر صاحب نے کھوجنے والے انداز میں اس سے پوچھا۔

"ہمم... میرا اندازہ ہے اسے اور کوئی پرابلم نہیں ہے، شاید وہ علیزہ اور ولید سے بڑا ہونے کے ناتے زیادہ پروٹوکول چاہتا ہے، وہ سختی سے گھبراتا ہے۔" اسے اپنے الفاظ مجتمع کرنے میں بڑی دقت ہوئی، وہ نہیں چاہتی تھی کہ ان کو ذرا سی بھنک بھی پڑے کہ وہ معید کے بارے میں سب کچھ جان چکی ہے، ورنہ ایک اور پنڈورا بکس کھلنے کے ساتھ ساتھ حویلی میں کئی افراد کی شامت آجاتی اور شاید وہ بھی شامل تفتیش کرلی جاتی۔

"تم نے خود دیکھا ہوگا کہ اس کا رویہ کیسا ہے سب کے ساتھ، کتنا خودسر ہوگیا ہے وہ اپنی مرضی سے حویلی میں جاتا ہے، رات گئے لوٹتا ہے، کیا مجھے اتنا بھی حق نہیں کہ پوچھ سکوں وہ کیا کرتا پھرتا ہے، پہلے اسے اپنی حرکتوں پر غور کرنا چاہیے۔" وہ اپنی بات میں وزن رکھتے تھے اور حق بجانب تھے۔

"اگر وہ یہ چاہتا ہے کہ میں اسے کھلی چھٹی دے دوں اور اس کے ہر اچھے یا برے کام پر آمین کہتا رہوں تو یہ نہیں ہوسکتا، میں بچپن سے لے کر اب تک اس کی ہر خواہش پوری کرتا رہا ہوں، اس کا صلہ یہ ہے کہ وہ میرے سامنے زبان درازی کرے، بحث کرے میرے ساتھ، اگر اس کو پیار میں کمی محسوس ہوتی ہے تو اس کا ذمہ دار وہ خود ہے۔" وہ طیش میں آگئے تھے، رتبہ کچھ دیر خاموشی سے سر جھکائے ٹیبل کی شفاف سطح پر اپنی انگلی پھیرتی رہی۔

"میں اس سے بات کروں گی، وہ بھی اپنا رویہ بدلے گا، آج کتنے دنوں بعد اس نے یہاں بیٹھ کر کھانا کھایا ہے اور میں نے نوٹ کیا ہے چند دن سے وہ شام سے پہلے حویلی میں لوٹ آتا ہے، اگر سب اس کو توجہ دیں تو میرے خیال میں وہ بہت جلد اپنی روش چھوڑ دے گا، اس کا علاج سمجھ کر ہی سہی سب کو ایسا ایک بار تو کرنا ہوگا۔" اس نے جیسے سب سے استدعا کی تھی، اب وہ انہیں کیا بتاتی کہ ایک ایسی ہی استدعا وہ دو روز قبل کسی اور سے بھی کرچکی ہے، مگر وہ مسترد کردی گئی تھی، میر سعید حیرت سے رتبہ کو دیکھ رہے تھے، وہ مسئلہ جو پچھلے تین سالوں سے حویلی میں بدمزگی اور پریشانی کا سبب بنا ہوا تھا، کتنی آسانی سے اس نے اس کا حل ڈھونڈ نکالا تھا، وہ دل ہی دل میں اس کی ہمت اور ذہانت کی داد دے رہے تھے۔

"بھائی جان میرے خیال میں رتبہ ٹھیک کہتی ہے، ہوسکتا ہے، بھابھی صاحبہ کے جانے کے بعد ہماری توجہ غیر محسوس طریقے سے اس سے ہٹ گئی ہو اور اس نے اس کو دل پر لے لیا ہو، حساس تو وہ بچپن سے ہے۔" میر سعید نے رتبہ کی تائید میں بات آگے بڑھائی۔

"حساس ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ ضد پکڑ لے اور اپنی من مانیاں کرتا پھرے۔" میر بازید اب بھی اس سے خائف نظر آرہے تھے۔

"چلیں چھوڑیں جو بھی ہے آپ بڑے ہیں اور وہ چھوٹا، یہ عمر نا سمجھی کی ہوتی ہے اسے پیار سے سمجھائیں گے تو سمجھ جائے گا، بعض معاملات میں دل بڑا کرنا پڑتا ہے۔" میر سعید نے میر صاحب کو نرم کرنے کی کوشش کی اور وہ اس میں کافی حد تک کامیاب رہے۔

"ٹھیک ہے اگر وہ نالائق اسی غلط فہمی میں ہے کہ میں اس سے محبت نہیں کرتا تو اسے بتادینا کہ میں اس وقت تک چین سے نہیں سوتا جب تک وہ رات کو گھر واپس نہیں لوٹتا۔" وہ ٹیبل سے اٹھتے ہوئے دکھ سے بولے، رتبہ نے دیکھا یہ بات کرتے ہوئے ان کے لہجے میں صرف محبت ہی محبت تھی، غصہ تو کہیں مفقود ہوچکا تھا، ٹیبل کے اردگرد بیٹھے ہوئے افراد اس بات سے لاعلم تھے کہ بالائی منزل کی آخری سیڑھی پر کھڑا معید ساری گفتگو سن چکا تھا، کسی کو اسے بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ کمرے میں اپنی چیزیں سمیٹ کر ایک جگہ رکھ رہی تھی، تھوڑی دیر قبل اشعر کا فون آیا تھا کہ وہ کل آرہا ہے، اس لیے وہ پہلے سے پیکنگ میں مصروف ہوگئی تھی، دروازے کو کسی نے انگلیوں سے بجایا تھا۔

"آجائیں۔" اس نے سوٹ کیس کو سوٹ کیس کے اندر ٹھونستے ہوئے کہا، اس کی پشت دروازے کی جانب تھی، اس نے کسی کے قدموں کی چاپ اپنے عقب میں سنی جو بھی تھا وہ کمرے میں آچکا تھا، اس نے رخ موڑ کر نووارد کو دیکھنا چاہا، معید کو اپنے پیچھے کھڑا دیکھ کر اس کے تیزی سے حرکت کرتے ہاتھ ایک لمحے کو رکے، مگر پھر جلد ہی حرکت میں آگئے، وہ دوبارہ سوٹ کیس پر جھک گئی تھی، جیسے معید کی آمد سے اسے کوئی سروکار نہ ہو، وہ سینے پر بازو لپیٹے کچھ دیر خاموشی سے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتا رہا۔

"مجھے بیٹھنے کو نہیں کہو گی؟" وہ گلا کھنکار کر آہستگی سے گویا ہوا، رتبہ اب بھی اس جانب پشت کیے بیڈ پر رکھے سوٹ کیس میں بلاوجہ دلچسپی لے رہی تھی۔

"بیٹھ جائیں آپ کا اپنا گھر ہے، میں تو مہمان ہوں یہاں۔" وہ حد درجہ تکلف سے کام لیتے ہوئے بولی تو معید زیر لب مسکرا دیا۔

"تم واپس جارہی ہو۔" وہ اس کے قریب آکر بولا۔

"جو بات معلوم ہے وہ پوچھنے کا فائدہ۔" وہ اس کی جانب رخ موڑتے ہوئے روٹھے انداز میں گویا ہوئی۔

"اتنی جلدی، کچھ دن اور رک جاؤ۔" وہ خلاف توقع چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ سجائے کھڑا تھا۔

"جس مقصد کے لیے میں یہاں رکنا چاہتی تھی وہ مقصد ہی ختم ہوگیا، پھر رکنے کا فائدہ؟"

"کون سا مقصد؟" اس نے جلدی سے سوال داغا۔

"تم جانتے ہو۔" وہ بیڈ پر رکھی شال اٹھا کر تہ لگانے لگی۔

"لیکن میرا تو خیال ہے تم اپنے مقصد میں کامیاب رہی ہو۔"

"اچھا یہ انقلاب کب برپا ہوا؟" وہ طنزیہ انداز میں معید کو دیکھنے لگی۔

"جب تم میرے کمرے سے ناراض ہو کر چلی آئی تھیں۔" وہ اسے اپنی نظروں کے حصار میں لیتے ہوئے بولا تو وہ ایک ثانیے کو چونکی، پھر خود کو نارمل کرتے ہوئے بولی۔

”یہ میں کیسے مان لوں؟“

”تمہیں ماننا پڑے گا۔“ وہ مصر ہوا۔

”کوئی ثبوت ہے تمہارے پاس۔“ وہ بے نیازی سے بال پیچھے باندھتے ہوئے گویا ہوئی۔

”یہ ثبوت کم ہے کہ میں اس وقت تمہارے پاس آیا ہوں‘ اس بات کا اعتراف کرنے کہ تم ٹھیک کہتی ہو۔“ وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”صرف اعتراف کرنے آئے ہو یا عمل بھی کرو گے؟“ وہ تصدیق چاہ رہی تھی۔

”اس لیے تو کہہ رہا ہوں کہ چند روز اور رک جاؤ‘ پھر دیکھ لینا کہ میں کتنا عمل کررہا ہوں۔“

”واقعی۔“ وہ ایک تحیر بھری نگاہ معید پر ڈال کر بولی‘ اس کے اعصاب ایک دم ڈھیلے پڑ گئے تھے‘ وہ مطمئن اور شانت سی ہوگئی تھی کہ اس کی کوشش رائیگاں نہیں گئی‘ معید اس کی بات کی تہ تک پہنچ گیا تھا‘ یہ ہی تو وہ چاہتی تھی۔

”تھینکس تم نے اپنی ضد چھوڑ ہی دی۔“

”تم کیوں شکریہ ادا کررہی ہو‘ مجھے تمہارا احسان مند ہونا چاہیے‘ تم نے مجھے دوسرے رخ کو دیکھنے پر مجبور کیا‘ مجھے احساس کمتری سے باہر نکالا‘ یقین کرو اگر کچھ وقت مزید اسی کشمکش میں گزر جاتا تو شاید میں کوئی انتہائی قدم اٹھا لیتا‘ شکریہ اچھی لڑکی۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا ممنونیت سے بولا تو وہ اس کی نگاہوں کی تپش سے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی‘ وہ بہت پراعتماد تھی‘ مگر نہ جانے کیوں آج اس کا سارا اعتماد جیسے جھاگ کی مانند بیٹھتا جارہا تھا‘ معید کی پرشوق نگاہیں وہ اچھی طرح پڑھ سکتی تھی اور سمجھ بھی سکتی تھی‘ مگر وہ گھبرا رہی تھی۔

”چچ۔۔۔ چلو یہ تو بہت اچھا ہوا‘ اب ماموں بھی بہت خوش ہوں گے‘ تمہیں بدلا ہوا دیکھ کر۔“ وہ اضطراری انداز میں بولی۔

”اور تم۔۔۔ تم خوش نہیں ہو۔“ وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔

”ظاہر ہے میں بھی خوش ہوں۔“ وہ بلا ضرورت پھر سوٹ کیس پر جھک گئی۔

”تم چاہتی ہو کہ میں ہمیشہ اسی طرح اچھا رہوں۔“

”کیا مطلب؟“ وہ اس کے بے سروپا سوال پر ہنستے ہوئے بولی۔

”میں نے جو پوچھا ہے وہ بتاؤ۔“ وہ اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے دوبارہ گویا ہوا۔

”میں کیوں نہیں چاہوں گی بھلا کتنا سر کھپایا ہے تمہارے ساتھ۔“ وہ شرارتی انداز میں سوٹ کیس بند کرتے ہوئے بولی۔

”اس کے لیے تو تمہیں میری ٹریننگ کرنی ہوگی۔“ وہ شرط عائد کرنے والے انداز میں بولا۔

”کب تک؟“ وہ سیدھی ہوتے ہوئے بولی۔

”ساری عمر۔“ وہ نہایت اطمینان سے بولا تو وہ ایک لمحے کو چپ سی ہوگئی۔

”میں جانتا ہوں تمہیں بہت حیرانی ہوئی ہے‘ مگر تم وہ واحد لڑکی ہو جو مجھے سمجھتی ہو‘ میرا ماضی میرا حال‘ سب تمہیں معلوم ہے‘ میں نے زندگی میں صرف ایک عورت سے محبت کی تھی‘ جس نے مجھے کوکھ بخشی اور پھر ماں کا پیار بھی دیا‘ اس سے جدا ہوا تو بری طرح بکھرا اور پھر بگڑتا چلا گیا‘ آج ستائیس سال بعد مجھے اس عورت سے محبت ہوگئی ہے‘ جس نے مجھے نئے سرے سے سنوارا ہے‘ مجھے ڈر ہے کہ اگر یہ بھی جدا ہوگئی تو میں پھر سے نہ بکھر جاؤں‘ میں اپنی راہ پھر سے کھوٹی نہیں کرنا چاہتا رتبہ۔“ وہ اس کے قریب آیا وہ ہنوز ساکت کھڑی تھی۔

”تم ساتھ دوگی میرا؟“ وہ سراپا سوال تھا اور وہ گنگ۔

اس نے سر اٹھا کر سامنے ایستادہ معید کو دیکھا‘ اس کی شکنوں سے پاک پیشانی کتنی کشادہ لگ رہی تھی آج‘ اس کے چہرے پر غصے کی کوئی لکیر نہیں تھی تو وہ پہلے کی طرح وجیہہ اور معصوم لگ رہا تھا۔

”میرے کمرے میں آکر تو بہت لیکچر جھاڑتی تھیں‘ اب کیوں چپ ہو؟“ وہ اس کا کندھا تھام کر اپنی طرف موڑتے ہوئے شرارت سے بولا‘ تو وہ جھجل سی ہوکر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

”میں کیا بولوں معید مجھے توقع نہیں تھی کہ تمہارے اندر واقعی اتنا بڑا انقلاب آسکتا ہے‘ تم کچھ اور سوچنے لگو۔“ اس سے اور کچھ نہ بن پڑا تو اتنا کہہ کر کھڑکی سے پار دیکھنے لگی۔

”تمہیں برا لگا؟“ وہ آہستگی سے بولا‘ وہ رتبہ کی خاموشی سے کچھ بھی اخذ کرنے سے قاصر تھا۔

”نہیں اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے۔“ وہ بے ساختہ کہہ گئی‘ پھر خود ہی وضاحت کرنے لگی۔

”میرا مطلب ہے ہر کسی کو حق ہے کہ وہ اپنے دل کی بات کہہ سکے۔“ وہ کندھے اچکا کر بیڈ پر بیٹھ گئی اور ایسے ظاہر کیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

”کب جارہی ہو؟“ اس نے بات کا رخ موڑتے ہوئے پوچھا۔

”پرسوں۔“ وہ مختصراً بولی۔

”تم نے سب کو کراچی آنے کی دعوت دی‘ مجھے کیوں نہیں؟“ اسے اچانک یاد آیا۔

”سب کے ساتھ تم بھی آجانا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”بہت جلد آؤں گا۔“ وہ الٹے قدموں پیچھے کی طرف ہٹتے ہوئے بولا۔

”بلکہ ایک ہی بار آؤں گا تمہیں لینے کے لیے‘ پھر تم یہاں مہمان بن کر نہیں پورے استحقاق کے ساتھ رہ سکوگی۔“ اس کے لہجے میں یقین تھا‘ رتبہ نے بیڈ شیٹ کے ڈیزائن پر انگلی پھیرتے ہوئے ایک نظر اس کی طرف دیکھا‘ اس کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کہے۔

”رتبہ!“ باہر سے چھوٹی ممانی کی آواز آئی تھی‘ اس کی مشکل حل ہوگئی تھی۔

”ابھی آئی۔“ وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تم نے جواب نہیں دیا۔“ معید نے پاس سے گزرتے ہوئے اسے روک لیا۔

”ہر بات کا جواب ضروری نہیں ہوتا۔“ وہ بلاوجہ چڑ سی ہوگئی تھی۔

”تو پھر میں کیا سمجھوں؟“ وہ ضد پر اڑا تھا۔

”وہی جو تمہارا دل کہے۔“ وہ زیر لب مسکرائی اور اس سے کترا کر باہر نکل گئی۔ وہ کوٹ کی جیبوں سے ہاتھ نکال کر بالکونی میں چلا آیا‘ سامنے کونجوں کی ڈار اڑ کر اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی‘ نیلگوں پہاڑوں میں سورج غروب ہونے کو تھا‘ مگر اس کی آنکھوں میں مہتاب طلوع ہو رہا تھا۔

سنو!
جب خوشبوئیں اعلان کرتی ہیں
کسی کے لوٹ آنے کا
تو پھر لفظوں میں کیسے لکھ سکیں گے
اس کی آمد کی کہانی کو
وفا کی حکمرانی کو
سنو! تم بھی ذرا دیکھو
محبت کی دعائیں مانگتی شب نے
نئے اک سرخرو دن کے
سہانے خواب دیکھے ہیں
یہ کیسا خوش نما احساس ہے
آئندہ برسوں میں
ہر اک موسم‘ ہر اک دن کی دھنک
کرنوں کو
ہم اک ساتھ برتیں گے
سنو! یہ خوشبوئیں اعلان کرتی ہیں

وہ سینے پر ہاتھ باندھے یک ٹک سامنے کا منظر دیکھ رہا تھا‘ باہر سب کچھ پہلے کی طرح تھا‘ مگر کہیں نہ کہیں نیا پن ضرور تھا‘ وہ مسکرا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

☼ ☼

مہوش افتخار

میری حسرتوں کا شمار کر

مکمل ناول

مہندی لگے گی تیرے ہاتھ
ڈھولک بجے گی ساری رات
جا کے تم ساجن کے ساتھ
بھول نہ جانا یہ دن رات

لان میں بڑا ہنگامہ اپنے عروج پر تھا۔ اور اوپر اپنے کمرے میں تیار کھڑے ولید عباس کے حواس کان سے لگے موبائل نے سلب کر لیے تھے۔ فق چہرے کے ساتھ وہ بامشکل تمام لائن پر موجود شخص کو جواب دے پایا تھا۔ مگر اب خود اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے؟

شل ہوتے اعصاب کے ساتھ، ہاتھ میں پکڑا موبائل کرتے کی جیب میں ڈالتے ہوئے وہ کھلی کھڑکی کی جانب بڑھا تھا۔ جہاں سے نیچے کا منظر صاف نظر آرہا تھا۔

گولڈن لائٹس گیندے کے پھولوں اور پیلے رنگ کے آرائشی سامان سے سجایا گیا وسیع و عریض لان مہمانوں سے بھرا پڑا تھا جبکہ اسٹیج پہ دولہا، دلہن کے لیے رکھے گئے خوبصورت سے لکڑی کے جھولے پر پیلے جوڑے میں ملبوس ماہا کو بٹھایا جاچکا تھا۔ رسم کا سارا سامان جھولے کے سامنے رکھی گلاس ٹیبل پر سجا دیا گیا تھا۔ اور اب یقیناً "دولہا کی آمد کا انتظار تھا" تاکہ مہندی کی یہ مشترکہ رسم انجام دی جاسکے۔

سارے منظر کا ایک نگاہ میں جائزہ لینے کے بعد وہ بے چینی سے کمرے کے وسط میں آکھڑا ہوا تھا۔ ایک بات تو طے تھی کہ اس وقت وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سوائے حوصلے اور صبر کے مگر یہ بھی طے تھا کہ اسے جلد از جلد یہاں سے نکلنا تھا۔

خود کو بے بسی کی انتہاؤں پر محسوس کرتے ہوئے وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے کاؤچ پر گر سا گیا تھا۔ اور تبھی اس کے کمرے کا دروازہ خاصی بے صبری سے بجایا گیا تھا۔

"ولی یار! جلدی کر! تو نے تو عورتوں کو بھی مات کر دیا ہے۔" دانش کی آواز پر اس نے اک مضطرب سی نگاہ بند دروازے پر ڈالی تھی۔ جس کے دوسری جانب اس کے کزنز اور دوست بے چینی سے اس کے منتظر تھے سرعت سے خود کو سنبھالتا وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"تیری تیاری آج کچھ زیادہ لمبی نہیں ہو گئی؟" دروازے کے کھلتے ہی دانش نے مسکرا کر شوخی سے اس کی جانب دیکھا تو باوجود کوشش کے وہ کوئی جواب نہ دے پایا۔ حتیٰ کہ ہلکی سی مسکراہٹ بھی لبوں کو چھو نہ سکی۔

"کیا ہوا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اس کے سپاٹ چہرے اور عجیب سے تاثرات پہ دانش نے اب کے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا تو جیسے اک خیال کوندے کی مانند لپک کر ذہن کو روشن کر گیا۔

"نہیں۔" دائیں ہاتھ سے کنپٹیوں کو دباتا وہ پلٹ کر بیڈ کے کنارے پر آبیٹھا تو تبھی تیزی سے اس کے

نزدیک چلے آئے۔

"کیوں خیر تو ہے۔ کیا ہو گیا؟" دانش نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے پریشانی سے پوچھا۔ باقی سب بھی تشویش بھری نظروں سے اسے تک رہے تھے۔

"بس یار وہی مائیگرین۔" دونوں ہاتھوں میں سر گرائے اس نے تھکے تھکے سے لہجے میں جواب دیا تو وہ سب پریشان ہو گئے۔

"مگر ابھی تھوڑی دیر پہلے تک تو تو ٹھیک تھا۔" اس کے قریب کھڑا ارقم تشویش سے گویا ہوا۔ تو وہ پیشانی مسلتا سیدھا ہو بیٹھا۔

"نہیں یار، میرا سر صبح سے ہی بوجھل ہو رہا تھا۔"

"تو اس ہی وقت دوا لے لیتی تھی نا۔" دانش نے ناراضی سے اسے دیکھا تو وہ اک گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

"بس یار! دھیان ہی نہیں رہا۔"

"اب کھائی ہے؟" سعد نے پوچھا تو وہ اثبات میں سرہلا گیا۔ اس ہی وقت کھلے دروازے سے زائرہ بیگم رجا اور ماہین اندر چلی آئیں۔

"تم لوگ کہاں رہ گئے ہو بھئی! باہر سب انتظار کر رہے ہیں۔" غصے میں بولتی زائرہ آگے بڑھیں تو نظریں بے اختیار بیڈ پہ بیٹھے ولید کے چہرے سے جا ٹکرائیں۔

"اسے کیا ہوا؟" وہ تیزی سے بیٹے کے قریب چلی آئیں۔

"کچھ نہیں تائی اماں، بس ذرا سا سر میں درد ہے۔" دانش قصداً "نارمل لہجے میں کہتا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"مائیگرین کا اٹیک تو نہیں؟" ولید کے برابر بیٹھتے ہوئے انہوں نے تشویش پوچھا تو وہ اثبات میں سرہلا گیا۔

"لیکن اب میری طبیعت قدرے بہتر ہے۔" ماں کے پریشان چہرے سے نظریں چراتے ہوئے وہ اگلے ہی پل تسلی آمیز لہجے میں بولا تھا۔

اپنی حرکت پہ شرمندگی کا گہرا احساس اس کے اندر جاگا تھا۔ مگر وہ اپنی جگہ مجبور تھا۔ بے حد مجبور!

"تم صحیح کہہ رہے ہو نا؟" نہ جانے کیوں اس کا چہرہ انہیں مطمئن نہیں ہونے دے رہا تھا۔

"جی۔" اب کے وہ قصداً "ہلکا سا مسکراتے ہوئے بولا تو زائرہ بیگم سمیت کمرے میں موجود سبھی افراد قدرے پرسکون سے ہو گئے۔

"چلو اللہ کا شکر ہے۔ ورنہ میں تو پریشان ہو گئی تھی۔ اب فوراً" اٹھو اور رسم کے لیے باہر آؤ۔ بچی بے چاری کب سے انتظار میں بیٹھی ہوئی ہے۔" وہ بولتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں تو ماہین باہر کی جانب بڑھ گئی۔ جبکہ رجا نے جو ہی ہاتھ میں پکڑا دوپٹہ کھول کر لڑکوں کے حوالے کیا۔ کمرے میں خوشگوار سی ہلچل مچ گئی۔

"امی پلیز۔ اس رسم وغیرہ کے سلسلے کو ذرا جلدی ختم کروا دیجیے گا۔ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔" وہ ایک نظر ان سب پہ ڈالتے ہوئے ماں سے مخاطب ہوا۔ ایک اس مقصد کے لیے ہی تو اس نے یہ جھوٹ بولا تھا۔ وہ یہاں سے جلد از جلد فراغت پا کے نکلنے کا خواہش مند تھا۔

"فکر مت کرو۔ میں خود بھی یہی چاہ رہی ہوں کہ تم جلد ہی رسم سے فارغ ہو جاؤ۔" وہ رسان سے بولیں تو ولید کا مضطرب دل قدرے ٹھہر سا گیا۔

زرتار آنچل کے سائے تلے، وہ ماں اور بہن کے ساتھ، دوستوں اور کزنز کی ہمراہی میں لان میں داخل ہوا۔ تو ماحول میں رچی۔ خوشگواریت اپنے عروج پر پہنچ گئی۔

بی جان نے آگے بڑھ کر اپنے لاڈلے پوتے کی پیشانی چومتے ہوئے اسے سینے سے لگایا، تو نا چاہتے ہوئے بھی ولید کا بوجھل دل مزید بوجھل ہو گیا۔ جسے بامشکل تمام سنبھالتے ہوئے وہ زبردستی کی مسکراہٹ لبوں پہ سجائے بی جان کے نحیف وجود کو اپنے مضبوط بازو کے گھیرے میں لیے اسٹیج کی جانب چلا گیا۔ جہاں

زرد آنچل کا گھونگھٹ نکالے بیٹھی ماہا کا سمٹا سمٹایا وجود، ایک پل کے لیے اسے نظریں چرانے پر مجبور کر گیا۔

بے اختیار ایک گہری سانس لیتے ہوئے وہ اس سے ذرا فاصلے پر بیٹھ گیا۔ تو نصرت بیگم نے اپنے دونوں جگر گوشوں کا سر چومتے ہوئے دعاؤں کے ساتھ رسم کا باقاعدہ آغاز کیا۔ جس کے بعد ہنسی مذاق کے اک طوفان کے درمیان سبھی خواتین نے باری باری رسم ادا کی۔

رسم سے فراغت کے بعد دانش وغیرہ اسے کمرے میں چھوڑ گئے تو وہ کچھ سوچ کر ڈریسنگ روم کی جانب بڑھ گیا۔

کپڑے چینج کرنے اور والٹ میں مزید رقم رکھنے کے بعد وہ گاڑی کی چابی کو نظرانداز کرتا، صرف اپنا موبائل اٹھائے کمرے سے نکل کر کچن میں چلا آیا۔ جہاں ماسی زینت شاید کسی بچے کے لیے دودھ گرم کر رہی تھی۔

"ماسی!"

"جی صاحب جی۔" وہ اپنے دھیان میں پلٹی تھی۔ لیکن سامنے کھڑے ولید کو پینٹ شرٹ میں ملبوس، کہیں جانے کے لیے تیار کھڑا دیکھ کر ٹھٹک سی گئی تھی۔

"میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔ امی پوچھیں تو بتا دینا کہ گھر میں شور سے میرا دل گھبرا رہا تھا۔" بنا کسی تاثر کے وہ انتہائی نارمل لہجے میں بولا۔ تو ماسی نے خاموشی سے اثبات میں سرہلاتے ہوئے، حیرت سے اسے دیکھا جو کچن کے پچھلے دروازے سے باہر نکل گیا تھا۔

"بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔" خود کلامی کرتے وہ اس "انوکھے دولہا" کو سوچے گئی جس کے مزاج پر اس کی اپنی مہندی کا شور گراں گزر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ولید کی طبیعت اب کیسی ہے؟" کمرے میں داخل ہوتے ہی ماہا نے گھونگھٹ پیچھے سرکاتے ہوئے تشویش سے پوچھا۔ اسے ماہین کے ذریعے، اسٹیج پر ہی ولید کی طبیعت خرابی کے بارے میں علم ہو چکا تھا۔ اور چونکہ اس وقت وہ زیادہ بات کرنے کی پوزیشن میں نہ تھی۔ لہٰذا اب اندر آتے ہی وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی تھی۔ لیکن اس کی یہ تشویش فی الحال ان سب کو اسے چھیڑنے کا موقع فراہم کر گئی تھی۔

"بڑی فکر ہو رہی ہے محترمہ کو۔" رجاء نے بھنویں اچکاتے ہوئے شرارت سے کہا تو ماہا جھینپ کر مسکرا دی۔ جبکہ ہانیہ کمر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے شوخی سے بولی۔

"تو نند صاحبہ آپ کے مزاج پہ کیا گراں گزر رہا ہے۔ فکر کرنا یا "ماہا" کا فکر کرنا۔" ماہا پہ خاص زور دیا گیا تھا۔

"ظاہری بات ہے بھئی ماہا کا فکر کرنا۔ آخر کو بھابھی پہ نگاہ رکھوں گی تو اکلوتے بھائی کی حفاظت کر پاؤں گی نا۔" رجاء مسکراہٹ دبائے۔ حاضرین محفل سے گویا ہوئی تو سبھی ہنس پڑیں۔

"لیکن میرے خیال میں اگر آپ اکلوتے بھائی کے بجائے اپنے اکلوتے فیاسی کی حفاظت کریں تو زیادہ بہتر ہو گا۔ جناب "شیریں آنٹی کی بیٹی کے ساتھ کچھ زیادہ ہی لمبے "مذاکرات" میں الجھے نظر آ رہے تھے۔" ماہین نے معنی خیز مسکراہٹ لبوں پہ سجاتے ہوئے، دانش کا حوالہ دیا۔

"میں نے کیا حفاظت کرنی ہے۔ ان حضرت کی تو اللہ ہی حفاظت فرمائے گا۔" رجاء جو پہلے ہی دانش صاحب کی "خوش اخلاقیوں" سے عاجز آئی بیٹھی تھی، جل کر گویا ہوئی تو ان سب کے ساتھ ساتھ اب کے ماہا بھی کھل کر ہنس پڑی۔

"اور میرے خیال میں وہ اس وقت بھی ایک اہم "مذاکرے" میں مصروف ہیں۔ لیکن شیریں آنٹی کی بیٹی کے ساتھ نہیں بلکہ ساحرہ جمال کے ساتھ۔" کھڑکی کے پاس کھڑی ہانیہ نے باہر جھانکتے ہوئے مسکرا کر نئی صورت حال سے آگاہ کیا تو رجاء تلملا اٹھی۔

"اس کو تو میں ابھی دیکھتی ہوں۔" وہ تیز قدموں

سے دروازے کی جانب بڑھی تو محفل کشت زعفران بن گئی۔

تھوڑی دیر ماما کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ سب ایک بار پھر اٹھ کر باہر چل دیں۔ تو ماما بیڈ کی پشت سے کمر ٹکا کے نیم دراز ہو گئی۔

مہندی ابٹن گجروں کی ملی جلی خوشبو اس کے ارد گرد منڈلانے لگی تو بے اختیار اک دھیمی سی مسکان اس کے خوبصورت لبوں پر آن ٹھہری۔

دو دن بعد وہ اپنی زندگی کے ایک نئے اور خوبصورت دور میں داخل ہونے والی تھی۔ اس انسان کے ساتھ جس کے ساتھ وہ تین سال پیشتر بزرگوں کی خوشی اور اپنی رضامندی سے وابستہ ہوئی تھی۔ اور جسے ان گزرے تین سالوں میں وہ دل کی گہرائیوں سے چاہنے لگی تھی۔ ورنہ اس سے قبل تو وہ صرف اس کے لیے تایا زاد بھائی کی حیثیت رکھتا تھا۔ جس کے لیے اس کے دل میں سوائے عزت اور اپنایت کے تیسرا کوئی جذبہ نہ تھا۔

ویسے بھی وہ خاندان کا سب سے بڑا اور لاڈلا پوتا ہونے کے ساتھ ساتھ خاصی لیے دیے رہنے والی طبیعت رکھتا تھا۔ جو موڈ ہوتا تو ان سب کے ساتھ ہنسی مذاق بھی کر لیتا۔ اور اگر جو مرضی نہ ہوتی تو اپنے کام سے کام رکھنا پسند کرتا۔

گو کہ وسیع و عریض "سکندر ولا" میں بی جان کے تینوں بیٹوں کے اپنے اپنے پورشن تھے۔ لیکن پکانا اور کھانا سبھی کا اکٹھا تھا۔ سکندر صاحب کی وفات کے بعد گھر کی باگ ڈور جہاں نصرت بیگم نے سنبھالی تھی۔ وہیں وسیع کاروبار کی تمام تر ذمہ داری از خود ان کے تینوں بیٹوں نے اٹھائی تھی۔ جو تاحال بنا کسی چپقلش کے مشترکہ ہی تھا۔

عباس سکندر چونکہ چار بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ لہٰذا باپ کی وفات کے بعد۔ بہن بھائیوں نے انہیں گھر کے سربراہ کی طرح جانا اور مانا تھا۔ اور انہوں نے بھی اسی مان کو قائم رکھتے ہوئے اپنے ہر فرض کو استطاعت سے بڑھ کر نبھایا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نا صرف دونوں بھائی اور اکلوتی بہن ان کی دل و جان سے عزت کرتے تھے۔ بلکہ آگے ان کی آنے والی نسل بھی باخوشی اپنے والدین کے نقش قدم پہ عمل پیرا تھی۔

جن میں سرفہرست عثمان سکندر کے تینوں بیٹے دانش، سعد اور فراز عمر سکندر کی دونوں بیٹیاں ماہا اور ماہین اور رافیہ پھپھو کی تینوں اولادیں ارقم، ارسلان اور ہانیہ شامل تھے۔

حتیٰ کہ جب بی جان اور عباس سکندر نے جنہیں وہ سب کزنز، ولید اور رجاء کی دیکھا دیکھی بابا جان کہتے تھے۔ ولید کے ساتھ ماہا کا اور دانش کے ساتھ رجاء کا رشتہ طے کرنے کا فیصلہ کیا تو ان چاروں نے بغیر کسی حیل و حجت کے بزرگوں کی اس خواہش کے آگے سر جھکا دیا۔

ان کی اس درجہ سعادت مندی نے جہاں بڑوں کا مان بڑھایا تھا، وہیں ان سب کے دلوں کو بھی ایک نئے احساس سے دوچار کر دیا تھا۔ جس کے زیر اثر ماہا کے دل نے تو ان تین سالوں میں بہت تیزی سے محبت تک کا سفر طے کیا تھا۔ لیکن ولید کے خیالات میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی تھی یا نہیں، یہ بات وہ آج تک جاننے سے قاصر رہی تھی۔ کیونکہ اس کے رویے اور انداز میں بظاہر تو کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اب یہ اس کی فطرت تھی یا بزرگوں کے فیصلے سے اختلاف رائے وہ نہیں جانتی تھی۔ مگر کبھی کبھی اس کی ذات عجیب سے واہموں اور وسوسوں کا شکار ہونے لگتی اور تب اس کے لیے اپنے ڈوبتے دل کو سمجھنا مشکل ہو جاتا۔ لیکن اب تین سال بعد جب ان کا یہ رشتہ ایک مضبوط تعلق میں تبدیل ہونے چلا تھا تو دل از خود ہر واہمے اور وسوسے سے آزاد ہو کر مطمئن ہو چلا تھا۔

یقیناً" یہ سب ولید عباس کی رضامندی اور خوشی کے بغیر تو ممکن نہ تھا۔ باقی رہا اس کے دل کا بھید تو اس راز سے آگہی حاصل کرنے میں بھی کچھ زیادہ وقت نہ رہا تھا۔ اور اس سلسلے میں اس کی یہی دعا تھی کہ اللہ اس کے مان کو ہمیشہ سلامت اور محبت کو سرخرو رکھے۔

✿ ✿ ✿

ولید کچن سے نکل کر نہایت خاموشی سے عمارت کا چکر کاٹتا پچھلے لان کی جانب چلا آیا تھا۔ جس کے انتہائی سرے پر موجود گیٹ کو کھول کر وہ باآسانی کسی کی نظر میں آئے بنا باہر نکل گیا تھا۔ تیز قدموں سے روڈ کو کراس کرتا وہ اگلے چند منٹ میں مین روڈ پر تھا۔ جہاں سے ٹیکسی کے ذریعے وہ جب تک اپنی منزل پر پہنچا اس کی پریشانی اور بے چینی اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔

ٹیکسی مطلوبہ عمارت کے سامنے رکی، تو وہ عجلت میں اسے فارغ کرتا تیز قدموں سے اندر ریسپشن کی جانب چلا آیا۔ جہاں موجود اسٹاف کی نشاندہی پہ اس کی اگلی منزل "شعبہ حادثات" تھی۔

دھڑکتے دل اور لبوں پہ مچلتی بے شمار دعائیں لیے وہ جب وہاں پہنچا تو ڈاکٹرز ان پانچوں کو ابتدائی طبی امداد دینے کے بعد وارڈ میں شفٹ کر چکے تھے۔ ان کے مطابق مریضوں کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔

اس اطلاع پہ بے اختیار اک سکون بھری سانس لیتا وہ ڈیوٹی پہ موجود ڈاکٹر کے ہمراہ مطلوبہ وارڈ کی جانب چلا آیا، جہاں سامنے ہی خدیجہ آپی اور حیدر بھائی کے ہوش سے بیگانہ وجود میں قطرہ قطرہ زندگی اتاری جا رہی تھی۔

بے قراری سے آگے بڑھتے ہوئے اس نے متوحش نگاہوں سے ان کے چاروں جانب دیکھتے ہوئے کسی کو تلاشنا چاہا تھا۔ اور جونہی اس کی نظر ان کے دائیں جانب لگے بستر پر دراز انیب اور غیب کے زخمی وجود سے ہوتی ایک تیسرے وجود پر آن ٹھہری، وہ تڑپ کر آگے بڑھتا اس کی سرد پیشانی پر اپنے لب رکھ گیا۔ بے اختیار اسے اپنی آنکھیں بھیگتی محسوس ہوئی تھیں۔

"شی از ویری لکی! اسے سوائے معمولی خراشوں کے کوئی سیریس انجری نہیں ہوئی۔" ڈاکٹر چلتا ہوا اس کے پاس آکھڑا ہوا تو ولید بے چینی سے گویا ہوا۔

"ڈاکٹر پھر یہ ہوش میں کیوں نہیں ہے؟"

"ڈونٹ وری، یہ بے ہوش نہیں، بلکہ دواؤں کے زیر اثر سو رہی ہے۔ آپ اگر چاہیں تو اسے گھر بھی لے جا سکتے ہیں۔" ڈاکٹر اسے تسلی دیتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ تو وہ اک اطمینان بھری سانس لیتے ہوئے ایک بار پھر اس کی جانب دیکھنے لگا، جس کا چہرہ نہ جانے کیوں بار بار دھندلائے جا رہا تھا۔

جھک کر اس کے ہاتھ چومتا وہ سیدھا ہوا تو نظریں بے اختیار سامنے کھڑے عمر رسیدہ شخص کے اجنبی، لیکن مانوس نقوش سے سجے چہرے سے جا ٹکرائیں۔ جو انتہائی خشمگیں نگاہوں سے اسے گھور رہا تھا اور باوجود اس حقیقت کے کہ سامنے کھڑے شخص سے ولید کی ملاقات پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ اسے محض ایک لمحہ لگا تھا، بیڈ پہ دراز حیدر بھائی اور سامنے کھڑے بزرگ کے چہروں میں پائی جانے والی مماثلت کھوجتے ہیں۔

"السلام علیکم۔" خود پہ قابو پاتا وہ آہستگی سے بولا تھا۔ لیکن دوسری جانب سے کوئی جواب دیے بنا اسے صرف سرد نگاہوں سے دیکھنے پہ اکتفا کیا گیا تھا۔ ناچاہتے ہوئے بھی وہ نظر جھکانے پر مجبور ہو گیا تھا۔

"آگئی یاد تمہیں اپنی ذمہ داری کی؟" وہ استہزائیہ انداز میں گویا ہوئے تو ولید لب بھینچ کر رہ گیا۔

"تم جیسا خود غرض اور بے حس انسان میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ جس کے نزدیک ایک سوائے اپنی ذات کے اور کوئی چیز معنی نہیں رکھتی۔ تم نے پہلے بھی خود غرضی دکھائی تھی اور اب بھی تمہارے نزدیک اہم ہیں تو صرف تمہارے مسائل اور تمہاری پریشانیاں، باقی تمہاری وجہ سے کوئی کس قدر تکلیف میں مبتلا ہے، تمہیں اس سے نہ کل کوئی سروکار تھا اور نہ آج کوئی غرض ہے۔" ارد گرد موجود لوگوں کا خیال رکھتے ہوئے وہ دھیمے لیکن انتہائی سخت لہجے میں کہتے اس کے مقابل کھڑے اسے چپ رہنے پر مجبور کر گئے تھے۔

اسے اس حقیقت سے انکار نہ تھا کہ وہ ایک کمزور شخص واقع ہوا تھا۔ لیکن یہ بھی سچ تھا کہ کم از کم اس

معاملے میں اس نے خود غرضی نہیں دکھائی تھی۔ بلکہ وہ تو اپنی اس ذمہ داری کو ہر قیمت پہ نبھانا چاہتا تھا۔ مگر وہ مجبور کردیا گیا تھا، بے حد مجبور۔

"بہرحال میں تم سے مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ سوائے اس کے کہ تم ابھی اور اسی وقت اسے اپنے ساتھ ڈسچارج کروا کے لے جاؤ۔" اس کی خاموشی کو کینہ توز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے وہ حکمیہ لہجے میں بولے تو ولید ان کے مطالبے پر ساکت سا رہ گیا۔

"انکل! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں یوں اچانک اور وہ بھی اس وقت اسے کس طرح اپنے ساتھ لے جاسکتا ہوں؟"

"یہ میرا نہیں تمہارا مسئلہ ہے، لہٰذا میرے سامنے آئیں بائیں شائیں کرنے کی تم قطعی کوئی کوشش مت کرنا۔ کیونکہ اسے تو میں اپنے ساتھ کسی صورت نہیں لے کر جاؤں گا اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔" واشگاف الفاظ میں اپنی بات مکمل کرتے وہ پلٹ کر باہر کی جانب بڑھ گئے تو حیران پریشان سا ولید سر پکڑ کر قریب رکھی کرسی پر گر سا گیا۔

بے اختیار ہی اس کی نظریں سامنے دراز وجود سے ہوتی ہوئیں خدیجہ آپی اور حیدر بھائی کے نرم مہربان چہروں پر آن ٹھہری تھیں، جنہوں نے صحیح معنوں میں — بڑے بہن بھائی کا کردار نبھاتے ہوئے ہر ہر لمحہ اس کا ساتھ دیا تھا۔ لیکن کاش اس روز وہ ان دونوں کی بات نہ مانتے ہوئے اپنے کیے گئے فیصلے پہ ڈٹا رہتا تو آج حالات اس قدر پیچیدہ اور نازک موڑ پہ نہ آن ٹھہرتے۔

لیکن پھر قسمت کی جانب سے آنے والی اس اچانک آزمائش کا کسے پتا تھا۔ جس نے لمحوں میں ساری صورت حال کو بدل کر رکھ دیا تھا اور ولید جیسے اپنی غلطیوں کو سدھارنے کا بہت اچھا موقع ملا تھا۔ حالات کے ہاتھوں کسی کٹھ پتلی کی مانند بے بس و لاچار خود اپنی ہی ذات کا تماشا دیکھنے پر مجبور کردیا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اسپتال کی تمام ضروری فارملیٹیز نمٹا کر جس وقت وہ اسے ساتھ لیے ٹیکسی میں بیٹھا، رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ موبائل وہ کافی دیر پہلے ہی آف کرچکا تھا۔ لہٰذا اب جو گاڑی منزل کی جانب رواں ہوئی تو ہر طرح کی سوچ دامن گیر ہوکر آنے والے کڑے وقت کا احساس دلانے لگی۔ باہر پھیلا گھپ اندھیرا اور خاموشی اسے یکایک اپنے اندر اترتی محسوس ہوئی تھی۔ اور شاید یہی کیفیت تھوڑی ہی دیر میں وہاں بھی طاری ہونے والی تھی۔ جہاں یقیناً "سب اس پل بے چینی اور پریشانی سے اس کے منتظر تھے۔ مگر جن میں سے کسی کا بھی سامنا کرنے کی وہ خود میں ہمت نہ پا رہا تھا۔

کاش! اس نے پہلے قدم پر ہی خود کو روک لیا ہوتا۔ یا دو ٹوک اور واضح الفاظ میں اپنا مدعا بیان کردیا ہوتا تو آج دل میں اتنا خوف اور نگاہوں میں اتنی پشیمانی نہ ہوتی۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ امی، بابا، بی جان سب کا مجرم تھا۔ اس نے ان کے اعتماد کو توڑا تھا۔ مگر وہ ایک لڑکی جو آج اس کے نام کی مہندی اپنے ہاتھوں پہ سجائے بیٹھی تھی۔ اس کے تو شاید اس نے پورے وجود کی ہی دھجیاں بکھیر ڈالی تھیں۔ وہ اس سے کس طرح نظریں ملا پائے گا کن الفاظ میں اپنے لیے معافی طلب کرے گا؟ اس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا۔

احساس جرم تھا کہ ہر آن بڑھتا چلا جارہا تھا۔ اس حد تک کہ وہ اپنے ساتھ موجود وجود کو بھی یکسر فراموش کر بیٹھا تھا۔ وہ تو جب ٹیکسی والے نے مطلوبہ پتے پر گاڑی روکی، تب وہ اپنے گرد و پیش میں لوٹا چونک کر سیدھا ہو بیٹھا۔ اسے تو اس بات کا بھی احساس نہ تھا کہ اس نے کب اور کہاں ڈرائیور کو روٹ کے سلسلے میں گائیڈ کیا تھا۔ لیکن اب جو سوچوں کے گرداب سے نکل کر خود میں لوٹا تو نظریں بے اختیار ہی اس وجود سے ہوتی، سجی ہوئی عمارت پہ جا ٹھہریں، جس کے اطراف میں چھایا سناٹا اندر برپا ہنگامے کے اختتام پذیر ہوجانے کا غماز تھا۔

میکانکی انداز میں ڈرائیور کو فارغ کرتا وہ اسے ساتھ لیے ٹیکسی سے اتر کر گیٹ کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔ مگر اب جیسے دستک دینے کی ہمت نہ رہی تھی۔ اندر جانے کا محض خیال لمحوں میں ولید کے پورے وجود کو پسینے میں تر کر گیا تھا۔ حالانکہ اس وقت رات کے سوا دو بجے گھر والوں کے سوا اندر کسی مہمان کی موجودگی کا امکان خاصا کم تھا۔ ویسے بھی شادی کے سلسلے میں باہر سے آنے والے تمام عزیز و اقارب کے ٹھہرنے کا انتظام ہوٹل میں کروایا گیا تھا۔ جبکہ حالات کے پیش نظر رات گئے تک ہنگامہ برپا رکھنے کے بابا جان اور بی جان قائل نہ تھے۔

کتنی ہی دیر اپنی ہمت مجتمع کرنے کے بعد اس نے کال بیل کا بٹن دبایا تھا اور دوسری جانب موجود چوکیدار نے جھٹ سے گیٹ کھول دیا تھا۔ یوں جیسے نہ جانے کب سے وہ صرف بیل بجنے کا ہی منتظر تھا۔

"صاحب! آپ کہاں چلا گیا تھا؟ سارا گھر والا پریشان ہوگیا تھا، آپ..." اس کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی نصراللہ نے بے تابی سے بولنا شروع کیا تھا۔ مگر ولید کے اندر قدم رکھتے ہی اس کی تیزی سے چلتی زبان رک سی گئی تھی۔ اس کی آنکھوں اور چہرے سے چھلکتی بے تحاشا حیرت کو نظرانداز کیے وہ خاموشی سے آگے بڑھا تھا۔ جہاں ابھی ایسی کتنی نگاہیں اس کی جانب اٹھنے والی تھیں۔

خود کو آنے والے طوفان کے لیے تیار کرتا وہ پورچ سے گزر کر وسیع و عریض برآمدے میں موجود داخلی دروازے کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔ جس کے دوسری جانب یقیناً "وہ سب پریشان حال بیٹھے تھے۔ اک گہری سانس لیتے ہوئے اس نے چند لمحے بغور اپنے ساتھ موجود وجود کی جانب دیکھا تھا۔ اور پھر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ ایک نہایت خوب صورت سبزہ زار میں پھولوں کے کنج کے پاس بیٹھی ان پہ اڑتی تتلیوں کے رقص کو محویت سے دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ نرم ٹھنڈی ہوا کے باعث ماحول نہایت خوشگوار تھا۔ ارد گرد پھیلی روشن چمکیلی دھوپ آنکھوں کو بے حد بھلی معلوم ہورہی تھی۔

یونہی مسکراتے ہوئے اس نے اپنے دھیان میں نظریں آسمان کی جانب اٹھائی تھیں۔ اور ایک طرف سے اٹھتے کالے بادلوں کے غبار کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ جو بڑی تیزی سے پورے آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ہر چیز اس سیاہ غبار کی لپیٹ میں آگئی تھی۔ سبک ہوا یک لخت آندھی میں تبدیل ہوکر اس کی آنکھوں میں چبھنے لگی تھی۔

دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ مگر سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ کہاں جائے پناہ تلاش کرے آندھی کی شدت میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ معاً" آسمان پہ بجلی کا کوندا سا لپکا تھا۔ اور چند لمحوں کے بعد فضا بادلوں کی زوردار گرج سے گونج اٹھی تھی تنہائی اور خوف کے مارے اس کا پورا وجود کانپ اٹھا تھا۔ بری طرح روتے ہوئے اس نے امی اور پاپا کو پکارا تھا۔ مگر اس کی آواز بادلوں کی گرج میں دب کر رہ گئی تھی۔

تبھی اس شور کے درمیان اسے کسی کی آواز سنائی دی تھی۔ کوئی اسے بلا رہا تھا۔ پکار رہا تھا۔ اس نے بے قراری سے اپنے چاروں جانب دیکھا تھا۔ مگر ہر سو پھیلے اندھیرے میں کوئی نظر نہ آیا تھا۔

آواز قریب آتی جارہی تھی۔ واضح ہوتی جارہی تھی۔

"ماہا!" اور وہ بری طرح ڈر کر اٹھ بیٹھی تھی۔ گھبرا کر اس نے اپنے ارد گرد دیکھا تھا۔ اور خود کو اپنے کمرے میں، ڈرائنگ چیئر پہ پاکر بے اختیار اک گہری سانس اس کے لبوں سے آزاد ہوئی تھی۔ نہ جانے کب یہاں بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

تیزی سے دھڑکتے دل پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے اپنے بکھرتے اعصاب کو پرسکون کرنا چاہا تھا۔ جب معاً" اس کی نگاہ اپنے قریب کھڑی ماہین کے چہرے سے جا ٹکرائی تھی۔ اسے اس عجیب و غریب خواب سے

بے دار کرنے کا سبب یقیناً" وہی تھی۔ اور ساتھ ہی ایک خیال جیسے کوندے کی مانند لپک کر اس کے سوئے ہوئے حواس بحال کر گیا تھا۔

"ولید آ گیا؟" تیزی سے سیدھے ہوتے ہوئے اس نے ماہین کی جانب دیکھا جو ایک ٹک خاموشی سے اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

"میں کیا پوچھ رہی ہوں؟" اس کے ستے ہوئے چہرے پر غور کیے بنا اب کے وہ قدرے جھنجلا کر بولی تو وہ دھیرے سے اثبات میں سر ہلا گئی۔

"اللہ تیرا شکر ہے۔" بے اختیار اک گہری سانس لیتے ہوئے وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا گئی تھی۔

آج تو ولید نے غیر ذمہ داری کی حد کر دی تھی۔ ان گزرے ہوئے گھنٹوں میں ان سب پہ کیا گزری تھی یہ تو صرف وہ جانتے تھے یا ان کا خدا!

پتا نہیں وہ گھر سے کب اور کیسے نکلا تھا جو کسی کو بھی علم نہ ہو سکا تھا۔ وہ تو جب مہمان رخصت ہوئے تب پریشان حال سی ماہی نے آ کر تائی اماں کو اس کی گھر سے غیر حاضری کی اطلاع دیتے ہوئے پوری بات کہہ سنائی تھی۔ اور پورا گھر جیسے بے چین ہو اٹھا تھا۔ اگر اس کی طبیعت ٹھیک ہوتی تو شاید اتنی پریشانی نہ ہوتی۔ لیکن اب تو جیسے ہر کوئی سولی پہ ٹنگا تھا۔ اس پہ مستزاد اس کا موبائل بھی مسلسل آف تھا۔ جس کے باعث سب کی پریشانی دھیرے دھیرے غصے میں ڈھل چکی تھی۔ ہر کوئی اس کی اس غیر ذمہ دارانہ حرکت پہ حیران تھا' جو اس کے مزاج کے بالکل برعکس تھی۔

گھر کے سبھی لڑکے گاڑیاں لیے آس پاس کے علاقے میں اسے ڈھونڈنے کے لیے نکلے تو وہ روتی ہوئی تائی اماں کو حوصلہ دیتی' حاجت کے نفل ادا کرنے کی نیت سے اوپر اپنے کمرے میں چلی آئی۔

گڑگڑا کر اپنے اللہ سے اس کی حفاظت اور سلامتی کے ساتھ واپسی کی دعائیں کرتی' وہ وہیں' راکنگ چیئر پہ بیٹھ کر تسبیح کرنے میں مشغول ہو گئی تھی۔ جب پتا نہیں کب اور کیسے اس درجہ پریشانی کے عالم میں بھی' اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

"میں شکرانے کے نفل ادا کر لوں۔ پھر نیچے چلتے ہیں۔" وہ وضو کی نیت سے اٹھتے ہوئے مطمئن سی بولی تھی۔ ذہن کیا ہلکا ہوا تھا۔ چند لمحے پیشتر کا خواب اور اپنی گھبراہٹ سب ہی کچھ بھول بھال گیا تھا۔

اپنے گرد لپٹا دوپٹہ اتار کر کرسی کی بیک پہ ڈالتے ہوئے وہ آگے بڑھنے کو تھی۔ جب یک لخت ماہین نے اس کا بازو تھام لیا۔

"کیا ہوا؟" اس نے چونک کر سامنے کھڑی بہن کی جانب دیکھا۔ اور پہلی بار اسے ایک عجیب سا احساس ہوا تھا۔

"ماہین! ولید ٹھیک تو ہے نا؟" تیزی سے ڈوبتے دل کے ساتھ اس نے اگلے ہی لمحے بے قراری سے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔

"ہاں.... تم نیچے چلو۔" وہ دھیمی آواز میں گویا ہوئی۔ تو ماہا ایک نظر اس کے چہرے پہ پھیلے عجیب سے تاثرات کو دیکھتی' تیزی سے دوپٹہ اٹھاتے باہر نکل گئی۔

سیڑھیاں اتر کر تیز قدموں سے لابی کراس کرتی وہ لاؤنج کی جانب بڑھی تو اندر سے آتی رونے کی آواز نے جیسے اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا کروا لے۔

وحشت زدہ سی اس نے اگلے ہی پل ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر اندر قدم رکھتے ہوئے متوحش نگاہوں سے فقط ایک ہی چہرے کو تلاشا تھا۔ جو اسے تائی اماں کے قدموں میں بیٹھا نظر آیا۔ وہ بے اختیار اک اطمینان بھری سانس لے کر رہ گئی تھی۔ مگر تبھی اسے کمرے میں یک لخت چھا جانے والے سکوت کے ساتھ ساتھ خود پہ جمی ڈھیروں نگاہوں کا احساس چونکنے پر مجبور کر گیا تھا۔

نا سمجھی کے عالم میں اس نے پلٹ کر اپنے اردگرد دیکھا تھا۔ اور تبھی اسے اپنی امی کے زور زور سے رونے کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ جس میں چند سیکنڈ کے توقف سے بی جان' پھپھو' تائی اماں اور نہ جانے کس کس کی سسکیاں شامل ہونے لگی تھیں۔

گھبرا کر اس نے سامنے کھڑے عمر سکندر کی جانب

دیکھا تھا۔ جو لب بھینچے تیزی سے رخ موڑ گئے تھے۔ مگر اس کے باوجود ماہا کو محسوس ہوا تھا۔ جیسے وہ رو رہے ہوں۔ اپنے باپ جیسے مضبوط شخص کی آنکھوں کی یہ نمی اسے گویا ہلا کر رکھ گئی تھی۔

"کیا۔ کیا ہوا؟ آپ سب اس طرح۔" خشک پڑتے لبوں کے ساتھ اس نے بامشکل تمام اپنی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی وحشت کو زبان دینا چاہی تھی جب اچانک اس کی نگاہ ولید کے سامنے اور تائی اماں کے قدموں میں دھرے تھکے سے وجود سے جا ٹکرائی تھی۔ جو بری طرح سے رو رہا تھا۔ مگر جس کی آواز اتنی ساری آوازوں میں دب کر رہ گئی تھی۔ اس کے بلک بلک کر رونے کے باوجود کوئی بھی اس پہ اک نگاہ غلط ڈالنے کا روادار نہ لگ رہا تھا۔

"یہ۔ یہ کون ہے؟" اس کی آواز میں اب کے حیرت کا عنصر بھی شامل تھا۔ مگر حاضرین محفل کو گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔ اس نے حیرت سے تمام افراد خانہ کی جانب دیکھا تھا اور تبھی اس کے کانوں نے ولید عباس کی گھٹی گھٹی سی آواز سنی تھی۔

"میری بیوی۔" اور ماہا کا چہرہ ایک جھٹکے سے ولید کی جانب گھوما تھا۔ دونوں کی نگاہیں ملی تھیں۔ اور وہ آنکھیں پھاڑے اس کے چہرے پہ پھیلی نمی کو بے یقین نگاہوں سے تکتے ہوئے بے اختیار پیچھے ہٹی تھی۔

کچھ دیر پہلے دیکھا گیا خواب اچانک ایک بار پھر' پوری جزئیات کے ساتھ ذہن کے پردے پر نمودار ہوا تھا۔ مگر اس بار سیاہ غبار کی لپیٹ میں اردگرد موجود چہرے بھی آنے لگے تھے۔ اگلے ہی لمحے وہ چکرا کر زمین پہ گری تھی۔

☆ ☆ ☆

چند لمحوں کا کھیل تھا اور خانہ شادی' خانہ غم میں بدل گیا تھا۔ ساری رات تمام گھر والے اپنا غم بھلائے اس کی پٹی سے لگے بیٹھے رہے تھے۔ مگر وہ تو جیسے ہر احساس سے عاری ہو چلی تھی۔ یاد تھا تو صرف اتنا کہ آنکھ کھلی تھی اور بچانے کو پیچھے کچھ بھی نہ رہا تھا۔

اس کی زندگی میں اچانک در آنے والا طوفان نا صرف اس کے ارمان' خواب اور آرزوئیں بہا لے گیا تھا۔ بلکہ اس کے وجود اور اس وجود میں گردش کرتی محبت اور مان کے بھی پرخچے اڑا گیا تھا۔ جس کے بعد اگر کچھ بچا تھا تو یہ لق و دق صحرا۔ جس میں فقط آتی جاتی سانس زندگی کی غماز تھی اور بس!

جبکہ اصل امتحان کی گھڑی تو اب آئی تھی۔ کل ہونے والی تقریب اور دنیا داری کے خوف نے تمام افراد خانہ کا خون خشک کر کے رکھ دیا تھا۔ عباس سکندر نے تو واشگاف الفاظ میں سب کو اپنے بیٹے کے کرتوت سے آگاہ کرنے کے لیے کہا تھا۔ مگر راضیہ پھپھو اور عثمان چچا کے مشورے سے فی الوقت اصل حقیقت سے صرف قریبی رشتے داروں کو آگاہ کیا گیا تھا۔ جبکہ باقی لوگوں سے خاندان میں اچانک ہونے والی فوتگی کا بہانہ کرتے ہوئے معذرت کر لی گئی تھی۔

مگر اس سب کے باوجود اصل بات محض چند ہی گھنٹوں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلی تھی۔ اس پہ مستزاد "اپنوں" کی ہزار صلواتیں وہ سب بے بس سے اپنی عزت کا تماشا بنتا دیکھنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکے تھے۔

اس روز عباس سکندر نے زندگی میں پہلی مرتبہ نا صرف اپنے لاڈلے بیٹے پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ بلکہ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی نظروں سے دور ہو جانے کا حکم سناتے ہوئے سب کے درمیان اپنے چھوٹے بھائی اور بھاوج کے سامنے روتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی تھی۔

مگر اس سب کے باوجود ان کے ساتھ ساتھ زائرہ بیگم میں بھی اب کسی سے نظریں ملانے کا حوصلہ نہ رہا تھا کہ ان کا اپنا ہی بیٹا ان کا مان توڑ کر انہیں بھرے خاندان میں رسوا کر گیا تھا۔ وہ گلہ کرتے بھی تو کس سے؟

جبکہ اس قصے کا سب سے اہم کردار تو جیسے خود سے بھی نظریں ملانے کے قابل نہ رہا تھا۔ یہ احساس کہ وہ

جو کبھی اپنے ماں باپ کے لیے باعث فخر تھا۔ آج ساری دنیا کے سامنے ان کا سر جھکا گیا تھا۔ اسے دانش، ارقم اور سعد کے حوصلہ دلانے کے باوجود' اشک ندامت بہانے سے روک نہ سکا تھا۔

اس کی ہمیشہ سے یہی کوشش رہی تھی کہ اس کے والدین کو کبھی اس کی ذات سے کوئی دکھ نہ پہنچے۔ اور اس کوشش کے نتیجے میں ہی وہ اپنی زندگی کے سب سے اہم معاملے میں پس و پیش سے کام لیتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ "وہ" اس سے ہمیشہ کے لیے دور چلی گئی اور وہ چاہ کر بھی کچھ نہ کر سکا تھا مگر آج اس نے اپنے ہاتھوں' اپنی تمام تر محنت پہ پانی پھیر دیا تھا۔

اس نے اپنی ذات سے' اپنے والدین کو وہ صدمہ پہنچایا تھا جو انہیں تا عمر یاد رہنے والا تھا۔

☆ ☆ ☆

ماہین اپنے دھیان میں کمرے میں داخل ہوئی تو کانچ کے بہت سے ٹکڑے اس کے پاؤں تلے آکر ٹوٹ گئے۔ بے اختیار پیچھے ہٹتے ہوئے اس نے نیچے کی جانب دیکھا تو قالین پر جابجا بکھرے ہری پیلی چوڑیوں کے بہت سے ٹکڑے اس کا دل چیر کر رہ گئے۔

تیزی سے بھیگتی آنکھوں کو اٹھاتے ہوئے اس نے بیڈ کی پشت سے سر ٹکائے ساکت بیٹھی ماہا کی جانب دیکھا۔ جس کا چہرہ اس پل بالکل بے تاثر اور آنکھیں غیر مرئی نقطے پر جمی ہوئی تھیں۔ جبکہ نیچے بیڈ کی پائنتی کے پاس اس کے مایوں کا پیلا اور ہرا جوڑا اس کے خوابوں کی طرح بکھرا پڑا تھا۔ اور خود وہ اپنے گھر کے عام سے کپڑوں میں ملبوس تھی۔

"ماہا!" تڑپ کر آگے بڑھتے ہوئے اس نے بہن کو پکارا تو وہ اس کی طرف دیکھے بنا سپاٹ سے لہجے میں بولی۔

"ماہین! اسے یہاں سے اٹھا کر لے جاؤ۔" اور وہ اپنی جگہ پر ٹھٹک کر رکنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ بہتے آنسوؤں کے درمیان وہ کتنی ہی دیر بہن کے خالی چہرے پر نگاہیں جمائے کھڑی رہی تھی۔ مگر جب دل میں اٹھتی ٹیسیں حد سے سوا ہونے لگیں۔ تب وہ آہستگی سے پلٹتی اس جانب چلی آئی جہاں وہ جوڑا زمین پہ بکھرا پڑا تھا جسے بہت ارمانوں اور خوشیوں سے زیب تن کیا تھا۔

چہرے پر پھیلتی نمی انگلیوں پہ سمیٹتے ہوئے اس نے جھک کر جوں ہی ان کپڑوں کو اٹھایا۔ مہندی' ابٹن اور تیل کی ملی جلی خوشبو اس کے نتھنوں سے آ ٹکرائی۔ اگلے ہی پل وہ اپنی سسکیاں دبائے کمرے سے بھاگتی ہوئی نکلی تھی۔

بے خودی کے عالم میں اس کے قدم ولید کے کمرے کی جانب اٹھے تھے۔ جس کا دروازہ دھاڑ سے کھولتے ہوئے وہ اندر چلی آئی۔

"میری بہن کے خوابوں کو نوچنے اور اس کی خوشیوں کو چھیننے والے' مجھے تم سے نفرت ہے۔ شدید نفرت!" ہاتھ میں پکڑے کپڑوں کا گولا سا بنا کر اس کے منہ پر مارتی وہ آندھی اور طوفان کی طرح کمرے سے نکلی چلی گئی تو ساکت زدہ سا ولید اپنے پیروں میں پڑے ان کپڑوں کو دیکھے گیا۔ جنہیں کل تک اپنے تصور میں سجائے وہ اسٹیج پہ اس کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی۔ مگر جو آج اس کے قدموں میں بکھرے کسی کی حرماں نصیبی کی داستان سنا رہے تھے۔

شاید ضیاء صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ وہ واقعی ایک خود غرض اور بے حس انسان تھا۔ جس کی وجہ سے نا صرف اس کے پیدا کرنے والے مصلوب ہوئے تھے۔ بلکہ وہ دو وجود بھی جو اس سے "محبت" کرنے کے سزاوار ٹھہرے تھے۔

☆ ☆ ☆

آج ماہا کی سالگرہ تھی۔ لہٰذا صبح سے ہی اس کا موڈ خاصا خوشگوار تھا۔ مگر جوں جوں دن ڈھلتا گیا۔ اس کی خوشی یاسیت میں بدلتی چلی گئی۔

رات بارہ بجے ہی اسے سب گھر والوں اور کزنز نے وش کر دیا تھا۔ اور اگلے دن بھی یہ سلسلہ جاری رہا تھا۔ مگر وہ' جس کے پیغام کا اسے لاشعوری طور پہ سب سے پہلے انتظار تھا اس نے تا حال فون تو دور ایک میسیج

تک نہ کیا تھا اور یہی وجہ اس کے دل کو لحظہ بہ لحظہ بوجھل کرتی چلی جا رہی تھی۔ جس کے باعث آنکھیں نہ جانے کتنی ہی بار بھرا چکی تھیں۔ مگر وہ اپنے آنسو چھپائے' بظاہر ہنستے مسکراتے ہوئے۔ اپنے سب کزنز کے ساتھ' خود اپنی ہی چھوٹی سی برتھ ڈے پارٹی کے انتظام میں مشغول تھی۔ جو ہمیشہ کی طرح گھر میں ہی ہلکے پھلکے طریقے سے منائی جا رہی تھی۔

مگر باوجود مصروفیت کے وہ چاہ کر بھی اپنا دھیان ولید کی جانب سے ہٹا نہ پا رہی تھی۔ جو جب سے کراچی گیا تھا اسے "غالباً" بھولتا جا رہا تھا۔ جبھی تو اس سے کسی قسم کے رابطے میں نہ تھا۔

یہ نہ تھا کہ ان کے درمیان ہمیشہ سے کوئی بڑی بے تکلفی کا رشتہ رہا تھا۔ وہ اس کے سب سے بڑے تایا کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ اس ناتے ایک لحاظ از خود ہمیشہ ان کے درمیان موجود رہا تھا مگر جب سے ان دونوں کے درمیان ایک نیا رشتہ استوار ہوا تھا۔ وہ فطری طور پہ اپنے دل میں اس کے لیے کچھ خاص قسم کے جذبات محسوس کرنے لگی تھی۔ جن کی بدولت نا چاہتے ہوئے بھی وہ اس سے بہت سی توقعات وابستہ کر بیٹھی تھی۔

"کیا بات ہے؟ تم صبح سے خاصی اداس سی ہو خیر تو ہے؟" رجاء نے سینڈوچز کے لیے چکن شریڈ کرتے ہوئے پوچھا۔ تو ماہین نے بھی ایک نظر بہن کے جھکے چہرے کی جانب دیکھا۔ جو خاموشی سے پاستا کے لیے سبزیاں کاٹنے میں مصروف تھی۔

"نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ بنا اس کی جانب دیکھے آہستگی سے بولی۔ تو رجاء بے اختیار ماہین کو دیکھ کر رہ گئی۔ اگلے ہی لمحے اس نے آگے بڑھ کر ماہا کے ہاتھ سے چھری لے لی۔

"بات تو ضرور ہے۔ ہاں تم اگر بتانا نہ چاہو تو وہ تمہاری مرضی۔"

"میں نے تم لوگوں سے پہلے کبھی کوئی بات چھپائی ہے۔ جو آج چھپاؤں گی۔" سر اٹھاتے ہوئے اس نے رجاء کی جانب دیکھا۔

"تو پھر بولو۔ کیوں چپ چپ سی ہو؟" وہ اپنی کھوجتی نگاہیں اس کے چہرے پر جمائے گویا ہوئی تو ماہا اک گہرا سانس لے کر رہ گئی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی ماہین تیزی سے بول اٹھی۔

"کہیں تمہارے اور ولید بھائی کے درمیان کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟"

"گڑبڑ ہونے کے لیے رابطے میں ہونا ضروری ہے۔" نا چاہتے ہوئے بھی اک تلخ مسکراہٹ اس کے لبوں پر آن ٹھہری تو دونوں جیسے از خود معاملے کی تہہ تک پہنچ گئیں۔

"اب سمجھی! بھائی تمہیں وش کرنا بھول گئے ہیں نا۔" رجاء نے مسکراتے ہوئے اپنے خیال کی تصدیق چاہی تو ماہا کا دل چاہا کہ وہ کہے۔

"نہیں۔ وہ صرف آج کا دن ہی نہیں بلکہ میری ذات کو بھی بھولتے جا رہے ہیں۔" مگر ہونٹ بھینچے وہ اگلے ہی لمحے آنکھوں میں پھیلتی نمی چھپانے کے لیے چہرہ جھکا گئی۔

"او گاڈ! اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ پاگل ہو گئی ہو کیا۔" رجاء نے آگے بڑھ کر اس کا چہرہ اونچا کرنا چاہا تو ماہا کا ضبط جیسے جواب دے گیا۔ واہمے اور اندیشے آنسوؤں کی صورت بہنے لگے تو رجاء سمیت ماہین بھی گھبرا گئی۔

"ماہا! کیا ہو گیا ہے یار تم تو بہت سمجھدار ہو۔" اسے خود میں سموئے رجاء نے پیار سے اس کی پشت سہلاتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ماہین جلدی سے پانی کا گلاس بھر لائی۔

"تھوڑا پانی پیو۔" اس نے بہن کا بازو نرمی سے چھوتے ہوئے کہا تو چند لمحوں کے توقف کے بعد ماہا کو جیسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔

رجاء بے شک اس کی بہترین سہیلی تھی۔ مگر بہر حال وہ ولید کی بہن تھی۔ اس ناتے ان دونوں کے درمیان موجود رشتہ بے حد نازک تھا۔ جس میں ایک چھوٹی سی بات بھی بدگمانی کی دراڑ ڈال سکتی تھی۔

خود پہ قابو پاتے ہوئے وہ آہستگی سے اس سے علیحدہ ہوئی تو ماہین نے ہاتھ میں پکڑا گلاس اس کی جانب بڑھا

دیا۔ جسے خاموشی سے تھام کر وہ گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔

"تم بھائی کے معاملے میں اتنی سینسیٹو ہو۔ یہ مجھے آج پتا چلا ہے۔" نرمی سے اس کے چہرے پر بکھر آنے والی لٹیں پیچھے ہٹاتے ہوئے رجاء قصدا" شوخی سے گویا ہوئی تو ماہا اپنی نم پلکیں جھکا گئی۔

"اب نظریں جھکانے کا کوئی فائدہ نہیں محترمہ! بھید تو کھل چکا ہے۔" اس کی حرکت کو شرم پہ محمول کرتے وہ اب کے کھل کر ہنس پڑی۔ تو ماہین نے بغور بہن کا جائزہ لیا۔ جو رجاء کی مسلسل چھیڑ چھاڑ کے نتیجے میں مسکرانے پر مجبور ہوگئی تھی۔ مگر جس کے چہرے پر پھیلی یاسیت اسے اندر ہی اندر پریشان کر گئی تھی۔

بامشکل تمام اپنی پریشانی پس پشت ڈالتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اپنے کام کی جانب متوجہ ہونا چاہا تھا۔ جب معا" لاؤنج سے بلند ہونے والی آوازیں۔ ان تینوں کو عجلت کے عالم میں کچن سے نکلنے پر مجبور کر گئیں۔

تیز قدموں سے آگے پیچھے چلتی ہوئی وہ لاؤنج میں داخل ہوئیں تو وہاں موجود ولید کو دیکھ کر ایک خوشگوار سی حیرت نے انہیں آن گھیرا۔

"یقینا" اس سرپرائز کے چکر میں ہی بھائی نے ماہا کو وش نہیں کیا۔ اور یہ بے وقوف۔" اک شوخ نظر روتی ماہا پر ڈالتی رجاء تیزی سے بھائی کی جانب بڑھ گئی۔ جو سب بڑوں سے ملنے کے بعد' اب تمام کزنز کے نرغے میں تھا۔ جو بزرگوں کا لحاظ کیے بنا۔ اس درجہ رومانٹک حرکت پہ اس کا خوب ریکارڈ لگا رہے تھے۔

بے اختیار گردن موڑتے ہوئے ماہین کے ساتھ کھڑی ماہا کی جانب دیکھا تھا۔ جس کے چہرے پر موجود حیرت اب خوشگوار تاثرات میں بدل چکی تھی۔ اس کا یہ اطمینان ناچاہتے ہوئے بھی ماہین کے دل کو ہلکا کر گیا تھا۔

"آپ کو پتا ہے بھائی ابھی کچھ دیر پہلے کچن میں ایک بڑا ہی زبردست راز افشا ہوا ہے۔" سب کو چپ کرواتے ہوئے رجاء نے شرارت سے بھرپور نظروں سے ماہا کو تکتے ہوئے بات شروع کی تو جہاں سب پلٹ کر ان ہی کی طرف دیکھنے لگے وہیں اس تمام عرصے میں پہلی بار' ولید نے دروازے کے قریب کھڑی' گھبرائی ہوئی سی ماہا کی جانب دیکھا۔ جو نظروں کے اس تصادم پہ چہرے پر اڑتی ہوائیوں سمیت آن واحد میں واک آؤٹ کر گئی تھی۔

اس کے یوں فرار ہو جانے پر رجاء اور ماہین کی بے اختیار ہنسی چھوٹی تھی۔ اور ولید کا شرمندہ دل مزید بوجھل ہو گیا تھا۔ وہ آج حقیقتا" ماہا کی سالگرہ بھول بیٹھا تھا۔ اور اس کا یوں اس وقت پہنچنا محض ایک اتفاق کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

رات دھیرے دھیرے گہری ہو رہی تھی۔ مگر اس کی آنکھوں میں دور تک نیند کا شائبہ تک نہ تھا۔ مسلسل اسموکنگ کے باعث کمرے کی فضا میں عجیب سی کثافت پیدا ہو چکی تھی۔ جسے دور کرنے کو اس نے جونہی آگے بڑھ کر کھڑکی کھولی۔ خنک ہوا کا تیز جھونکا اسے اک گہری سانس لینے پر مجبور کر گیا۔

بے اختیار اپنی پشت کھڑکی سے ٹکاتے ہوئے وہ خالی الذہنی کے عالم میں باہر پھیلے گھپ اندھیرے کو دیکھنے لگا۔ جس کی سیاہی نے ہر چیز کو اس طرح سے اپنے حصار میں لے رکھا تھا کہ جانا پہچانا منظر بھی نگاہوں کو اجنبی سا لگنے لگا تھا۔ بالکل۔ بالکل ماہا کی طرح!

ذہن کی اس عجیب و غریب تشبیہ پہ ولید بے اختیار چونکتے ہوئے سیدھا ہوا تھا۔ اس کی نظریں ایک بار پھر اندھیرے کی چادر تلے ڈھکے در و دیوار سے الجھی تھیں۔ جن سے وہ بچپن سے مانوس تھا۔ مگر جو اس پل واقعی بے حد اجنبی سے لگ رہے تھے۔

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ ماہا عمر کی ذات بھی اس کے لیے ایک ایسا ہی منظر تھی۔ جس سے وہ بچپن سے مانوس تھا۔ اسے آج بھی وہ دن اچھی طرح سے یاد تھا۔ جب چچی جان نے مسکراتے ہوئے اپنے گھر آنے والی اس چھوٹی سی خوبصورت گلابی گڑیا کو بہت احتیاط سے

اس کے ننھے بازوؤں میں پکڑایا تھا۔ اور وہ مارے اشتیاق کے کتنی ہی دیر اس سوئے ہوئے وجود کے چھوٹے چھوٹے سے ہاتھ پاؤں کو دیکھ کر حیران اور خوش ہوتا رہا تھا۔

چونکہ وہ راضیہ پھپھو کے ارقم اور "سکندر ولا" میں موجود ولید' دانش اور سعد کے بعد خاندان میں آنے والی پہلی بیٹی تھی۔ لہٰذا وہ سب کی بے حد لاڈلی تھی۔ جس کی اہمیت میں اس کے فورا" بعد آنے والی رجاء بھی کسی طور کمی نہ کر پائی تھی۔ مگر اس درجہ لاڈ پیار کے باوجود ماہا کی شخصیت میں کسی قسم کا کوئی بگاڑ پیدا نہ ہوا تھا۔ جس کی بنیادی وجہ اس کی بے حد سلجھی ہوئی فطرت تھی۔ جس کا سبھی گھر والوں کے ساتھ ساتھ خود ولید بھی معترف تھا۔ اس ہی لیے جب بابا جان نے اس کے سامنے بی جان سمیت سبھی گھر والوں کی خواہش کا ذکر کیا۔ تو وہ بنا کسی پس و پیش کے راضی ہو گیا تھا۔ کہ اسے ان سب کے اس فیصلے پر تب تک کوئی اعتراض نہ تھا۔

مگر جب آٹھ ماہ قبل کراچی ٹرانسفر پہ اس کی ملاقات اپنی ایک کولیگ اسماء احمد سے ہوئی تو اسے احساس ہوا کہ وہ اپنی زندگی کا کتنا بڑا قدم' کتنی عجلت میں اٹھا بیٹھا تھا۔ شادی جیسا اہم فیصلہ وہ بھی بنا محبت کے اب اسے کسی حماقت سے کم نہ لگنے لگا تھا۔

اس پہ مستزاد اسماء کا اقرار محبت وہ تو گویا ہواؤں میں اڑنے لگا تھا۔ دل اب کسی قیمت پر بھی اسماء سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھا۔ جس کی صورت اسے اپنی زندگی کا آئیڈیل مل گیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے تو اس نے کسی لڑکی کے لیے ایسے جذبات محسوس نہ کیے تھے۔ حتی کہ ماہا کے لیے بھی نہیں' جو اس کی کزن ہونے کے ساتھ ساتھ منگیتر بھی تھی۔ اور جس کے ساتھ رشتہ طے ہونے پر وہ سمجھتا رہا تھا کہ وہ خوش ہے۔ مگر خوشی در حقیقت کس احساس کا نام ہے یہ اسے اسماء سے ملنے کے بعد پتا چلا تھا۔ جس کی محض ایک مسکراہٹ اس کے دل میں یہاں سے وہاں تک پھول ہی پھول کھلا دیتی تھی۔ اور جس کی آنکھ کا فقط ایک آنسو اسے تڑپا کر رکھ دینے کے لیے کافی تھا۔

ایسے میں وہ لڑکی جو کبھی اسے بے حد مکمل شخصیت کی مالک لگا کرتی تھی۔ بے حد عام سی لگنے لگی تھی۔ اتنی عام کہ اسے اسماء پر فوقیت دینے کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ پتا نہیں اس نے کیا سوچ کر اپنی زندگی ماہا عمر کے ساتھ بتانے کا فیصلہ کیا تھا۔ کہ اب تو محض یہ خیال ہی اس کا حلق تک کڑوا کرنے کے لیے کافی تھا۔

اس کی یہ کڑواہٹ بہت جلد اس کے رویے میں لاتعلقی اور الجھن بن کر در آئی تھی۔ اسلام آباد آمدورفت کا سلسلہ تو ویسے بھی مہینے میں ایک آدھ بار تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ مگر اب تو وہ فون پر بھی ماہا سے بات کرنے سے گریزاں رہنے لگا تھا۔

اپنے مزاج کی اس تبدیلی کا اسے خود بھی باخوبی احساس تھا۔ مگر کیا کرتا ماہا کی ذات یکایک اس کے لیے ایک "رکاوٹ" بن چلی تھی۔ جسے دور تو محض ایک جملے میں کیا جا سکتا تھا۔ مگر جس کے بعد اٹھنے والے طوفان کو قابو کرنا' اتنا آسان نہ تھا۔ اس پہ ضمیر کی سرزنش وہ ایک عجیب سی جھنجلاہٹ میں مبتلا رہنے لگا تھا۔

مگر اس بار تو وہ جیسے اندر سے شرمندگی کے مارے کٹ کر رہ گیا تھا جب سب نے اس کی اچانک آمد کو اس کی جانب سے ماہا کے لیے "برتھ ڈے سرپرائز" قرار دیتے ہوئے' جی بھر کے انجوائے کیا تھا اور ماہا! اس کے چہرے پر خوشی کے کیسے انوکھے رنگ بکھرے تھے۔

اس پل ولید عباس پہ یہ جان لیوا انکشاف ہوا تھا کہ جس سے وہ دامن چھڑانے کی ٹھانے بیٹھا ہے وہ نادان تو اس سے محبت کرنے لگی تھی ـــــ جرم کا احساس بڑی تیزی سے دل و دماغ میں جاگا تھا۔ اور وہ چاہ کر بھی ان سب کی غلط فہمی دور نہ کر پایا تھا۔ انہیں اپنی آمد کے اصل وجہ بیان نہ کر سکا تھا۔ جس کا مقصد ان سب کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ اسماء کے لیے قائل کرنا تھا۔ کیونکہ ان دونوں کے پاس اپنی محبت کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے

لیے اب زیادہ وقت نہ تھا۔

مگر یہاں تو ایک نئی مشکل آکھڑی ہوئی تھی۔ جس نے اس کی آنکھوں سے نیند تک غائب کروالی تھی۔ دل و ضمیر کی لڑائی میں وہ خود جیسے پس کر رہ گیا تھا۔ مگر کچھ سمجھا کے نہ دے رہا تھا۔ اوپر سے بی جان کی اچانک طبیعت خرابی نے صورت حال کو مزید گمبھیر بنا ڈالا تھا۔ ایسے میں ان کی طبیعت سنبھلنے پر اس نے سب سے پہلا کام کراچی واپسی کا کیا تھا۔

فرار معاملے کا حل نہ تھا۔ مگر فی الحال اس کے سوا اس کے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

دروازہ ناک کرتے ہوئے رشید نے اسے اسماء کے آنے کی اطلاع دی۔ تو وہ جو صبح سے کسلمندی سے بستر پر پڑا تھا۔ اک گہری سانس لیتا ہوا اٹھ کر ڈریسنگ روم کی جانب بڑھ گیا۔

وہ کل شام کراچی واپس پہنچا تھا۔ مگر طبیعت اتنی مکدر ہو رہی تھی کہ صبح اٹھ کر فریش ہو جانے کے باوجود وہ آفس نہ جا سکا تھا۔ موبائل بھی رات سے بند پڑا تھا۔ جبکہ وہ خود ناشتے کے بعد سے اب کمرے سے نکلا تھا۔

"السلام علیکم!" وہ لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے بولا تو اپنے دھیان میں صوفے پر گم سم سی بیٹھی اسماء چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"وعلیکم السلام۔ کیسے ہو؟" بغور اس کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ تو وہ ایک نظر اس کے تھکے تھکے سے چہرے پر ڈالتا ہوا ___ بڑے کاؤچ پر بیٹھ گیا۔

"ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ؟" اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ قصداً "نارمل انداز میں گویا ہوا تو اسماء بے اختیار اک گہری سانس لیتے ہوئے بیٹھ گئی۔

"فی الحال تو ٹھیک ہوں۔ تم بتاؤ واپسی کی اطلاع کیوں نہیں دی۔" اس کی جانب دیکھتے ہوئے وہ بنا کسی تاثر کے بولی تو ولید چند لمحے اس کی طرف دیکھنے کے بعد نگاہیں پھیر گیا۔

"بس یونہی۔"

"اور موبائل کیوں آف کر رکھا تھا؟"

"ایسے ہی۔" وہ دو لفظوں میں گویا ہوا۔ اسماء بے اختیار خاموش ہو گئی جبکہ سامنے بیٹھا شخص اس کی نظروں اور کمرے میں پھیلی خاموشی سے بے نیاز گلاس ونڈو سے باہر نگاہیں جما کر بیٹھ گیا۔

اس کا ہر انداز واضح طور پر اس کی ناکامی کی داستان سنا رہا تھا مگر پھر بھی نہ جانے کس آس کے تحت وہ خود کو پوچھنے سے باز نہ رکھ پائی تھی۔

"تم نے گھر میں بات کی؟"

"نہیں۔" چند لمحوں کے تذبذب کے بعد آہستگی سے جواب دیتے ہوئے اس کی نظریں اسماء کے چہرے کی جانب پلٹی تھیں۔ جہاں روشن امید کا دیا یک لخت ٹمٹما کر بجھ گیا تھا۔ اس بجھتے دیے کا دھواں ولید کو اپنے دل پہ چھاتا محسوس ہوا تھا۔

اس کی محبت نے اس نازک سے وجود کی مشکلات کو کتنا بڑھا دیا تھا۔ وہ اس حقیقت سے باخوبی واقف تھا۔ جبھی کل سے اب تک اس کا سامنا کرنے سے گریزاں تھا۔ اس بات کا علم رکھنے کے باوجود کہ وہ کس قدر شدت سے اس کی واپسی کی منتظر تھی۔

"ولید! تایا ابا نے نا صرف اپنے دوست کو "ہاں" کر دی ہے۔ بلکہ اس جمعے کو نکاح کی تاریخ بھی طے کر دی جائے گی۔" آنکھوں میں پھیلتی نمی کو حلق میں اتارتے ہوئے اس نے کپکپاتے لہجے میں اطلاع دی تو ولید بے یقینی سے اسے تکنے لگا۔

"ایسا۔ ایسا کیسے کر سکتے ہیں وہ؟ تم نے کہا تو تھا کہ خدیجہ آپی اور حیدر بھائی ان سے بات کریں گے۔"

"کی تھی انہوں نے بات۔ مگر وہ کاسٹ سے باہر شادی کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اور تم؟ تم نے کون سا اپنے گھر والوں کو راضی کر لیا۔ حالانکہ کتنی ریکوئسٹ کی تھی میں نے تم سے کہ آپی اور بھائی کے لیے تایا ابا کو منانا آسان ہو جائے گا۔ اگر جو تمہاری فیملی تمہارا

پرپوزل لے کر ان کے پاس چلی جائے گی۔ مگر تم نے انہیں راضی کرنا تو دور ذکر تک نہیں کیا۔ ایسے میں وہ دونوں بھلا مزید کیا کر سکیں گے۔" ولید کی کم ہمتی اسماء کو بے طرح غصہ دلا گئی تھی۔

خدیجہ آپی اور حیدر بھائی کے ساتھ اپنے دل کی بات شیئر کرنا تو چلو کوئی اتنی مشکل بات نہ تھی کہ اس کی اکلوتی بہن نے مما اور پاپا کے بعد "اسے" اپنی اولاد کی طرح چاہا تھا۔ اور کچھ یہی حال حیدر بھائی کی محبت کا بھی تھا۔ جو نا صرف اس کے بہنوئی بلکہ تایا زاد بھائی بھی تھے۔ مگر ان کے ذریعے اپنی بات تایا ابا تک پہنچانا کچھ اتنا سہل نہ تھا کہ وہ مزاج کے سخت ہونے کے ساتھ ساتھ آپی کے سسر بھی تھے۔ جنہوں نے چھوٹے بھائی بھاوج کی موت کے بعد دونوں بھتیجیوں کو اولاد کی طرح پالا تھا۔ ان کی کسی بات سے روگردانی "ان دونوں بہنوں" کے لیے خاصا دشوار امر تھا۔ مگر اس سب کے باوجود ایک صرف اس کی محبت میں "وہ نا صرف خود ہر طرح کی مشکل سہنے کو تیار تھی۔ بلکہ اپنی بہن کو بھی امتحان میں ڈالے بیٹھی تھی۔

"تو تمہارا کیا خیال ہے۔ میرے نزدیک یہ معاملہ اہمیت کا حامل نہیں؟ میں نہیں چاہتا کہ ہم دونوں کی محبت جلد از جلد اپنی منزل تک پہنچے؟" اس کی بات پہ ولید کی پیشانی پر ڈھیروں بل آن ٹھہرے۔

"نہیں خدانا خواستہ تمہاری نیت پہ شک نہیں کر رہی ولید! لیکن تم پلیز سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ اور میں کسی طور تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔" بات کے اختتام پہ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تو اس کی ذہنی اذیت کا اندازہ کرتے ہوئے وہ دھیما پڑ گیا۔

"پلیز اسماء! حوصلے سے کام لو۔ اللہ نے چاہا تو وہ ہمارے لیے ضرور کوئی راستہ نکالے گا۔" اپنی پریشانی پس پشت ڈالتے ہوئے وہ اٹھ کر اس کے برابر آبیٹھا۔

اس پل "ایک لمحے کے لیے بھی اسے اپنی خود غرضی یا اس لڑکی کا احساس نہ ہوا تھا۔ جس کے لیے وہ انتہائی بے رحمی سے ہجر کے دکھ مانگ رہا تھا۔

"دیکھیے حوصلے سے کام لوں ولی! حالات اور قسمت کچھ بھی تو ہمارے حق میں نہیں۔" وہ آنسوؤں کے درمیان بولی تو ولید نرمی سے اس کا ہاتھ تھام گیا۔

"سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ تم مجھے خدیجہ آپی کا نمبر دو۔ میں خود ان سے بات کرتا ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔ وہ دونوں پرسوں کراچی پہنچ رہے ہیں۔" وہ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی تو ولید کے گرتے حوصلے جیسے پھر سے بلند ہو گئے۔ وگرنہ اسماء کی بات نے تو اس کے قدموں تلے سے زمین سرکا دی تھی۔

"ویری گریٹ۔ تم مجھے اتنی اچھی خبر اب سنا رہی ہو؟" اسے گھورتے ہوئے وہ مصنوعی خفگی سے بولا تو اسماء اک گہری سانس لے کر رہ گئی۔ اس کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے وہ قصداً "بات کا رخ پلٹ گیا۔

"ویسے وہ لوگ ٹھہریں گے کہاں؟" اسماء چونکہ خود بھی یہاں ٹرانسفر کے بعد ہی آئی تھی۔ لہٰذا تنہا ہونے کے باعث اس کی رہائش ہاسٹل میں تھی۔ اس کی فیملی کا تعلق راولپنڈی سے تھا۔ جبکہ حیدر بھائی اپنے بزنس کی وجہ سے لاہور میں رہائش پذیر تھے۔

"فلیٹ پہ اور کہاں۔" بنا دیکھے وہ قدرے چڑ کر گویا ہوئی تو اس کے انداز پہ ولید اپنی مسکراہٹ دبا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں کراچی میں اس کی ذاتی رہائش موجود ہے۔

"او ہاں! میں تو بھول ہی گیا تھا۔ ویسے یار تم یوں کٹ کھنی بلی بنی بھی خاصی خوبصورت لگتی ہو۔" دایاں ہاتھ سر کے نیچے رکھتے ہوئے وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگا گیا۔ تو اس بے محل بات پہ وہ پلٹ کر اسے گھورنے لگی۔ مگر اسے اپنی جانب شرارت سے تکتا پا کر وہ خود کو بھی مسکرانے سے روک نہ سکی۔

"دیٹس بیٹر! اب تم زیادہ خوبصورت لگ رہی ہو۔" اپنے دل میں اترتے سکون کو محسوس کرتے ہوئے وہ شوخی سے کہتا سیدھا ہو بیٹھا تو اسماء نے بے اختیار پاس پڑا کشن اسے رسید کر ڈالا۔

☼ ☼ ☼

اگلے دو دن بعد اسماء نے اسے اپنے گھر ڈنر پہ انوائیٹ کیا تھا۔ جہاں اس کی ملاقات حیدر ضیاء اور خدیجہ حیدر سے ہوئی تھی۔ ولید کو ان دونوں سے مل کر حقیقتاً" بہت اچھا لگا تھا۔ کہ وہ دونوں ہی بے حد نفیس اور بااخلاق شخصیت کے حامل تھے۔

ہلکی پھلکی گفتگو کے دوران کھانا کھاتے ہوئے انہوں نے ان کے مسئلے سے متعلق کوئی بات نہ کی تھی۔ لیکن جب کھانے سے فراغت کے بعد اسماء' حیدر بھائی کی فرمائش پہ گرین ٹی بنانے کچن میں چلی گئی۔ تب انہوں نے نہایت سلیقے سے اصل موضوع کی جانب پیش رفت کی۔

"ولید! اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔" خدیجہ آپی کے پوچھنے پر اپنی فیملی کے متعلق بتاتے ولید کو حیدر بھائی نے انتہائی شائستگی سے ٹوکا تو وہ قدرے اچنبھے سے ان کی جانب دیکھنے لگا۔

"جی ضرور۔"

"آپ کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا ہے کہ ماشاء اللہ سے آپ کے گھر میں سبھی افراد کے درمیان بے حد اتفاق ہے۔ خاص طور پہ آپ کے والد کی تو شاید سبھی بہت عزت کرتے ہیں۔ ایسے میں آپ کا اپنی کزن کے لیے انکار' خاندان میں ناچاقی اور آپ کے والدین کے لیے شرمندگی کا باعث نہ بنے گا؟" اس کی جانب دیکھتے ہوئے انہوں نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں استفسار کیا۔ تو ولید کی نگاہیں بے اختیار جھک سی گئیں۔

اسے ان سے اس درجہ صاف گوئی کی امید نہ تھی۔ لیکن شاید صحیح فیصلے پر پہنچنے کے لیے ان کا رویہ بالکل درست تھا۔ معاملے کو کسی منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے "کلیئر اینڈ کٹ" ڈسکشن کا ہونا بے حد ضروری ہوتا ہے۔ جبھی ان کی بات کا برا مانے بغیر وہ چند لمحوں کے توقف کے بعد بنا کسی جھجک کے سچائی سے بولا۔

"بس ایک یہی خیال تو مجھے آگے بڑھنے نہیں دیتا۔"

"ہوں۔ میں سمجھ سکتا ہوں۔ ایسے حالات میں آگے بڑھنا کچھ اتنا آسان ہو بھی نہیں سکتا۔ وہ بھی اس صورت میں جبکہ آپ کی منگنی آپ کی رضا سے ہوئی تھی۔ اور بقول آپ کے' آپ کی کزن میں کسی چیز کی کمی بھی نہیں۔" انہوں نے بات کرتے ہوئے ایک نظر اس کی جانب دیکھا جو اپنی نظریں ہاتھوں کی لکیروں پر گاڑے بیٹھا تھا۔

"ایک بات میں کہنا چاہوں گا کہ آپ کی سچائی سے میں بے حد متاثر ہوا ہوں۔ ورنہ آپ اگر چاہتے تو کوئی بھی جھوٹی کہانی گھڑ کے ہمیں سنا سکتے تھے۔ لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ ایک اچھے اور کھرے انسان ہیں۔ اور میں ایسے لوگوں کی بے حد قدر کرتا ہوں۔" ان کی بات نے ولید کو بے اختیار اپنی نگاہیں اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا۔

"آپ کی یہ سچائی اس بات کی متقاضی ہے کہ ہم بھی آپ کو کسی قسم کے دھوکے میں نہ رکھیں۔ تاکہ آپ کو کسی فیصلے پر پہنچنے میں آسانی ہو سکے۔" اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے انہوں نے ایک لمحے کو رک کر اس کی جانب دیکھا۔ جو ہمہ تن گوش تھا۔ خدیجہ آپی اس دوران ایک سامع کا کردار ادا کرتے ہوئے بالکل خاموش بیٹھی تھیں۔

"بات دراصل یہ ہے ولید کہ میرے والد صاحب اس رشتے کے لیے قطعی راضی نہیں۔ ہم دونوں نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن ان کا اس سلسلے میں ایک ہی جواب ہے کہ وہ اپنی ذات سے باہر کسی طور پر بھی رشتہ نہیں کریں گے۔ ان کے اس دو ٹوک انکار کے باوجود میرا اور خدیجہ کا خیال تھا کہ ہم رفتہ رفتہ ہی سہی لیکن انہیں قائل کر لیں گے۔ مگر انہوں نے اچانک اسماء کے لیے اپنے دوست کے بیٹے کا پرپوزل قبول کر کے سمجھو بات ہی ختم کر ڈالی ہے۔"

"لیکن بھائی' ابھی معاملہ فائنل تو نہیں ہوا نا۔" بے حد امید سے اس نے جیسے مضطرب دل کی تسلی چاہی تھی۔

"فائنل ہی سمجھو۔ اس جمعے کو وہ لوگ نکاح کی تاریخ طے کرنے کے لیے آ رہے ہیں۔" وہ آہستگی سے

گویا ہوئے تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ گو کہ وہ اس تمام صورت حال سے پہلے سے واقف تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں حیدر بھائی کے منہ سے ساری بات سن کے اسے معاملہ ہاتھ سے نکلتا نظر آ رہا تھا۔

اسے یوں دونوں ہاتھوں میں سر گرائے دیکھ کر بے اختیار خدیجہ کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے انہوں نے ساتھ بیٹھے شوہر کی جانب دیکھا تھا جو خود بھی خاصے دل گرفتہ سے لگ رہے تھے۔

"دیکھو ولید! تم پریشان مت ہو۔ ہم یہاں اسی لیے ہی آئے ہیں کہ مل کر کوئی راستہ نکال سکیں۔" ان سے مزید چپ نہ رہا جا سکا تو وہ اٹھ کر اس سے ذرا فاصلے پر آ بیٹھیں۔ ان کی بات پر اک گہری سانس لیتے ہوئے اس نے اپنا سر اٹھایا تھا۔ اور تبھی قہوے کی ٹرے اٹھائے اسماء اندر داخل ہوئی تھی۔ بے اختیار ولید کی نظریں اس کے چہرے سے ٹکرائی تھیں اور اس کی زندگی میں موجود بہت سی "محبتوں" پہ اس ایک چہرے کی "محبت" حاوی ہو گئی تھی۔ لمحوں کا کھیل تھا اور فیصلہ ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ہاتھ میں پکڑا مگ لبوں سے لگاتے ہوئے اس نے ٹھنڈی چائے کا بڑا سا گھونٹ اپنے اندر اتارتے ہوئے سامنے پھیلے آسمان کی جانب دیکھا تھا۔ جس کے گلابی پڑتے کنارے ایک اور دن ڈھل جانے کی اطلاع دیتے ہوئے اس کے بوجھل دل کو مزید بوجھل کر گئے تھے۔ نجانے کیوں آج صبح سے اس کا دل بے حد بے چین اور بھاری ہو رہا تھا۔ مگر پھر طبیعت کا یہ اضطراب تو وہ پچھلے بہت دنوں سے محسوس کر رہی تھی۔ شاید تب سے جب ولید یہاں پہ تھا۔

اس شام اس کی اچانک آمد نے جہاں اس کے اندر پنہاں ہر خدشہ ہر اندیشہ مٹا ڈالا تھا۔ وہیں آنے والے دنوں میں ولید کی غیر معمولی خاموشی نے ماہا کو چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یوں جیسے وہ کسی ادھیڑ بن میں مصروف ہو۔ اس پہ مستزاد اس کے انداز میں در آنے والا تناؤ اور سرد مہری وہ چاہ کر بھی اس کے رویے کو نظرانداز نہ کر پائی تھی۔ جو باقی سب کے ساتھ تو بالکل ٹھیک تھا۔ مگر اس کے ساتھ نہ جانے کیوں اجنبیت اختیار کیے ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ولید عباس ولد عباس سکندر' آپ نے اسماء احمد بنت احمد حسن کو بعوض تین لاکھ روپے سکہ رائج الوقت' اپنے نکاح شرعی میں قبول کیا؟"

قاضی صاحب کے استفسار پر ولید نے تیسری بار بھی واضح اور مضبوط لہجے میں اقرار کرتے ہوئے نکاح نامے پر دستخط کیے تو سادہ سی محفل میں شریک گنے چنے افراد نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کر دیے۔

جبکہ اپنی آنے والی زندگی کے لیے خیر و بھلائی کی دعا مانگتے ولید عباس کی آنکھیں یک لخت جھلملا سی گئیں۔ اپنی زندگی کے انتہائی اہم موقعے پہ' اپنے والدین اور گھر والوں کی غیر موجودگی' اس کے دل کو کسی تیشے کی طرح کاٹ رہی تھی۔

اس نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ وہ اپنی زندگی کا سب سے بڑا قدم یوں تنہا اٹھائے گا۔ وہ بھی اس صورت میں جبکہ اس نے کبھی اپنے ماں باپ کی نافرمانی نہ کی تھی۔ مگر شاید اسی کو قسمت کہتے ہیں۔ جو کب اور کہاں آپ کو بند گلی میں لا کھڑا کرے۔ آپ کو پتا ہی نہیں چلتا۔

اسماء سے نکاح بھی اس کی زندگی کا ایک ایسا ہی فیصلہ تھا۔ جو اسے انتہائی مجبوری کی حالت میں کرنا پڑا تھا۔ کہ اس کے سوا اس کے پاس اور کوئی حل نہ تھا۔ وقت کی کمی اور ناموافق حالات نے اسے حقیقتاً" کچھ اس طرح سے بے بس کیا تھا کہ اگر وہ اس پل اسماء سے نکاح کا فیصلہ نہ کرتا تو شاید اسے ہمیشہ کے لیے کھو بیٹھتا جو اسے کسی طور قبول نہ تھا۔

اس کے اس اچانک فیصلے پہ جہاں اسماء حیرت زدہ سی کھڑی رہ گئی تھی۔ وہیں حیدر بھائی اور خدیجہ آپی بھی ایک پل کو بھونچکا سے بیٹھے رہ گئے تھے۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ولید؟" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد حیدر ضیاء جیسے اپنی حیرت کو زبان دینے کے قابل ہوئے تھے ان کی بے یقین نگاہیں بے اختیار سامنے بیٹھے خدیجہ کی جانب اٹھی تھیں۔ جن کے چہرے پر بھی کم و بیش ویسے ہی تاثرات تھے۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں بھائی۔ میں آپ دونوں کی رضامندی سے اسماء سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔" ایک نظر اسماء کے سفید پڑتے چہرے پر ڈالتے ہوئے اس نے دھیمے لہجے میں اپنی بات دہرائی۔ تو نا چاہتے ہوئے بھی حیدر بھائی کی نظریں اب تک کمرے کے وسط میں گم سم سی کھڑی اسماء کی طرف اٹھ گئیں۔ جسے ولید کے اس فیصلے سے بے خبری کے باوجود شرمندگی کی لہر بڑی تیزی سے اپنے اندر اترتی محسوس ہوئی تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ ہاتھ میں پکڑی ٹرے سینٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے سرعت سے لاؤنج سے نکل گئی تھی۔

اس کی اس حرکت پہ جہاں حیدر بھائی اور خدیجہ آپی کی نظریں ملی تھیں۔ وہیں ولید بھی لب بھینچ کر رہ گیا تھا۔ وہ اسماء کی ناراضی کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ جس کی پوزیشن اس کی اس بات سے اپنے بہن بہنوئی کے سامنے انتہائی آکورڈ ہو چلی تھی۔ مگر فی الوقت اس کے پاس اس ناراضی کو خاموشی سے مول لینے کے سوا دوسرا کوئی چارہ نہ تھا۔

"مگر ولید اس طرح...."

"پلیز بھائی! سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس اور کوئی راستہ نہیں۔" اس نے بے اختیاری کی سی کیفیت میں انہیں ٹوک دیا۔ تو وہ اک گہری سانس لے کر رہ گئے۔

"آپ کی ہر بات درست سہی ولید لیکن آپ یہ تو سوچیں کہ آپ کے اس انتہائی فیصلے کا آپ دونوں کی زندگی پر کیا اثر ہو گا؟ اسماء کے لیے اگر میں اس کے بڑے بھائی کی حیثیت سے سب کے سامنے اسٹینڈ لے بھی لوں۔ تب بھی میرا یہ قدم کتنا بڑا طوفان برپا کر دے گا۔ آپ کو شاید اس بات کا اندازہ نہیں جبکہ آپ جو اپنے ماں باپ کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ ان کے لیے آپ کی یہ بغاوت کس قدر دکھ اور تکلیف کا باعث ہو گی یہ غالباً" "مجھے آپ کو بتانے کی ضرورت نہیں۔" ان کی بات نے ایک لمحے کو اسے چپ رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"ایسی صورت حال میں آپ کے گھر میں اسماء کو وہ عزت اور مقام کبھی نہ مل سکے گا۔ جس کی وہ حق دار ہو گی۔ آپ کے لیے اگر کبھی ان سب کے دل نرم پڑ بھی گئے تب بھی اسماء کے لیے وہ شاید ہی کبھی اپنے دلوں میں گنجائش پیدا کر سکیں کہ ان کے نزدیک ان کے بیٹے کی نافرمانی اور بیٹی کی بربادی کی "وجہ" ہمیشہ اس کی ذات ہی رہے گی۔" ولید کے چہرے پر نگاہیں جمائے وہ تمام تر تلخ سچائیاں اس کے سامنے بے نقاب کرتے چلے گئے۔ تو وہ اک بوجھل سانس فضا کے سپرد کرتا صوفے کی پشت سے کمر ٹکا گیا۔

ان کی کسی بات سے اسے انکار نہ تھا۔ انہوں نے جو بھی کہا تھا وہ حقیقت پر مبنی تھا۔ مگر اس حقیقت کے آگے پسپائی اختیار کرنے کا مطلب تھا۔ اپنی محبت' اپنے خوابوں سے دستبرداری جو کم از کم اس کے لیے زندگی سے دستبرداری کے مترادف تھا۔

"تم دونوں کی بہتری اس ہی میں ہے کہ تم اسماء کو بھول جاؤ ولید!" کمرے میں پھیلی بوجھل سی خاموشی کو پہلی بار خدیجہ آپی کی مدھم سی آواز نے توڑا تو وہ جیسے تڑپ اٹھا۔

"پلیز آپی! میری ذات کو اتنے بڑے امتحان سے تو دوچار نہ کریں۔"

"ولید! سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم دونوں۔"

"میں کچھ سمجھنا نہیں چاہتا آپی! آپ پلیز' پلیز' صرف میرا ساتھ دینے کے لیے راضی ہو جائیں۔ باقی اسماء کے لیے ہر موڑ پہ ڈھال بننے کا عہد میں آپ سے کرتا ہوں۔" تیزی سے ان کی بات کاٹتے ہوئے وہ بے تابی سے بولا تو خدیجہ بے بس سی نظروں سے شوہر کو دیکھ کر رہ گئیں۔ جو اک گہری سانس لے کر رہ گئے تھے۔

"میرا یہ قدم بے شک میرے لیے بہت سے مشکلات کے در وا کر دے گا۔ لیکن کسی بھی مشکل کو سہنا میرے لیے اتنا تکلیف دہ نہ ہو گا۔ جتنا کہ اسماء کو چھوڑ دینے کا محض خیال! آپ لوگ مجھے بے حس کہیں۔ خود غرض یا کچھ اور میں اس معاملے میں خود کو بہت بے بس پاتا ہوں۔ میرے لیے اب اس کے بنا رہنا ممکن نہیں۔"

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ چاہے اپنے طور پہ وہ سب اسماء کے لیے بہتر نہیں بلکہ بہترین رفیق حیات کا انتخاب کیوں نہ کر لیتے' دل کی جو خوشی اور طمانیت کا جو احساس اسے ولید عباس کی ہمراہی میں ملنا تھا وہ اسے کسی اور شخص کا ساتھ کبھی نہ دے سکتا تھا۔ اور یہی نکتہ حیدر کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر گیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد حیدر ضیاء نے ایک انتہائی غیر متوقع فیصلہ سنایا۔ تو جہاں ولید پہ ایک پل کی بے یقینی کے بعد شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہیں خدیجہ بھی ساکت رہ گئیں۔

"یہ آپ۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" حیرت کی زیادتی سے ان کی آنکھیں پھٹ سی گئی تھیں۔ اسماء کی خاطر وہ اتنا بڑا قدم اٹھالیں گے۔ انہیں یقین نہ آرہا تھا۔

"جو بھی کہہ رہا ہوں۔ بہت سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔ ان دونوں کو حقیقی خوشی کا احساس ایک دوسرے کا ساتھ ہی دے سکتا ہے ہماری آج کی زور زبردستی دو نہیں چار چار زندگیاں خراب کر دے گی۔"

"تھینک یو سو مچ حیدر بھائی! آپ واقعی انسان نہیں فرشتہ ہیں۔" ولید اٹھ کر ان کے برابر آ بیٹھا۔

"میں کوئی فرشتہ نہیں ولید بس ایک بھائی ہوں۔ اور ایک بہن کا اپنے بھائی پہ بہت حق ہوتا ہے۔" لبوں پہ دھیمی مسکراہٹ سجائے وہ اپنے مخصوص نرم انداز میں گویا ہوئے تو ولید آنکھوں میں ستائش لیے اپنے سامنے بیٹھے اس "بلند قامت" شخص کو دیکھ کر رہ گیا۔ جس کی اچھائی کے آگے تمام تعریفی کلمات چھوٹے لگ رہے تھے۔

اور پھر اس رات ولید کے جانے کے بعد انہوں نے نا صرف اسماء کو سمجھایا تھا۔ بلکہ ضیاء صاحب کو بھی رام کرنے کی ایک آخری کوشش کی تھی۔ جس کا حسب توقع نتیجہ نکلنے کے بعد انہوں نے بڑے مودب انداز میں اپنے لیے معافی طلب کرتے ہوئے انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس درخواست کے ساتھ کہ "اگر وہ ان کے اس فیصلے میں شامل ہو کر اسماء کو اپنی دعاؤں کے سائے تلے رخصت کریں گے تو ان کے بیٹے کے دل سے ایک بڑی کسک دور ہو جائے گی۔"

مگر اس پل وہ محض لب بھینچ کر رہ گئے تھے۔ جب دوسری جانب سے ان کی ہر التدعا کو بری طرح سے رد کرتے ہوئے مکمل بائیکاٹ کی دھمکی کے ساتھ ہی رابطہ منقطع کر دیا گیا تھا۔

تایا ابا کے اس درجہ شدید رد عمل پہ ان دونوں بہنوں کی تو جان پہ بن آئی تھی۔ اسماء نے رو رو کر حیدر ضیاء سے کتنی ہی بار اس بات کو یہیں اسی جگہ ختم کر دینے کی درخواست کی تھی۔ مگر انہوں نے تو لگتا تھا جیسے کان بند کر لیے تھے۔ جبھی ان دونوں کے روکنے کے باوجود انہوں نے اگلے دن ولید کو بلا کر تمام معاملات طے کر ڈالے تھے۔

اور یوں ٹھیک تین دن بعد اسماء اپنی ماں جیسی پیاری بہن اور باپ سے شفیق بہنوئی کی دعائیں لیتی' ولید کے سنگ رخصت ہو کر اس کے فلیٹ میں چلی آئی تھی۔ جہاں ایک نئی اور خوبصورت زندگی نے آگے بڑھ کر ان دونوں کے دل سے ہر ملال ہر دکھ کو مٹا ڈالا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ چائے لیجیے۔" زائرہ بیگم نے چائے ملا کر کپ سامنے بیٹھے عباس صاحب کی جانب بڑھایا جو ابھی کچھ دیر پہلے فیکٹری سے لوٹے تھے۔

"ولید کا فون آیا؟" انہوں نے ہاتھ میں پکڑا اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے زائرہ بیگم کی جانب دیکھا۔ جو اپنا کپ اٹھاتے ہوئے لان چیئر سے پشت ٹکا گئیں۔

"آج تو نہیں۔ لیکن تین چار دن پہلے بات ہوئی تھی۔ بتا رہا تھا کہ ورک شاپ کی وجہ سے بہت

مصروفیت ہے۔"

"اور اس کے اس کولیگ کا کیا بنا جو اس کے ساتھ اپارٹمنٹ شیئر کرنے کے لیے آنے والا تھا؟" انہوں نے چائے کا سپ لیتے ہوئے اگلا سوال پوچھا۔

"پتا نہیں۔ میری اس سلسلے میں اس سے کوئی بات نہیں ہوئی۔"

"ہوں...." ان کے جواب پہ پرسوچ انداز میں ہنکارا بھرتے ہوئے انہوں نے ہاتھ میں پکڑا کپ سامنے موجود چھوٹی سی ٹیبل پر رکھ دیا۔ اگلے ہی لمحے وہ پاس پڑے موبائل پہ ولید کا نمبر ملاتے ہوئے۔ فون کان سے لگا گئے تھے۔

"شش! بابا کا فون آرہا ہے۔" اسکرین پہ جگمگاتے نمبر کو دیکھ کر ولید نے فوراً" پاس بیٹھی اسماء کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کال ریسیو کی تھی۔

"السلام علیکم بابا۔"

"وعلیکم السلام بیٹا۔ کیسے ہو؟"

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں۔"

"میں بھی ٹھیک ہوں یار یہ بتاؤ تمہاری یہ ورک شاپ کب تک چلے گی۔؟" وہ جب بہت موڈ میں ہوتے تھے ولید کو یونہی پکارا کرتے تھے۔ ان کے اس انداز پہ جہاں اس کے لبوں پر اک دھیمی سی مسکراہٹ آن ٹھہری تھی۔ وہیں جرم کے احساس نے بڑے زور سے اس کے اندر چٹکی بھری تھی۔ اگلے ہی لمحے اس کے چہرے کی چمک اور مسکراہٹ دونوں پھیکی پڑ گئی تھیں۔

"بس بابا کچھ دن اور۔" چاہتے ہوئے بھی وہ اپنے لہجے کی بشاشت کو قائم نہ رکھ سکا تھا۔

"اچھا۔۔۔ اور اس لڑکے کا کیا بنا جو تمہارے ساتھ فلیٹ شیئر کرنے کے لیے آنے والا تھا؟" ان کے اگلے سوال نے اس کے احساس شرمندگی کو مزید ہوا دی۔

کراچی میں اس کی رہائش کا انتظام اس کے آفس کی جانب سے کیا گیا تھا جہاں وہ اب تک ملازم کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ مگر اسماء کو رخصت کروانے کے بعد اپنے ایک کولیگ کے ساتھ اپارٹمنٹ شیئر کرنے کی یہ کہانی بھی اس نے حفظ ماتقدم کے طور پہ گھڑ کر سنائی تھی۔ تاکہ گھر سے اگر کسی کا کراچی آنے کا پروگرام بنے تو وہ آنے سے پہلے اسے اطلاع ضرور کرے۔

"وہ۔ وہ تو پندرہ دن پہلے ہی آچکا ہے۔" اس کی زبان بے اختیار لڑکھڑائی تھی۔

"ایڈجسٹ کرنے میں کوئی پرابلم تو نہیں ہوئی؟" انہوں نے متفکر لہجے میں پوچھا تو وہ نادم سالب کاٹ کر رہ گیا۔ ان کی محبت، ان کی پریشانی ہر چیز جیسے اس کے دل پہ دھرے بوجھ کو بڑھاتی چلی جارہی تھی۔

"نہیں۔" اب کے وہ بامشکل تمام بول پایا تھا۔

"چلو پھر میں رکھتا ہوں۔۔۔۔ تم اپنا خیال رکھنا۔ اوکے!"

"جی۔ آپ بھی اپنا خیال رکھیے گا۔ اور سب کو میرا سلام کہیے گا۔" ان کی محبت بھری نصیحت کا جواب دیتے ہوئے اس نے لب بھینچتے ہوئے رابطہ منقطع کرتے ہوئے بے دلی سے موبائل ایک جانب اچھال دیا۔ تو اتنی دیر سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ پہ نگاہیں جمائے بیٹھی اسماء اک گہری سانس لے کر رہ گئی۔ وہ اس پل کن احساسات سے دوچار تھا۔ وہ جان سکتی تھی۔

"ولید!"

"ہوں۔"

"آپ کچھ دنوں کے لیے اسلام آباد کا چکر لگا آئیں۔" اس نے نرمی سے کہا تو ولید یونہی نیم دراز سا آنکھیں کھول کر اسماء کو دیکھنے لگا۔ ان کی شادی کو ڈیڑھ ماہ کا عرصہ ہونے والا تھا۔ اور وہ اس دوران آفیشل ورک شاپ کا بہانہ کر کے اپنا اسلام آباد جانا کینسل کر چکا تھا۔ جبکہ اسماء کی فیملی نے تو اس کے ساتھ ساتھ خدیجہ آپی اور حیدر بھائی سے بھی قطع تعلق کر لیا تھا۔ اور اس کے لیے وہ دونوں ان پرخلوص ہستیوں سے از حد شرمندہ تھے۔ جو محض ایک ان کی خاطر خاندان بھر کی مخالفت مول لے چکے تھے۔

"ویسے بھی آپ وہاں جائیں گے تو معاملہ آگے بڑھ پائے گا نا۔" اس کے چہرے پر نگاہیں جمائے وہ اپنے سابقہ انداز میں گویا ہوئی تو ولید اک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ دل کی مراد بر آنے پہ زندگی یک لخت بہاروں کی سی دلفریب ہو چلی تھی۔ مگر یہ بھی ایک تلخ حقیقت تھی کہ ان کی اس ادھوری خوشی نے جہاں اسے کسی بھی پل چین نہ لینے دیا تھا، وہیں وہ زندگی میں پہلی بار اپنوں کا سامنا کرنے سے گھبرا رہا تھا۔ مگر آخر کب تک؟ جلد یا بدیر اسے وہاں جانا تو تھا۔

"ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مگر تم پیچھے اکیلی کیسے رہو گی؟" چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ آہستگی سے کہتا سیدھا ہو بیٹھا۔

"آپ میری فکر نہ کریں۔ میں ماسی سکینہ سے کہوں گی کہ وہ کچھ دنوں کے لیے ادھر ہی آجائے۔" اس نے کام والی کا حوالہ دیا تو وہ پرسوچ انداز میں سرہلاتا خاموش ہو گیا۔

"ولید!" یک لخت اس کے ہاتھ پہ اسماء کا ہاتھ آن ٹھہرا۔ تو وہ اپنے دھیان سے چونکتے ہوئے اس کی جانب دیکھنے لگا۔

"آپ۔ آپ گھر میں بات تو کریں گے نا؟" اس نے قدرے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ تو ولید چاہتے ہوئے بھی اس کی امید کو تلخ حقیقتوں کے سپرد نہ کر سکا۔

"کوشش کروں گا۔" اس نے نظریں چراتے ہوئے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"او تھینک یو ولید۔ تھینک یو سوچ۔" وہ بے اختیار اس کے کندھے سے آلگی تھی۔ اور ولید کو اپنا آپ کسی نادیدہ بوجھ تلے دبتا محسوس ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ جوس لے لیں۔" زائرہ بیگم کی گود میں سر رکھے وہ اپنے لاڈ اٹھوانے میں مگن تھا۔ جب مترنم آواز پہ بے اختیار اس نے نگاہیں اٹھاتے ہوئے سامنے دیکھا تھا۔ جہاں لائٹ بلو کلر کے تھری پیس سوٹ میں ہالا اپنی دلکش رنگت سمیت اسے نظریں چرانے پر مجبور کر گئی تھی۔

"چینی تو نہیں ڈالی؟" اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اس نے غیر ارادی طور پہ پوچھا۔ تو زائرہ بھنویں سکیڑتے ہوئے بیٹے کی جانب دیکھنے لگیں۔

"اس نے کوئی پہلی بار تمہارے لیے جوس بنایا ہے۔؟" اور ولید اپنی جگہ پہ شرمندہ سا ہو گیا تھا۔

"تھینک یو!" گلاس تھامتے ہوئے وہ آہستگی سے بولا چند لمحے اس کے بے تاثر چہرے کو تکنے کے بعد وہ خاموشی سے پلٹ گئی۔

"کیا سوچ رہی ہیں امی؟" جوس کے سپ لیتے ہوئے اس نے ساتھ بیٹھی ماں کی جانب دیکھا جو یکا یک نہ جانے کس سوچ میں گم ہو چلی تھیں۔

"یہی کہ اس سال تم دونوں کی شادی ہو جانی چاہیے۔" انہوں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"پلیز امی! اس قصے کو فی الحال رہنے دیں۔" منہ میں گھلتی مٹھاس یک لخت کڑواہٹ میں تبدیل ہو کر اس کے لہجے کے ساتھ ساتھ چہرے پر بھی در آئی۔

"کیوں رہنے دوں" منگنی کو ڈیڑھ سال ہونے کو آیا ہے۔ تم بھی ماشاء اللہ سے سیٹل ہو چکے ہو۔ ہالا بھی اپنی پڑھائی مکمل کر چکی ہے۔ پھر بھلا اب کس لیے اس معاملے کو لٹکایا جائے؟" دزدیدہ نگاہوں سے اس کے اکھڑے تیوروں کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے بظاہر عام سے لہجے میں استفسار کیا۔

"بس۔ میں۔ میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔" وہ جھنجلا کر ہاتھ میں پکڑا گلاس ایک طرف رکھتے ہوئے بولا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا اپنا مدعا انہیں کن الفاظ میں بیان کرے۔

"تو یہی تو پوچھ رہی ہوں۔ کیوں نہیں کرنا چاہتے؟" اس کی بلاوجہ کی تکرار پہ ان کے لہجے میں بھی خفگی در آئی۔

"کیونکہ۔ کیونکہ مجھے ہالا پسند نہیں۔" لہجے کی پس و پیش کے بعد اس نے دل کڑا کرتے ہوئے معاملے کو پار لگانے کی ٹھانی تھی۔

"ہائیں! دماغ تو ٹھیک ہے یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

مارے بے یقینی کے زائرہ بیگم کی آنکھیں پھٹ سی گئیں۔

"ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ میں ماہا سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔" زبان کی جھجک کیا دور ہوئی تھی۔ ساری گھبراہٹ بھی از خود ختم ہو گئی تھی۔ اس بات کا احساس کیے بنا کہ اس کی نگاہوں کے یہ بدلحاظی اس کی ماں کے دل کو کیسے صدمے سے دوچار کر گئی تھی۔

"تمہیں ماہا پسند نہیں' یہ بات اس وقت کہنی تھی۔ جب رشتہ کرنے سے قبل تم سے' تمہاری مرضی پوچھی گئی تھی۔" بے انتہا غصے کے باوجود انہوں نے اپنی آواز حتی الامکان نیچی رکھنے کی کوشش کی تھی۔ مبادا کوئی سن نہ لے۔

"امی! تب تک مجھے اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔" ان کے غم وغصے کی پروا کیے بنا وہ اپنے سابقہ انداز میں گویا ہوا تھا۔

"اور اب ڈیڑھ سال بعد آپ کو راتوں رات "اس رشتے" میں کیڑے نظر آنے لگے ہیں' واہ صاحب زادے کیا کہنے ہیں آپ کے۔" "اس رشتے" کو چبا چبا کر ادا کرتے ہوئے وہ طنزیہ انداز میں مسکرائی تھیں۔

"امی پلیز! آپ سمجھنے کی کوشش کریں' تب میں۔۔۔"

"میں سب سمجھ رہی ہوں ولید! تمہارا یہ سرکش لہجہ' یہ بدلے ہوئے تیور مجھے بہت کچھ سمجھا گئے ہیں۔۔۔ کل تک جس رشتے سے تم خاصے خوش اور مطمئن تھے۔ آج یکایک اس سے تمہارا دل کیوں اوب گیا ہے۔ میں تمہارے بنا کہے بھی وجہ جان چکی ہوں۔ لیکن تمہاری بہتری اس ہی میں ہے کہ تم اس وجہ کا ذکر دوبارہ کبھی میرے سامنے کرنے کی کوشش مت کرنا۔ کیونکہ اگر تم ایک اولاد کا فرض بھول کر اپنے ماں' باپ کی عزت داؤ پر لگانے کی جرات کر سکتے ہو تو میں بھی تم سے ناخلف بیٹے سے ہر رشتہ توڑنے کا حوصلہ رکھتی ہوں۔" دوٹوک اور کڑے لہجے میں اپنی بات مکمل کرتیں وہ اٹھ کر کمرے سے نکل گئیں۔ تو اب تک کسی بت کی مانند ساکت وجامد بیٹھا ولید اپنی ماں کا یہ روپ دیکھ کر حیران رہ گیا۔

گو کہ زائرہ بیگم شروع سے ہی بڑی اصول پسند طبیعت کی مالک تھیں۔ لیکن اس درجہ قطعیت سے شاید ہی کبھی انہوں نے کوئی بات کہی تھی اور ولید کے لیے اس بات کا اندازہ لگانا قطعا" مشکل نہیں رہا تھا کہ وہ اپنے اس فیصلے کو کسی طور نہیں بدلیں گی۔

☼ ☼ ☼
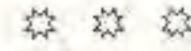
زائرہ بیگم سے ہونے والی تلخ کلامی کے نتیجے میں ولید اگلے ہی روز آفس سے ایمرجنسی کال کا بہانہ کرتے ہوئے کراچی کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔

اس کی اچانک واپسی پہ سوائے ایک زائرہ بیگم کے کبھی نے سوال اٹھایا تھا۔ جو اصل بات سے واقف ہونے کے باوجود مہر بہ لب رہی تھیں۔ وہ ولید کے غصے کو خاطر میں لا کر اسے اپنی مضبوطی کا احساس دلانا چاہتی تھیں۔ اس پر یہ واضح کر دینا چاہتی تھیں کہ وہ ان کی ماممتا کو ان کی کمزوری بنا کر اپنی ہر جائز' ناجائز خواہش نہیں منوا سکتا۔

یہ نہ تھا کہ ولید کی سوچ میں در آنے والی اس تبدیلی نے انہیں پریشان نہ کیا تھا۔ اس کے تیور انہیں اندر ہی اندر متفکر کر گئے تھے۔ مگر یہ احساس کہ بہر کیف آخری فیصلے کا حق تو ان ہی کے پاس محفوظ ہے۔ انہیں کافی حد تک مطمئن کیے ہوئے تھا۔ یہ حقیقت جانے بنا کہ ان کا بیٹا تو بہت پہلے ان کے اس مان اور بھروسے کی دھجیاں بکھیر چکا تھا۔

دوسری جانب ولید کو یکایک اپنا آپ حق بجانب اور اپنا فیصلہ بالکل درست اور بروقت لگنے لگا تھا' کیونکہ اس بحث کے بعد ایک بات تو واضح ہو چلی تھی کہ اگر وہ اپنے والدین کی رضامندی کا منتظر رہتا تو شاید اپنی محبت سے ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھو بیٹھتا۔

سوچ میں آنے والی اس تبدیلی نے جہاں ولید کے اندر موجود شرمندگی اور ملال کا خاتمہ کر ڈالا تھا' وہیں اس کی بے چینی کو بھی اطمینان میں تبدیل کر دیا تھا۔ جو اس کے چہرے کے ساتھ ساتھ اس کے لہجے میں بھی در آیا تھا۔

"کیا بات ہے آپ جب سے آئے ہیں خاصے چہک رہے ہیں۔ خیر تو ہے؟" جلدی جلدی کھانے کی تیاری کرتے ہوئے اسماء نے پلٹ کر ولید کی جانب دیکھا' جو اس کے پیچھے ہی کچن میں چلا آیا تھا۔ اس کے استفسار پر بے اختیار اک گہری مسکراہٹ ولید کے لبوں پر آن ٹھہری تھی۔ واقعی وہ جب سے گھر میں داخل ہوا تھا' مسلسل بول رہا تھا۔

"تمہیں کس بات پر اعتراض ہے' میرے آنے پر یا میرے چہکنے پر۔" اس کے قریب آتے ہوئے وہ نرمی سے اسے اپنے حلقے میں لیتا اس کے شانے پر ٹھوڑی ٹکا گیا تو اسماء بھی مسکرا دی۔

"دونوں پر۔"

"پوچھ سکتا ہوں کیوں؟" اس کا رخ اپنی جانب کرتے ہوئے وہ نگاہیں اس کے صبیح چہرے پر جماتے ہوئے بولا۔

"کیونکہ پہلے آپ کی آمد اور پھر یہ خوش مزاجی دونوں ہی بالکل غیر متوقع ہیں۔" اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ شرارت سے بولی تو ولید اس کے چہرے پر جھولتی لٹ کو اس کے کان کے پیچھے اڑستے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولا۔

"سب تمہارا قصور ہے' جس نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔"

"اچھا!" وہ ابرو اچکاتے ہوئے مسکرائی۔

"بالکل' جبھی تو دوڑا چلا آیا ہوں۔" وہ چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بولا تو اسماء کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"لیکن جناب دوڑنے سے پہلے وہ کام کیا یا نہیں جو کرنے گئے تھے؟" اس کے خیال میں ولید کی یہ خوش مزاجی اس کی کامیابی کی مرہون منت تھی۔ جبھی وہ بنا کسی پس و پیش کے پوچھ بیٹھی تھی۔ مگر ولید کے مسکراتے لب اس کے دل کو بھی سکیڑ گئے تھے۔

"نہیں۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ آہستگی سے گویا ہوا تو باوجود از حد مایوسی کے وہ زبردستی مسکرا دی۔

"چلیں کوئی بات نہیں۔ اچھا یہ بتائیں گھر میں سب ٹھیک تھے؟" غیر محسوس انداز میں اس کی ڈھیلی پڑتی گرفت سے نکلتے ہوئے وہ پلٹ کر پین میں چمچہ چلانے لگی تو ولید اک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"ہوں۔۔۔" اس کے چہرے کا پھیکا پن ولید کا اپنا دل بھی بوجھل کر گیا تھا۔ مگر اس موضوع پر مزید کوئی بات کر کے وہ اسے اور پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"تم سناؤ پیچھے کوئی پرابلم تو نہیں ہوئی؟" وہ اس کے دائیں جانب سلیب سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

"نہیں کچھ خاص نہیں' بس ذرا میری طبیعت ٹھیک نہیں رہی۔" وہ ڈھکی ہوئی چکن اٹھا کر فرائنگ پین میں ڈالتے ہوئے بولی تو ولید پریشان سا ہو گیا۔

"کیوں کیا ہو گیا تھا؟"

"پتا نہیں' لیکن چکر بہت آ رہے ہیں' شاید بی پی لو ہے۔" وہ اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

"ڈاکٹر کے پاس گئی تھیں؟" اس نے متفکر لہجے میں پوچھا تو وہ نفی میں سر ہلا گئی۔

"چلو پھر شام میں چلتے ہیں۔" وہ اپنے سابقہ انداز میں بولا تو وہ اثبات میں سر ہلاتی ایک بار پھر سامنے رکھے پین کی جانب متوجہ ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"مبارک ہو آپ کو' آپ کی رپورٹس پازیٹو ہیں۔" چند ایک ٹیسٹ کروانے کے بعد ڈاکٹر رابعہ نے بالآخر مسکراتے ہوئے انہیں مطلع کیا تو اسماء اور ولید کے چہروں پر خوشگوار سی حیرت آن ٹھہری۔

"لیکن آپ کا بی پی خاصا لو ہے۔ اس لیے آپ بھاگ دوڑ سے ذرا پرہیز کیجیے۔" انہوں نے پرچہ لکھ کر اسماء کی جانب بڑھایا تو دونوں ان کا شکریہ ادا کرتے باہر نکل آئے۔

"او گاڈ! اسماء تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ آج میں کتنا' کتنا خوش ہوں۔" ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے وہ خوشی سے تمتماتے چہرے کے ساتھ بولا تو

اسماء کے گلابی پڑتے چہرے پر شرمگیں سی مسکراہٹ آن ٹھہری۔

"تھینک یو سوچ مائی لو! تھینک یو سو مچ۔" بے اختیاری کے سے عالم میں وہ اس کا ہاتھ تھام کر لبوں سے لگا گیا تو نا چاہتے ہوئے بھی اسماء کی آنکھیں بھر آئیں۔

"کیا ہوا؟ تم رو کیوں رہی ہو؟" آن کی آن اس نے سڑک پر سے نگاہیں ہٹاتے ہوئے اس کی جانب دیکھا جو چہرے پر پھیلتی نمی اپنے دوپٹے میں جذب کر رہی تھی۔

"کاش ہماری شادی ہمارے بڑوں کی رضامندی سے ہوئی ہوتی' تو آج ہماری خوشی میں سب شریک ہوتے۔" وہ بھرائے ہوئے لہجے میں گویا ہوئی تو ولید کی آنکھوں میں بھی درد آٹھہرا۔

واقعی! اس کی اولاد کی خبر سکندر ولا میں ہنگامہ برپا کر دیتی۔ بی جان' بابا جان' امی' رجاء' چاچو' وہ چشم زدن میں جیسے سب کے تاثرات دیکھ آیا تھا۔ نا چاہتے ہوئے بھی اک سرد سی آہ اس کے لبوں سے آزاد ہوئی تھی۔

"اللہ نے چاہا تو وہ دن بھی ضرور آئے گا' تم پریشان مت ہو۔" اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے وہ تسلی آمیز لہجے میں گویا ہوا تو اسماء اک بوجھل سانس لیتی کھڑکی سے بھاگتے دوڑتے منظر پر اپنی خالی نگاہیں جما گئی۔

اور پھر آنے والے دنوں میں ان دونوں کی زندگی کا محور یکسر تبدیل ہو گیا تھا۔ ان کی تمام تر توجہ اس وجود کی جانب مرکوز ہو چلی تھی جس کی آمد کا انہیں بے چینی سے انتظار تھا۔

اسماء کو کمزوری چونکہ کافی زیادہ تھی۔ اس لیے ولید نے ایک فل ٹائم ملازمہ کا بندوبست کر لیا تھا۔ جو اس کے آفس سے واپسی تک اسماء کے ساتھ رہتی تھی۔ مگر ہر طرح کی احتیاط اور مکمل بیڈ ریسٹ کے باوجود اس کا بی پی نارمل نہیں ہو پا رہا تھا۔

اس کی تنہائی اور طبیعت کو مدنظر رکھتے ہوئے حیدر بھائی نے خدیجہ آپی کو کراچی بھجوا دیا تھا۔ مگر اس کا یہ مسئلہ ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ جس نے ان سب کے ساتھ ساتھ اب ڈاکٹرز کو بھی تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔

اس روز بھی ولید معمول کے مطابق آفس گیا ہوا تھا۔ چونکہ رات سے اسماء کی طبیعت پھر خاصی خراب تھی۔ لہٰذا صبح گیارہ بجے کے قریب جب وہ سو کر اٹھی تو لاؤنج سے آپی کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ جو یقیناً گل بانو سے صفائی کروانے میں مصروف تھیں۔

انہیں زحمت نہ دینے کے خیال سے وہ خود ہی بیڈ کا سہارا لیتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی وہ باتھ روم کی جانب چلی آئی تھی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ دروازہ بند کرتی شدید قسم کے چکر نے اسے اگلے ہی لمحے تیورا کر زمین پہ گرا دیا تھا۔

درد کی شدت سے بے اختیار لبوں سے چیخ کی صورت نکلی تھی اور اس سے پہلے کہ بوکھلائی ہوئی' خدیجہ آپی اور گل بانو اس تک پہنچتیں' وہ ہوش و خرد سے بے گانہ ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

حواس باختہ سا ولید جب تک اسپتال پہنچا تب تک اسماء کو آپریشن تھیٹر میں لے جایا جا چکا تھا۔ اس کی آمد پہ اسے پیشنٹ کی انتہائی سیریس کنڈیشن کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے فوری طور پہ بلڈ کا انتظام کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ مگر اس کی تمام دوڑ دھوپ' ڈاکٹرز کی بھرپور کوشش اور خدیجہ آپی کی آنسوؤں میں ڈوبی ان گنت دعائیں سب کچھ اس وقت بے معنی ہو کر رہ گیا تھا۔ جب آپریشن تھیٹر سے باہر آنے والوں نے انہیں موت کی ردا میں لپٹی ایک نئی زندگی تھماتے ہوئے تقدیر کی ستم ظریفی پہ ساکت کر ڈالا تھا۔

محض دس ماہ' پندرہ دن اور نو گھنٹے گزرے تھے اور وہ آشیانہ جو ولید عباس نے بہت ارمانوں سے بنایا تھا بکھر کر رہ گیا تھا۔ غم' حیرت اور تہی دامن رہ جانے کا احساس اس قدر شدید تھا کہ وہ اپنے آنگن میں اترنے والی اس ننھی سی پری کو بھی فراموش کر بیٹھا تھا' جس کا کبھی اسے شدت سے انتظار تھا۔

ایسے میں اس بے حد کمزور وجود کو جو اپنے مقررہ وقت سے بہت پہلے دنیا میں آ گیا تھا' ماں کا نرم کومل احساس خدیجہ آپی نے ہی بخشا تھا۔ جو اگر اپنے غم کو پیچھے دھکیل کر اپنی بہن کی اس آخری نشانی کو سینے سے نہ لگاتیں تو شاید وہ بھی اس ظالم دنیا سے محض چند ہی گھنٹوں میں اپنا ہر ناتا توڑ لیتی۔ جہاں آنے کے فوراً بعد اسے ماں کی پر حرارت گود کے بجائے کتنے ہی گھنٹے انکیوبیٹر کی مصنوعی فضا میں اپنی بقا کی جنگ لڑنی پڑی تھی۔

ایسے کڑے وقت میں جب قدرت نے ان سب کو ایک نہیں اکٹھے دو امتحانوں سے دوچار کر ڈالا تھا۔ خدیجہ کو نا چاہتے ہوئے بھی خود کو سنبھال کر اپنے آنسو پونچھنے پڑے تھے۔ ورنہ شاید انہیں دوہرے نقصان کی اذیت سے دوچار ہونا پڑ جاتا۔ جس کی کم از کم ان میں ہمت نہ تھی۔

ولید سے انہیں یا حیدر کو کوئی گلہ نہ تھا کہ اس کی ذہنی اذیت کا وہ بخوبی اندازہ لگا سکتے تھے۔ جو اپنی بستی بستی دنیا کے اجڑنے کا غم تن تنہا جھیلنے پر مجبور تھا۔ وہ بھی مکمل زباں بندی کے حکم کے ساتھ۔ اس پہ مستزاد بچی کی ذمہ داری اور پرورش کی فکر' وہ جیسے سوچ سوچ کر نڈھال ہو چکا تھا۔ اپنی بے بسی اور لاچاری کا احساس اسے کتنی ہی بار پھوٹ پھوٹ کر رونے پر مجبور کر گیا تھا۔ مگر مشکلات کا کوئی حل سوجھ کے نہ دے رہا تھا۔

ایسے میں اسے اپنا وجود ان تمام رشتوں کی بددعاؤں کے زیر اثر لگنے لگا تھا۔ جنہیں وہ صرف اپنی خوشی کی خاطر داؤ پر لگا چکا تھا اور اب بدلے میں اللہ نے اسے اسی خوشی سے محروم کرتے ہوئے ان اپنوں کی قدر و قیمت بہت اچھے طریقے سے باور کروا دی تھی۔ جن سے اس نے اپنی خوشیاں تو بڑی خود غرضی سے الگ کر لی تھیں۔ مگر جن کے بنا اب اپنے غم تنہا جھیلنا اس کے بس سے باہر ہو چلا تھا۔

اس کی دگرگوں حالت کے پیش نظر حیدر کو یہ ہی مناسب لگا تھا کہ وہ کچھ عرصے کے لیے اسلام آباد چلا جائے۔ ورنہ اس کا ڈپریشن شدید صورت اختیار کر سکتا تھا۔

بچی کا اس کے ساتھ جانا چونکہ کسی بھی طور پہ ممکن نہ تھا۔ لہٰذا اسے اپنے ساتھ لاہور لے جانے کا فیصلہ کرتے ہوئے انہوں نے ایک بار پھر آگے بڑھ کے ولید کی ہر پریشانی' ہر ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی۔ یہ جانے بنا کہ ان کی اس درجہ بھلائی پہ اس کے ضمیر نے اسے نا صرف اپنے ماں' باپ کا بلکہ اپنی اولاد کا بھی مجرم قرار دے دیا تھا اور کسی احساس جرم کے ساتھ زندہ رہنا کتنا اذیت ناک ہوتا ہے۔ یہ کوئی ولید عباس سے پوچھتا جس کے وجود کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ مگر اسے اف تک کرنے کی اجازت نہ تھی۔

☼ ☼ ☼

"اب کیسی طبیعت ہے بیٹا؟" اسے آنکھیں کھولتا دیکھ کر زائرہ بیگم نے نرمی سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے خشک پڑتے لبوں پر زبان پھیری تھی۔

"امی مجھے پانی دیں۔" وہ آہستگی سے بولا تو رجاء تیزی سے سائیڈ ٹیبل کی جانب بڑھ گئی۔

"اٹھو بیٹا۔" وہ گلاس ہاتھ میں لیے چلی آئی تو زائرہ بیگم' ولید کو اٹھنے میں مدد دینے لگیں' جو پورا گلاس ایک ہی سانس میں خالی کرتے ہوئے نڈھال سا بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا گیا۔

بے اختیار ان کی متفکر نگاہوں نے بیٹے کے کمزور چہرے کا جائزہ لیا تھا۔ جو انہیں دو دن کا نہیں بلکہ صدیوں کا بیمار لگ رہا تھا۔

ولید کو اسلام آباد آئے آج تیسرا دن تھا اور وہ جو اب تک بڑی ہمت سے سارا بوجھ تنہا اٹھائے ہوئے تھا۔ گھر پہنچتے ہی یوں نڈھال ہو کر بستر پہ پڑا تھا کہ اگلے دو روز تک خود اسے بھی اپنی خبر نہ رہی تھی اور وہ سب لوگ جو پہلے ہی اس کی گری ہوئی صحت دیکھ کر حیران

تھے۔ اس کی اس اچانک بیماری کی وجہ سے بے حد فکر مند ہو گئے تھے۔ جس کی وجہ ڈاکٹر کے مطابق حد سے بڑھا ہوا ذہنی دباؤ تھا۔

اس نئی اطلاع نے سب گھر والوں کو پریشانی کے ساتھ ساتھ بے چینی میں بھی مبتلا کر دیا تھا۔ ہر کوئی اس کی اس درجہ ٹینشن کی وجہ جاننا چاہتا تھا۔ مگر بھی ولید کی طبیعت کے پیش نظر خاموشی اختیار کرنے پر مجبور تھے۔ جو آج کہیں جا کر اٹھنے اور چلنے پھرنے کے قابل ہوا تھا۔

زائرہ بیگم کے دل کو انجان سے واہمے ستانے لگے تھے۔ نہ جانے کیوں ان کی چھٹی حس مسلسل انہیں کسی انہونی کے وقوع پذیر ہو جانے کا احساس دلا رہی تھی۔ ایسی انہونی جس کا تعلق کہیں نہ کہیں اس ہستی سے ضرور تھا جو چند ماہ قبل ان دونوں کے درمیان بحث کا باعث بن چکی تھی۔

"امی! میں نہیں آپ، آپ سے اب مزید دور نہیں رہ سکتا۔" وہ آپ کا گناہ گار کہنا چاہتا تھا۔ مگر زبان ساتھ نہ دے سکی تھی اور وہ مارے بے بسی کے ماں کی گود میں چہرہ چھپا کر آنکھیں میچ گیا تھا۔

"تو بیٹا تم اپنے ٹرانسفر کے لیے کوشش کیوں نہیں کرتے؟" گو کہ اس نے ان کے سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔ مگر پھر بھی وہ اس کے گھنے بالوں کو سہلاتے ہوئے بظاہر نرمی سے بولی تھیں، جبکہ اندر ہی اندر وہ حقیقتاً "پریشان ہو اٹھی تھیں۔

ان کا بیٹا اس درجہ کمزور کبھی بھی نہ تھا کہ گھر والوں سے دوری کو وہ بھی ڈیڑھ سال بعد یوں اعصاب پہ سوار کر کے بیمار پڑ جاتا۔ یقیناً "بات کچھ اور تھی، جو بے حد گمبھیر بھی تھی۔ مگر ان کے اطمینان کو فی الوقت اتنا ہی کافی تھا کہ وہ واپس اسلام آباد آنے کا خواہاں تھا۔ جبھی انہوں نے مزید کچھ کہنے سے گریز کیا تھا۔ اگر وہ نہیں بتانا چاہتا تھا تو اصرار کر کے وہ بھی اسے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

"میں اپنے باس سے بات کروں گا۔" اس نے بوجھل لہجے میں جواب دیا، تو زائرہ بیگم کا متفکر دل

قدرے ٹھہر سا گیا، جبکہ ولید انجانے میں ہی سہی لیکن جیسے کسی نتیجے پر پہنچ گیا تھا۔ وہ اب دوبارہ کبھی کراچی نہیں جانا چاہتا تھا۔ جہاں جا بجا اس کی ادھوری خوشیوں اور ٹوٹے ہوئے خوابوں کی کرچیاں بکھری تھیں۔

درد کا شدید احساس ایک بار پھر اس کی روح میں سرائیت کرنے لگا تو وہ بے اختیار سختی سے آنکھیں میچ گیا اور کتنے ہی بے آواز آنسو اس کی پلکوں سے ٹوٹ کر اس کی ماں کے وسیع دامن میں جا سمائے تھے۔

☼ ☼ ☼

"آئی ہیو آ گڈ نیوز فار یو۔" ماہین نے کمرے میں داخل ہوتے اعلان کیا تو وہ جو بیڈ شیٹ بچھا رہی تھی، سر اٹھاتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

"ولید بھائی واپس اپنا ٹرانسفر اسلام آباد کروا رہے ہیں۔" خوشی سے بولتی ہوئی وہ اس کے نزدیک چلی آئی تو ایک پل کے لیے ماہا خاموش کھڑی رہ گئی۔

"کیا ہوا؟ تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟" اس کے بے تاثر چہرے پر نگاہیں جمائے اب کے اس نے سنجیدگی سے استفسار کیا تو ماہا اک گہری سانس لیتی بیڈ پہ ٹک گئی۔

"ماہی! تمہیں یہ سب کچھ عجیب سا نہیں لگ رہا؟"

"کیا مطلب؟" قدرے الجھ کر اس کی جانب دیکھتے ہوئے وہ بھی بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"مطلب کہاں تو ولید کے پاس اسلام آباد آنے کی فرصت نہ ہوتی تھی اور کہاں اب وہ اچانک ہی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اپنا ٹرانسفر یہاں کروا رہا ہے۔"

"ہاں تو انہوں نے کہا ہے نا کہ وہ وہاں بہت تنہا فیل کرتے ہیں۔"

"تنہا فیل کرتے ہیں؟" ماہین کی بات پہ اس کے چہرے پر حیرت در آئی۔

"ڈیڑھ سال بعد؟" اس نے تعجب سے بہن کی

طرف دیکھا تھا۔

"تو اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ انسان کبھی بھی ہوم سک ہو سکتا ہے، اور مجھے تو یہ سمجھ نہیں آرہا کہ تم کیوں خوامخواہ بال کی کھال نکال رہی ہو۔ کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں کہ ولید بھائی واپس آرہے ہیں اور تم دونوں کے درمیان جو ایک فاصلہ آگیا تھا اب کم از کم وہ تو دور ہو سکے گا نا۔" ماہا کی سوچ بچار اس کے نزدیک ــــ بے معنی تھی۔ جبھی وہ چڑ سی گئی تھی۔ جبکہ اس کی بات پہ ماہا یک لخت خاموش سی ہو گئی تھی۔ اب وہ اسے یہ بات کیسے سمجھاتی کہ دلوں کے درمیان در آنے والے فاصلے کا دوری یا نزدیکی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

لہٰذا دوپہر کے کھانے سے فراغت کے بعد تھوڑی سی دیر ستا کر اب بھی لان میں محفل جمائے شام کی چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جب معاً "دانش کی کسی بات پہ سب کے ساتھ ساتھ ولید بھی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

اسے یوں کھل کر ہنستا دیکھ کر ان چاروں کو بے حد خوشگوار سی حیرت نے آن گھیرا تھا، جو قدرے فاصلے پر بیٹھی باتوں میں مشغول تھیں۔

"یار! ولید بھائی یوں ہنستے ہوئے کتنے اچھے لگ رہے ہیں نا۔" ہانیہ نے ان سب سے تائید چاہی تو بے اختیار وہ تینوں مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا گئیں۔

آج نہ جانے کتنے عرصے بعد انہوں نے ولید کو یوں ہنستے دیکھا تھا۔ ورنہ پچھلے تین ماہ سے تو گویا وہ مسکرانا تک بھول گیا تھا۔ تنہائی اور خاموشی کا ایک عجیب سا حصار تھا۔ جس نے اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس حد تک کہ وہ سب چاہ کر بھی اسے "کھلنے" پر مجبور نہ کر سکے تھے۔

"ولید بھائی کی طبیعت تو اب ٹھیک رہتی ہے نا؟" نظروں کا رخ بدلتے ہوئے ہانیہ نے رجاء کی جانب دیکھا۔

"ہاں اللہ کا شکر ہے۔ بس مائیگرین کا مسئلہ ہو جاتا

ہے کبھی کبھی۔" رجاء کا لہجہ نا چاہتے ہوئے بھی بوجھل ہو گیا۔ اس درجہ ڈپریشن کا نتیجہ بالآخر مائیگرین کی صورت نکلا تھا۔ جو جب بھی ہوتا، ولید کو نڈھال کر کے رکھ دیتا۔

"اللہ شفا دے انہیں، یہ کوئی بہت بڑا مسئلہ نہیں ہے، بس دعا کرو کہ وہ اس فیز سے جلد نکل آئیں۔" ہانیہ نرمی سے بولی تو وہ تینوں بے اختیار آمین کہہ اٹھیں۔

چائے اپنے لوازمات سمیت بے حد پسند کی گئی تو وہ چاروں خوش ہو گئیں، جنہوں نے ساری دوپہر لگا کر اتنا اہتمام کیا تھا۔

"بس بی جان، اب آپ بھی گھر میں کسی فنکشن کا بندوبست کروا لیں۔" بات لڑکیوں کے سگھڑاپے سے ہوتی ہوئی ساتھ والی مسز اجمل کے بیٹے کی شادی پر جا پہنچی، تو بے اختیار راضیہ پھوپھو کو اپنے گھر کی فکر ستانے لگی۔ جس پہ سوائے ایک شخص کے وہاں موجود سبھی افراد کے چہروں پہ مسکراہٹ اپنی چھب دکھلا گئی۔

"تم نے تو میرے دل کی بات کہہ ڈالی ہے بیٹا۔ میری بھی یہ ہی خواہش ہے کہ کم از کم اب ولید اور ماہا کے معاملے میں مزید دیر نہیں ہونی چاہیے۔" نرم شفیق لہجے میں انہوں نے بیٹی کی تجویز کو سراہتے ہوئے دونوں بیٹوں کی جانب دیکھا۔ تو بہت سی شوخ اور شریر نگاہیں گفتگو کے مرکزی کرداروں پر آن ٹھہریں۔ جس پہ جھینپی ــــــ سی ماہا خالی برتن سمیٹتی اٹھ کر اندر کی جانب بڑھ گئی۔ جبکہ ولید کے چہرے پر چھائی شگفتگی کی جگہ یک لخت تناؤ بھری کیفیت نے لے لی۔

"جب آپ کی بھی یہ ہی خواہش ہے بی جان تو پھر بھلا ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" عباس سکندر مسکراتے ہوئے سعادت مندی سے گویا ہوئے تو بی جان کا بوڑھا چہرہ جگمگا اٹھا۔

"اللہ تم لوگوں کو صحت و تندرستی دے۔ اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھو۔ بیٹا اگر تم سب راضی ہو تو پھر اگلے چاند کی کوئی اچھی سی تاریخ رکھ لیتے ہیں۔" وہ

سب کو دعاؤں سے نوازتے ہوئے بولیں۔ تو تمام حاضرین ــــ اس اچانک اور غیر متوقع پیش رفت پہ حیران رہ گئے۔ جبکہ ولید کی کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والی کیفیت ہو چلی تھی۔ یہ بات کا رخ یکایک کہاں سے کہاں چلا گیا تھا' وہ ساکت رہ گیا تھا۔

"لیکن بی جان اتنی جلدی تیاری کیسے ہوگی؟" رابعہ چونکہ بیٹی کی ماں تھیں۔ لہٰذا دنیاداری کی فکر سب سے پہلے انہیں لاحق ہوئی تھی۔

"تیاری کیسی بھابھی۔ گھر کی تو بات ہے۔" راضیہ پھوپھو نے گویا کان پر سے مکھی اڑائی تھی۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن پھر بھی۔۔۔"

"راضیہ ٹھیک کہہ رہی ہے رابعہ۔ کسی تیاری کے جھنجٹ میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔" زائرہ نے نرمی سے دیورانی کو ٹوکا تو وہ دھیمے سے مسکرادیں۔

ان کی اس درجہ ایفیشنسی پہ ولید اک تیز نگاہ ان کے چہرے پر ڈالتا نظروں کا زاویہ بدل گیا تھا۔ نا چاہتے ہوئے بھی اس کے چہرے پر ناگواری اور خفگی آن ٹھہری تھی۔ جسے اور کسی نے نہیں لیکن ساتھ بیٹھے دانش نے ضرور محسوس کر لیا تھا۔

"کیا ہوا' تیرا موڈ کیوں آف ہے؟" اس نے آہستگی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" اس کے لہجے کی تلخی بے اختیار دانش کو چونکنے پر مجبور کر گئی۔

حیرت سے اس کے اکھڑے تیوروں کا جائزہ لیتے ہوئے دانش نے غیر محسوس انداز میں قدرے فاصلے پر بیٹھی رجاء کو ولید کی جانب اشارہ کرتے ہوئے متوجہ کیا تھا۔ جو پہلے پہل تو نا سمجھی سے کبھی اسے اور کبھی ولید کو دیکھتی رہی۔ لیکن جونہی دانش کا مطلب واضح ہوا وہ بغور بھائی کا چہرہ تکنے لگی۔ جو کچھ دیر قبل کے برعکس خاصا خاموش اور لیا دیا سا بیٹھا تھا۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے بھائی؟" اگلے ہی پل وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے دوسری جانب آ بیٹھی تو ولید اک کڑی نگاہ اس پہ ڈالتا سامنے دیکھنے لگا۔ جہاں امی' پھوپھو اور دونوں چاچیوں کی گفتگو میں اب بی جان بھی شریک ہو چکی تھیں۔

اس کے رد عمل پہ رجاء کی استفہامیہ نگاہیں تیزی سے دانش کی جانب اٹھی تھیں۔ جواباً لاعلمی ظاہر کرنے کو کندھے اچکا گیا تھا۔ بے اختیار اپنی نظروں کا زاویہ بدلتے ہوئے اس نے ایک بار پھر ولید کی طرف دیکھا تھا۔ جو اب لب بھینچے عثمان چچا کی جانب متوجہ تھا اور آن واحد میں جیسے پوری بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ یقیناً اسے اس سارے معاملے میں اپنی رائے نہ پوچھے جانے کا قلق تھا۔

دل ہی دل میں بھائی کے بچپنے پہ ہنستے ہوئے وہ اگلے ہی لمحے باآواز بلند ماں سے مخاطب ہوئی تھی۔

"امی! آپ لوگ خود ہی سب کچھ طے کرتے جارہے ہیں۔ ذرا ایک بار بھائی سے بھی تو ان کی مرضی پوچھ لیں۔"

"بیٹا جان' آپ کے بھائی کی مرضی رشتہ کرنے سے پہلے پوچھ لی گئی تھی۔ اب دیگر معاملات طے کرنا بڑوں کا کام ہے۔ ویسے بھی میرا نہیں خیال کہ ولید کو کوئی اعتراض ہوگا۔ کیوں بیٹا؟" زائرہ بیگم کے بجائے جواب عباس سکندر نے دیتے ہوئے ولید کی طرف دیکھا' تو سبھی ایک پل کو خاموش ہو کر اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔

اور وہ جو سوچے بیٹھا تھا کہ تنہائی ملتے ہی ماں کو ابھی شادی سے صاف منع کر دے گا۔ باپ کے یوں بھری محفل میں ماں سے استفسار کرنے پہ چپ کا چپ رہ گیا تھا۔

"ولید تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں بیٹا؟" اس کی خاموشی محسوس کرتے ہوئے انہوں نے اب کے واضح الفاظ میں اپنا سوال دہرایا۔ تو وہ ایک نظر سامنے بیٹھے عباس سکندر کے چمکتے چہرے پر ڈالتا نگاہیں جھکا گیا۔

"نہیں!" شکستگی کے بھرپور احساس نے اسے سرتاپا مغلوب کر دیا تھا۔ اس پل ان کی بات سے انکار کر کے وہ بھلا کیسے انہیں سب کے سامنے شرمندہ کر سکتا تھا۔

اس کے اس غیر متوقع جواب پہ رجاء نے حیرت سے پلٹ کر بھائی کے جھکے چہرے کی جانب دیکھا تھا۔ اس کے خیال میں تو وہ شاید گھر والوں کی اس درجہ جلد بازی پہ نالاں تھا۔ لیکن اپنی رضامندی ظاہر کر کے تو اس نے رجاء کو مزید الجھا دیا تھا۔

"مبارک ہو بیٹا۔ میں اب اللہ کا نام لو اور اگلے ماہ کی 25 تاریخ طے کرو۔" بی جان کی خوشی سے بھرپور آواز اس کی سوچوں کو بکھیر گئی تو وہ اک گہری نظر ولید کے ناقابل فہم تاثرات سے سجے چہرے پر ڈالتی سیدھی ہو بیٹھی۔ اگر وہ دل سے راضی تھا تو خوشی کی کوئی رمق اس کے چہرے پر کیوں نہ تھی۔

"جی بی جان' جیسے آپ کہیں۔" عباس صاحب نے مسکراتے ہوئے اپنی رضامندی ظاہر کی تو لان میں ایک خوشگوار سی ہلچل مچ گئی۔ مبارک سلامت کے شور میں بی جان اٹھ کر اپنے لاڈلے کو سینے سے لگاتے ہوئے ڈھیر ساری دعاؤں سے نوازا تو نا چاہتے ہوئے بھی ولید کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

☆ ☆ ☆

ساری رات آنکھوں میں گزارنے کے بعد وہ اگلے دن صبح ہی بائے روڈ لاہور کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔

اس کی اچانک آمد جہاں حیدر اور خدیجہ کو حیران کر گئی تھی وہیں اس کی آنکھوں کی سرخی بڑھی ہوئی شیو اور تھکا تھکا سا لہجہ انہیں کسی گڑبڑ کا احساس دلا گیا تھا۔ مگر انہوں نے قصداً اسے چھیڑنے سے گریز کیا تھا۔ جو آتے ہی اپنی تمام تر کلفت بھلائے اپنی لاڈلی کے ساتھ مصروف ہو گیا تھا۔

"کیا بات ہے ولید تم اتنے پریشان کیوں لگ رہے ہو؟" اور جواب میں اس نے بوجھل لہجے میں انہیں ساری بات سنانے کے ساتھ ساتھ اپنے فیصلے سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔ جس پہ وہ رات بھر کی سوچ بچار کے بعد پہنچ پایا تھا۔

ساری تفصیل جاننے کے بعد وہ دونوں ایک پل کو چپ سے ہو گئے تھے۔ مگر اگلے ہی لمحے خدیجہ آپی کی بات نے اسے گویا ساکت کر ڈالا تھا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں آپی۔" ولید کی آنکھیں مارے بے یقینی کی پھیل سی گئی تھیں۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ولید۔ جو ہو رہا ہے اسے ہونے دو۔ گزری باتوں سے پردہ ہٹا کر اپنی آنے والی زندگی کے لیے نئی مشکلات مت کھڑی کرو۔" اس کے بے یقین چہرے پر نگاہیں جمائے وہ رسان سے گویا ہوئی تھیں۔

"لیکن آپی میں اتنی بڑی بات اپنے گھر والوں سے کیسے چھپا سکتا ہوں۔ اور پھر مجھے دانیہ کو بھی تو اپنے ساتھ لے کر جانا ہے۔"

"تو تمہارا کیا خیال ہے اتنے بڑے انکشاف کے بعد تمہاری فیملی تمہیں معاف کر دے گی؟" انہوں نے استہزائیہ لہجے میں پوچھا تو وہ اک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"اگر انہوں نے مجھے معاف نہ بھی کیا تو بھی کم از کم میرا ضمیر تو مطمئن ہو جائے گا کہ میں نے مزید غلط بیانی کرتے ہوئے کسی کو کوئی دھوکا نہیں دیا اور پھر سب سے بڑی بات کہ میں اپنی بیٹی کو بنا کسی جھجک کے اپنے پاس رکھ سکوں گا۔ والدین کے سامنے نہ سہی' لیکن اپنی اولاد کے سامنے تو سرخرو ہو سکوں گا نا۔" وہ دھیمے لہجے میں گویا ہوا تو حیدر بے اختیار اس کی تائید میں سر ہلا گئے۔

"خدیجہ! ولید ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اسے اپنی نئی زندگی کی بنیاد سچ پہ رکھنی چاہیے۔"

"لیکن کیا آپ نے یہ سوچا ہے کہ اگر ان لوگوں نے دانیہ کو قبول نہ کیا تو اس ننھی سی جان کا کیا بنے گا؟" انہوں نے پلٹ کر شوہر کی جانب دیکھا تو ایک پل کے لیے وہ خاموش سے ہو گئے۔

"ولید! دانیہ تمہاری اولاد ہے۔ اور اس سے تمہاری محبت ایک فطری عمل ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس محبت کے باوجود نہ تو تم اس کی تنہا پرورش کر سکتے ہو اور نہ ہی ساری زندگی تنہا گزار سکتے

ہو۔ ایسے میں اگر کل کو تمہاری زندگی میں آنے والی عورت اسے قبول نہیں کرتی تو تم اسے اپنی بیٹی سے محبت کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ تم اس سے یہ ڈیمانڈ نہیں کر سکتے کہ وہ اپنے بچوں جیسا پیار و توجہ تمہاری پہلی بیٹی کو بھی دے۔ ایسے حالات میں دانیہ کی شخصیت پہ کیا اثر پڑے گا، تم نے اس بات پر بھی غور کرنے کی زحمت کی ہے؟" بولتے بولتے ان کا لہجہ تند ہو چلا تو ولید بے اختیار نظریں جھکا گیا۔

"تم اولاد کے سامنے سرخرو ہونے کی بات کر رہے ہو۔ لیکن یہ سرخروئی حاصل کرنا اتنا آسان نہیں ہے ولید۔ وہ بھی اس صورت میں جبکہ دانیہ کی اپنی ماں مر چکی ہے۔ اور جہاں تم اسے لے جانے کی بات کر رہے ہو۔ وہاں اسے پالنا تو دور شاید کوئی دیکھنے کا بھی روادار نہ ہو گا۔" اس کے جھکے چہرے پر نگاہیں جمائے وہ بنا کسی لگی لپٹی کے بہت سے تلخ حقائق اس کے سامنے رکھتی چلی گئیں۔ تو ولید جیسے ہار سا گیا۔ جبکہ حیدر بھی نا چاہتے ہوئے۔ ان پہلوؤں پہ غور کرنے پر مجبور ہو گئے۔

"تو پھر آپ ہی بتائیں میں کیا کروں؟" وہ صحیح معنوں میں خود کو مکمل طور پہ بے بس محسوس کر رہا تھا۔

"تم۔ تم دانیہ کو مجھے سونپ دو۔" ایک پل کی ہچکچاہٹ کے بعد وہ اس سے گویا ہوئیں تو ولید جیسے تڑپ اٹھا۔

"یہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں آپی؟" اسے اپنی آنکھیں یک لخت بھیگتی محسوس ہوئی تھیں۔

"میں جانتی ہوں کہ میری بات سے تمہیں بہت تکلیف پہنچی ہے۔ لیکن ولید میرے بھائی! یہ تکلیف اس اذیت سے بہت کم ہے، جو تم اپنی اولاد کی ہر نفی پہ محسوس کرو گے۔ اور جسے برداشت کرنا میرے لیے بھی کسی طور ممکن نہ ہو گا کہ دانیہ میری اس بہن کی آخری نشانی ہے، جو میرا کل خاندان تھی۔ اس کی ذات میری زندگی میں کیا معنی رکھتی تھی۔ یہ شاید کوئی نہیں جان سکتا۔ کوئی بھی نہیں....." وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔ تو حیدر نرمی سے ان کے گرد اپنا بازو پھیلا گئے۔

"مجھ۔ مجھے معاف کر دیں حیدر۔ میں نے اتنا بڑا فیصلہ آپ۔ آپ کی اجازت کے بغیر لے لیا۔" وہ آنسوؤں کے درمیان بولیں۔

"خدیجہ! اگر اسماء تمہیں بے تحاشا پیاری تھی۔ تو مجھے بھی کم عزیز نہ تھی۔ اس نسبت سے دانیہ کے لیے تم نے جو فیصلہ کیا ہے۔ مجھے اس پہ کوئی اعتراض نہیں۔" انہوں نے مضبوط لہجے میں انہیں اپنے ساتھ کا ایقان بخشتے ہوئے سامنے بیٹھے ولید کی جانب دیکھا۔ جو اپنے آنسوؤں پہ بامشکل بند باندھے بیٹھا تھا۔ ضبط کے مارے اس کا چہرہ سرخ اور لب سختی سے بھینچے ہوئے تھے۔

"ولید! زندگی میں بعض مقام ایسے بھی آتے ہیں۔ جب آپ کو اپنی ذات پہ بہت کچھ جھیلنا پڑ جاتا ہے۔ محض "اپنوں" کی بہتری اور بھلائی کے لیے۔ ایسے میں انسان کو وہ کچھ بھی کرنا پڑ جاتا ہے۔ جس کے بارے میں عام حالات میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ خدیجہ کا اپنے طور پہ کیا گیا۔ فیصلہ فی الوقت تمہیں بھی ایک ایسا ہی کڑوا گھونٹ لگ رہا ہو گا۔ جسے بھرنا تمہارے لیے بے حد اذیت ناک ہو گا۔ لیکن اگر تمہیں مجھ پہ ذرا سا بھی بھروسہ ہے تو یقین کرو کہ دانیہ کے لیے اس سے بہتر فیصلہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

دانیہ کی ہماری زندگی میں کیا اہمیت ہے یہ مجھے تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ شاید اللہ نے مجھے دو بیٹے اس ہی لیے دیے تھے۔ کہ میرے گھر میں بیٹی کی کمی دانیہ کے وجود نے پوری کرنی تھی باقی آگے جیسے تم مناسب سمجھو کہ بہرکیف آخری فیصلے کا اختیار تو تمہیں ہی حاصل ہے۔"

بے اختیار اس کی نظریں سامنے بیٹھے شخص کے باوقار، پرخلوص اور بے حد نرم چہرے پر آن ٹھہریں۔ جس کے وجود پہ اسے کسی روشن ستارے کا گمان ہو رہا تھا۔ کاش! کاش کہ اس کی ذات میں بھی اس درجہ مسیحائی کا ہنر ہوتا تو شاید آج وہ یوں خود کو اپنوں کا گناہ گار

محسوس نہ کر رہا ہوتا۔

"ٹھیک ہے مجھے آپ کا فیصلہ قبول ہے۔" بھرایا ہوا لہجہ اس کی شکستگی کا اعلان کر رہا تھا۔

"شاید مکافات عمل اسی کو کہتے ہیں۔ میں نے اپنے والدین کے اعتماد کو توڑا تھا۔ اور بدلے میں قدرت نے مجھے اولاد کے دکھ سے آشنا کر دیا۔ اب میں کبھی چاہ کر بھی اپنی اولاد کو اپنا نہ کہہ سکوں گا۔ اسے کبھی کھل کے پیار نہ کر سکوں گا۔ اور شاید یہیں میری سزا ہے۔" وقت رخصت اپنی لاڈلی کی پیشانی چومتے ہوئے اس نے آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو بڑی بے دردی سے صاف کرتے ہوئے سوچا تھا۔

اور پھر سب کچھ طے شدہ لائحہ عمل کے مطابق ہوتا چلا گیا۔ اپنے ماں باپ، بہن اور گھر والوں کی خوشی اس کے احساس جرم کو بہت حد تک کم کر گئی تھی۔ اپنی ذات پہ تکلیف جھیل کر وہ خود سے وابستہ افراد کی امیدوں پر کھرا اترا تھا۔ اس کے اطمینان قلب کو یہی بہت تھا۔ مگر شاید قدرت کو ابھی اس کا مزید امتحان مقصود تھا۔ جو بہن اس کی مہندی والے روز لاہور سے راولپنڈی آتے ہوئے حیدر بھائی اور خدیجہ آپی کی گاڑی کو وہ بھیانک حادثہ پیش آ گیا۔ جس نے نا صرف اس کی تمام تر کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ بلکہ لمحوں میں اسے کچھ اس طرح سے بے دست و پا کر ڈالا کہ اس کے پاس حالات کے سامنے سرنگوں ہونے کے سوا دوسرا کوئی راستہ نہ بچا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا زائرہ! کہ میرا بیٹا، میرا اپنا خون مجھے اتنا بڑا دھوکا دے جائے گا۔ اس نے نا صرف مجھے سب کے سامنے ذلیل و خوار کر کے رکھ دیا ہے۔ بلکہ میری برسوں کی قربانیوں، میری عزت، میرے مان بھروسے ہر چیز کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی ہیں۔ اس نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا زائرہ، کہیں کا نہیں۔" اپنے کمرے کی تنہائی میں عباس سکندر کی ہمت اور حوصلہ دونوں جواب دے گئے تھے۔

ویسے بھی دل کو لگنے والی ضرب اتنی کاری تھی کہ دکھ اور صدمہ کسی طور کم ہونے کا نام نہ لے رہے تھے۔ بلکہ انہیں تو اس بات پر بھی حیرت تھی کہ وہ یہ سب جھیل کیسے گئی تھیں؟ وہ لمحہ جب ولید نے گود میں اٹھائے اس چھوٹے سے وجود کو ان کے قدموں میں رکھتے ہوئے، بہتی آنکھوں اور جھکے سر کے ساتھ اپنے جرم کا اعتراف کیا تھا۔ ان کے وجود کو جیسے ہزاروں ٹکڑوں میں بکھیر گیا تھا۔ جس کے بعد سے اب تک وہ سانس بھی کیسے لے رہی تھیں۔ انہیں معلوم نہ تھا۔

"اس نے اتنا بڑا قدم اٹھانے سے پہلے ایک بار بھی ہمارے بارے میں سوچا۔ ہماری عزت، ہمارے اعتبار کو اپنی خواہشوں کی بھینٹ چڑھانے سے پہلے ایک مرتبہ بھی اس بات کا احساس کیا کہ ہم نے اسے اس قدر محبتوں سے کیا اس لیے پال پوس کر بڑا کیا تھا کہ وہ ہماری گردنوں میں رسوائی اور جگ ہنسائی کے طوق ڈال دے۔" انگاروں سی سرخ نگاہیں، ان کی برستی آنکھوں میں گاڑے انہوں نے تلخ لہجے میں استفسار کیا تو زائرہ بیگم کے آنسوؤں میں شدت آ گئی۔ جبکہ باہر کھڑے ولید میں مزید کسی سچائی کو سہنے کا یارا نہ رہا تو وہ بے قراری سے ادھ کھلے دروازے کو دھکیلتا اندر چلا آیا۔

اس پہ نظر پڑتے ہی عباس صاحب نفرت سے منہ پھیر گئے۔

"امی! بابا! میں آپ دونوں کا گناہ گار ہوں۔ آپ مجھے جتنا برا بھلا کہنا چاہیں کہہ لیں۔ جتنا مارنا چاہیں مار لیں مگر مجھ سے یوں منہ نہ موڑیں پلیز مجھ سے یوں منہ نہ موڑیں۔" ان کے سامنے دوزانو گرتا ہوا وہ سسک اٹھا تھا۔ مگر عباس صاحب اس پہ اک نگاہ غلط ڈالے بنا تیزی سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"زائرہ! اسے کہو یہاں سے چلا جائے۔" ان کے لہجے میں اس قدر ٹھنڈک تھی کہ بیٹے کی تڑپ میں کچھ کہنے کی خواہش میں، زائرہ بیگم کے لب محض کپکپا کر رہ گئے۔

"زائرہ!" ان کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے اب کے وہ عالم اشتعال میں دھاڑے تو زائرہ بیگم کا کلیجہ کانپ اٹھا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ ولید سے کچھ کہتیں اس نے آگے بڑھ کر یک لخت باپ کے پیروں کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

"پلیز بابا! پلیز مجھے معاف کردیں۔" اس کے آنسو عباس صاحب کے پیروں پر گر رہے تھے۔ اور زائرہ کو لگا تھا جیسے کسی نے ان کا دل مسل کر رکھ دیا ہو۔ خود کو بے بسی کی انتہاؤں پر محسوس کرتے ہوئے وہ بے اختیار دوپٹے میں منہ چھپا کر رو پڑی تھیں۔

"ولید! اس سے پہلے کہ میں باپ بیٹے کا یہ رشتہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے توڑ ڈالنے کی قسم اٹھالوں۔ تم یہاں سے چلے جاؤ۔" عباس سکندر کی سرد و سپاٹ آواز کمرے میں گونجی تو ایک لمحے کو وقت کی نبض جیسے تھم سی گئی۔

تڑپ کر اپنی بھیگی نگاہیں اٹھاتے ہوئے اس نے کسی بے کس و لاچار سوالی کی طرح باپ کے چہرے کی جانب دیکھا تھا۔ مگر وہاں چھائی چٹانوں سی سختی نے اسے نا چاہتے ہوئے بھی اٹھنے پر مجبور کردیا تھا۔

دھندلائی نظروں سے اپنی زار و قطار روتی ماں کو دیکھتا وہ اگلے ہی لمحے شکستگی کے عالم میں خود کو گھسیٹتا دروازے کی جانب بڑھ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

بارات کی مقرر کردہ تاریخ کا سورج اپنے ساتھ رونق اور خوشیوں کے بجائے 'آنسوؤں اور خاموشی کا راج لے کر آیا تھا۔ جس نے سبھی کی ناتمام حسرتوں کا غم سوا کردیا تھا۔ اس درجہ کہ کوئی چاہ کر بھی کسی کو تسلی و تشفی کا ایک لفظ نہ کہہ سکا تھا۔ دن نکلے کئی گھنٹے بیت چکے تھے۔ مگر اب تک گھر میں "زندگی" کے آثار نمودار نہ ہوسکے تھے۔

ہانیہ صبح سے کتنے ہی چکر ماما کے کمرے کے لگا چکی تھی۔ مگر ہر بار کی طرح اس مرتبہ بھی خود میں اندر جانے کی ہمت نہ پاتے ہوئے بالآخر تھک کر لاؤنج میں آبیٹھی تھی۔ جو آج بالکل خالی پڑا تھا۔

در و دیوار پہ چھائی اس سوگوار سی ویرانی نے اسے چند ہی لمحوں میں گھبراہٹ میں مبتلا کردیا۔ تو وہ کچھ سوچتی ہوئی اٹھ کر کچن کی جانب چلی آئی۔ جہاں ماسی زینت اپنی بیٹی کے ساتھ ایک کونے میں بیٹھی کھسر پھسر میں مصروف تھی۔ چہرے اور آنکھوں کے تاثرات سے موضوع گفتگو کا اندازہ لگانا قطعاً "مشکل نہ تھا۔ مگر وہ انہیں مکمل طور پہ نظر انداز کرتی چلتی ہوئی کچن کے وسط میں آکھڑی ہوئی تھی۔ اسے اندر داخل ہوتا دیکھ کر جہاں دونوں کی زبانوں کو بریک لگا تھا۔ وہیں وہ تیزی سے اٹھ کھڑی بھی ہوئی تھیں۔

"ماسی! یہ ابھی تک ناشتا کیوں نہیں تیار ہوا؟" ناقدانہ نظروں سے ارد گرد کا جائزہ لیتے ہوئے اس سے تیکھے لہجے میں پوچھا تو ماسی زینت گھبرا سی گئی۔

"وہ کسی نے کہا ہی نہیں تو میں سمجھی کہ۔۔۔۔"

ہانیہ کی پیشانی پر ابھرتی شکنیں اسے گڑبڑا کر خاموش کرواگئیں۔

"روزانہ آپ کو ناشتے کے لیے کہنا پڑتا ہے کیا؟" اس نے کڑی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے استفسار کیا تو شرمندہ سی زینت بی بی نظریں جھکا گئی۔

"چلیں ادھر آئیں اور آکر ناشتے کی تیاری کریں۔ اور پلیز آئندہ ہر کام وقت پہ ہونا چاہیے۔" اس نے قدرے سخت لہجے میں انہیں باور کروایا تو دونوں ماں بیٹی اثبات میں سر ہلاتی تیزی سے کاؤنٹر کی جانب چلی آئیں۔

انہیں چند ایک ہدایات دیتی وہ بی جان کے لیے فریش جوس لیے ان کے کمرے کی جانب چلی آئی۔

ہلکی سی دستک دیتے ہوئے وہ دائیں ہاتھ سے دروازہ کھولتی اندر داخل ہوئی تو نظریں سیدھی بیڈ پہ ٹیک لگائے بیٹھے کمزور سے وجود کے جھریوں زدہ چہرے سے جا ٹکرائیں۔ جہاں پھیلی یاسیت اور نمی ایک پل کے لیے ہانیہ کا دل بری طرح سے دکھا گئی۔

بے اختیار اک بوجھل سانس فضا کے سپرد کرتی وہ

آہستگی سے دروازہ بند کرتی ہوئی بیڈ کی جانب چلی آئی جہاں بیٹھی دونوں خواتین نجانے کن سوچوں میں گم تھیں کہ انہیں اس کی آمد کا احساس ہی نہ ہوسکا تھا۔

"السلام علیکم!" اس کے آہستگی سے سلام کرنے پہ اپنے دھیان میں بیٹھی راضیہ نے چونک کر نظریں اٹھائی تھیں۔

"وعلیکم السلام۔ تم کب آئیں؟" وہ خالی نگاہوں سے بیٹی کی جانب دیکھتے ہوئے بولیں تو بی جان بھی اک گہری سانس لیتے ہوئے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں خشک کرنے لگیں۔

"ابھی آئی ہوں۔" اس نے ہاتھ میں پکڑی ٹرے سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بی جان کے قریب بیٹھ کر نرمی سے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"پلیز بی جان خود کو سنبھالیں۔ ہم سب کو آپ کی بہت ضرورت ہے۔" فرط جذبات سے یک لخت اس کی آواز بھرا گئی تو راضیہ کی آنکھیں بھی بے اختیار چھلک اٹھیں۔

"کیسے سنبھالوں بیٹا۔ میری ماہا کی زندگی تباہ ہوگئی۔ میری بچی کی خوشیاں لٹ گئیں۔ میں خود کو کیسے سنبھالوں۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں تو ہانیہ ان کے گلے سے لگ گئی۔

"یوں نہ کہیں بی جان۔ یوں نہ کہیں۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔" آنسو تیزی سے اس کا اپنا چہرہ بھی بھگونے لگے تھے۔

"اس قیامت کے بعد اب کچھ ٹھیک نہیں ہونے والا۔" وہ آنسوؤں کے درمیان بولیں تو راضیہ کا دل جیسے کانپ اٹھا۔

"خدا کے لیے بی جان ایسے تو نہ کہیں۔" ان کا ہاتھ بے اختیاری کے عالم میں ماں کے بازوؤں پہ آن ٹھہرا تھا۔

"ولید کے ایک غلط قدم نے صرف باپ دادا کی عزت اور نیک نامی کو ہی نہیں بلکہ رشتے ناتوں کو بھی داؤ پر لگا دیا ہے۔ یہ گھر جو تمہارے آغا جی نے بہت پیار سے اپنی اولاد اور آنے والی نسلوں کے لیے بنوایا تھا۔ اب مجھے واضح طور پہ بکھرتا نظر آرہا ہے۔ اور میری بے بسی دیکھو کہ میں چاہ کر بھی اپنے بچوں اور اپنے اس گھر کے لیے کچھ نہیں کرسکتی۔" درد شفاف قطروں کی صورت ایک بار پھر ان کے چہرے پر بہنے لگا تو اذیت کی ایک تیز لہر راضیہ کو سرتاپا بھگو گئی۔ اپنے عزیز از جان بھائیوں کے درمیان پڑنے والی دراڑ کا احساس' آن واحد میں ان کے جسم سے جیسے سارا خون نچوڑ لے گیا تھا۔

"کیوں نہیں کرسکتیں بی جان! آپ ہم سب کی بڑی ہیں۔ میں مانتی ہوں کہ یہ معاملہ معمولی نوعیت کا نہیں۔ لیکن بہرکیف کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے۔ ویسے بھی اگر آپ بڑے یوں ہمت ہار جائیں گے تو ماہا کے بارے میں سوچیں' اس کا کیا بنے گا؟ اسے کون حوصلہ دے گا؟" بی جان کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے ہانیہ نے ان کی ہمت بندھانے کے ساتھ ساتھ رسان سے ان پہ سوچ کے نئے در وا کیے تو راضیہ بھی تائید میں سر ہلاتے ہوئے بولیں۔

"ہانیہ ٹھیک کہہ رہی ہے بی جان' یہ ہمارے بچوں کی زندگی کے ساتھ ساتھ ہمارے گھر' ہمارے رشتوں کا معاملہ ہے۔ اور عقلمندی کا تقاضا یہی ہے کہ اسے جتنی جلدی ہوسکے سلجھا لیا جائے۔"

"یہ معاملہ اب اتنی آسانی سے سلجھنے والا نہیں ہے۔ راضیہ۔ تم کیوں بھول رہی ہو کہ بات اب صرف ولید کے چوری چھپے نکاح کرنے یا ماہا کے ساتھ اس کی شادی تک محدود نہیں رہی۔ بات ہے اس بچی کی جو ولید کی اولاد ہے۔ اور جسے قبول کرنا شاید ہم میں سے کسی کے لیے بھی آسان نہیں۔" دانیہ کے ذکر پر نصرت بیگم کے چہرے اور لہجے میں تنفر سا در آیا تو ہانیہ اپنی بے حد محبت کرنے والی شفیق سی نانی کا یہ تلخ روپ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ جو اپنے پرائے سبھی کے لیے بے حد نرم دل رکھتی تھیں۔ مگر آج محض ایک چند ماہ کی بچی کے لیے اپنے دل اور ظرف کو وسیع کرنے سے قاصر تھیں۔

"ماما کہہ رہی ہے اسے بھوک نہیں۔" ماہین اور رجاء آگے پیچھے چلتی ڈائننگ روم میں داخل ہوئیں۔ تو وہاں موجود سبھی افراد کے چہروں پر یاست کے رنگ مزید گہرے ہو گئے۔

وہ تینوں راضیہ بیگم کے کہنے پہ ماہا کے لیے کمرے میں ناشتا لے کر گئی تھیں۔ مگر باوجود اصرار کے اس نے بنا دروازہ کھولے انہیں منع کر دیا تھا۔ مجبوراً انہیں بھری ہوئی ٹرے کے ساتھ واپس آنا پڑا تھا۔

"تو تم لوگ کم از کم اسے یہ جوس ہی پلا دیتے۔" راضیہ نے بوجھل لہجے میں کہا۔ ہانیہ نے ہاتھ میں پکڑی ٹرے آہستگی سے ٹیبل پر رکھ دی۔

"امی اس نے دروازہ ہی نہیں کھولا۔" اس نے آزردگی سے انہیں مطلع کیا تو ایک لمحے کو سب چپ سے ہو گئے۔ مگر اگلے ہی پل رابعہ بیگم دونوں ہاتھوں میں سر گرائے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔ تو بی جان سمیت سبھی خواتین کے لیے اپنے آنسوؤں پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ جبکہ عمر سکندر کی آنکھیں اور چہرہ شدت ضبط کے باعث سرخ ہو چلے تھے۔

"پلیز بھابھی حوصلے سے کام لیں۔" راضیہ اٹھ کر ان کی پشت سہلاتے ہوئے آنسوؤں کے درمیان بولیں تو ماہین کے لیے مزید وہاں کھڑے رہنا دشوار ہو گیا۔ تیزی سے پلٹتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

"کہاں سے لاؤں حوصلہ؟ میری بچی کی زندگی تباہ ہو گئی۔ اس کی خوشیاں لٹ گئیں۔ اور تم کہتی ہو کہ حوصلہ کروں؟" وہ جیسے چیخ سی گئی تھیں۔ اس درد کو مزید سہنا ان کی برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔

"آپ ہی بتائیں بی جان! آخر میں اپنی بچی کی بربادی کا ذمے دار کس کو ٹھہراؤں؟ کس کا گریبان پکڑ کر اس کی آئندہ زندگی کا سوال اٹھاؤں؟" تڑپ تڑپ کر روتے ہوئے انہوں نے تلخ لہجے میں بی جان سے سوال کیا تو نصرت بیگم کے خاموش آنسوؤں میں مزید شدت آ گئی۔ وہ انہیں بھلا کیا جواب دے سکتی تھیں۔ وہ تو خود اس پل مکمل بے بسی کی تصویر تھیں۔

"میں تم لوگوں کے آگے جوابدہ ہوں رابعہ! تم میرا گریبان پکڑو۔ مجھے کوسو کہ میں اس بدبخت کا باپ ہوں جو تمہارا مجرم ہے۔" یک لخت عباس سکندر نے اٹھ کر بھائی بھاوج کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تو روتی ہوئی زائرہ بیگم نے سختی سے آنکھیں میچ لیں۔ جبکہ زار و قطار آنسو بہاتی رجا کا دل چاہا کہ وہ جا کر اپنے بے حس بھائی کا خاتمہ کر ڈالے۔ جس کی بدولت آج اس کے باپ کو اس درجہ ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

"میں تمہارا گناہ گار ہوں عمر! یہ سب میرے غلط فیصلے کا نتیجہ ہے جو آج تم سب کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ میں کھرے اور کھوٹے کی پہچان نہ کر سکا۔ تم مجھے معاف کر دو۔ میرے بھائی۔ مجھے معاف کر دو!" وہ بہتی آنکھوں کے ساتھ ان کے سامنے جھکنے لگے۔ تو عمر سکندر تڑپ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"خدا کے واسطے بھائی جان! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" بجلی کی سی تیزی سے ان کے ہاتھوں نے اپنے باپ جیسے بھائی کے جھکتے شانوں کو تھاما تھا۔

"مجھے آپ سے یا ماہا بھی سے کوئی گلہ کوئی شکایت نہیں!" رندھی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے انہوں نے اگلے ہی پل بھائی کو سینے سے لگایا تو ان دونوں کے ساتھ ساتھ باقی سب کے آنسوؤں میں بھی تیزی آ گئی۔

☼ ☼ ☼

دروازے پہ ہوتی دستک نے مسلسل حرکت کرتی راکنگ چیئر کو ایک پل کے لیے ساکت کیا تھا۔ مگر اس سے پیشتر کہ وہ دستک کی اس آواز کو پہلے کی طرح نظر انداز کر دیتی۔ دوسری جانب سے ابھرنے والی عمر سکندر کی پیار بھری پکار نے اس کی آنکھوں کو نئے سرے سے جلنے پر مجبور کر دیا تھا۔

ناچاہتے ہوئے بھی اسے اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھنا پڑا تھا۔

"مجھے پتا تھا میری بیٹی میرا کہا نہیں ٹالے گی۔"

دروازے کے وا ہوتے ہی عمر صاحب کی نظریں اپنی لاڈلی کی سرخ متورم آنکھوں سے ہوتی ہوئی اس کے بکھرے ہوئے وجود سے جا ٹکرائی تھیں۔

وہ اسے ساتھ لگائے کاؤچ پر آ بیٹھے۔

"حوصلہ میری جان، حوصلہ!" اس کی پشت سہلاتے ہوئے ان کے اپنے ہاتھ اور آواز کپکپا گئی تھی۔

"میں جانتا ہوں بیٹا تمہارا نقصان بہت بڑا اور زیاں بے حد ہے لیکن اتنے دکھ اور درد کے باوجود تم خود کو سنبھالے بیٹھی ہو۔ یہ بہت بڑی بات ہے تمہارے اس درجہ حوصلے اور ہمت پر مجھے ناز ہے میری جان۔" انہوں نے جھک کر ایک بار پھر اپنے آنسو صاف کیے۔

اگلے ہی لمحے وہ اپنی سسکیاں دبائے آہستگی سے باپ سے علیحدہ ہو گئی تو عمر صاحب بے اختیار اس کا ہاتھ تھام گئے۔

"میری بچی میں تم سے بہت شرمندہ ہوں کہ تمہارے لیے صحیح فیصلہ نہ کر سکا میرے غلط انتخاب نے تمہاری خوشیوں کو داؤ پر لگا دیا مجھے معاف کر دو بیٹا۔" ماہا جیسے تڑپ اٹھی۔

"فار گاڈ سیک پاپا! ایسے نہ کہیں۔ اس میں آپ کا یا کسی اور کا کوئی قصور نہیں۔"

"کیسے قصور نہیں؟ اس دھوکے باز کے ساتھ تمہارا رشتہ ہم سب نے طے کیا تھا۔ یہ ہم تھے جو اپنے ہی خون کو پہچان نہ سکے اور نتیجہ تمہیں بھگتنا پڑ گیا۔" جھنجلاہٹ کے باعث ان کی آواز یک لخت تیز اور لہجہ تلخ ہو چلا تو ماہا اک بوجھل سانس لیتی سر جھکا گئی۔

"واقعی! پہچاننے میں تو بہت بڑی غلطی ہوئی ہے ولید عباس۔ لیکن تمہیں نہیں بلکہ تمہاری آنکھوں کو۔ جن میں میرے لیے تو کبھی بھی کوئی جذبہ نہ تھا۔" اپنے ہاتھوں پہ نگاہیں جمائے اس نے آزردگی سے سوچا تھا۔

"بہت اچھا ہوا جو اس مکار شخص کا دھوکا اور فریب پہلے ہی سامنے آ گیا۔ کم از کم میری بچی تو برباد ہونے سے بچ گئی۔" وہ خود کلامی کے سے انداز میں گویا ہوئے تو

اپنے باپ کی اس درجہ سادگی پر اس کے لبوں پہ تلخ مسکراہٹ اور آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

"مجھے یہاں سے لے چلیں پاپا۔ پلیز مجھے یہاں سے لے چلیں!" روتے ہوئے وہ ایک ہی جملے کی گردان کیے گئی تو بے اختیار عمر سکندر اثبات میں سر ہلا گئے۔

"لے چلوں گا بیٹا لے چلوں گا۔" اس کے سر کو سہلاتے ہوئے ان کے لہجے میں صدیوں کی تھکن در آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

دانش کے ذریعے جب ماہا کی ضد ولید تک پہنچی تو کتنی ہی دیر وہ ساکت سا بیٹھا رہ گیا۔ مگر جونہی دماغ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا وہ اپنی خود ساختہ گوشہ نشینی ترک کرتا اٹھ کر بی جان کے کمرے کی جانب چلا آیا جہاں اس وقت گھر کے سبھی بڑے موجود تھے۔

"السلام علیکم!" کمرے کی سرد خاموشی میں اس کی آواز نے ارتعاش برپا کیا تو سوائے ایک سمیعہ چچی کے اور کسی نے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

"میں جانتا ہوں۔ آپ سب میں سے کوئی میری شکل دیکھنے کا روادار نہیں۔ نہ ہی کسی کو میری بات پہ بھروسہ رہا ہے۔ لیکن یہ سچ ہے کہ میرے نزدیک آپ کا رد عمل بالکل درست اور جائز ہے۔ آپ سب کو اس بات کا پورا پورا حق ہے کہ آپ مجھ سے منہ موڑ لیں۔ کیونکہ میں نے آپ سب کا نا صرف مان توڑا ہے بلکہ آپ کے حوصلوں اور محبتوں کا بھی بہت کڑا امتحان لیا ہے۔" ایک نظر سب کے چہروں کو دیکھنے کے بعد اس نے آہستگی سے نگاہیں جھکا لی تھیں۔

"مجھ جیسے خود غرض انسان کا' جو ایک محبت پانے کے لیے 'اپنی زندگی میں موجود تمام محبتوں کو داؤ پر لگا دے' یہی انجام ہونا چاہیے کہ اس سے نا صرف ان بے شمار محبتوں کا بیش بہا خزانہ چھین لیا جائے بلکہ اس ایک محبت سے بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا جائے۔ جس کی خاطر اس نے اپنا ہر فرض بھلا دیا ہو۔" دھیمے لہجے میں کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا سی گئی تو وہ

ایک لمحے کو چپ کر گیا۔

کمرے میں چھائی خاموشی تا حال برقرار تھی۔ جسے توڑنے کی کسی نے بھی کوشش نہ کی تھی۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ میں آپ سب کا مجرم ہوں۔ لیکن جس ان دیکھے وجود سے آپ سب بے تحاشا نفرت محسوس کر رہے ہیں۔ اسے اس دنیا سے گئے چار ماہ ہو گئے ہیں۔" اس کے انکشاف پہ سوائے سمیعہ چچی کے سب کی نظریں بے اختیار ولید کی جانب اٹھی تھیں۔ جو چہرہ جھکائے چند لمحوں کے لیے خاموشی اختیار کر گیا تھا۔

"اسماء کی اچانک موت ہی میری کراچی سے واپسی کا سبب بنی تھی۔ کیونکہ اس حادثے کے بعد مجھ میں مزید کسی رشتے کو کھونے کا حوصلہ نہ رہا تھا۔ میں آپ سب......"

"کس کھونے کی بات کر رہے ہو۔ برخوردار؟" عباس صاحب اچانک اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں گویا ہوئے۔

"یہ کام تو اس ہی روز بلکہ شاید اس ہی لمحے ہو گیا تھا جب تمہاری نیت بدلی تھی۔ اور تم نے اپنے ماں باپ کو مردہ مان کر اس لڑکی سے چھپ کر نکاح پڑھوایا تھا۔" الفاظ تھے یا تیز دھار چاقو! ولید کو لگا تھا جیسے کسی نے اسے اندر تک ادھیڑ کر رکھ دیا ہو۔

"پلیز بابا ایسے نہ کہیں!" وہ بے اختیار تڑپ اٹھا۔

"میں مانتا ہوں کہ میں نے آپ سب سے بد دیانتی برتی ہے۔ لیکن اللہ گواہ ہے کہ اسماء سے یوں شادی کے بارے میں، میں نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ بلکہ میں تو خاص طور پہ اس کے بارے میں آپ دونوں سے بات کرنے کے لیے کتنی ہی بار کراچی سے یہاں تک آیا تھا۔ مگر اسے میری کم ہمتی کہیں یا بدنصیبی کہ میں چاہ کر بھی آپ لوگوں کو کچھ نہ بتا سکا۔ اور حالات اچانک اس نہج پہ آپہنچے جہاں میرے پاس اس راستے کے سوا دوسرا کوئی راستہ نہ بچا تھا۔" سب کے سامنے اپنے نکاح کا اعتراف ایک پل کو ہی سہی لیکن اس کی زبان لڑکھڑا گیا تھا۔ اور پل بھر کی یہ لڑکھڑاہٹ عباس صاحب کے لبوں پہ اک تمسخرانہ مسکراہٹ بکھیر گئی۔

"جس کام کو کرتے ہوئے شرم نہ آئی برخوردار، اس کے ذکر پہ کیوں جھجک محسوس ہو رہی ہے۔" اور ولید گویا کٹ کر رہ گیا۔ جبکہ عباس صاحب سب کی موجودگی سے بے نیاز اپنے سابقہ انداز میں گویا ہوئے۔

"اور تم نے کیا سوچا تھا کہ تم ہمیں اس لڑکی کے بارے میں بتاؤ گے۔ اور ہم تمہارے ساتھ چل پڑیں گے؟" انہوں نے شعلہ بار نگاہوں سے بیٹے کے خفیف چہرے کی جانب دیکھا۔

"نہیں ولید صاحب! یہ آپ کی غلط فہمی تھی۔ کیونکہ اگر آپ مجھ سے اس لڑکی کا ذکر بھی کرتے تو میں آپ کی زبان گدی سے کھینچ لیتا۔" ان کے لہجے کی ٹھنڈ نے ولید کے ساتھ ساتھ بی جان اور زاہدہ بیگم کو بھی منجمد کر دیا۔

وہ سب عباس سکندر کی اصول پسند شخصیت سے بخوبی واقف تھے۔ اس لیے اچھی طرح سے جانتے تھے کہ اس درجہ سخت الفاظ سے ان کی کیا مراد تھی۔ وہ ولید کو اس کی غلطی کی سزا دینے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتے تھے۔

"مجھے نہیں یاد پڑتا کہ میں نے کبھی کسی معاملے میں تم پہ اپنی مرضی یا اپنے فیصلے مسلط کیے ہوں۔ تم نے بزنس کی پڑھائی کے بجائے آرکیٹیکچر کی تعلیم حاصل کرنا چاہی۔ میں نے تمہیں نہیں روکا۔ تم نے فیملی بزنس کو جوائن کرنے کے بجائے جاب کرنا چاہی میں نے تب بھی تمہیں کچھ نہیں کہا حتیٰ کہ اپنی خواہش کے باوجود میں نے بابا سے تمہارا رشتہ اس ہی صورت میں طے کیا تھا جب تم نے ہامی بھری تھی۔ پھر تم نے میرے ساتھ یہ سب کیوں کیا ولید؟ کیوں؟" دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے وہ اس کے مقابل آکھڑے ہوئے تو ان کی آنکھوں میں نمی کے ساتھ ہلکورے لیتا شکوہ ولید کو زمین میں گاڑ گیا۔

واقعی اس نے یہ سب کیوں کیا؟ وہ جانتا تو تھا کہ وہ ماہا سے منسوب ہے۔ اس کی محبت، وفا ہر جذبے پہ صرف

ماہا کا حق ہے۔ پھر اس نے کیا سوچ کر اس کی حق تلفی کی؟ کیوں اپنے ماں باپ کے اعتبار کو توڑا؟

اپنے ہی عمل کی وضاحت کبھی خود کو دینی اس قدر مشکل ہو جائے گی، ولید نے سوچا نہ تھا۔

"پلیز بابا مجھے معاف کر دیں۔" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ آہستگی سے گویا ہوا تو عباس سکندر کھول اٹھے۔

"معاف کر دوں...؟ تمہاری وجہ سے آج میرا گھر، میرے رشتے بکھرنے کے درپے ہیں اور تم کہتے ہو کہ میں تمہیں معاف کر دوں!" انہوں نے پلٹ کر رابعہ اور عمر کی طرف اشارہ کیا تو ولید تڑپ کر ایک قدم آگے بڑھ آیا۔

"بابا میں آپ کا گھر، آپ کے رشتے کچھ بھی بکھرنے نہیں دوں گا۔ میں... میں سب کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگ لوں گا۔ بس آپ ایک بار، ایک بار مجھے معاف کر دیں۔" ان کا ہاتھ تھامے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا تو بی جان اور زاہدہ بیگم سمیت سمیعہ اور رابعہ بھی رو پڑیں۔ جبکہ رابعہ بیگم نفرت سے ہنکارا بھرتی رخ پھیر کر شوہر کی جانب دیکھنے لگیں۔ جن کے چہرے پر بھی عجیب سرد سے تاثرات رقم تھے۔

"بات میرے معاف کرنے کی نہیں ہے ولید۔ بات ہے ماہا کی۔ جو اب کسی طور یہاں نہیں رہنا چاہتی۔" ان کی آواز آزردگی میں ڈھل کر یک لخت دھیمی ہو چلی تھی۔

"میں اپنے کیے ہر جرم کی معافی مانگوں گا ماہا سے۔ میں، میں اسے سمجھاؤں گا۔" ولید آنسوؤں کے درمیان بے قراری سے بولا تھا۔

"کس حیثیت سے؟" عمر سکندر کی اچانک ابھرنے والی کرخت آواز نے ایک پل کے لیے سبھی کو ساکت کر دیا تھا۔

بے اختیار سب کی نگاہیں ان کی جانب اٹھی تھیں جو غصے سے سرخ چہرہ لیے اسے خشمگیں نگاہوں سے گھور رہے تھے۔

"میں اگر اس سارے تماشے میں اب تک خاموش رہا ہوں تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ مجھے تم سے یا تمہاری کہانی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ تم ہمارے لیے اس ہی روز مر گئے تھے۔ جس روز تم نے اس گھر میں اپنی بیٹی کے ساتھ قدم رکھا تھا۔ لہٰذا اب تمہارا مجھ سے یا میری فیملی سے کوئی تعلق نہیں...... میں تمہاری گھٹیا اور ناپاک زبان سے دوبارہ کبھی ماہا کا ذکر تو دور اس کا نام بھی نہیں سننا چاہوں گا۔ سمجھے!" وارننگ کے سے انداز میں انگلی اٹھا کر وہ بلند آواز سے گرجے تو چند سیکنڈ کے لیے تمام حاضرین محفل کو سانپ سونگھ گیا۔

"سمجھ گیا۔ لیکن آپ یہ تو سوچیں کہ یہ اس کی زندگی کا سوال ہے۔" کتنی ہی دیر ان کے سرخ چہرے کو نم آنکھوں سے تکنے کے بعد وہ ملتجیانہ انداز میں بولا۔

"ہونہہ! اس کی زندگی اور موت کی تمہیں کب سے فکر ہونے لگی؟" ان کا کاٹ دار لہجہ ایک پل کے لیے ولید کو خاموش کروا گیا۔ مگر اگلے پل وہ اپنی تمام تر ہمت مجتمع کرتے ہوئے آہستگی سے بولا۔

"کیونکہ۔ کیونکہ وہ مجھے چاہتی ہے۔" اور سب کو لگا تھا کہ اب اسے عمر سکندر کے احتساب سے کوئی نہ بچا سکے گا۔ مگر سب کی سوچ کے برعکس عمر صاحب کا رد عمل بہت پرسکون تھا۔

"اور تم اس کے جذبات کو ذریعہ بنا کر اسے اموشنلی بلیک میل کرنے کا ارادہ رکھتے ہو۔" سینے پہ بازو باندھے وہ طنزیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولے تو ولید اس الزام پہ تڑپ اٹھا۔

"آپ۔ آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں چاچو! میں سچے دل سے اپنی غلطیوں کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔ میری بے جا خاموشی اور بزدلی کی وجہ سے وہ پہلے ہی بہت کچھ سہہ چکی ہے۔ اس لیے اب میں نہیں چاہتا کہ وہ کسی لمحاتی فیصلے کی رو میں آکر اپنے لیے نئی مشکلات کھڑی کرے۔" اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنی بات ان سب کو کن الفاظ میں سمجھائے۔

ایک لمحے کو چپ کر گیا۔

کمرے میں چھائی خاموشی تاحال برقرار تھی۔ جسے توڑنے کی کسی نے بھی کوشش نہ کی تھی۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ میں آپ سب کا مجرم ہوں۔ لیکن جس ان دیکھے وجود سے آپ سب بے تحاشا نفرت محسوس کر رہے ہیں۔ اسے اس دنیا سے گئے چار ماہ ہو گئے ہیں۔" اس کے انکشاف پہ سوائے سمیعہ چچی کے سب کی نظریں بے اختیار ولید کی جانب اٹھی تھیں۔ جو چہرہ جھکائے چند لمحوں کے لیے خاموشی اختیار کر گیا تھا۔

"اسماء کی اچانک موت ہی میری کراچی سے واپسی کا سبب بنی تھی۔ کیونکہ اس حادثے کے بعد مجھ میں مزید کسی رشتے کو کھونے کا حوصلہ نہ رہا تھا۔ میں آپ سب......"

"کس کھونے کی بات کر رہے ہو۔ برخوردار؟" عباس صاحب اچانک اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں گویا ہوئے۔

"یہ کام تو اس ہی روز بلکہ شاید اس ہی لمحے ہو گیا تھا جب تمہاری نیت بدلی تھی۔ اور تم نے اپنے ماں باپ کو مردہ مان کر اس لڑکی سے چھپ کر نکاح پڑھوایا تھا۔" الفاظ تھے یا تیز دھار چاقو۔ ولید کو لگا تھا جیسے کسی نے اسے اندر تک ادھیڑ کر رکھ دیا ہو۔

"پلیز بابا ایسے نہ کہیں!" وہ بے اختیار تڑپ اٹھا۔

"میں مانتا ہوں کہ میں نے آپ سب سے بددیانتی برتی ہے۔ لیکن اللہ گواہ ہے کہ اسماء سے یوں شادی کے بارے میں میں نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ بلکہ میں تو خاص طور پہ اس کے بارے میں آپ دونوں سے بات کرنے کے لیے کتنی ہی بار کراچی سے یہاں تک آیا تھا۔ مگر اسے میری کم ہمتی کہیں یا بدنصیبی کہ میں چاہ کر بھی آپ لوگوں کو کچھ نہ بتا سکا۔ اور حالات اچانک اس نہج پہ آ پہنچے جہاں میرے پاس اس راستے کے سوا دوسرا کوئی راستہ نہ بچا تھا۔" سب کے سامنے اپنے نکاح کا اعتراف ایک پل کو ہی سہی لیکن اس کی زبان لڑکھڑا گیا تھا۔ اور پل بھر کی یہ لڑکھڑاہٹ

عباس صاحب کے لبوں پہ اک تمسخرانہ مسکراہٹ بکھیر گئی۔

"جس کام کو کرتے ہوئے شرم نہ آئی برخوردار' اس کے ذکر پہ کیوں جھجک محسوس ہو رہی ہے۔" اور ولید گویا کٹ کر رہ گیا۔ جبکہ عباس صاحب سب کی موجودگی سے بے نیاز اپنے سابقہ انداز میں گویا ہوئے۔

"اور تم نے کیا سوچا تھا کہ تم ہمیں اس لڑکی کے بارے میں بتاؤ گے۔ اور ہم تمہارے ساتھ چل پڑیں گے؟" انہوں نے شعلہ بار نگاہوں سے بیٹے کے خفیف چہرے کی جانب دیکھا۔

"نہیں ولید صاحب! یہ آپ کی غلط فہمی تھی۔ کیونکہ اگر آپ مجھ سے اس لڑکی کا ذکر بھی کرتے تو میں آپ کی زبان گدی سے کھینچ لیتا۔" ان کے لہجے کی ٹھنڈک نے ولید کے ساتھ ساتھ بی جان اور زارا بیگم کو بھی منجمد کر دیا۔

وہ سب عباس سکندر کی اصول پسند شخصیت سے بخوبی واقف تھے۔ اس لیے اچھی طرح سے جانتے تھے کہ اس درجہ سخت الفاظ سے ان کی کیا مراد تھی۔ وہ ولید کو اس کی غلطی کی سزا دینے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتے تھے۔

"مجھے نہیں یاد پڑتا کہ میں نے کبھی کسی معاملے میں تم پہ اپنی مرضی یا اپنے فیصلے مسلط کیے ہوں۔ تم نے بزنس کی پڑھائی کے بجائے آرکیٹیکچر کی تعلیم حاصل کرنا چاہی۔ میں نے تمہیں نہیں روکا۔ تم نے فیملی بزنس کو جوائن کرنے کے بجائے جاب کرنا چاہی میں نے تب بھی تمہیں کچھ نہیں کہا حتیٰ کہ اپنی خواہش کے باوجود میں نے ماہا سے تمہارا رشتہ اس ہی صورت میں طے کیا تھا جب تم نے ہامی بھری تھی۔ پھر تم نے میرے ساتھ یہ سب کیوں کیا ولید؟ کیوں؟" دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے وہ اس کے مقابل آ کھڑے ہوئے تو ان کی آنکھوں میں نمی کے ساتھ ہلکورے لیتا شکوہ ولید کو زمین میں گاڑ گیا۔

واقعی اس نے یہ سب کیوں کیا؟ وہ جانتا تو تھا کہ وہ ماہا سے منسوب ہے۔ اس کی محبت' وفا ہر جذبے پہ صرف

ماہا کا حق ہے۔ پھر اس نے کیا سوچ کر اس کی حق تلفی کی؟ کیوں اپنے ماں باپ کے اعتبار کو توڑا؟

اپنے ہی عمل کی وضاحت کبھی خود کو دینی اس قدر مشکل ہو جائے گی ولید نے سوچا نہ تھا۔

"پلیز بابا مجھے معاف کر دیں۔" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ آہستگی سے گویا ہوا تو عباس سکندر کھول اٹھے۔

"معاف کر دوں...؟ تمہاری وجہ سے آج میرا گھر' میرے رشتے بکھرنے کے در پے ہیں اور تم کہتے ہو کہ میں تمہیں معاف کر دوں!" انہوں نے پلٹ کر رابعہ اور عمر کی طرف اشارہ کیا تو ولید تڑپ کر ایک قدم آگے بڑھ آیا۔

"بابا میں آپ کا گھر' آپ کے رشتے کچھ بھی بکھرنے نہیں دوں گا۔ میں۔ میں سب کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگ لوں گا۔ بس آپ ایک بار' ایک بار مجھے معاف کر دیں۔" ان کا ہاتھ تھامے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا تو بی جان اور زارا بیگم سمیت سمیعہ اور رابعہ بھی رو پڑیں۔ جبکہ رابعہ بیگم نفرت سے بیگانہ ابھرتی اس نئی تصویر کو شوہر کی جانب دیکھنے لگیں۔ جن کے چہرے پر بھی عجیب سرد سے تاثرات رقم تھے۔

"بات میرے معاف کرنے کی نہیں ہے ولید۔ بات ہے ماہا کی۔ جو اب کسی طور یہاں نہیں رہنا چاہتی۔" ان کی آواز آزردگی میں ڈھل کر یک لخت دھیمی ہو چلی تھی۔

"میں اپنے کیے ہر جرم کی معافی مانگوں گا ماہا سے۔ میں میں اسے سمجھاؤں گا۔" ولید آنسوؤں کے درمیان بے قراری سے بولا تھا۔

"کس حیثیت سے؟" عمر سکندر کی اچانک ابھرنے والی کرخت آواز نے ایک پل کے لیے سبھی کو ساکت کر دیا تھا۔

بے اختیار سب کی نگاہیں ان کی جانب اٹھی تھیں جو غصے سے سرخ چہرہ لیے اسے خشمگیں نگاہوں سے گھور رہے تھے۔

"میں اگر اس سارے تماشے میں اب تک خاموش رہا ہوں تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ مجھے تم سے یا تمہاری کہانی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ تم ہمارے لیے اس ہی روز مر گئے تھے۔ جس روز تم نے اس گھر میں اپنی بیٹی کے ساتھ قدم رکھا تھا۔ لہٰذا اب تمہارا مجھ سے یا میری فیملی سے کوئی تعلق نہیں...... میں تمہاری گھٹیا اور ناپاک زبان سے دوبارہ کبھی ماہا کا ذکر تو دور اس کا نام بھی نہیں سننا چاہوں گا۔ سمجھے!" وارننگ کے سے انداز میں انگلی اٹھا کر وہ بلند آواز سے گرجے تو چند سیکنڈز کے لیے تمام حاضرین محفل کو سانپ سونگھ گیا۔

"سمجھ گیا۔ لیکن آپ یہ تو سوچیں کہ یہ اس کی زندگی کا سوال ہے۔" کتنی ہی دیر ان کے سرخ چہرے کو نم آنکھوں سے تکنے کے بعد وہ ملتجیانہ انداز میں بولا۔

"ہونہہ! اس کی زندگی اور موت کی تمہیں کب سے فکر ہونے لگی؟" ان کا کاٹ دار لہجہ ایک پل کے لیے ولید کو خاموش کروا گیا۔ مگر اگلے پل وہ اپنی تمام تر ہمت مجتمع کرتے ہوئے آہستگی سے بولا۔

"کیونکہ۔ کیونکہ وہ مجھے چاہتی ہے۔" اور سب کو لگا تھا کہ اب اسے عمر سکندر کے احتساب سے کوئی نہ بچا سکے گا۔ مگر سب کی سوچ کے برعکس عمر صاحب کا رد عمل بہت پرسکون تھا۔

"اور تم اس کے جذبات کو ذریعہ بنا کر اسے اموشنلی بلیک میل کرنے کا ارادہ رکھتے ہو۔" سینے پہ بازو باندھے وہ طنزیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولے تو ولید اس الزام پہ تڑپ اٹھا۔

"آپ۔ آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں چاچو! میں سچے دل سے اپنی غلطیوں کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔ میری بے جا خاموشی اور بزدلی کی وجہ سے وہ پہلے ہی بہت کچھ سہہ چکی ہے۔ اس لیے اب میں نہیں چاہتا کہ وہ کسی لمحاتی فیصلے کی زد میں آ کر اپنے لیے نئی مشکلات کھڑی کرے۔" اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی بات ان سب کو کن الفاظ میں سمجھائے۔

"ہمیں تمہاری ہمدردیوں کی ضرورت نہیں۔ ماہا کے لیے کیا۔۔۔"

"عمر! ولید ٹھیک کہہ رہا ہے۔" یک لخت بی جان کی آواز کمرے میں گونجی تو حیرت زدہ سے عمر صاحب پلٹ کر ماں کا چہرہ تکنے لگے۔ جن سے انہیں کم از کم ایسے جملے کی توقع نہ تھی۔ جبکہ ولید کے ساتھ ساتھ باقی سب بھی آنکھوں میں حیرانی لیے نصرت بیگم کی جانب دیکھنے لگے۔ جنہوں نے ان سب کو حقیقتاً" چونکا ڈالا تھا۔

"میں جانتی ہوں بیٹا کہ تمہیں میری بات سن کے اچھا نہیں لگا۔ لیکن یہ حقیقت ہے بیٹا کہ اس پل فیصلہ جوش سے نہیں بلکہ ہوش سے ہونا چاہیے۔ ماہا بے شک ایک بہت سمجھ دار بچی ہے۔ لیکن اس وقت وہ جس ذہنی کیفیت سے گزر رہی ہے۔ وہاں اس کے لیے کوئی منطقی فیصلہ کرنا ممکن نہیں۔ آج وہ جن تلخ حقیقتوں کو سوچنا سمجھنا نہیں چاہتی کل کو وہی اس کے ساتھ ساتھ تمہارے لیے بھی مشکلات کھڑی کر سکتی ہیں۔" بیٹے کی جانب دیکھتے ہوئے انہوں نے رسان سے اپنی بات مکمل کی تو رابعہ بیگم جلبلا کر بولیں۔

"آپ کہنا کیا چاہتی ہیں۔ ہم آنکھوں دیکھی مکھی نگل لیں۔"

اور گو کہ زائد عباس اس سارے قصے میں اپنے بیٹے سے بے حد نالاں تھیں۔ پھر بھی رابعہ کے اس قدر تلخ الفاظ اور انداز انہیں اپنے دل میں کسی تیر کی طرح پیوست ہوتے محسوس ہوئے تھے۔ جن کی اذیت نے ان کی آنکھوں کو تیزی سے نم کر ڈالا تھا۔

"میں نے ایسا کچھ نہیں کہا رابعہ! لیکن اتنا ضرور چاہتی ہوں کہ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے تم دونوں 'جتنے منہ اتنی باتیں' والی مثال ضرور یاد رکھنا لوگ یہ بات کبھی نہیں بھولیں گے کہ یہ شادی بارات سے محض ایک دن پہلے ٹوٹی تھی۔ اور اس حقیقت کا اثر ماہا کی زندگی پر بھی پڑے گا۔ اس لیے ایک بار ولید کو ماہا سے بات کر لینے دی جائے۔ کیونکہ اگر ماہا اب بھی اس کے لیے اپنے دل میں گنجائش پا سکتی ہے تو میرا نہیں خیال کہ ہمیں اس معاملے کو اپنی انا کا مسئلہ بنانا چاہیے۔" بہو کے تیز لہجے کے برعکس انہوں نے نہایت تحمل اور سلیقے سے ولید کے دل کی بات کہہ ڈالی تو بے اختیار اس کا دل چاہا کہ وہ بڑھ کر دادی کا منہ چوم لے جو نا صرف اس کی بہت بڑی مشکل آسان کر گئی تھیں۔ بلکہ تمام حاضرین محفل پر بھی سوچ کے نئے در وا کر چکی تھیں۔ جس کا واضح ثبوت کمرے میں چھا جانے والا سناٹا تھا۔

☼ ☼ ☼

نصرت بیگم کے کہنے سے کوئی دل سے متفق تھا یا نہیں مگر اتنا ضرور ہوا تھا کہ اس کے بعد عمر سکندر نے اس معاملے میں خاموشی اختیار کر لی تھی اور ولید عباس بی جان کی رضامندی سے ماہا تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ جو مہندی والی رات سے خود کو اب تک کمرے تک محدود کیے ہوئے تھی۔

گزشتہ چار دن اگر ماہا کے لیے کڑے دن تھے تو ولید کے لیے بھی یہ اس کی زندگی کا سب سے تلخ اور سخت وقت تھا۔ جس میں اس نے ہر لحہ جرم کے احساس تلے اپنا احتساب کرتے ہوئے گزارا تھا۔

زرد دوپٹے کے ہالے میں ماہا کا بے جان پڑتا بے یقین چہرہ، اپنی ماں کے آنسو، بے بسی کی انتہاؤں کو چھوتے باپ کی مار، بہن کی شکوہ کرتی نگاہیں کچھ بھی تو اسے چین نہ لینے دے رہا تھا۔ جس کے نتیجے میں روح اس قدر بوجھل ہو چلی تھی کہ سانس لینا دوبھر ہو گیا تھا۔

اس کی یہ مشکل اسی صورت آسان ہو سکتی تھی جب ماہا اسے معاف کر کے اپنی غلطی سدھارنے کا ایک موقع دے دیتی۔ جس کے بعد باقی سب کی ناراضی تو از خود دور ہو جانے والی تھی۔ ایسے میں دن رات اگر وہ کسی چیز کا طالب تھا۔ کسی بات کے لیے دعا گو تھا۔ تو وہ تھی ماہا سے ملنے والی معافی جس کا آج جب موقع آیا تھا تو ولید خود میں اس لڑکی سے سامنا کرنے کی ہمت نہ پا رہا تھا جسے اس نے ان تین سالوں میں ایک لمحے کے لیے بھی کسی اہمیت، کسی توجہ کے

لائق نہ جانا تھا۔ مگر آج جس کے ہاتھ میں قدرت نے اس کی سب سے بڑی دولت، اس کا سکون رکھ چھوڑا تھا۔ اور اس پل اس کے کمرے کے باہر کھڑا وہ اپنا رہن رکھا یہی سکون واپس لینے آیا تھا جس کا حصول بہرکیف اتنا آسان نہ تھا۔

اندر اس کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا تھا اسے خود بھی معلوم نہ تھا۔ مگر اس پہلے اور شاید آخری موقعے کو گنوانے کا اس کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ تبھی اپنی ہچکچاہٹ پہ قابو پاتے ہوئے وہ ہلکی سی دستک دینے کے بعد جونہی اندر داخل ہوا تو نظر کھڑکی میں کھڑے وجود کی پشت سے جا ٹکرائی۔ جو اپنے پیچھے چھائی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے جونہی پلٹا، ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گیا۔ گو کہ راضیہ پھپھو اسے بڑی محبت سے پوری بات کے ساتھ ساتھ بی جان کی خواہش سے بھی آگاہ کر گئی تھیں۔ پھر بھی نجانے کیوں ولید کو یوں اپنے سامنے پا کر وہ ایک پل کو منجمد سی ہو گئی۔

اور وہ جو ہمیشہ اس کے چہرے اور آنکھوں میں اپنے لیے ایک نرم سا تاثر دیکھنے کا عادی تھا۔ سامنے موجود سپاٹ سے زرد چہرے اور ویران آنکھوں کو دیکھ کر نگاہیں چرانے پر مجبور ہو گیا۔

"ماہا!" اس کی دھیمی آواز کمرے کی ساکت فضا میں ارتعاش برپا کرتی ماہا عمر تک پہنچی تو بے اختیار وہ اپنی آنکھیں سختی سے میچ گئی۔ اس کا بس چلتا تو وہ اس شخص سے اپنا نام تک لینے کا حق چھین لیتی جس نے اس کی زندگی اس کی محبت اور اس کے ارمانوں تک ہر چیز بکھیر کر رکھ دی تھی۔

"ماہا! میں جانتا ہوں تم میری شکل تو دور میری آواز تک نہیں سننا چاہتیں۔ اور مجھے تم سے اس بات کا کوئی گلہ بھی نہیں۔ میں نے جو زیادتی تمہارے ساتھ کی ہے۔ اس کے بعد میں کسی رعایت، کسی ہمدردی کا مستحق نہیں۔ لیکن پھر بھی میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ تم پلیز، پلیز ایک بار اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لو۔"

"نظر ثانی کر لوں؟" ایک جھٹکے سے اس کی جانب پلٹتے ہوئے وہ جیسے چیخ سی گئی تھی اس کا مدعا ماہا کے اندر چنگاریاں سی بھر گیا تھا۔

"کس لیے؟ تمہاری بچی کی آیا بننے کے لیے یا تمہاری کھوئی ہوئی عزت لوٹانے کے لیے؟"

"تم بات کو غلط انداز سے سوچ رہی ہو ماہا!" وہ اس کی قیاس آرائی پہ تڑپ اٹھا تھا۔

"میں صرف تمہیں مزید مشکلات سے بچانا چاہتا ہوں۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ تمہاری یہ ٹوٹی ہوئی شادی، آنے والے وقت میں تمہارے لیے ایک عذاب کی صورت اختیار کر جائے۔" اس کا دلگرفتہ لہجہ دھیما تھا۔

"کتنا خیال ہے آپ کو میرا اور میری زندگی کا!" ولید کا "احساس ذمہ داری" اس کے لبوں پہ تلخ مسکراہٹ اور آنکھوں میں نمی بکھیر گیا۔

"لیکن ایک بات تو بتا ئیں ولید صاحب! اگر آپ کی بیوی زندہ ہوتی تو کیا تب بھی آپ میری اس درجہ پروا کرتے؟" اس نے اپنی شرارے برساتی نگاہیں سامنے کھڑے شخص کے "پرخلوص" چہرے پر ٹکاتے ہوئے سوال کیا تو ایک پل کے لیے ولید گڑبڑا سا گیا۔

"واقعی! کیا تب اسے ماہا کی بربادی یا آبادی سے کوئی سروکار ہوتا؟" اس کے اندر کسی نے چیکے سے سوال دوہرایا تھا اور جواب میں خفت کے رنگ بڑی تیزی سے اس کے چہرے پر عیاں ہوئے تھے۔ جنہوں نے نا چاہتے ہوئے بھی ماہا کے لبوں پر پھیلی طنزیہ مسکراہٹ کو مزید گہرا کر ڈالا۔

"چپ کیوں ہو گئے ولید عباس؟ آپ تو میرے بہت بڑے خیر خواہ ہیں۔ پھر بھلا اتنی سوچ بچار کس لیے؟" اس نے مصنوعی حیرت سے اس کی جانب دیکھا جو مہر لب کھڑا تھا۔

"یا پھر اس پل خوف خدا محسوس ہو رہا ہے۔ جو مزید جھوٹ بولنے کا حوصلہ نہیں رہا؟" اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ استہزائیہ لہجے میں بولی تو ولید جیسے پھٹ پڑا۔

"ہاں ہو رہا ہے خوف خدا محسوس! تھک گیا ہوں میں اپنے سینے پر اپنی غلطیوں کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے نہیں ہے مجھ میں مزید کسی رشتے کو کھونے کا حوصلہ!"
اس کی جانب دیکھتے ہوئے وہ بے اختیار دھاڑا تو ماہا تاسف سے اس خود غرض شخص کو دیکھ کر رہ گئی جس کے نزدیک آج بھی اگر کوئی اہم تھا تو ایک صرف اس کی ذات اور ترجیحات' باقی سب تو کل بھی ثانوی حیثیت رکھتے تھے اور آج بھی قطعی غیر اہم تھے۔
"نہیں ولید عباس! اگر خوف خدا محسوس ہو رہا ہوتا تو آج کم از کم تمہاری یہ "میں" کی گردان ختم ہو چکی ہوتی تم مجھے نہیں بلکہ خود کو مزید مشکلات سے بچانا چاہتے ہو۔ تم یہ سب کچھ اس لیے سدھارنا چاہتے ہو تاکہ "اپنے" ضمیر کی عدالت میں سرخرو ہو سکو۔ اپنے پچھتاوؤں میں کمی کر سکو۔ "اپنے" رشتوں کو واپس پا کر "اپنا" سکون حاصل کر کے "اپنی" زندگی مکمل کر سکو۔ پھر چاہے اس کے لیے تمہیں اس لڑکی سے کیوں نہ رشتہ جوڑنا پڑ جائے جس سے نہ تو تمہیں محبت ہے اور نہ ہمدردی۔ جس کی ذات کو اپنی خواہشوں کی بھینٹ چڑھانے سے پہلے تم نے ایک بار بھی اس کی زندگی اس کی محبت اور اس کے خوابوں کے بارے میں نہیں سوچا۔ پھر بھلا اس سب میں سچی ندامت اور پشیمانی کہاں؟ نیت کا اخلاص کہاں؟" غصے سے سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ اس نے ایک ہی جھٹکے میں ولید کے اندر دفن سچائی کو نکال باہر پھینکا تو اس کے لیے ماہا سے تو کیا خود سے بھی نظریں ملانا مشکل ہو گیا۔
اپنی ذات سے متعلق ہر خوش فہمی بھاپ بن کر اڑ گئی تو ماہا سے بات کرنے اور سمجھانے کی ہر خواہش بھی از خود دم توڑ گئی۔ ویسے بھی اب کہنے کو بچا ہی کیا تھا۔ سب کچھ تو اس نے خود کہہ ڈالا تھا۔
"ماہا! مجھے۔ مجھے معاف کر دو۔" کپکپاتے لبوں کے ساتھ وہ ندامت سے چور لہجے میں بولا تو وہ بے اختیار نفی میں سر ہلا گئی۔
"نہیں۔ ولید! اب یہ ممکن نہیں۔"
"پلیز ماہا! میں نے نہ سہی لیکن تم نے تو مجھ سے سچی محبت کی ہے۔ اس محبت کے واسطے ماہا مجھے معاف کر دو!" آنکھوں میں نمی لیے اس نے بھرائی ہوئی آواز میں التجا کی تو ماہا کا حوصلہ بکھرنے لگا۔ یہ وہ کس حوالے کو بیچ میں لے آیا تھا۔ اس جذبے ہی نے تو اسے آج یہ دن دکھایا تھا۔ ورنہ ولید عباس کی آنکھوں سے چھلکتی اجنبیت اور بے زاری کو پڑھنا کچھ اتنا مشکل تو نہ تھا۔
بے اختیار پاس پڑے کاؤچ کا سہارا لیتے ہوئے اس نے خود کو مضبوط کرنا چاہا تھا۔ مگر دل جیسے پانی بننے لگا تھا۔
"آزمائے ہوئے کو آزمانا سب سے بڑی بے وقوفی ہے نادان! کیا اگر تو کل اس شخص کو اس محبت کا واسطہ دے کر اسے "اپنی" محبت سے دستبردار ہونے کی التجا کرتا تو کیا یہ تیری درخواست قبول کر لیتا۔؟" دماغ نے کرخت لہجے سوال کیا تو وہ جیسے منجمد سا ہو گیا۔
"نہیں ولید عباس! تم میری درخواست کبھی قبول نہ کرتے۔" سختی سے آنکھیں بند کیے وہ بھرائی ہوئی آواز میں بڑبڑائی تھی۔
"پلیز ماہا! مجھے اپنی غلطی سدھارنے کا ایک موقع دے دو۔" یک لخت اسے اپنے ٹھنڈے ہاتھوں پہ کسی کے مضبوط ہاتھوں کا احساس ہوا تو ایک جھٹکے سے اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔
اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیے وہ اس کے بے حد قریب کھڑا ایک لمحے کے لیے اسے پوری جان سے لرزا گیا تھا۔ لیکن اگلے ہی پل وہ اپنے جسم کی پوری طاقت لگاتے ہوئے ایک جھٹکے سے اپنے ہاتھ چھڑا کر الٹے قدموں اس سے دور ہٹی تھی۔
"نہیں ولید! اب اور نہیں۔" چہرے پر لڑھک آنے والے آنسوؤں کو اس نے سختی سے رگڑ ڈالا۔
"آخر تم مرد کب تک عورت کی محبت کو اس کی کمزوری بناتے رہو گے۔ اگر یہ دھوکا دہی' یہ بدعہدی میں نے تمہارے ساتھ کی ہوتی اور تم سے اس ہی محبت کے واسطے معافی مانگی ہوتی تو کیا تم مجھے معاف کر کے اپنا لیتے۔؟" اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے اس نے لہجے میں ولید عباس کی آزمائش کا سامان کر ڈالا تو وہ بے اختیار لب بھینچ گیا۔
اس کی یہ خاموشی ماہا کے لبوں پر اک تلخ مسکراہٹ بکھیر گئی۔
"نہیں ولید عباس! تم میری محبت پہ تھوک دیتے۔ کیونکہ کسی مرد میں اتنا حوصلہ نہیں کہ وہ عورت کی جانب سے ملنے والے دھوکے کو معاف کر سکے۔ اس کی بے وفائی کے زخم کو بھلا کر اسے پھر سے اپنی محبت سے نواز سکے۔ اس لیے تم پلیز۔ پلیز یہاں سے چلے جاؤ کہ میرے پاس اب تمہیں دینے کو کچھ بھی نہیں رہا۔ نہ محبت اور نہ معافی!" بولتے بولتے اس کا لہجہ بھرا گیا تو وہ بے اختیار اس کی جانب سے رخ موڑ گئی۔ اور ساکت کھڑا ولید شکستہ نظروں سے اس کی پشت کو دیکھ کر رہ گیا۔ جس کی نرمی' نیکی اور اچھائی کا سب کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی معترف تھا۔ مگر جسے اس درجہ کٹھور بنانے والا بھی وہ خود ہی تھا۔
"ٹھیک ہے۔ ماہا! تم مجھ سے محبت نہیں کر سکتیں۔ مت کرو۔ مجھے معاف نہیں کر سکتیں۔ بے شک مت کرو۔ لیکن اس گھر سے جانے کی بات پھر کبھی مت کرنا۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ بوجھل لہجے میں گویا ہوا تو ماہا عمر کے آنسوؤں میں شدت آ گئی۔
"غلطی میری تھی تمہاری نہیں۔ اس لیے اس گھر اور اپنوں سے دوری کا عذاب اگر کوئی سہے گا تو وہ میں ہوں گا' تم نہیں' ویسے بھی میں نے بابا سے وعدہ کیا ہے کہ میں ان کے گھر اور رشتوں کو بکھرنے نہیں دوں گا اور مجھے یقین ہے کہ تم مجھے سرخرو ہونے کا یہ آخر موقع ضرور دو گی۔" نم لہجے میں اس کی حیرت کا سامان کرتا وہ پلٹ کر دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ تو ماہا بے اختیار گھوم کر اس کی جانب دیکھنے لگی جو لمبے لمبے ڈگ بھرتا دروازے کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ دہلیز عبور کرتا ماہا کی بھرائی ہوئی آواز اس کے بڑھتے قدموں کو روک گئی۔
"مجھے کوئی حق تو نہیں کہ میں تمہیں کوئی نصیحت کروں۔ لیکن انسانیت کے ناتے اتنا ضرور کہنا چاہوں گی ولید کہ جو کچھ تم نے اپنے ماں' باپ اور دیگر رشتوں کے ساتھ کیا' وہ سب اپنی اولاد کے ساتھ کبھی مت دہرانا۔ اسے کبھی بے اعتبار مت کرنا ولید عباس! خود کو کبھی برا باپ نہ بننے دینا۔" اس کی پشت پہ نگاہیں جمائے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تو ساکت کھڑا ولید سن سا ہو گیا۔
اگلے ہی لمحے اسے اپنی آنکھوں میں بے تحاشا جلن اترتی محسوس ہوئی تھی۔ جسے نظر انداز کیے وہ بے اختیاری کے عالم میں اس کی جانب پلٹا تھا۔ جو سراپا اس کی محبت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ مگر جسے وہ اپنے ہاتھوں گنوا چکا تھا۔
"اس درجہ محبتوں کو بے یقین کر کے تجھے کیا ملا ولید عباس؟" کسی نے اس کے اندر سے پوچھا تھا اور سامنے کھڑا وجود دھندلا سا گیا تھا۔ بے اختیار ہی اس نے اپنی آنکھیں مسلی تھیں۔ لیکن منظر صاف ہونے کے بجائے مزید گدلا گیا تھا۔ تب اپنی یہ بے کار سی کوشش ترک کرتے ہوئے وہ بے بسی سے اثبات میں سر ہلاتا شکستہ قدموں سے دہلیز پار کر گیا تھا اور ماہا عمر کے آنسوؤں میں شدت کے ساتھ ساتھ درد بھی اتر آیا تھا۔
"اے میرے مولا! میں نے اس شخص کو معاف کیا' تو بھی اسے معاف فرما دے۔" اس کے لرزتے لبوں نے اپنے رب سے خاموش استدعا کی تھی۔ محبت سے تعلق توڑنا تو ممکن ہے۔ مگر اسے فنا کرنا ممکن نہیں۔

☆ ☆

شعاع عمیر

جامع اور اہم نصیحتیں اور وصیتیں

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مجھے میرے رب نے ان باتوں کا خاص طور پر حکم فرمایا ہے۔

☆۔ اللہ سے ڈرنا خلوت اور جلوت میں۔

☆۔ عدل و انصاف کی بات کہنا غصہ میں اور رضا مندی میں (یعنی ایسا نہ ہو کہ جب کسی سے ناراض اور اس پر غصہ ہو تو اس کی حق تلفی اور اس کے ساتھ بے انصافی کی جائے اور جب کسی سے دوستی اور رضامندی ہو تو اس کی بے جا حمایت اور طرفداری کی جائے بلکہ ہر حال میں عدل و انصاف اور اعتدال کی راہ پر چلا جائے)

☆۔ اور حکم فرمایا میانہ روی پر قائم رہنے کا۔ غریبی و ناداری اور فراخ دستی اور دولت مندی، دونوں حالتوں میں (یعنی جب اللہ تعالیٰ ناداری اور غریبی میں مبتلا کرے تو بے صبری اور پریشان حالی کا اظہار نہ ہو اور جب وہ فراخ دستی اور خوش حالی نصیب فرمائے تو بندہ اپنی حقیقت کو بھول کر غرور اور سرکشی میں نہ ہو جائے۔ الغرض ان دونوں امتحانی حالتوں میں افراط و تفریط سے بچا جائے۔ اور اپنی روش درمیانی رکھی جائے۔ یہی وہ میانہ روی ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا۔

☆۔ اور مجھے حکم فرمایا کہ میں ان اہل قرابت کے ساتھ رشتہ جوڑوں اور ان کے حقوق قرابت اچھی طرح ادا کروں جو مجھ سے رشتہ قرابت توڑیں اور میرے ساتھ بدسلوکی کریں۔

امبر اسلم۔۔۔ کراچی

عمل

کسی نے حضرت لقمان سے کہا۔

"آپ فلاں خاندان کے غلام رہے تھے۔" آپ نے فرمایا۔

"ہاں تھا۔" پھر لوگوں نے پوچھا۔

"کس چیز نے آپ کو اس مرتبہ تک پہنچایا؟"

فرمایا۔

"راست گوئی امانت میں خیانت نہ کرنے سے، ایسی گفتگو اور ایسے عمل کے ترک سے جس سے مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا اور جن چیزوں کو اللہ نے مجھ پر حرام کر دیا ہے ان کی طرف آنکھ بند کر لینے سے اور لغو باتوں سے اپنی زبان کو روکنے سے اور حلال روزی کھانے سے اس درجے تک پہنچا ہوں، لہٰذا جو شخص ان باتوں پر مجھ سے زیادہ عمل کرے گا مجھ سے زیادہ مرتبے تک پہنچے گا اور جو شخص میرے ہی جتنا عمل کرے گا وہ مجھ جیسا ہوگا۔"

عینی قریشی۔۔۔ نواب شاہ، سندھ

مومن اسیر ہوتا ہے

حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

"مومن دنیا میں اسیر کی طرح ہوتا ہے جو اپنی گردن آزاد کرانے کے لیے جدوجہد کرتا رہتا ہے اور جب تک اللہ تعالیٰ سے جا کر نہ مل جائے اسے کسی چیز کی طرف سے اطمینان نہیں ہوتا۔"

کنیز فاطمہ۔۔۔ فیصل آباد

دعا

○ مظلوم کی بددعا سے ڈرو کیوں کہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ نہیں (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم)

○ ہمیشہ مغفرت کی دعا کرتے رہو (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم)

○ جب تم مانگو تو اکیلے میں اپنے اللہ سے جو پوشیدہ ہے دعا مانگو اس صورت میں تمہاری دعا ضرور قبول ہوں (حضرت عیسیٰ علیہ السلام)

○ تم دعا مانگتے ہو اور قبول نہیں ہوتی کیوں کہ تم غلط چیز کے لیے دعا مانگتے ہو (بائبل)

○ ایک بھائی کی دعا دوسرے بھائی کے حق میں جو محض اللہ کے لیے کی جائے ضرور قبول ہوگی (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

○ میں دعا بادشاہ کے حق میں کروں گا کیوں کہ بادشاہ کی اصلاح سے خلق خدا کی اصلاح ہوگی۔

○ دعا در حقیقت ترک گناہ کا نام ہے۔ (سفیان ثوری)

○ عمر درازی کی دعا بے کار ہے اپنے لیے صلاحیت کی دعا کرو (عمر بن عبدالعزیز)

○ دعا کا اثر دل کے ذریعہ روح پر ہوتا ہے۔

○ دعا خاموشی کی آواز ہے (ہورن)

○ صبر سب سے بڑی دعا ہے (مہاتما گاندھی)

○ مظلوم کی بددعا ظالم کی موت کا اعلان ہے (نے عین)

سورٹھ سانند۔۔۔ روحل والی گاؤں

سنہری باتیں

☆ جس کو مسلمان کا غم نہ ہو وہ میری امت میں سے نہیں (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم)

☆ مالداروں کے ساتھ عالموں اور زاہدوں کی دوستی ریاکاری کی دلیل ہے۔ (حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ)

☆ مومن نہ کسی کو دھوکا دیتا ہے اور نہ اسے کوئی دھوکا دے سکتا ہے۔ (حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

☆ محبت کی تاثیر عادتوں کو بدل دیتی ہے۔ (حضرت داتا گنج بخش)

☆ جو شے رونے سے واپس نہیں ہو سکتی اس پر رونا کیا اور رونا تو ہوتا ہی اس شے پر ہے، جو رونے سے بھی واپس نہ آئے۔ (واصف علی واصف)

☆ محبت کو نہ تو دلائل سے حاصل کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی فراموش کیا جا سکتا ہے۔ (ملٹن)

☆ وفا کا درس سیکھنا ہے تو ان پھولوں سے سیکھو جو کانٹوں سے جدا ہوتے ہی مرجھا جاتے ہیں۔

☆ بدترین ہے وہ شخص جو عقیدے کی لذت سے تو ہمیں مانے مگر اعمال میں ہماری اطاعت نہ کرے۔ (حضرت زین العابدین)

☆ جسم ایک دکان ہے اور زبان اس کا تالا ہے تالا کھلتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ دکان سونے کی ہے یا کوئلے کی۔ (حضرت علی رضی اللہ عنہ)

☆ اگر آپ کی آنکھ خوب صورت ہے تو آپ کو دنیا اچھی لگے گی۔ لیکن اگر آپ کی زبان خوب صورت ہے تو آپ دنیا کو اچھے لگو گے (حضرت علی رضی اللہ عنہ)

سدرہ وزیر، ناصرہ بتول۔۔۔ خوشاب

کاروباری ذہن

ایک فقیر کی لاٹری کھلتی ہے اور وہ ان پیسوں سے مسجد تعمیر کرواتا ہے دوسرا فقیر پوچھتا ہے۔

"یار تم نے اپنے پیسوں سے مسجد ہی کیوں بنوائی؟"

پہلا فقیر "تاکہ اس مسجد کے باہر صرف میں ہی بھیک مانگوں۔"

عینی قریشی۔۔۔ نواب شاہ

محبت

تم سمجھتے ہو کہ

بادل، بارش
خوشی، سکون ہے
زندگی اچھی گزرتی ہے
مگر جانم!
محبت ہو تو سب بے کار ہے

فوزیہ ثمر بٹ.... گجرات

قطعہ

یہ تیرے خط، تیری خوشبو، یہ تیرے خواب و خیال
متاعِ جاں ہیں، تیرے قول اور قسم کی طرح
گزشتہ سال بھی میں نے انہیں ___ یونہی رکھا تھا
کسی غریب کی جوڑی ہوئی رقم کی طرح

فرزانہ.... کراچی

زبان یار من

مولانا ابوالکلام آزاد جیسا کہ نام سے ظاہر ہے "قادر الکلام" شخص تھے۔ اردو بولتے یا لکھتے تو عربی اور فارسی اشعار اور محاورے اتنے تسلسل سے وارد ہوتے کہ یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا کہ مولانا کس زبان میں کلام فرما رہے ہیں۔ عربی جس میں "بقدر اشک بلبل" اردو استعمال ہو رہی ہے یا فارسی، جسے عربی محاوروں کی مدد سے "معرب" کیا جا رہا ہے۔

ایک مرتبہ پنجاب کے سکھ دہقانوں کا ایک وفد اپنے مسائل کی فہرست لے کر مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مولانا نے شرف باریابی بخشا۔ پہلے تو خاموشی کا طویل وقفہ رہا۔ دہقان شاید پاس ادب سے چپ رہے اور مولانا منتظر کہ یہ خود ہی کچھ ارشاد فرمائیں۔

پھر مولانا نے پہل کی۔

"سنائیے! امسال تمہاری کشت ہائے زرعی میں نزول باراں ہوا یا نہیں؟" کسانوں نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا کہ۔

"کیوں بھائی! کسی کی سمجھ میں آیا کچھ؟" سب کے چہرے سپاٹ تھے۔ مودب اور سرنگوں بیٹھے رہے۔

مولانا پھر گویا ہوئے۔

"نزول باراں عطیہ ہے، رحمت باری تعالیٰ کا اثمار و اناج نشوونما پاتے ہیں، فضائے بسیط کی کثافت دور ہوتی ہے۔"

وفد میں جو قدرے سمجھ دار تھا، اٹھا باقی افراد کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ سب لوگ مولانا کی طرف پیٹھ کیے بغیر الٹے پاؤں واپس آ گئے۔ دانا شخص نے بتایا۔

"اس وقت مولانا عبادت میں مصروف ہیں۔ اپنی مذہبی زبان میں وظیفے پڑھ رہے ہیں۔"

ارم.... کراچی

محبت

محبت ہمیشہ سفید لباس میں عمرو عیار ہے۔ ہمیشہ دوراہوں پہ لا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ اس کی راہ پہ ہر جگہ راستہ دکھانے کو صلیب کا نشان گڑا ہوتا ہے۔ محبت جھمیلوں میں کبھی فیصلہ کن سزا نہیں ہوتی ہمیشہ عمر قید ہوتی ہے۔ محبت کا مزاج ہوا کی طرح ہے کہیں ٹکتا ہی نہیں۔ محبت میں بیک وقت جوڑنے اور توڑنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ محبت ہیرون کے ساتھ اندھا جاتی ہے۔ جب تک روز اس تصویر میں رنگ نہ بھرو تصویر فیڈ کرنے لگتی ہے۔ روز سورج نہ چڑھے تو دن نہیں ہوتا۔ جس روز محبت کا سورج طلوع نہ ہو تو ہر طرف اندھیرا ہی رہتا ہے۔

(بانو قدسیہ کے ناول "راجہ گدھ" سے اقتباس)

حرمت روا اکرم.... ڈلوال

گوہر آبدار

☆ اپنی خامیوں کا احساس ہی انسان کی کامیابی کی کنجی ہے۔
☆ سورج کی طرح اپنی شخصیت بناؤ جو ہر طرف اپنی کرنیں بکھیرتا ہے۔
☆ زندگی ایک پھول کی مانند ہے پتا نہیں کب مرجھا جائے۔
☆ اللہ سے محبت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے لیے اس کے بندوں سے محبت کی جائے۔

☆ ☆

فرزانہ کی ڈائری میں تحریر

ابن انشاء کی غزل

کل چودھویں کی رات تھی، شب بھر رہا چرچا ترا
کچھ نے کہا یہ چاند ہے، کچھ نے کہا چہرا ترا

ہم بھی وہیں موجود تھے، ہم سے بھی سب پوچھا کیے
ہم ہنس دیے، ہم چپ رہے، منظور تھا پردا ترا

اس شہر میں کس سے ملیں، ہم سے تو چھوٹیں محفلیں
ہر شخص تیرا نام لے، ہر شخص دیوانہ ترا

کوچے کو تیرے چھوڑ کر، جوگی ہی بن جائیں مگر
جنگل ترے، پربت ترے، بستی تری، صحرا ترا

ہم اور رسم بندگی، آشفتگی، افتادگی
احسان ہے کیا کیا ترا، اے حسن بے پروا ترا

اے بے دریغ و بے اماں، ہم نے کبھی کی ہے فغاں
ہم کو تری وحشت سہی، ہم کو سہی سودا ترا

ہم پر یہ سختی کی نظر، ہم ہیں فقیر رہ گزر
رستا کبھی روکا ترا، دامن کبھی تھاما ترا

ہاں ہاں تری صورت حسیں، لیکن تو ایسا بھی نہیں
اس شخص کے اشعار سے، شہرہ ہوا کیا کیا ترا

بے درد سننی ہو تو چل، کہتا ہے کیا اچھی غزل
عاشق ترا، رسوا ترا، شاعر ترا، انشا ترا

سدرہ وزیر، ناصرہ بتول، کی ڈائری میں تحریر

امجد اسلام امجد کی نظم

گئے دنوں کی عزیز باتیں
گلاب صبحیں، گلاب راتیں
بساطِ دل بھی عجیب شے ہے
ہزار جیتیں، ہزار ماتیں
جدائیوں کی ہوائیں لمحوں کی
خشک مٹی اڑا رہی ہیں
گئی رتوں کا ملال کب تک
بچھڑ کے شاخیں تو پھر رہی ہیں
بجھ کے قبروں پر خون رونے سے
اپنی آنکھیں ہی پھوڑتی ہیں

تسنیم چودھری، کی ڈائری میں تحریر

احمد فراز کی غزل

اس سے پہلے کہ بے وفا ہو جائیں
کیوں نہ اے دوست ہم جدا ہو جائیں

تو بھی ہیرے سے بن گیا پتھر
ہم بھی کل جانے کیا سے کیا ہو جائیں

ہم بھی مجبوریوں کا عذر کریں
پھر کہیں اور مبتلا ہو جائیں

اب کی بار تو ملے تو ہم تجھ سے
ایسے لپٹیں تیری قبا ہو جائیں

بندگی ہم نے چھوڑ دی ہے فراز
کیا کریں لوگ جب خدا ہو جائیں

صائمہ ؛ کی ڈائری میں تحریر
راشد ملک کی نظم

لکیریں تو لکیریں ہیں!

لکیریں اپنے ہاتھوں کی
ملا کر دیکھیں کبھی ہم نے
تو سوچا تھا!
جدا ہم اب نہیں ہوں گے
مگر اب یاد آتا ہے
لکیریں تو لکیریں ہیں
ستارے ان کے ملتے ہیں
انہی کے جوڑے بنتے ہیں
خدا جن کو ملاتا ہے

زوباریہ ؛ کی ڈائری میں تحریر
امجد بخاری کی غزل

دن بدن بڑھتے گئے جو ظلمتوں کے سلسلے
دیس میں ہوں گے بپا پھر وحشتوں کے سلسلے

ایک تو کچا مکان تنہا لب دریا میرا
اور پھر اوپر سے وحشی بارشوں کے سلسلے

ساون و بیت جیٹھ، بہاراں، سردیاں گرمیاں
تیرے بن ہم کیا کریں گے موسموں کے سلسلے

مٹ گئے ہیں حرف غلط کی شکل میں الفاظ سب
آنکھ میں تحریر تھے جو قربتوں کے سلسلے

رات کی تاریکیوں میں چاند کے ہم رکاب
آج بھی جاری ہیں اپنے رت جگوں کے سلسلے

دل لگی دل کی لگی ہونے کو ہے امجد مگر
ختم ہوتے ہی نہیں یہ فاصلوں کے سلسلے

نگینہ راشد ؛ کی ڈائری میں تحریر
راشد ترین کی غزل

ایسے نہ اپنی زلف کی زنجیر کر مجھے
میں آسمان کا چاند ہوں تسخیر کر مجھے

مدت سے خستہ حال ہیں دیوار و در مرے
گرتا ہوا مکان ہوں تعمیر کر مجھے

ویسے تو اس سے وصل کا امکاں تک نہیں
مولا اسی کے ہاتھ کی تقدیر کر مجھے

تو شاعری کے سارے ہنر جانتا تو ہے
میں حرف حرف زخم ہوں تحریر کر مجھے

کوئی اجنبی نہیں ہوں میری آنکھ میں اتر
میں عکس ہوں اگر کوئی تصویر کر مجھے

راشد تمہارے پیار کے قابل نہیں رہا
گر ہو سکے تو درد کی جاگیر کر مجھے

نسرین خان ؛ کی ڈائری میں تحریر
ریحان سمیر کی غزل

ہمیں اپنے مقدر کے سویرے ڈھونڈنے ہوں گے
وگرنہ بدنصیبی کے اندھیرے ڈھونڈنے ہوں گے

اگر جینا پڑے گا ان تڑپتے روتے لوگوں میں
ہمیں پھر ضبط کے زنداں میں ڈیرے ڈھونڈنے ہوں گے

نہیں محفوظ کوئی آج انسانوں کی بستی میں
ہمیں اونچے پہاڑوں پر بسیرے ڈھونڈنے ہوں گے

اگر ظلم و جبر سے قوم کو آزاد ہونا ہے
وطن کے کونے کونے سے وڈیرے ڈھونڈنے ہوں گے

نکالیں زہر آ کر آج انسانوں کی فطرت سے
سمیر اس کام کی خاطر سپیرے ڈھونڈنے ہوں گے

شگفتہ سلیمان

حرمت رواکرم ——— ڈلوال

اپنی یادیں، اپنی باتیں لے کر جانا بھول گیا تھا
جانے والا جلدی میں تھا مل کر جانا بھول گیا تھا
وقت رخصت میری آنکھیں پونچھ رہا تھا ہاتھوں سے
اس کو غم تھا اتنا زیادہ، خود وہ رونا بھول گیا تھا

لائبہ امین ——— کراچی

میرے ہونٹوں کے مہکتے ہوئے نغموں پہ نہ جا
میرے سینے میں کئی اور بھی غم پلتے ہیں
میرے چہرے پہ دکھاوے کا تبسم ہے مگر
میری آنکھوں میں اداسی کے دیے جلتے ہیں

جاسمہ مریم فرید ——— کراچی

غم جاناں، ہجر کی راتوں کو سونے نہیں دیتا
لیکن ضبط میرا دامن بھیگنے نہیں دیتا
عجیب بات ہے گو کہ جی بھی رو سکتا ہے مگر
وہ شخص کبھی کھل کے مجھے رونے نہیں دیتا

فوزیہ ثمر بٹ ——— گجرات

ہمیں بھی آ گیا ہنر اس ضبط گریز کا
کبھی دامن کسی کے سامنے بھگویا نہیں کرتے
محبت جرم ٹھہری، عشق دامن کا داغ لیکن
اہل وفا اس داغ کو دھویا نہیں کرتے

ندا فقہ ——— فیصل آباد

یوں تیری چاہتوں سے گزرے ہیں
جیسے کوئی حصار سے گزرے
خواب میں تو ملا نہیں اور ہم
بادلوں کی قطار سے گزرے

آسیہ جاوید ——— علی پور چٹھہ

موسم تھا بے قرار تمہیں سوچتے رہے
کل رات بار بار تمہیں سوچتے رہے
بارش ہوئی تو گھر کے دریچے سے لگ کے ہم
چپ چاپ سوگوار تمہیں سوچتے رہے

کرن بخش ——— کراچی

شام ہوتے ہی لگا ہوں میں اتر آتے ہو
دل کی دھڑکن تیرے پیروں کی دھمک لگتی ہے

ثریا شاہ ——— کبیر والا

وہ لوگ ہم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیے
ڈھونڈا تھا آسمان نے جنہیں خاک چھان کر

سیدہ نسبت زہرا ——— کبیر والا

اک کرب سا ہے روح کے اندر بسا ہوا
آنکھوں میں جل رہے ہیں مرے خواب کیا لکھوں

ثمرہ اقرأ ——— کراچی

بے عذر وہ کر لیتے ہیں وعدہ یہ سمجھ کر
یہ اہل مروت ہیں تقاضا نہ کریں گے

عائشہ بھی ——— کراچی

دیر تک کچھ نظر نہیں آتا
خواب جب ٹوٹ کر بکھرتا ہے

گیلانی سسٹرز ——— کبیر والا

اک عکس میرے خواب سے باہر نکل گیا
آنکھیں کھلیں تو پردے پہ منظر بدل گیا
ہم تھامتے ہی رہ گئے زنجیر وقت کو
آیا، رکا، ہنسا، مڑا اور ایک پل گیا

صدف عمران ——— کراچی

آگہی کا عذاب باقی ہے
کھل گئی آنکھ خواب باقی ہے
وقت تتلی تھا اڑ گیا کب کا
ڈائری میں گلاب باقی ہے

عظمیٰ غلام نبی ——— گوجرہ

یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا
ایک ہی شخص تھا جہاں میں کیا

ماہ نور علی ——— ہری پور ہزارہ

کچی عمروں میں بہکنے کا سبب ہے اتنا
عمر کم ہوتی ہے اور جذبات بہت ہوتے ہیں

مریم یوسف ـــــــــ کراچی
ہیں وہ گزرا ہوا ماحول کہاں سے لاؤں
دل کہ وہ رنگ، وہ خوشبو، وہ ہوائیں مانگے
سازِ ہستی کبھی خاموش نہیں رہ سکتا
ٹوٹ بھی جائے تو کچھ اور صدائیں مانگے

مدیحہ ـــــــــ فیصل آباد
آج کے دن نہ پوچھو میرے دوستوں
زخم کتنے ابھی بخت بسمل میں ہیں
دشت کتنے ابھی راہ منزل میں ہیں
تیر کتنے ابھی راہ منزل میں ہیں

کنیز فاطمہ ـــــــــ فیصل آباد
ہجر کی راہ میں سلگو تو برا لگتا ہے
ہیں تم سے ملنے کو ترسوں تو برا لگتا ہے
تمنا ہے کہ تم فقط مجھ پر مہرباں رہو
تم کسی اور کو دیکھو تو برا لگتا ہے

تمینہ اکرم ـــــــــ کراچی
نوچ کر شاخوں کے تن سے خشک پتوں کا لباس
زرد موسم کی بانجھ رت کو بے لباسی دے گیا
لے گیا محسن وہ مجھ سے ابر بنتا آسماں
اس کے بدلے میں زمیں صدیوں کی پیاسی دے گیا

عنوبی اکرم ـــــــــ کراچی
خوشی کا کیا ہے کہ کس موڑ پر بچھڑ جائے
رہ حیات میں تم کو بھی ہم سفر رکھنا

نمل، زینب ـــــــــ حیدرآباد
کئی زمانے میں اپنی کڑی شکست کے بعد
خود اپنے ٹوٹے ہوئے بازوؤں میں قید رہا
وہ ایک چہرہ جو آنکھوں میں آبسا تھا کبھی
تمام عمر مرے آنسوؤں میں قید رہا

حمنہ جٹ ـــــــــ عبدالحکیم
تیری آنکھوں نے خدا جانے کیا کیا جادو
کہ طبیعت میری مائل کبھی ایسی تو نہ تھی

امامہ حبیب ـــــــــ عبدالحکیم
تم کو جب بوجھ لگے ساتھ تو بتا دینا
ہم چپ چاپ محبت سے مکر جائیں گے

سورتھ سانہ ـــــــــ آزادانی گاؤں
ہیں کیسے سرد ہاتھوں سے تمہارے گال چھوتا تھا
دسمبر میں تجھے میری شرارت یاد آئے گی

خدیجہ سلیم ـــــــــ کراچی
کیا بات ہے نہ جانے تجھے دیکھنے کے بعد
اچھی بہت لگی مجھے دنیا کبھی کبھی
تجھ سے میرا بچھڑنا تو معمول ہو گیا
لیکن جو تجھ سے رابطہ ٹوٹا کبھی کبھی

زبیدہ ریاض ـــــــــ کراچی
تمام دن بھی تو پانا ہے غیر لوگوں میں
یہ رات تیرے خیالوں میں کٹ گئی تو کیا
بہت کٹھن تھا پس چشم روکنا سیلاب
جو بولتے ہوئے آواز پھٹ گئی تو کیا

روز مینہ سعدیہ ـــــــــ شریف آباد
تو بہ ساتی دو پہر وں میں اس کی یادیں
ٹھنڈی کرنوں میں بھیگے رنگوں جیسی
اک چہرے کا لپکا میرے چاروں جانب
میں ہوں اور یہ دنیا ہے آئینوں جیسی

سدرہ وزیر، ناھرہ بتول ـــــــــ خوشاب
بچھڑتے سمے پہلے کوئی الزام رکھ دیتے
میرے حصے میں پچھتاوے کا کوئی کام رکھ دیتے
اندھیری رات کے در پر تجلی سی بکھر جاتی
کوئی جگنو پکڑ کر ہم کنار شام رکھ دیتے

عینی قریشی ـــــــــ نواب شاہ
ہماری عمر میں تو برف باری کی رتیں زلفوں میں بکھر رہی ہیں
اس آزمائش میں تم انا کی تمازتوں کو سنبھال رکھنا
ہمیں تو حاصل ہے اک خزینہ ترے تصور کی نکہتوں کا
تجھے تو ہر گز نہ راس آیا رفاقتوں کو سنبھال رکھنا

کرن ـــــــــ شجاع آباد
جاگتے رہنے سے بھی کبھی رکتے ہیں بہتے آنسو محسن
عمر بھر ہو گی یہ برسات چلو سو جائیں

نازش ریحان ـــــــــ کراچی
اب تمہیں بھی شہر والوں کی ہنسی ڈسنے لگی
میں نہ کہتا تھا میرا دکھ تم نہ اپنایا کرو
کل تھکے ہارے پرندوں نے نصیحت کی مجھے
شام جب ڈھل جائے تو محسن تم بھی گھر جایا کرو

سرورق کی شخصیت

ماڈل	رانیہ
ڈائنپر فیشن	موسیٰ رضا
میک اپ	روز بیوٹی پارلر

تجربہ

بمبئی کے عالیشان ہوٹل میں چار دن قیام کرنے کے بعد جب ایک اطالوی سیاح نے بل دیکھا تو وہ کاؤنٹر سے کہنے لگے۔

"یہ تو ٹھگی ہے ٹھگی! فرانس میں دیکھیے سیاحوں کی کیسی آؤ بھگت ہوتی ہے۔ شاندار سجے سجائے کمرے میں ٹھہرنے کا کرایہ کچھ نہیں، نہایت عمدہ ناشتا اور کھانا بالکل مفت اور ہر صبح کو تکیے کے اوپر دو ہزار فرانک رکھے ملتے ہیں۔"

کاؤنٹر کلرک نے یقین نہ کرتے ہوئے پوچھا۔
"کیا یہ آپ کا ذاتی تجربہ ہے؟" سیاح بولا۔
"نہیں، یہ میری بیوی کا ذاتی تجربہ ہے۔"

نازیہ خان، سیالکوٹ

تشویش

ایک پرانی نرس، نئی آئی ہوئی نرس کو اسپتال دکھا رہی تھی ایک وارڈ کے قریب پہنچ کر اس نے کہا۔
"اس وارڈ میں وہ مریض ہیں جو خطرے کی حد کو پہنچ چکے ہیں۔" نئی نرس نے کہا۔
"آپ کا مطلب ہے وہ مریض جو شاید بیمار ہیں؟"
پرانی نرس نے کہا۔
"جی نہیں! وہ مریض جو کافی حد تک صحت یاب ہو چکے ہیں اور دوڑ سکتے ہیں۔"

صائمہ، کراچی

مشورہ

ایک عادی شرابی کو کسی نے مشورہ دیا کہ وہ یوگا کی مشق کرے اس طرح شراب چھوڑنے میں آسانی رہے گی۔ دس ماہ کی طویل اور صبر آزما مشقت کے بعد وہ آدمی یوگا میں ماہر ہو گیا۔ کسی نے اس کی بیوی سے پوچھا۔
"کیا یوگا کی مشقوں سے کوئی فائدہ ہوا۔"
"جی۔" ہاں بیوی بولی۔ "اب وہ سر کے بل کھڑے ہو کر شراب پی سکتا ہے۔"

امبر، لاہور

وجہ

شوہر اور بیوی میں لڑائی ہوئی، شوہر نے خودکشی کی ٹھان لی چنانچہ انھوں نے ایک زہر کی پڑیا خریدی اور اسے کھا لیا لیکن وہ مرے نہیں بیمار ہو گئے۔
بیوی نے سر پیٹ کر کہا۔ "سو بار کہا ہے کہ چیزیں دیکھ بھال کر خریدا کرو اتنے پیسے بھی بے کار گئے اور جس کام کے لیے لائے تھے وہ کام بھی نہیں ہوا۔"

اسماء، کراچی

تخیل کی پرواز

ایک صاحب ریل کے ڈبے میں لکڑی کا ایک بند پنجرہ لیے بیٹھے تھے ایک آدمی نے ان سے پوچھا۔
"اس پنجرے میں آپ نے کیا رکھا ہے؟" انھوں نے کہا۔
"اس کے اندر نیولا ہے۔" اس نے پھر پوچھا۔
"آپ ساتھ میں نیولا لیے کیوں پھرتے ہیں؟" ان صاحب نے جواب دیا۔
"جب میں شراب پیتا ہوں تو مجھے چاروں طرف

سانپ نظر آتے ہیں اور میں فوراً "پنجو کھول کر نیولا چھوڑ دیتا ہوں اور سانپ بھاگ جاتے ہیں؟" اس آدمی نے کہا۔

"یہ تو آپ کے تخیل کی پرواز ہوئی۔ سانپوں کی کوئی حقیقت نہیں لیکن آپ نیولا ساتھ رکھنے کی زحمت کیوں مول لیتے ہیں۔" ان صاحب نے جواب دیا۔

"تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں سچ مچ نیولا رکھتا ہوں۔"

آمنہ۔ لاہور

ایک نہ شد

ایک بہرہ ایک دکان پر گیا اور ایک چیز کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگا۔

"کتنے کا ہے؟" اتفاق سے دکان دار بھی بہرہ تھا۔

اس نے کہا۔ "پانچ کا۔"

گاہک نے کہا۔

"میں یہ نہیں معلوم کر رہا ہوں کہ وہ کانچ کا ہے، قیمت بتاؤ؟"

دکاندار نے جھنجھلا کر کہا۔

"پانچ کا ہے پانچ کا۔" گاہک سمجھ کر بولا۔

"ٹین کا ہو گا پانچ کا نہیں ہو سکتا۔" دکان دار نے غصے سے کہا۔

"ٹین کا نہیں کانچ کا ہے۔"

نایاب اسلم، کراچی

معصومیت

ایک فوٹو گرافر کے پاس ایک عورت پہنچی اور کہنے لگی۔

"میں نے اپنے شوہر سے کہا تھا کہ ٹوپی پہن کر فوٹو مت کھنچوانا، لیکن وہ ٹوپی اتارنا بھول گئے، کیا آپ یہ ٹوپی ہٹا سکتے ہیں؟" فوٹو گرافر نے کہا۔

"جی ہاں، لیکن آپ یہ تو بتائیے کہ آپ کے شوہر سیدھی مانگ نکالتے ہیں کہ الٹی۔" یہ سن کر عورت بولی۔

"جب آپ ٹوپی اتاریں گے تب خود ہی دیکھ لیجیے گا۔"

نفیسہ خان۔ لاہور

ایک سے بڑھ کر ایک

ایک کنجوس اس بات پر خوش تھا کہ اس نے دس سال سے کوئی نیا کپڑا بنایا نہ نیا جوتا پہنا، حالانکہ اللہ کا دیا بہت کچھ تھا اس شخص کو اپنی کنجوسی پر بہت ناز تھا۔

ایک دن اس نے سنا کہ قریب کے قصبے میں ایک اور آدمی ایسا ہے جو کنجوسی میں اس سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔ اس کا دل چاہا کہ اس سے ملے مگر کپڑوں اور جوتوں کے گھسنے کے ڈر سے گھر بیٹھا رہا۔ لیکن دوسرے کنجوس کی باتیں سن سن کر اس نے اک دن اس سے ملنے کا سوچ لیا۔ اگلے دن وہ آدمی کے گھر پہنچا، دوسرے کنجوس نے گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا اور پوچھا۔

"میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

پہلا کنجوس حیران۔ کہ یہ کنجوسی نہیں ہو سکتی۔ میزبان کے اصرار پہ اس نے کہا۔

"آپ مجھے قلاقند کھلا دیں۔" وہ فوراً راضی ہو گیا اور قریبی حلوائی کی دکان پر آیا اور قلاقند کی طرف اشارہ کرکے پوچھا۔

"یہ قلاقند کیسا ہے؟" حلوائی نے کہا۔

"بالکل کھوپرے جیسا کہیے کتنا تولوں۔" میزبان نے کہا۔

"حلوائی کہتا ہے کہ کھوپرا بہتر ہے تو کیوں نہ آپ کو اعلا چیز کھلائی جائے۔" پھر مہمان کا ہاتھ تھام کر خشک میوہ جات والے کے پاس آیا اور کھوپرے کی بابت پوچھا۔

"ارے جناب خالص گھی کی مانند ہے یہ تو۔" کھوپرے والے نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے گھی کھوپرے سے بہتر ہے کیوں نہ آپ کو گھی پیش کروں اور ہاتھ پکڑے گھی والے کی دکان پر آیا۔ ارے گھی والے، تمہارا گھی کیسا ہے؟"

"جناب پانی کی طرح ہے گھی کھا کر دیکھیں پانی کی طرح حلق سے اتر جائے گا۔" میزبان بولا۔

"دیکھیں جناب خالص دیسی گھی کی مثال پانی سے دی گئی ہے تو یقیناً پانی گھی سے بہتر ہے۔ آیئے سامنے نل سے پانی پیتے ہیں۔"

حرمت روا۔۔۔ ڈلوال

حادثہ

ایک صاحب نے انشورنس ایجنٹ کی بے پناہ کوششوں کے بعد آخر ایک انشورنس پالیسی خریدلی۔ انشورنس ایجنٹ ان کے کاغذات تیار کر رہا تھا۔ ایک فارم کی خانہ پری کرتے ہوئے ایجنٹ نے پوچھا۔

"آپ کو زندگی میں کبھی کوئی حادثہ پیش آیا ہے؟"

"نہیں۔۔۔!" ان صاحب نے جواب دیا۔

"واقعی۔۔۔؟" ایجنٹ نے حیرت اور بے یقینی سے کہا۔

"آپ کو کبھی زندگی میں کوئی حادثہ پیش نہیں آیا؟"

"نہیں۔ البتہ ایک مرتبہ سانپ نے مجھے کاٹ لیا تھا۔" انہوں نے بتایا۔

"تو کیا آپ اسے حادثہ شمار نہیں کرتے؟" ایجنٹ نے دریافت کیا۔

"نہیں۔۔۔ یہ حادثہ کیسے ہو سکتا ہے؟ سانپ نے جان بوجھ کر مجھے کاٹا تھا۔" ان صاحب نے جواب دیا۔

نور الایمان احمد۔۔۔ ڈلوال

حساب

"اگر میں تمہیں دو خرگوش دوں اور پھر دو خرگوش اور دوں تو تمہارے پاس کتنے خرگوش ہو جائیں گے؟" ایک استاد نے بچے سے پوچھا۔

"پانچ۔" بچے نے جواب دیا۔

"نہیں۔۔۔ غور سے سنو! اگر میں تمہیں دو سیب دوں اور پھر دو سیب اور دوں تو تمہارے پاس کتنے سیب ہو جائیں گے؟"

"چار۔"

"شاباش اب بتاؤ اگر میں تمہیں دو خرگوش اور پھر دو خرگوش دوں تو تمہارے پاس کتنے خرگوش ہو جائیں گے؟"

"پانچ۔"

"بھلا وہ کیسے؟" استاد زچ ہو کر پوچھا۔

"اس لیے کہ میرے پاس ایک خرگوش پہلے ہی ہے۔"

سیدہ نسبت زہرا۔۔۔ کھروڑپکا

پیشکش

سگریٹ نوشی پر پابندی تھی ایک میجر فوجی بیرک کا معائنہ کر رہا تھا کہ اسے فرش پر سگریٹ کا ایک ادھ جلا ٹکڑا نظر آیا قریب ہی کھڑے سپاہی سے میجر نے پوچھا۔

"کیا یہ سگریٹ کا ٹکڑا تمہارا ہے؟" سپاہی نے پریشانی اور گھبراہٹ سے جواب دیا۔

"نہیں سر آپ اسے لے سکتے ہیں۔"

مازاحسان۔۔۔ کراچی

عقل مندی

بیگم شوہر سے۔

"باورچی خانے سے پھول دار پلیٹ تو لے آئیں۔"

شوہر۔ تھوڑی دیر بعد

"مجھے تو وہاں کوئی پھول دار پلیٹ نہیں ملی۔"

بیگم اطمینان سے۔

"مجھے معلوم تھا کہ آپ کو کوئی چیز نہیں ملتی، اس لیے میں پہلے ہی اٹھا لائی تھی۔"

نسبت منعم۔۔۔ کھروڑپکا

دسترخوان

خالدہ جیلانی

دیسی آلو

اجزا :

آلو — بیس عدد
(دھو کر درمیان سے کاٹ لیں)
پیاز (سلائس کاٹ لیں) — ایک عدد
لہسن کے جوے — دو عدد (کوٹ لیں)
ادرک (کٹا ہوا) — دو چائے کے چمچے
کری پاؤڈر — ڈیڑھ کھانے کا چمچہ
رائی — ایک چائے کا چمچہ
لیموں کا رس — دو چائے کے چمچے
نمک — حسب ذائقہ
تیل — چوتھائی کپ
پانی — چوتھائی کپ

ترکیب :

آلوؤں کو نمک ملے پانی میں ابال لیں۔ ایک سوس پین میں تیل گرم کرکے اس میں پیاز' لہسن' ادرک ڈال کر اس پیاز کو نرم ہوجانے تک فرائی کریں۔ رائی' کری پاؤڈر' نمک اور لیموں کا رس شامل کرکے کچھ دیر تک مزید فرائی کریں۔ آلو اور پانی ڈال کر چمچہ چلائیں اور ہلکی آنچ پر گریوی کے گاڑھے ہونے تک پکائیں۔ لذیذ و مسالے دار دیسی آلو تیار ہیں۔ انہیں سرونگ ڈش میں نکالیں اور ابلے ہوئے چاولوں یا پوری کے ساتھ گرم گرم سرو کریں۔

ہیش براؤن پوٹیٹو

اجزا :

آلو — آدھا کلو
پیاز (باریک چوپ کرلیں) — دو عدد
نمک — حسب ذائقہ
سیاہ مرچ پاؤڈر — حسب ذائقہ
مکھن — دو کھانے کے چمچے
تیل — دو کھانے کے چمچے

ترکیب :

نمک ملے پانی میں آلو ابال لیں اور چھلکا اتار کر آلو کو ایک بڑے پیالے میں رکھیں اور کانٹے سے اس کے لمبے ٹکڑے اسی طرح کریں کہ آلو کش کیا ہوا لگے۔ اس میں احتیاط سے پیاز' نمک اور سیاہ مرچ پاؤڈر مکس کریں۔ نان اسٹک فرائنگ پین میں درمیانی آنچ پر مکھن پگھلا کر اس میں تیل ڈال کر گرم کریں۔ گیلے ہاتھوں سے آلو کے آمیزے کے یکساں سائز کے گول کباب بنائیں اور فرائنگ پین میں اسے ڈال کر دونوں اطراف سے گولڈن براؤن ہونے تک تل لیں۔ اس کے بعد نکال کر کچن پیپر پر رکھ کر اضافی تیل جذب کرلیں۔ سرونگ پلیٹ میں رکھیں۔ مزے دار ہیش براؤن پوٹیٹو تیار ہے' کیچپ کے ساتھ گرم گرم سرو کریں۔

چکن اینڈ گرین پیپر آملیٹ

اجزا :

چکن — ایک کپ
(ابلا اور ریشے کیا ہوا)
انڈے — تین عدد
دودھ — دو کھانے کے چمچے
سیاہ مرچ — حسب ذائقہ (پسی ہوئی)
تیل — ایک کھانے کا چمچہ
ہری مرچ (باریک کٹی ہوئی) — دو سے تین عدد
ٹماٹر — دو عدد
(بغیر چھلکے کے باریک کٹے ہوئے)

نمک — حسب ذائقہ

ترکیب :

ایک باؤل میں انڈے' دودھ' سیاہ مرچ ڈال کر پھینٹ لیں۔ فرائنگ پین میں تیل ڈالیں۔ ہری مرچیں ڈال کر فرائی کریں۔ اب ٹماٹر اور چکن ڈال دیں۔ ایک منٹ پکائیں۔ اب پھینٹے ہوئے انڈے فرائنگ پین میں ڈال دیں۔ تھوڑی دیر انڈے کے مکسچر کو سیٹ ہونے دیں۔ اس کے بعد ہری مرچیں ڈالیں۔ اب آہستہ سے انڈے کو پلٹ دیں۔ انڈے پک جانے پر چمچے کی مدد سے فولڈ کرلیں۔ مزے دار آملیٹ تیار ہے' گرم گرم سرو کریں۔

آلو' مٹر' ٹماٹر

اجزا :

آلو — آدھا کلو
مٹر — ایک کپ
ٹماٹو پیوری — ایک کپ
ہلدی پاؤڈر — آدھا چائے کا چمچہ
تیل — آدھا کپ
لہسن' ادرک پیسٹ — ایک کھانے کا چمچہ
پیاز — ایک عدد (بڑی)
لال مرچ (کٹی ہوئی) — ایک چائے کا چمچہ
نمک — حسب ذائقہ
ہرا دھنیا' ہری مرچ — حسب پسند

ترکیب :

ایک دیگچی میں تیل گرم کریں اور پیاز ڈال کر سنہری کرلیں۔ لہسن' ادرک' نمک' لال مرچ پاؤڈر' ہلدی پاؤڈر' ہری مرچیں ڈال کر فرائی کریں۔ اس کے بعد اس میں آلو' مٹر اور ٹماٹو پیوری ڈال کر ہلکی آنچ پر پکائیں۔ آلو گل جائیں تو ہرا دھنیا' ہری مرچیں ڈالیں' چپاتی کے لیے گرم گرم سرو کریں۔

شملہ مرچ کی کڑاہی

مرغی کا گوشت — ایک کلو
شملہ مرچ — چھ عدد
(باریک کاٹ لیں)
سرخ مرچ پاؤڈر — ایک چائے کا چمچہ
نمک — حسب ذائقہ
ہلدی پاؤڈر — چوتھائی چائے کا چمچہ
ٹماٹر — تین عدد (کاٹ لیں)
دہی — ایک کپ
الائچی — دو سے تین عدد
گرم مسالا پاؤڈر — آدھا چائے کا چمچہ
پیاز — تین عدد
(باریک کاٹ لیں)
ہری مرچیں — چار سے پانچ عدد
(باریک کاٹ لیں)
گھی — دو کپ
ادرک — ایک انچ کا ٹکڑا
(لمبی کاٹ لیں)
لہسن پیسٹ — ایک کھانے کا چمچہ
پانی — ایک کپ
لیموں کا رس — ایک کھانے کا چمچہ

سب سے پہلے دیگچی میں گھی ڈال کر گرم کریں اور پیاز ڈال کر براؤن ہونے دیں۔ اس کے بعد اس میں مرغی کا گوشت ڈال کر چمچہ چلائیں۔ سرخ مرچ پاؤڈر' نمک' دہی' ہلدی پاؤڈر' الائچی' گرم مسالا پاؤڈر' ہری مرچیں' ادرک' لہسن پیسٹ' لیموں کا رس ڈال کر پکنے کے لیے رکھیں۔ جب گوشت گل جائے تو اسے اچھی طرح بھونیں' گھی چھوڑ دے تو اس میں ٹماٹر' شملہ مرچ ڈال کر اچھی طرح بھونیں۔ اس کے بعد اس میں ایک کپ پانی ڈال دیں اور ڈھکن سے ڈھک دیں۔ بھاپ آجائے اور گوشت اور شملہ مرچیں گل جائیں تو دیگچی چولہے سے اتار لیں۔

لیجیے مزے دار شملہ مرچ کی کڑاہی تیار ہے' نان' سلاد کے ساتھ سرو کریں۔

حسن و صحت

ادارہ

موسم سرما اور جلد کا نکھار

موسم سرما میں سب سے بڑا مسئلہ جلد، بالوں، ہاتھ، پیروں کا ہے۔ خشکی، ہونٹوں اور ہاتھ، پیروں کی کھال کا اترنا وغیرہ اس موسم کے خاص مسائل ہیں۔ لیکن جہاں مسائل ہیں وہاں اس کا حل بھی ہے کہ کس طرح سرد موسم میں اپنے آپ کو نرم گرم رکھ سکتے ہیں۔

سب سے پہلے تو کچھ ایسے عوامل کا ذکر ہو جائے جو تقریباً "سب ہی کر سکتے ہیں اپنے دن کا آغاز ہلکی پھلکی ورزش سے کریں۔ بستر سے اٹھ کر تھوڑے ہاتھ پیر گھمانے میں آپ کا کیا خرچ ہوتا ہے اس میں تو آپ کا اپنا فائدہ ہے۔ سردی میں زیادہ وقت گزارنے کے بعد ایک دم سے گرم ماحول میں نہ جائیں نہ ہی گرم کمرے سے نکل کر سردی میں جائیں یہ بات ہمیشہ دھیان میں رکھنی چاہیے۔ سردیوں میں نیند پوری لیں غذا کا بھرپور استعمال کریں، تازہ پھلوں اور پانی کا استعمال زیادہ سے زیادہ کریں اور رات کو سونے سے قبل کلینزنگ کریں۔ آنکھوں کے ارد گرد کی جلد پر خصوصی توجہ دیں اگر آپ دن میں میک اپ کرتی ہیں تو رات سونے سے پہلے اسے لازمی اتار دیں اس کے لیے چہرے کی جلد کی مناسبت سے کوئی اچھی سی کریم استعمال کریں۔ سردیوں میں کولڈ کریم کا استعمال باقاعدگی سے کریں اس سے جلد شگفتہ رہتی ہے۔ یہ ہم سب ہی جانتے ہیں کہ انسانی جلد کا نظام سانس لینے کی وجہ سے قائم ہے وہ آکسیجن جذب کرتا ہے اور آکسیجن جذب کرنے کے لیے جسم کا صاف ستھرا ہونا ضروری ہے اگر جسم صاف ستھرا ہو گا تو جسم کے مسام بھی کھلے ہوں گے اب ہم جلد کی اقسام کے حساب سے بات کرتے ہیں۔

خشک جلد

جلد کے خشک ہونے کی ایک وجہ ہمارے جسم میں چکنائی کی مقدار کا کم ہونا ہے۔ اس کے علاوہ ٹشوز میں موجود رطوبت کے کم ہونے کی وجہ سے بھی جلد خشک نظر آتی ہے اس بات کا ذکر پہلے ہی ہو گیا ہے سردیوں میں ہوا میں نمی کا تناسب کم ہو جاتا ہے اور پھر ہم لوگ اکثر پانی پینا کم کر دیتے ہیں جن لوگوں کی جلد پہلے سے ہی خشک ہو ان کو مزید دشواریاں ہو جاتی ہیں اس میں عمر کا زیادہ ہونا بھی شامل ہے نیز غیر معیاری صابن، کریم یا لوشن خشکی کا باعث بن سکتے ہیں۔ وٹامن سی کی کمی بھی خشکی کا سبب بنتی ہے۔ یہ جلد بہت حساس ہوتی ہے وہ خواتین جن کی جلد خشک ہے ان کو ایسے صابن استعمال کرنا چاہئیں جن میں چکنائی اور روغنیات زیادہ ہوں۔ صابن سے منہ دھونے کے بعد کریم یا لوشن ایسا استعمال کریں جس میں چکنائی کا عنصر زیادہ ہو۔ خشک جلد کو چکنائی کی بہت ضرورت ہے اس لیے چہرے کی مالش بہت ضروری ہے۔ زیتون کے تیل کی مالش سے نا صرف روغنیات حاصل ہوں گے بلکہ چہرے کی رنگت اور تازگی میں بھی اضافہ ہو گا۔ خشک جلد رکھنے والی خواتین کو جلد کی حفاظت زیادہ کرنا پڑتی ہے کیونکہ ذرا سی لاپروائی سے اوائل عمر میں ہی جھریاں اور لکیریں پڑ جاتی ہیں۔ آنکھوں کے گرد ہلکی سی لکیریں نمودار ہو جاتی ہیں گالوں اور گردن کی جلد ایسی نظر آئے گی جیسے جھریاں پڑ گئی ہوں۔ خشک جلد کے لیے چکنائی سے زیادہ پانی کی ضرورت ہوتی ہے بہت زیادہ خشک جلد کا علاج تو ایسی پروڈکٹ سے ہو گا جو جلد کو بھرپور رطوبت فراہم کریں۔ تازہ پھلوں کے رس کا استعمال وافر مقدار میں کریں۔

میک اپ

میک اپ کی ضرورت تو خواتین کو اکثر پڑتی رہتی ہے۔ ملازمت پیشہ خواتین کو تو میک اپ کی ضرورت روزانہ ہوتی ہے۔ میک اپ کے تمام لوازمات ایسے خریدیں جن میں چکنائی کا عنصر زیادہ ہو یہ سب بازار سے باآسانی دستیاب ہو جاتا ہے۔ موئسچرائزنگ کریم کا استعمال کریں۔ کلینزر بھی ایسا استعمال کریں جو آپ کے مسامات کو بند کرنے والا سارا میل صاف کرنے کے ساتھ ہی نہ تو جلد کو خشک بنائے نہ ہی اسے سخت کرے شہد پر مشتمل اسکن ٹانک نازک اور خشک جلد کے لیے بہترین ثابت ہوتا ہے۔ آنکھوں کے ارد گرد کی جلد پر خصوصی توجہ دیں اور خاص احتیاط سے صفائی کریں۔ بادام کے تیل والی کریم خشک جلد کے لیے زبردست ہے یہ کریم خشک اور سیاہ ہونٹوں کے لیے بہت مفید ہے۔ خشک جلد کی مالش — تیل اور نم دار رکھنے والے مادوں سے کی جائے، غذا میں انڈا، کلیجی، مکھن، ٹماٹر اور سبزیوں کا استعمال زیادہ سے زیادہ کیا جائے۔

چکنی جلد

چکنی جلد رکھنے والی خواتین اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ سردیوں کے خشک موسم میں انہیں اپنی جلد کی طرف سے کسی حد تک فکر نہیں ہوتی لیکن یہ بھی طے ہے کہ جلد چاہے کسی بھی قسم کی ہو، توجہ ضرور مانگتی ہے بہرحال چکنی جلد رکھنے والی خواتین کو تیز اسٹرنجنٹس اور گرم پانی سے پرہیز کرنا چاہیے غذا میں چاکلیٹ، مکھن وغیرہ کا زیادہ استعمال چہرے پر مزید چکناہٹ لاتا ہے۔

بالوں کی حفاظت

سردیوں میں اکثر لوگوں کو خشکی ہو جاتی ہے بالوں کو خشکی سے پاک رکھنے کے لیے اینٹی ڈینڈرف شیمپو استعمال کریں۔ شیمپو کرنے سے قبل بالوں کو نیم گرم پانی سے اچھی طرح گیلا کریں اب شیمپو کو ہتھیلی میں لے کر انگلیوں کی مدد سے بالوں میں لگائیں پھر مالش کے انداز میں ملیں۔ پانچ سے سات منٹ لگا رہنے دیں پھر دھوئیں۔ شیمپو بار بار نہ بدلیں اب تو بازار میں اینٹی ڈینڈرف تیل بھی دستیاب ہے۔ گھر سے باہر نکلتے وقت اسکارف سے سر کو ڈھک لیں۔ اگر آپ کے بالوں کو کنڈیشنر سوٹ کرتا ہے تو پروٹین کنڈیشنر سے ہفتے میں دوبار سر دھویا کریں۔ لیموں کا رس تیل میں ڈال کر سر پر خوب ملیں اور ایک گھنٹہ بعد سر دھو لیں۔

سردیوں میں ہاتھ پیروں کی حفاظت

ہاتھ اور پیروں کی جلد چہرے کے بعد سب سے زیادہ سردیوں میں یا گرمیوں میں متاثر ہوتی ہے۔ یہاں ذکر سردیوں کا ہے تو سردیوں میں جلد کا خشک ہونا۔ کھال اترنا، بعض صورتوں میں خون بھی رستا ہے۔ یہ بات تو ہمیں معلوم ہو گئی ہے کہ ہماری جلد کی قسم کیا ہے۔ جس طرح سے ہم اپنے چہرے اور جسم کی حفاظت کرتے ہیں اسی کی مناسبت سے ہاتھ پیروں کا خیال رکھنا چاہیے۔ بستر پر جانے سے قبل اپنے ہاتھوں اور پیروں پر اچھی طرح سے کریم یا لوشن لگا کر سوئیں صابن سے ہاتھ پاؤں دھونے سے خشک ہو جاتے ہیں اس لیے ہاتھ پیر دھونے کے بعد لوشن ضرور لگائیں۔

◇

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ ۱۹۷۶ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں یہ سوال و جواب شائع کیے جا رہے ہیں۔

ذوالقرنین

شہناز فیضی..... کراچی

س - "وہ تم کو کیسی لگتی ہے۔ بھئی تم نے ہی تو لکھا ہے۔ آخر وہ ہے کون۔ اتا پتا بھی؟"

ج - "اب اس غلطی کی یہ سزا بھی نہیں ملنی چاہیے کہ مجھے اس کا اتا پتا بتانا پڑے۔"

سائرہ شیخ..... کراچی

س - "سویٹ سے بھیا جانی! آپ کو آخر کس حکیم نے افسانہ نگاری پر ستم ڈھانے کا مشورہ دیا ہے؟"

ج - "وہ بھی ایک مشہور افسانہ نگار تھے میری طرح۔"

س - "بھیا جانی آپ اپنے افسانے کے ہیرو کو اتنے سگریٹ کیوں پلواتے ہیں؟"

ج - "اس لیے کہ اب سگریٹ پینے سے ٹی بی نہیں ہوتی۔"

مس شائستہ..... نوڈیرو

س - "نین بھیا! شاید آپ اب تک دلوں کے مہمانوں کے میزبان نہیں بنے۔ "کرن" میں کسی نے سوال کیا تھا آپ سے کہ دلوں کے مہمانوں اور گھر کے مہمانوں میں کیا فرق ہے۔ آپ نے جواب دیا۔ واپس چلے جاتے ہیں پھر آنے کے لیے۔

نین بھیا! یہ جواب تو بالکل غلط ہے۔ دلوں کے مہمان تو بہت سی خوشیاں لاتے ہیں اپنے ساتھ جب جاتے ہیں تو بہت سی پریشانیاں دے جاتے ہیں؟"

ج - "پیارے بھیا عشق کی کتاب لکھ ڈالو۔ پیارے بھیا۔ ہم بہنوں کو اس قسم کے لغو سوالات کے جواب دے ڈالو۔ بڑی آئی بہن کہیں کی۔"

صائمہ شمس..... ریناله خورد

س - "بھیا آپ اپنی شادی پر اس محفل کی بہنوں کو (بھی ہم کو) کیا تحفہ دیں گے؟"

ج - "محفل چھوڑ جانے کا مشورہ۔ اس سے بہتر تحفہ اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔"

حمیرا نازش مجی..... راولپنڈی

س - "میاں بیوی دو گاڑی کے پہیے ہیں۔ اگر کسی شخص کی دو بیویاں ہوں تو؟"

ج - "تو پھر کیا وہ گاڑی کہاں رہی رکشا ہو گیا۔ میاں آگے بیویاں پیچھے۔"

شبانہ اصغر علی..... نامعلوم

س - "بھیا جلدی سے مچھر کا موئنث بتائیں؟"

ج - "یہ سوال بھائی مچھر سے کیا تھا تو اس نے کہا میں اپنی گھر والی کا نام کیسے بتا سکتا ہوں۔ ہمارے ہاں بہت پردہ ہے۔"

یاسمین روحی..... راولپنڈی

س – "اپنے بھیا کی شادی میں پہنا پہن کر موتیوں والا گہنا۔ سنگ سکھیوں کے ڈھولک بجائے گی۔ کب یہ وقت آئے گا؟"
ج – "انتظار...... کچھ اور انتظار۔"

محمودہ خانم آرزو...... مانسہرہ

س – "ذوقی! محبوبہ کی زلفوں کی چھاؤں میں سکون ملتا ہے یا درخت کی چھاؤں میں؟"
ج – "درخت کی چھاؤں کا تجربہ ہے ہمیں۔ بہت ملتا ہے سکون۔"
س – "نین! بند آنکھوں سے سپنے کیسے دیکھتے ہیں؟"
ج – "کبھی اچھے، کبھی بہت اچھے۔"

مس نقوی...... فیصل آباد

س –
تم میں جو بات ہے وہ بات نہیں آئی ہے
کیا یہ تصویر کسی غیر سے کھچوائی ہے
ج – "جبھی تو بیڑہ غرق ہوا ہے تصویر کا۔"

ثمن چوہان...... ٹنڈو جام

س – "گھر تو چلو بچو! ابا بیٹھے انتظار کر رہے ہیں مولی فرقان کے ساتھ تمہارا حسین و جمیل فوٹو دیکھ کر۔"
ج – "وہ تو بعد کی بات ہے تمہیں کیوں جلن ہونے لگی۔"

رضوانہ ضمیر خان...... ساہیوال

س – "لوگ دور جا کے بھلا کیوں دیتے ہیں؟"
ج – "آپ تو دور کی بات کرتی ہیں ہمیں تو قریب کا تجربہ ہے۔"

نوڈا...... گوجرانوالہ

س – "بھیا جی! انسان کس چیز کو اپنائے تو وہ عظیم بنتا ہے؟"
ج – "انسانیت کو۔"

س – "قرنی بھیا! انسان کی عظمت کس چیز میں پوشیدہ ہے؟"
ج – "اس کی نیک نیتی میں۔"

گل نسرین...... شاہ کوٹ

س – "مجنوں کی جگہ آپ ہوتے تو؟"
ج – "نہ نہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔"

مس یوسف...... سیالکوٹ

س – "ذوالقرنین بھائی! آپ اس قدر مغرور کیوں ہیں؟"
ج – "دور سے ایسے ہی لگتا ہے مس یوسف۔"

نسیم سحر...... کراچی

س – "نین جی! سنا ہے آپ گھاس بھی کھاتے ہیں۔ کیا یہ درست ہے؟"
ج – "کھلاتے بھی ہیں کبھی کبھی، یہ بھی درست ہے۔"

سیدہ نرگس زاہد...... ڈیرہ غازی خان

س – "بھیا! بھلا اس قدر سندر، پیارا اور خوب صورت ناولٹ لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ اب جلدی سے صدقہ اتار دیں۔ ایسا نہ ہو کسی دشمن کی نظر لگ جائے۔"
ج – "ہم نے دوست ہی نہیں بنائے تو دشمن کہاں سے لائیں۔ ویسے اتار دیتے ہیں صدقہ۔"

چاند سلطانہ عروج...... کراچی

س – "میں دراصل سچے عاشق و معشوق کی فہرست مرتب کر رہی ہوں۔ جیسے شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں، جلدی بتائیے کہ آپ کے ساتھ کس کا نام لکھوں؟"
ج – "ذوالقرنین اور بے ادبی۔ (بے ادبی ہمارے ملک کی مشہور شاعرہ ہیں۔"

مدیرہ

نائلہ...... حافظ آباد

کرن جنوری کا شمارہ تیرہ کو ملا ٹائٹل پسند آیا۔ کرن کا ٹائٹل ہمیشہ بہت اچھا ہوتا ہے۔ بلیک سوٹ اور اس پر موتیوں کا کام بہت نفیس تاثر دے رہا تھا اداریہ پڑھا۔ بہت خوبصورت بات آپ نے چند لائنوں میں کہہ دی۔ دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔ اپنا احتساب مشکل ترین کام ہے اور جس نے یہ کر لیا وہ کامیاب ہے۔ "بنجارن کا بوجھ" دلوں کا بوجھ بڑھا گیا۔

"دست کوزہ گر" کے صفحات بڑھا دیں۔ نبیلہ عزیز کہیں کہیں بہت طوالت اختیار کر جاتی ہیں۔ "عشق آتش" کا شمار کرن کے بہترین ناولوں میں ہو گا۔ سعدیہ راجپوت کو ہماری طرف سے مبارک باد، شگفتہ بھٹی پلیز اب کوشش عالیت کا انتظار کریں۔ روشنی بخاری شاید نئی رائٹر تھیں اگر یہ ان کی پہلی تحریر ہے تو بے حد اچھی اور سبق آموز تھی۔ محبت کرنے والوں کی تو دشمن ہمیشہ سے ہے یہ دنیا کہیں ذات پات کا فرق تو کہیں امیری غریبی، اچھی کہانی تھی ہم روشنی کی دوسری تحریر کے منتظر ہیں مگر پلیز ہنستی مسکراتی تحریر ہو۔

سنبل کا افسانہ "کیکٹس" بھی اچھا تھا محبت کرنے والوں کو سچی محبت کیوں نہیں ملتی......؟

علیزے حیدر کا افسانہ دلچسپ تھا۔ نازیہ جمال کرن کی مصنفین میں ایک اچھا اضافہ ہیں۔ غزالہ جلیل، ام ثمامہ نے بھی اچھا لکھا۔ مستقل سلسلے سب اچھے ہیں۔ کرن کتاب اس لیے اچھی تھی کہ میرے اسٹار کی خوبیاں زیادہ لکھی تھیں۔

سیدہ جیا...... اسلام آباد

کرن جنوری کا شمارہ بارہ کو ملا ٹائٹل گرل بس ٹھیک تھی۔ بلیک سوٹ البتہ اچھا تھا۔ ابن انشا کی نظم "بنجارن کا بوجھ" دکھی کر گئی۔ ایسے نابغہ روزگار لوگ برسوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ سال نو کا سروے دلچسپ نہیں تھا اگر سوال دلچسپ ہوتے تو جواب بھی مزے دار ہوتے...... خیر۔

فوزیہ یاسمین کو ہماری طرف سے شادی کی مبارک باد اللہ تعالیٰ انہیں اپنے ہم سفر کے ساتھ بہت ساری خوشیاں نصیب کرے (آمین) انٹرویز دونوں اچھے تھے سلسلے وار ناول دلچسپ جا رہے ہیں۔ مکمل ناول تینوں اچھے تھے۔ مگر "عشق آتش" نے محفل لوٹ لی۔ شگفتہ کا ناولٹ لگتا ہے اختتام کی طرف ہے۔ بہرحال اچھی تحریر ہے۔ روشنی بخاری کا ناولٹ "ادھورے خواب" دل اداس کر گیا۔ چوہدری جہانگیر کا انصاف اور مولوی صاحب کی خاموشی ہمیں یہ بات سوچنے پر مجبور کر گئی کہ ہمارے ملک کے حالات بالکل اسی طرح ہیں کوئی انصاف کی بات نہیں کرتا جس کی لاٹھی اسی کی بھینس والا معاملہ ہے۔ مگر دنیا ابھی اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہوئی عدیل کے کردار نے ہمیں انسانیت سے مایوس نہیں ہونے دیا۔ بہرحال ایک اچھی کوشش تھی روشنی بخاری کی۔ افسانوں میں سنبل کا "کیکٹس" بہت اچھا تھا باقی افسانے بھی اچھے تھے۔ مستقل سلسلوں میں مجھے "یادوں کے دریچے سے" بہت پسند ہے۔ یہ میرا پہلا خط ہے۔ حوصلہ افزائی ہوئی تو آئندہ بھی لکھوں گی۔

مسکان قریشی...... بلال کالونی، ملتان

خدا کرے! یہ سال، اس سال کا ہر دن، ہر ہفتہ اور ہر مہینہ پیارے "کرن، شعاع اور خواتین" کو ڈھیروں کامیابیوں سے ہمکنار کرے۔ آمین!

جس کہانی نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا وہ نبیلہ عزیز کا مکمل ناول "یادیں" ہے کہانی کو اگر کہانی سمجھ کر پڑھا جائے تو اس لحاظ سے یہ ناول اول سے آخر تک بہترین رہا لیکن......؟

کیا ہر پڑھنے والا کہانی کو "صرف کہانی" سمجھ کر پڑھتا

جاتا؟ مگر میں اس طلاق کو سزا نہیں کہوں گی۔ ایسے شخص کے ساتھ رہنے سے اچھا ہے کہ وہ اکیلی رہ لے۔ اور "ادھورے خواب" معافی چاہتی ہوں۔ مگر مجھے یہ تحریر بالکل بھی متاثر نہ کر سکی۔ کچا پن محسوس ہوا۔ اور مجھے اچھی اس لیے نہ لگی۔ کہ یہ کیا محبت میں ایک لڑکی رات کے اندھیرے میں گھر سے نکل جاتی ہے ہر روز' اور ساری رات باہر بیٹھ کر گزارتی ہے۔ محبت تو ہر رشتے کی قدر کروانا سکھاتی ہے۔ صبر اور سکون عطا کرتی ہے اور آخر میں کسی کی دلہن بن کر وہ سب بھول جانے کا سوچتی ہے جبکہ دوسری طرف زہرہ کے ساتھ جو کچھ ہوا؟ اور افسانے میں سب کچھ ٹھیک تھا۔

سنبل کا انداز اچھا لگا مجھے اور ہاں ام ثمامہ کا افسانہ بھی بہت اچھا لگا مستقل سلسلے "بول کہ لب آزاد ہیں تیرے" تنزیلہ الرحمن' آپ کے خیالات جان کر دلی خوشی ہوئی۔ یقین کریں کہ اگر میرا بس چلے تو کچھ ایسا کروں کہ یہ ایس ایم ایس وغیرہ ختم کر دوں۔ نوجوان نسل خراب ہو رہی ہے بلکہ ہو چکی ہے اللہ ہی عقل عطا کرے۔ "کرن کرن خوشبو" سب کا انتخاب اچھا تھا۔ خاص کر آمنہ اور عنبر وسیم کا۔ "یادوں کے دریچے سے" بھی سب کچھ کمال کا تھا۔ خاص کر فوزیہ ثمر کا اشعار بھی سارے اچھے تھے۔ مسکان قریشی جیسی قارئین کے بارے میں جان کر اچھا لگتا ہے یعنی وہ تب سے پڑھ رہی ہیں جب کرن صرف پندرہ روپے میں آتا تھا۔ مدیرہ آپی بارہ فروری کو ہماری سالگرہ ہے سو ہمیں مبارک باد ہی دے دو۔ اب بھی جواب دینا پڑے گا بھئی مبارک باد جو دینا ہے۔

(ج) پیاری سونیا! آپ کو سالگرہ کی بہت بہت مبارک باد اللہ تعالیٰ آپ کو ڈھیروں خوشیاں نصیب کرے (آمین)

تحریم بخاری۔۔۔ ضلع مظفر گڑھ

جنوری کا شمارہ سترہ تاریخ کو ملا۔ اول آخر پورا ڈائجسٹ بہت زبردست تھا۔ اور جب اپنا خط دیکھا تو مجھے بہت خوشی ملی اتنی خوشی کہ میں وہ خوشی اس کاغذ پر بھی بیان نہیں کر سکتی۔ اب بات ہو جائے کرن کی تحریروں کے متعلق اس ماہ مجھے سب سے زیادہ سنبل جی کی تحریر اچھی لگی "کیکٹس" واقعی لڑکیاں محبت چاہتی ہیں ایسی محبت جس کی گھنی چھاؤں ان پر ہمیشہ ہے۔ بہت کمال لکھا ہے۔

سنبل جی نے اس کے بعد مجھے نازیہ جمال کی تحریر "ایک جوڑا" اچھی لگی اس میں ہم سب لڑکیوں کے لیے سبق ہی ہے کہ ہم ان چھوٹی موٹی چیزوں کی قدر انسان کی قدر و اہمیت سے زیادہ نہ کریں۔ کیونکہ یہ سب چیزیں ایک نہ ایک دن اپنی قدر و قیمت کھو دیتی ہیں جبکہ ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ پیار و محبت کا جذبہ ہمیشہ قائم رہتا ہے اور وہ انسان ہمیشہ دل میں بس جاتا ہے جو آپ کے ساتھ مخلص ہو۔ کیونکہ اصل زندگی تو یہی ہے۔ انسان اپنے لباس سے نہیں بلکہ اپنی زبان اپنے کردار سے پہچانا جاتا ہے۔

روشنی بخاری کا ناولٹ بہت اچھا تھا جب میں نے اسے پڑھا تو مجھے اپنے ہی شہر کی ایک عورت جس کے ساتھ بہت بے رحمانہ سلوک کیا گیا اور پھر اسے موت کے گھاٹ اتار کر اس کی لاش کو نہر میں ڈال دیا گیا۔ وہ عورت تو بیاہتا دلہن تھی۔ جب میں کوئی بھی کہانی پڑھوں تو مجھے وہ حقیقت ہی لگتی ہے کیونکہ اس طرح کی کہانیاں ہمارے معاشرے میں عام ہو گئی ہیں۔ روشنی بخاری آپ کی "ادھورے خواب" بہت اچھی تحریر ہے امید ہے کہ آئندہ بھی آپ اس طرح کی عمدہ تحریروں سے نوازتی رہیں گی۔

باقی تو کرن کے تمام سلسلے زبردست ہیں اور سلسلے وار تحریریں بھی بہت اچھی جا رہی ہیں۔ "بول کہ لب آزاد ہیں تیرے" کرن کرن خوشبو' مسکراتی کرنیں' نامے میرے نام" یہ سلسلے مجھے بہت پسند ہیں اب میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتی ہوں سوال یہ ہے کہ جب آپ کو ہر ماہ ڈھیروں خطوط ملتے ہیں۔ تو کیا آپ سارے خطوط ایک ایک کر کے پڑھتے ہیں اور جو قابل اشاعت ہوتا ہے وہی شائع کرتے ہیں یا جس پر آپ کا دل آ جائے وہی شائع کرتے ہیں؟ جواب ضرور دیجیے گا۔ میرے پچھلے خط کا جواب آپ نے اچھے انداز میں دیا پڑھ کر دل کو بہت سکون ملا۔

2010ء کا سال ہم سب بھائی بہنوں کے لیے دردناک یادیں چھوڑ گیا۔ اس سال ہمارے ابو طویل علالت کے باعث اس دار فانی سے انتقال کر گئے تھے۔ ماں تو ہماری بچپن سے ہی ساتھ چھوڑ گئی تھیں۔ ماں کے بعد ابو نے ہمیں ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا تھا۔ اور جب ہم اس پیار کے عادی ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ہم سے دور کر دیا۔ ان کی یاد ان کی موت کا صدمہ ہم ابھی تک نہیں بھولے۔

زندگی کبھی بھی اتنی دشوار نہیں لگی جتنا کہ اب لگ رہی ہے۔ ابو کی صحت یابی کے لیے میں نے بہت سے دعائیں مانگی تھیں۔ لیکن ایک دعا بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی بارگاہ میں قبول نہیں کی۔ اب ہم پر کسی بزرگ کا دست شفقت نہیں ہے زمانے کی گرم دھوپ سے ہم بہت ڈرتے ہیں کہ کہیں یہ تیز دھوپ ہم کو پوری طرح جھلسا کے نہ رکھ دے۔

آپ خود بتائیے کہ جب ایک انسان مسلسل مصیبتوں' پریشانیوں کا شکار ہو تو خود بخود مایوسی کے اندھیرے اس کے چاروں طرف چھانے لگتے ہیں۔ چاہنے کے باوجود امید کا دیا وہ روشن نہیں کر سکتا۔ ہمارے لیے دعا کیجیے گا کہ اللہ تعالیٰ ہم میں حوصلہ ہمت پیدا کرے ہم اللہ کی رحمت کے طلبگار ہیں۔ امید ہے کہ آپ میرا یہ خط بھی شائع کریں گے۔ کیونکہ آپ کے ڈائجسٹ کی بدولت مجھے اپنی دل کی بات زبان پر لانے کا موقع ملتا ہے اللہ تعالیٰ آپ کے ادارے کو بہت ترقی دے آمین اور آپ سب کو اس زمین پر ہنستا بستا رکھے کوئی بھی غم آپ کے نزدیک نہ آئے (آمین)

(ج) پیاری تحریم! اتنی اداس اور دل گرفتہ نہ ہوں موت تو ایک اٹل حقیقت ہے آپ اپنے والدین کے ایصال ثواب کے لیے قرآن پاک پڑھا کریں۔ اس سے خود آپ کو بھی سکون ملے گا۔ ہمیں بہت سارے خطوط ملتے ہیں اور ہم تقریباً سارے خطوط پڑھتے ہیں صفحات کی کمی کے باعث کم خطوط شائع کرتے ہیں۔

شاہین محمد شوقین۔۔۔ میرپور خاص

اس مرتبہ کرن پندرہ کو ملا ماڈل اچھی لگ رہی تھی سب سے پہلے میری طرف سے کرن کے پورے اسٹاف کو نیا سال مبارک ہو سعدیہ راجپوت کا مکمل ناول "عشق آتش" پڑھا بہت زبردست لگا اور باقی آئندہ شمارے میں لکھا تھا تو سوچا اگلی قسط اس سے بھی زیادہ اچھی ہو گی پھر اس کے بعد "گوشہ عافیت" پڑھا۔ شگفتہ بھٹی کا ناول بالکل حقیقت لگا۔ "دردل" نے اپنی جانب توجہ کھینچ لی ہے اور نبیلہ اچھا لکھ رہی ہے اور "اک ستارہ" بھی اچھے ناول تھے اور افسانے بھی ٹھیک تھے کرن کے تمام سلسلے بہت پسند ہیں خاص طور پر "دو کا پہاڑہ" مسکراتی کرنیں' کرن کرن خوشبو' اور انٹرویو جبکہ "یادوں کے دریچے" مجھے

شعر پسند ہے' کرن کا دستر خوان' اور حسن و صحت اپنی جگہ کرن کی خوبصورت کا لازمی جزو ہے اس مرتبہ کرن میں' نیلے پر "دیلا" نہ دیکھ کر دل اداس ہو گیا' نامے میرے نام' میں اپنے نام کا شدت سے انتظار رہے گا اور پلیز میری فرمائش پر پاپ سنگر' عاطف اسلم کا انٹرویو لازمی لیجیے گا اللہ رب العزت کرن کو دن دگنی اور رات چوگنی کامیابی عطا فرمائے آمین آخر میں کرن کے لیے ڈھیروں دعائیں اچھا اب اجازت دیں۔ اللہ حافظ

فوزیہ ثمر بٹ۔۔۔ گجرات

کرن پندرہ کی صبح ملا۔ دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی جھلک دیکھتی ماڈل اچھی لگ رہی تھی۔ حسب عادت سب سے پہلے حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھا۔

سال نو میں فنکاروں کے جوابات اچھے تھے۔ ہمارے ہاں سب سے بڑا مسئلہ ہے کہ جب بھی کوئی با اختیار ہوتا ہے حقیقت میں وہ بے اختیار ہو جاتا ہے۔ تمام کے تمام اختیار کو قید کر لیا جاتا ہے۔ اگر اختیار اپنے بس میں ہوتے تو پاکستان کے حالات کچھ اور ہوتے ۔۔۔ دو کا پہاڑہ میں فصیلہ قیصر کی باتیں کچھ خاص متاثر نہ کر سکیں۔ یا پھر یہ سلسلہ اب کچھ یکسانیت کا شکار ہو رہا ہے۔ پتا نہیں کیوں۔ دل اب کرن میں کچھ تبدیلی مانگتا ہے۔

سب سے پہلے سعدیہ جی کا "عشق آتش" پڑھا۔ جس کا بڑی بے صبری سے انتظار تھا۔ مگر یہ کیا جیسے جیسے ناول پڑھتے گئے ویسے ویسے ہمارا منہ حیرت سے کھلتا گیا۔ یہ کیا ہم نے کیا سوچ رکھا تھا اور رائٹرز صاحبہ یہ کیا سسپنس ڈال دیا ہے کہانی میں بہت سوچا بہت ہی سوچا مگر ہم اور ہمارا دماغ سعدیہ صاحبہ کی سوچ تک رسائی حاصل نہ کر سکا۔

بقول' میری بھابھی طیبہ عمران کے سعدیہ جی نے تو ہمیں چکرا کے رکھ دیا ہے۔ اگر شایان' ثانیہ کو کہتا ہے کہ ظہیر فاروقی' ملیحہ کے جنازے میں شامل تھے اور بقول گھر کے ملازم بہادر کے ملیحہ تو گھر سے کہیں گئی ہی نہیں اور نہ ہی اس کی شادی ہوئی۔ وہ گھر میں ہی فوت ہوئی ہے۔ تو کیا وجدان نے شائلہ سے شادی کر لی۔ وجدان ایسے کرے لگتا تو نہیں۔ یا پھر وجدان کا بیٹا شایان نے پالک ہو۔ مگر یہاں آ کر دماغ تھک جاتا ہے جب وجدان خود کہہ رہا ہے کہ ملیحہ شایان کی ماں تھی۔ یہ سب کیا چکر ہے اس قسط میں تو

سعدیہ صاحبہ نے ہمیں چکرا کے رکھ دیا ہے بہر حال اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے اور پلیز ذرا صفحوں کی تعداد زیادہ کریں۔ تھوڑا ناول پڑھنے کا مزا نہیں آتا جہاں ذرا اسٹوری کا لطف آنے لگتا ہے باقی آئندہ ہمارا منہ چڑھا رہا ہوتا ہے اور پلیز آنے والی قسط میں ان رازوں سے پردہ ضرور اٹھائیے۔

ناول نبیلہ عزیز کا "یادیں" بہت اچھا لگا۔ لوجی ہمارے شہر گجرات کی کہانی کیا نبیلہ عزیز گجرات کی رہنے والی ہیں۔ شکر ہے حسی صاحب نے رائنہ کی انسلٹ کو اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنایا ضروری نہیں ہر تعلق کے لیے کسی خونی رشتہ کا ہونا ضروری ہو۔ بہر حال سارے کا سارا ناول بہترین تھا۔ لڑکوں کی شیث سوچ گر بے فکرے انداز سے بے فکری میں بھی کچھ کر گزرنے کے خیالات شکر ہے۔ رائنہ نے اپنی غلطی تو تسلیم کی۔

"اک ستارہ مہان" لیلیٰ کی شمشام کو خود سری کی پسند نہیں آئی۔ اب ایسا بھی کیا انسان محبت میں اندھا ہو جائے کہ اسے اپنی عزت وقار کی پروا نہ ہو۔ نیلم کے خاوند نے اگر دوسری شادی کر لی تھی۔ تو کیا ہوا۔ مرد تو ایسا کبھی بھی کر سکتا ہے مگر نیلم نے کیا کیا اپنے اور اپنے بچوں کے ساتھ۔ ایسا کرنے سے کیا اس نے خاوند سے بدلہ لیا نہیں یہ تو اس نے اپنے اور بچوں پہ ظلم کیا۔ شکر ہے نیناں شمشام کی اصلیت جان گئی اور اس نے اپنے لیے ایک بہتر راستے کا انتخاب کیا۔

ناولٹ میں روشنی بخاری کا "ادھورے خواب" ظلم کی انتہا ہے بھئی۔ محبت کا اتنا برا انجام۔ ماہین پہ بے تحاشا غصہ آیا۔ جب اسے محبت کا ساتھ نہیں دینا تھا تو کیوں محبت کی۔ چوہدری جہانگیر اپنی بیٹی کو بھی مار دیتا مگر یہاں انصاف کرتا کون ہے۔

"گوشہ عافیت" شگفتہ جی یہ کیا کر دیا آپ نے وجیہہ نے دلنشیں کو طلاق دے دی۔ دلنشیں کو ایک بار تو اپنی صفائی میں بولنے کا موقع دیتا وجیہہ ایک جذباتی انسان تھا۔ پہلے جذبات میں آکر عاصمہ سے شادی کی اور اب بے چاری دلنشیں کو بے قصور ہوتے ہوئے طلاق دے دی کیا عقل ماری گئی ہے۔ اور مراد کا کیا بنا۔ وجیہہ نے اچھا نہیں کیا دلنشیں کے ساتھ۔

افسانوں میں مجھے "عنوان کی تفسیر ہو تم" اچھا لگا۔

ہر اسٹوری کا ہیپی اینڈ اچھا لگتا ہے۔ مستقل سلسلوں میں میرے خیال میں کچھ ردوبدل کی ضرورت ہے۔ "ستارے میرے نام" میں شاید پہلی بار مجھے اپنا تبصرہ اچھا لگا ہے "کرن کرن خوشبو" میں مجھے کرن شاہ کا لطیفہ اچھا لگا۔ کرن میں کوئی مزے دار سلسلہ شروع کریں۔

نشانورین۔۔۔ بوتالہ جھنڈا سنگھ

کافی غیر حاضری کے بعد فروری میں شامل ہو رہی ہوں اس امید کے ساتھ کہ اب ہر ماہ باقاعدگی سے لکھوں گی نئے سال کا نیا شمارہ اوپر سے پیاری سی ماڈل کو دیکھ کر دل خوش ہو گیا تیرہ کو ملا اور چودہ کو خط لکھ رہی ہوں۔

مکمل ناول میں نبیلہ عزیز نے "یادیں" لکھ کر دل جیت لیا اور حسن کی نوک جھوک سے خوب مزا آیا "عشق آتش" اپنی رفتار کے مطابق اے ون جا رہا ہے بس سعدیہ جی اس ناول کو زیادہ لمبا نہ کرنا۔

شگفتہ آپی "گوشہ عافیت" کو بڑی خوب صورتی سے آگے لے کر جا رہی ہیں کہ دلنشیں کو طلاق دے کر اداس کر دیا بس آپی آپ نے اچھا نہیں کیا دلنشیں کے ساتھ باقی کرن ابھی پڑھا نہیں ہے آئندہ تفصیل سے حاضر ہوں گی۔

ثمرین۔۔۔ نواب شاہ سندھ

جنوری کا کرن تیرہ تاریخ کو ملا اور اس دن نواب شاہ میں بہت سردی تھی یقین کریں ہم نے تو فرسٹ ٹائم اتنی سردی دیکھی تھی ہم لوگ بہت انجوائے کر رہے ہیں سردیوں کو اب آتے ہیں کرن کی طرف سب سے پہلے فوزیہ یاسمین کو شادی کی ڈھیروں مبارکباد اور ان کا ناول "دست کوزہ گر" بھی بہترین چل رہا ہے اور اس ناول میں میرا فیورٹ کیرکٹر فوزیہ کا ہے اور فوزیہ سب سے کم ہی کو لکھتی ہیں۔

نبیلہ عزیز کے ناول کی میں نے ابھی تک ایک بھی قسط نہیں پڑھی پتا نہیں کیوں ان کا ناول مجھے انٹرسٹنگ نہیں لگا مکمل ناولز میں "عشق آتش" کی اگلی قسط کا مجھے بہت زیادہ شدت سے انتظار ہے کیا تھا اگر آپ آخری قسط کر دیتیں تو اور "یادیں" اس دفعہ کا سپر ناول تھا۔ نبیلہ عزیز نے بہت بہت اچھا لکھا جب حسی نے رائنہ سے شادی کی تو لگا وہ ہی روایتی سی کہانی ہے لیکن اینڈ پڑھ کر بہت مزا آیا نبیلہ عزیز نے تھوڑا ہٹ کر لکھا اس لیے زیادہ انٹرسٹنگ لگا۔